تفسیرِ مکی

جلد اوّل



استاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ
حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم
المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ

تفسیرِ مکیؒ

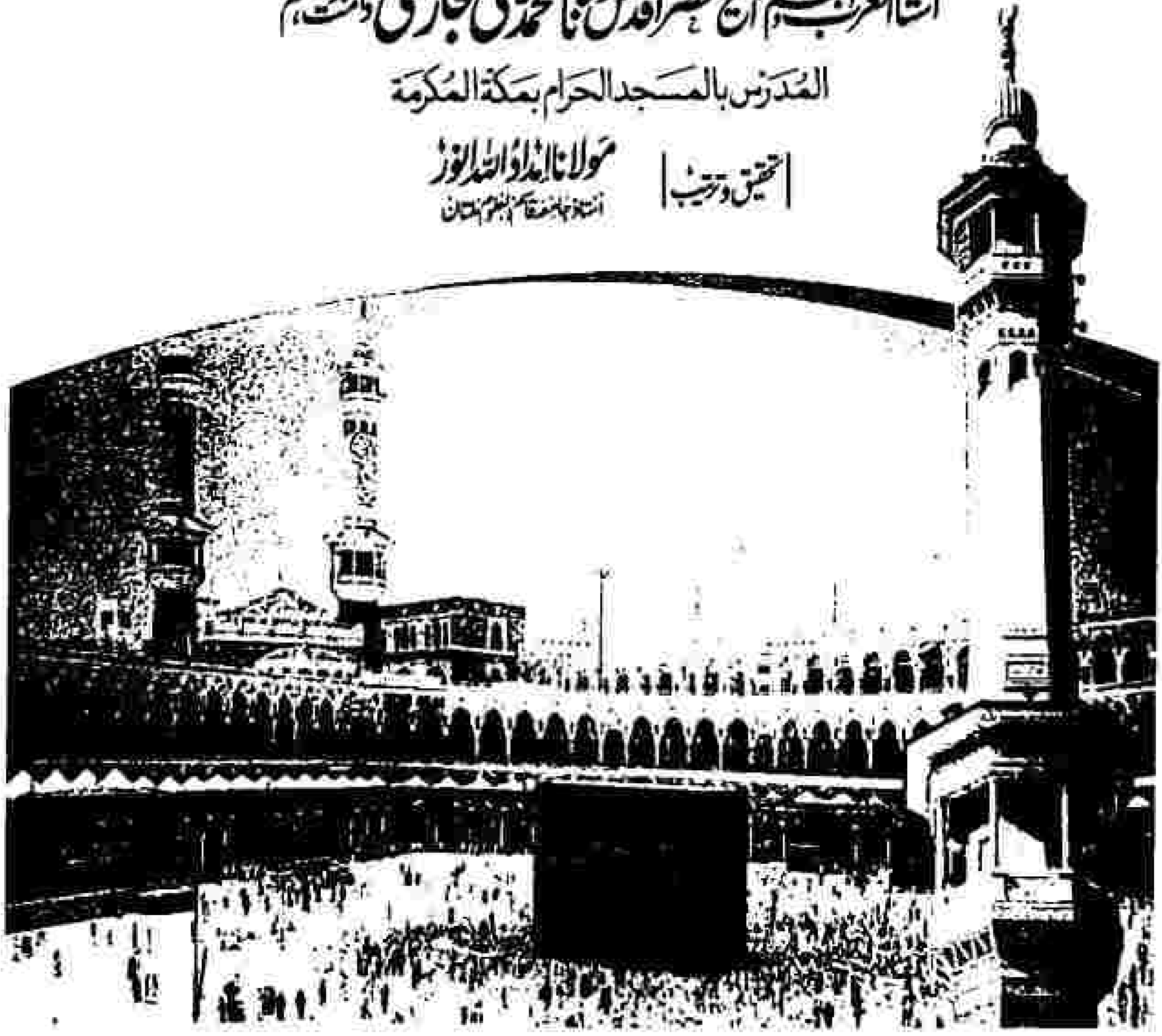
جلد 1

استاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم

المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ

تحقیق و ترتیب

مولانا امداد اللہ انور
استاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان



نام کتاب — تفسیر مکی جلد 1

صاحب خطبات — شیخ العرب والعجم حضرت مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم
المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ

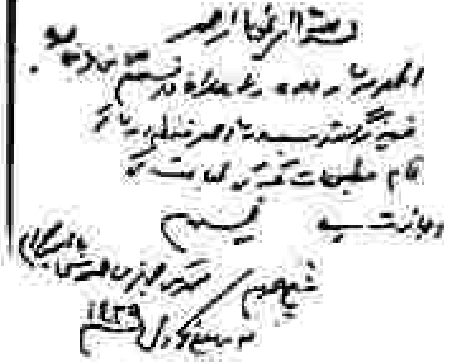
تحقیق و ترتیب — مولانا امداد اللہ انور

کمپوزنگ — دار التصنیف جامعۃ الفقیر اسلامی جھنگ

اشاعت اول — جنوری 2019ء

تعداد — 1100

اجازت طباعت



ناشر

مکتبۃ الفقیر

www.Tasawwuf.org

0300-9652292,03228669680

0335-7873390,03101702690

E-Mail : Alfaqeerfsd@yahoo.com

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرستِ مضامین

- عرضِ ناشر 11

43 حالاتِ صاحبِ تفسیر

- نام و نسب 43
- والد ماجد کا تعارف 43
- اولاد 44
- ابتدائی تعلیم 44
- شادی 45

- اشتیاق علم ــــ 453
- کیا آپ کی یہ ملازمت حکومت کی تعیین ہے؟ ــــ 465
- اساتذہ ــــ 467
- تبلیغی اسفار ــــ 468
- دروس وخطبات کی اشاعت ــــ 472
- پہلا حج ــــ 476
- تلامذہ ــــ 480
- مستقل عنوانات پر خطابات ــــ 483
- محلّ حمزہ کا مدرسہ ــــ 487
- فتنوں کی سرکوبی ــــ 488
- زہاطائی ــــ 503
- معمولات یومیہ ــــ 506
- اولاد ــــ 507

51 دروسِ تفسیر سورۂ فاتحہ

- سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ ــــ 529
- سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ ــــ 533
- تلاوت کے شروع میں ’’اَعُوْذُ بِاللّٰهِ‘‘ پڑھنا ــــ 535
- قرآن کی تلاوت سے پہلے تعوذ کیوں؟ ــــ 537
- جواب ــــ 540
- ’’إِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ‘‘ کا معنی ــــ 543

- "أَعُوْذُ" کا معنی کیا ہے؟ — 55
- "تَعَوُّذ" میں چار چیزیں ہیں — 55
- درود میں تشبیہ کا مسئلہ — 56
- اشکال — 57
- "تَعَوُّذ" میں پانچ چیزوں کی تفصیل — 57
- "تَعَوُّذ" کو مقدم کیوں کیا؟ — 58
- "تَعَوُّذ" کا صیغہ مفرد کیوں؟ — 59
- شیطان کی معرفت — 60
- حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ — 61
- تنبیہ — 61
- شیطان کا معنی — 62
- "رَجِیْم" کا معنی — 63
- قرآن کو "مَرْجُم" کہنا — 63
- علم کی اقسام — 63
- علوم نافعہ — 63
- شیطان کے سب کارنامے ناری ہیں — 63
- غزوہ بدر میں شیطان کی شرارت اور فرار — 64
- صوفیاء کا کلام — 65
- ایک پٹھان کی تقریر — 65
- بے نمازی کے کان میں شیطان کا پیشاب — 66
- جہنم میں دوزخیوں کا شیطان سے مباحثہ — 66
- شیطانی وساوس — 67
- شیطان سے پناہ کی وجہ — 67
- عجیب نکتہ! — 68

فہرست مضامین

- شیطان کی بات اثر کیسے کرتی ہے؟ — 69
- بعض دوسرے شیطانی شبہات — 69
- امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر الزام — 70
- شبہ کا جواب — 70
- شہوات کے ذریعے گمراہی — 72
- مال و دولت کے ذریعہ گمراہی — 72
- جہاد اقدامی کے خلاف شیطان کا دھوکہ — 73
- مرتد کے لیے شیطانی شبہ — 75
- جواب — 75
- شیطان کو پیدا کیوں کیا؟ — 76
- جواب — 76
- ایک لطیفہ، ایک حکایت — 76
- ایک مثال — 77
- شیطان کے وجود پر اعتراض — 77
- جوابات — 77
- شیطان دکھانے کا لطیفہ — 78
- ''أَعُوذُ بِاللّٰہِ'' سے شیطان کے بھاگنے کی وجہ — 79
- ''بِسْمِ اللّٰہِ'' تمام علوم کا خلاصہ ہے — 80
- ''بِسْمِ اللّٰہِ'' کا خلاصہ ''ب'' میں — 81
- ''ب'' کا مطلب — 81
- ''ب'' کے نقطے کا مطلب — 81
- نقطہ بڑھانے یا گھٹانے سے فرق — 81
- سنت کی اہمیت، بدعت کی مذمت — 82
- ''بِسْمِ اللّٰہِ'' میں اللہ کے تین نام — 82

- "بِسْمِ اللّٰہِ" کے متعلق نحوی بحث — 82
- ہر کام کے شروع میں "بِسْمِ اللّٰہِ" پڑھیں — 82
- مخلوق میں اسم موثر نہیں، ذات موثر ہے — 83
- اللہ کی ذات میں اسم موثر ہے — 83
- دلیل — 84
- اللہ کے ناموں کی تعداد — 84
- اللہ تعالیٰ کے کمالات کی کوئی حد نہیں — 84
- اسمائے حسنیٰ میں شعبوں کی تقسیم — 85
- حل مشکلات کا طریقہ — 85
- "تَوَسُّل بِالْاَعْمَال" کی دلیل — 86
- "تَوَسُّل بِالذَّات" اور اس کی دلیل — 88
- اللہ کے ناموں کا دعا میں استعمال — 89
- اسم اعظم سے دعا — 89
- دعا میں بے توجہی کا نقصان — 90
- ریاء کی عبادت — 90
- اللہ کا نام لینے سے نقصان ختم — 90
- حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا زہر کھانے کا واقعہ — 91
- خدا کی یاد کا فائدہ — 91
- ایک صحابی کی دعا — 92
- اسم اعظم کی برکت سے تخت حاضر ہو گیا — 93
- فہم قرآن کی شرائط — 94
- اللہ کی صفات — 94
- اللہ کی رحمت کی وسعت — 95
- غلبۂ رحمت کی ایک دلیل — 95

فہرست مضامین

- سو سال کے گناہ بھی رحمتِ باری سے معاف ہو جاتے ہیں ...... [illegible]
- رحمت کے غالب ہونے کی ایک اور مثال ...... [illegible]
- ''بسم اللہ'' میں ایک عجیب نکتہ! ...... [illegible]
- اللہ کی رحمت سے شرک کے سوا ہر گناہ کی معافی ہے ...... [illegible]
- ''بسم اللہ'' سورۂ فاتحہ کا جز نہیں 77
- ''بسم اللہ'' اس امت کی خصوصیت ہے ...... [illegible]
- ہر نماز میں سورۂ فاتحہ ضروری ہے 78
- خلاصۂ قرآن ...... [illegible]
- ملحدین کا ایک اعتراض ...... [illegible]
- جواب ...... [illegible]
- دین کا خلاصہ تین چیزیں ہیں 99
- خالق کی عظمت اور مخلوق پر شفقت کا نام ہی دین ہے 99
- ''بسم اللہ'' کا خلاصہ ''ب'' میں ہے 100
- نوافل سے قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے 100
- اللہ والوں کی خوشی کا راز 101
- حضرت ابراہیم علیہ السلام اور رضائے خداوندی 101
- ''ب'' کے اور معانی 102
- نکتہ 102
- اپنی خودی کی نفی کر دو 102
- عجیب نکتہ! 103
- ''بسم اللہ'' کا حاصل 103
- تین باتوں میں مغالطہ 104
- اسلام کی راہِ اعتدال 104
- صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذوقِ یقین 105

- حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کا واقعہ — 105
- حاصل کلام — 106
- "بسم اللہ" کا سبق کیا ہے؟ — 106
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اللہ کا حکم ہے — 107
- فراخی رزق کا وظیفہ — 107
- "بسم اللہ" میں دنیا وآخرت کی سب بھلائیاں ہیں — 108
- "تعوذ" اور "تسمیہ" کا مقصد — 108
- تمہید — 109
- اہل عرب پر اللہ کا خاص احسان — 109
- ہندوستان میں فہم قرآن کا ذوق — 109
- تفسیر فاتحہ کی ضرورت — 110
- نماز ہی دین کی اساس ہے — 110
- "نماز آنکھوں کی ٹھنڈک ہے" کی عجیب تشریح! — 110
- ایک بڑے پیر کو عید کی نماز بھی نہیں آتی تھی — 112
- جنازہ میں فاتحہ پڑھنے والوں کا رد — 113
- نماز کا ترجمہ ضرور سیکھیں — 114
- علم تکرار کرنے سے آتا ہے — 115
- ابا جی کا شوق علم — 115
- صحیح نماز کی برکات — 116
- سورۂ فاتحہ پہلی سورت کیسے ہے؟ — 116
- جواب — 116
- سورۂ فاتحہ کے کئی نام ہیں — 116
- دو نور — 117
- سورۂ فاتحہ سے عذاب ٹل گیا — 117

فہرست مضامین

- سارا قرآن فاتحہ کی شرح ہے — 117
- سورۂ فاتحہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم کا دم اور ہدیہ لینا — 117
- ہر بیماری سے شفایاب ہونے کے دو طریقے — 119
- سورۂ فاتحہ درخواست بھی ہے — 120
- فضیلت سورۂ فاتحہ — 122
- سورۃ الفاتحہ کے کچھ نام — 122
- آدابِ درخواست — 123
- سورۂ فاتحہ ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے — 123
- سورۂ فاتحہ میں بندے کا حصہ — 123
- جامع دعا — 124
- صراطِ مستقیم کی دعا مانگنے کی وجہ — 124
- مذاہب اربعہ حق ہیں — 125
- (1)......دین کی دعا مانگیں — 126
- حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا استغناء — 126
- ہمارے والد صاحب کا استغناء — 127
- ناجائز حیلہ — 127
- ایک چالاک شخص کا حیلہ — 128
- تصحیح معاملات — 128
- دارالعلوم دیوبند میں احتیاط — 129
- حضرت بنوری رحمہ اللہ اور احتیاط — 129
- A.K بروہی اور ختمِ نبوت کا مقدمہ — 130
- مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی رحمہ اللہ کے متعلق غلط فہمی — 130
- علماء اور خدمتِ دین — 131
- (2)......دعا کا دوسرا فائدہ — 132

- اس دعا میں کیا طلب کیا گیا؟ — [illegible]
- مرزائیوں کا فریب — [illegible]
- فریب کا رد — [illegible]
- حضور ﷺ کی حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کو تسلی — [illegible]
- صالحین میں شمولیت — [illegible]
- شہید کو شہید کیوں کہتے ہیں؟ — [illegible]
- صحابہ رضی اللہ عنہم کا مقام صدیقیت — 135
- علم کے مراتب — 135
- "مغلق" اور "مطلق" کی وضاحت — 136
- فلاسفۂ یونان اور ہندوؤں کا نظریہ — [illegible]
- عالموں کی دھوکہ بازیاں — [illegible]
- یہودی کا اعتراض، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جواب — [illegible]
- انسان میں کمال تحقیق — [illegible]
- جدید تہذیب کی ڈسی ہوئی عورتیں اور لڑکے — 139
- نئی تہذیب کی بدحالی — [illegible]
- حضرت ہزاروی رحمہ اللہ کی سادگی اور قناعت پسندی — [illegible]
- مولانا ہزاروی رحمہ اللہ کی جرأت — [illegible]
- نہرو کی سادگی — [illegible]
- اللہ کی قدرت کا کمال — [illegible]
- حضور ﷺ کے اخلاق کا ملے — [illegible]
- ایک ہندو جوگی اور اولیاء کے دل کی حالت — [illegible]
- یہود و نصاریٰ کا نظریہ اخلاق — [illegible]
- یہودی کا نظریہ — [illegible]
- یہودیوں کی تعداد کم کیوں ہے؟ — [illegible]

فہرست مضامین

- اسلام کے نزدیک انسان کی اصلاح ہو سکتی ہے ____ 145
- تخلیقِ انسانیت پر غور کرو ____ 146
- قرآن کے اعجاز پر کفار کی گواہی ____ 147
- انسان میں تین قوتیں ____ 148
- غصہ کی قوت ____ 148
- غصہ میں تین طاقتیں ____ 148
- غصہ میں اعتدال ____ 149
- حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اعتدال ____ 149
- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اعتدال ____ 150
- حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا اعتدال ____ 150
- کفار کا فلسفۂ اخلاق ____ 151
- اخلاقِ اسلامی اور گروہ بندی ____ 151
- علماء کی ذمہ داری ____ 151
- صوفیاء کے ہاں اصلاح کا طریقہ ____ 152
- حقیقی انقلاب ____ 152
- روزہ سے اخلاق کا علاج ____ 152
- حضرت علی رضی اللہ عنہ اور گمراہ لوگ ____ 153
- حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں غلو ____ 153
- شیعہ سنی کا لطیفہ ____ 154
- ایک اور لطیفہ ____ 155
- تحریف کر کے گیارہویں کا ثبوت ____ 155
- مولوی سردار لائل پوری سے مناظرہ ____ 155
- الزامی جواب کی حیثیت ____ 156
- حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل قرآن میں نہیں ____ 156

- علوی فرقہ کا رد — 157
- حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق عادلانہ رائے — 158
- والدین کے حق میں جہالت کی انتہاء — 158
- اعتدال کی مثال — 159
- گناہوں پر ناگواری ایمان کا حصہ ہے — 159
- افراط اور تفریط کی مثال — 160
- مصری عورتوں کا حسن — 160
- حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت — 160
- گناہ کا اثر — 160
- علم حاصل کرنے میں افراط و تفریط — 161
- مغرب کا ایک کمال، ایک زوال — 161
- چاند پر سب سے پہلے کتیا کو بھیجا — 162
- افراط کی ایک مثال — 162
- اچھی بات ہر کسی سے لی جاسکتی ہے — 162
- روزوں سے شہوانی قوت میں تبدیلی — 163
- سورۂ فاتحہ کے کچھ نام — 163
- فلسفۂ یونان کا رد — 163
- مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کا تجربہ — 165
- مولانا آزاد رحمہ اللہ کا جملہ — 165
- اسلام کا نظریہ — 165
- چالیس کے عدد میں حکمت — 167
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کا اثر — 168
- بچے پر ماں باپ کا اثر — 169
- بچے کی فطرت — 169

- ایک عالم کا عبرتناک قصہ ... 169
- یورپ میں دین داروں کی دین داری قابل رشک ہے ... 170
- اولیاء اللہ کی صحبت کا اثر ... 171
- میرے ایک دوست کا واقعہ ... 171
- سابقہ مضامین کے بیان کا مقصد ... 172
- مشورہ کی اہمیت ... 172
- ہر کام اطمینان سے کرو ... 172
- شفاعت کبریٰ میں حضور ﷺ کی حمد و ثنا ... 173
- اللہ تمام کمالات سے موصوف ہے ... 174
- والدین کا نافرمان ... 174
- کسی میت کے متعلق لوگوں کی اچھی یا بری گواہی ... 175
- ایسی موت پر تم ہنسو اور لوگ روئیں ... 176
- خدا کے خوف سے رونے والے ... 176
- سب کو پالنے والا رب ... 176
- جدید تعلیم یافتہ لوگ اور بوڑھے والدین ... 177
- ایک دیہاتی کی عجیب دعا ... 177
- اصلاح اخلاق کے تین طریقے ... 178
- (۱)......تلاوت کتاب ... 178
- تلاوت اور قراءت کا ایک فرق ... 179
- قرآن کی تلاوت کا اثر ... 180
- (۲)......قرآن و حدیث کی تعلیم ... 180
- (۳)......تزکیہ کے ذریعہ سے اصلاح ... 180
- علماء اور صلحاء کے ذریعہ سے علاج ... 181
- حضرت تھانوی رحمہ اللہ اور مولانا ظہیر الحق رحمہ اللہ کا واقعہ ... 181

- سنتوں اور نوافل کی اہمیت ______ 181
- فقہ حنفی کی خصوصیات ______ 182
- جلال الدین بخاری رحمہ اللہ اور محبوب سبحانی رحمہ اللہ کا واقعہ ______ 182
- قرآن و حدیث کے مخفی اشارات ______ 183
- روحانی معالج کا طریقہ اصلاح ______ 184
- حضرت لاہوری رحمہ اللہ چالیس دن میں اصلاح کر دیتے تھے ______ 184
- سید عطاء اللہ بخاری رحمہ اللہ کا واقعہ ______ 184
- اصلاح کے اہل حضرات ______ 185
- خدا کی ربوبیت عامہ ______ 186
- ایک ڈی سی کا لطیفہ ______ 187
- جنگ و جدال میں امن و امان کا حکم ______ 187
- سب پر رحم کا حکم ______ 188
- ایک گندی عورت کا قصہ ______ 188
- "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کا معنی ______ 189
- عدل و انصاف کا حکم ______ 189
- تواضع کا سبق ______ 190
- سلطان محمود اور ایاز کا واقعہ ______ 190
- قناعت و استغنی کا حکم ______ 190
- اپنے مولی پر انحصار کا واقعہ ______ 191
- علوم نافعہ اور علوم ضارہ ______ 191
- علوم رحمانیہ کے فائدے ______ 191
- سیدھا راستہ کیا ہے؟ ______ 192
- ہدایت کا معنی ______ 192
- استقامت کا معنی ______ 194

فہرست مضامین

- ہدایت کا مفہوم
- جانوروں کی ہدایت کا مفہوم
- ہدایت کی اقسام
- "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" کا معنی
- نماز کا مقصد
- دو صغیر صحابہ رضی اللہ عنہما کا واقعہ
- عبادت کو استعانت سے مقدم کیوں کیا؟
- "نَعْبُدُ" اور "نَسْتَعِیْنُ" کیوں فرمایا؟
- "نَعْبُدُنَا" کیوں نہیں فرمایا؟
- مانگنے والوں سے بھی زیادہ کب ملتا ہے؟
- دعا کے آداب
- ایک اللہ والے کا واقعہ
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقامِ عبدیت
- عبادت کا ایک طریق یہ ہے
- حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کا واقعہ
- جنتیوں کے لیے سب سے بڑی نعمت
- سلطان محمود رحمہ اللہ کے وزیر ایاز کا واقعہ
- "الصِّرَاطَ" کی قرأت
- بعض حروف کے مشکل مخارج
- دعا کی قبولیت کی شرائط
- ہدایت کے متعلق اشکال و جواب
- وسیلے کی جائز اقسام
- وسیلے کی ناجائز اقسام
- ہدایت اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں

- خاص الخاص ہدایت کا معنی ____ [illegible]
- ہدایت کی اقسام ____ [illegible]
- "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" کی تفسیر اور معانی ____ [illegible]
- اسلام دین بھی ہے اور مذہب بھی ____ [illegible]
- جدید مسائل کا حل ____ [illegible]
- گھر کو شریعت کے مطابق چلائیں ____ [illegible]
- ایک عورت کا واقعہ ____ [illegible]
- حضرت ابوبکر ﷛ کی جرأت ____ [illegible]
- اسلام کے متعلق جدید لوگوں کا مزاج ____ [illegible]
- اسلام پر پورا پورا عمل کرنے کا حکم ہے ____ [illegible]
- چار اماموں کے مسلک پر اعتراض ____ [illegible]
- جواب ____ [illegible]
- ائمہ اربعہ اور محدثین کی ضرورت و اہمیت ____ [illegible]
- ائمہ کا اصول اجتہاد ____ [illegible]
- مکمل دین کی اتباع لازم ہے ____ [illegible]
- ایک پیر کی جہالت ____ [illegible]
- حضور ﷺ کی طرف سے ایک بہترین مثال ____ [illegible]
- سیدھے راستے کے لیے پانچ صفات ____ [illegible]
- جھگڑا کب ہوتا ہے؟ ____ [illegible]
- ایک یہودی سے مکالمہ ____ [illegible]
- یہودی کے اعتراضات اور ان کے جوابات ____ [illegible]
- یہودی کا دوسرا اعتراض اور اس کا جواب ____ [illegible]
- دین اسلام کی حدود ____ [illegible]
- "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" کے دوسرے معانی ____ [illegible]

فہرست مضامین

- خلاصۂ بحث — [illegible]
- امام ابن جریر رحمہ اللہ کے نزدیک راجح قول — [illegible]
- ہدایت پانے کے بعد ہدایت مانگنے کا حکم کیوں ہے؟ — [illegible]
- حضرت عدی بن حاتم طائی رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کا واقعہ — [illegible]
- "اَلْمَغْضُوْبِ" کون اور "اَلضَّآلِّيْنَ" کون؟ — [illegible]
- عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا — [illegible]
- "ض" اور "ظ" کا مخرج — [illegible]
- "ض" پر جھگڑے — [illegible]
- فاتحہ میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی — [illegible]
- اللہ کی طرف مذموم چیز کی نسبت — [illegible]
- متشابہات کے ساتھ دھوکہ دینے والے فرقے — [illegible]
- فاتحہ کے بعد آمین — [illegible]
- فاتحہ کے بعد آمین کہنا مستحب ہے — [illegible]
- آمین کہنے میں فرشتوں کی موافقت — [illegible]
- آمین مل جانے کا مطلب کیا ہے — [illegible]
- آمین کا معنی — [illegible]
- امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھے — [illegible]
- آمین آہستہ کہو — [illegible]
- یہودیوں کا مسلمانوں سے بغض — [illegible]
- آمین اس امت کی خصوصیت ہے — [illegible]
- امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے کے دلائل — [illegible]
- نماز میں فاتحہ واجب ہے — [illegible]
- سورۂ فاتحہ کا اخلاق سے تعلق — [illegible]
- اللہ سب کو دیتا ہے — [illegible]

- اسرائیلی روایات کے متعلق حضور ﷺ کا فرمان
- ایک اسرائیلی قصہ
- امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ایک شرابی سے حسن سلوک
- امام احمد رحمہ اللہ کی ایک ڈاکو کے لیے دعا
- مرزائیوں کا ورد و لعنت
- پورے دین کا خلاصہ دو چیزیں
- میرا اپنے عہدیدار دوستوں سے رویہ
- انگریزوں کے نزدیک پاکستانیوں کی نفسیات
- انسان کی اصلاح کب ہوگی؟
- شفقت علی الخلق
- ایک فاحشہ عورت کا واقعہ
- ایک بلی پر ظلم کی وجہ سے جہنم کا فیصلہ
- حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ کا واقعہ
- حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی دعوت کا واقعہ
- دودھ کا ایک پیالہ ستر صحابہ کو کافی ہوگیا
- عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کی شفقت سے بھنگی مسلمان ہوگیا
- کسی پر ظلم مت کرو
- دوسروں کا بھی خیال رکھو
- عادت نہیں جاتی...... حکایت
- ﴿الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ کی تفسیر
- سورۂ فاتحہ میں سات اخلاق

سورۂ فاتحہ کی عرفانی تفسیر 253

- کتاب اللہ اور رجال اللہ 255
- حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت معنوی 255
- نجومیوں وغیرہ کی تصدیق کرنا 256
- طاہرا لقادری کا لطیفہ 257
- ایک لاکھ ریال مانگنے والے کا فراڈ 256
- ایک دو بجے والے مولوی کا لطیفہ 257
- قل خوانی کا لطیفہ 258
- اولیاء کی تعریف قرآن سے 258
- اولیاء کو ماننے میں اعتدال 258
- مولانا غلام محمد دین پوری رحمۃ اللہ علیہ نے کرامت کیوں نہ دکھائی؟ 259
- مولانا تاج محمود امروٹی رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت 259
- انگریز کا افسر اندھا ہو گیا 260
- روحانی سیر کے درمیان چار حجاب 261
- پہلا حجاب، غفلت 262
- دوسرا حجاب، جہل 262
- تیسرا حجاب، رسم 263
- فیشن کا زمانہ اور رسم و رواج 263
- چوتھا پردہ 264
- جھوٹی قسم میں قرآن اٹھانے والے کا واقعہ 264

- کچھ دوسری قسموں کا خوف ____ [illegible]
- سورۂ فاتحہ سے غفلت کا پردہ کیسے دور ہوتا ہے؟ ____ [illegible]
- جہالت کا پردہ کیسے دور ہوتا ہے؟ ____ [illegible]
- رسم و رواج کا پردہ کیسے دور ہوتا ہے؟ ____ [illegible]
- غیر سے خوف کا پردہ کیسے دور ہوتا ہے؟ ____ 265
- پردے ہٹنے کے بعد کا عمل ____ 266
- اللہ کی مخلوقات میں اللہ کی حکمتیں ____ 266
- سات کے عدد میں حکمتیں ____ 267
- سورۂ فاتحہ پر شبہات ____ 267
- شبہات کی مثال ____ 267
- پرانے شبہات ____ 268
- جوابات ____ 269
- اس جواب پر شبہ ____ 270
- جواب شبہ ____ 271
- مسیلمہ کذاب کی جھوٹی وحی ____ 271
- مرزا قادیانی کا فرشتہ ٹیچی ٹیچی ____ 271
- روافض کی تحریف قرآن ____ 271
- لوگوں کے دل اب قرآن کا اثر کیوں نہیں لیتے؟ ____ 272
- متأخرین اعدائے اسلام ____ 272
- اہل سنت کی اپنے اکابر سے غفلت ____ 273
- مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ____ 273
- میری تقاریر کا ایک نوجوان پر اثر ____ 273
- ہم پر قرآن کا اثر کیوں نہیں ہوتا؟ ____ 273
- الشابرتن کبھی نہیں بھر سکتا ____ 273

فہرست مضامین

- کٹورے میں تیل لینے والے بچہ کا واقعہ ______ [illegible]
- میرے ایک شاگرد کا قصہ ______ [illegible]
- میرا درس دینے کا مقصد ______ [illegible]
- اعتراض کیا اللہ کسی اور اللہ کے نام سے قرآن شروع کرتا ہے؟ ______ [illegible]
- پہلا جواب ______ [illegible]
- دوسرا جواب ______ [illegible]
- عیسائی این جی اوز اور مشنریز ______ [illegible]
- قدیم کفار کے اعتراضات کا محور ______ 278
- حضور ﷺ پر شاعر ہونے کا الزام ______ 278
- شاعرانہ تخیلات کا واقعہ نمبر ۱ ______ 279
- واقعہ نمبر ۲ ______ 279
- واقعہ نمبر ۳ ______ 279
- کفار کا حضور ﷺ کو شاعر کہنے کی ایک وجہ ______ 280
- جادوگروں کی گندگیاں ______ 281
- قبر میں عام مردوں کی حالت ______ 281
- حضور ﷺ کو جادوگر کہنے کی وجہ ______ 281
- حضور ﷺ کو کاہن کہنے کی وجہ ______ 281
- مشرکین کے دوسرے شبہات ______ 282
- آج کا دور ______ 282
- ترتیب قرآنی پر اعتراض ______ 283
- مدنی سورتیں پہلے کی بعد میں کیوں؟ ______ 284
- آج کل کے مسلمان کا حال ______ 284
- ترتیب قرآنی پر بہترین تفسیر ______ 286
- شبہات کا جواب دینے کی اہمیت ______ 286

- قرآن کو اللہ کے نام سے شروع کرنے پر شبہ
- جواب
- دوسرا جواب
- شبہ، اللہ کی اپنی زبان سے اپنی تعریف
- "رحمٰن ورحیم" کا تکرار
- بعض کلام میں تکرار کا حسن
- کیا سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں؟
- جواب
- رحمٰن ورحیم کی تقدیم وتاخیر کا سوال
- پہلا جواب
- دوسرا جواب
- تیسرا جواب
- ایک اور جواب
- عبادت پہلے اور مدد بعد میں کیوں؟
- جواب نمبر 1
- جواب نمبر 2
- علامہ اقبال مرحوم کا استدلال
- جواب نمبر 3
- کیا اللہ دنیا کا مالک نہیں؟
- ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں سے ہمارا مطالبہ
- قرآن اور اہل سنت کی صداقت
- کفار کو چیلنج
- شاہ فیصل مرحوم کا مدبرانہ جواب
- ایک مسلمان وکیل کی عقلمندی

فہرست مضامین

- اسلام کا قانون قصاص — [illegible]
- حرام کا کاروبار بھی حرام ہے — [illegible]
- شراب کی مذمت — [illegible]
- ایک صاحب کا واقعہ — [illegible]
- تثلیث کے استدلال کا رد — [illegible]
- ایک سنی عالم کا شیعہ کو جواب — [illegible]
- تثلیث کا جواب — [illegible]
- ہدایت پانے کے بعد ہدایت کی دعا کیوں؟ — [illegible]
- قرآن کی صداقت چودہ سو سال سے چیلنج کر رہی ہے — [illegible]
- قرآن کی اخبار غیب — [illegible]
- قرآن میں جدید علوم کا کمال — [illegible]
- اند کے دو ٹکڑے ہونے پر اعتراض — [illegible]
- جواب — [illegible]
- ایک نحوی اشکال — [illegible]
- جواب کی تمہید — [illegible]
- بدل اور مبدل منہ والے شبہ کا جواب — [illegible]
- کیا فاتحہ میں یہود و نصاریٰ کی دشمنی سکھائی گئی ہے؟ — [illegible]
- قرآن کی اہل کتاب سے رواداری — [illegible]
- ایک اعتراض اور اس کا بہترین جواب — [illegible]
- یہودیوں پر غضب کی ایک وجہ — [illegible]
- روی سپر پاور کے حکمران ہرقل کا حضور ﷺ کے بارے میں نظریہ — [illegible]
- ایک اور جواب — [illegible]
- قرآن کی عظیم الشان سورت — [illegible]
- سورۂ فاتحہ مکی بھی ہے اور مدنی بھی — [illegible]

- پورا قرآن صراط مستقیم کا جواب ہے ـــــــ [illegible]
- سورۂ فاتحہ کے اہم مضامین ـــــــ [illegible]
- سورۂ فاتحہ کا خلاصہ "بسم اللہ" میں ـــــــ [illegible]
- "بسم اللہ" کا خلاصہ "ب" کے نقطہ میں ـــــــ [illegible]
- نماز میں فاتحہ واجب ہے ـــــــ [illegible]
- امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا مسئلہ ـــــــ 323
- امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے دلائل ـــــــ 323
- امام کے کلام مقتدی کے کلام کیسے ہوئے؟ ـــــــ 325
- شریعت میں ایک مسئلہ کے کئی درست احتمالات ـــــــ 326
- پہلی مثال ـــــــ 326
- دوسری مثال ـــــــ 327
- ائمہ فقہ کی تعظیم ـــــــ 327
- بعض اسلامی کتابوں کی مقبولیت ـــــــ 328
- بعض مقبول تراجم قرآن ـــــــ 328
- ایک مراثی کا تفسیر لکھنے کا دعویٰ ـــــــ 329
- قربانی پر جدید لوگوں کا اعتراض ـــــــ 329
- اسلام پر جدید اعتراضات ـــــــ 330
- سورۂ فاتحہ کے نام ـــــــ 330
- سورۂ فاتحہ کے مضامین ـــــــ 331
- زمانوں کے اعتبار سے سورۂ فاتحہ کی تقسیم ـــــــ 331
- عبادت کا معنی اور اقسام ـــــــ 332
- عبادت صرف خدا کی ہے ـــــــ 332
- بندے کی صفت عبدیت کاملہ ـــــــ 332
- قبروں کی تعظیم ـــــــ 333

فہرست مضامین

- سجدہ صرف خدا کے لیے ____ 335
- بندے کو رب بنانے کی مثال اور چند قابل اصلاح امور ____ 336
- غیر سے مدد مانگنا کب شرک ہے؟ ____ 337
- معجزہ اور کرامات کے ذریعے نا طاقتی ____ 340
- غیر خدا کو قدرت واختیار ____ 341
- نعرۂ حیدری ____ 342
- یا رسول اللہ کا نعرہ ____ 342
- تین نعرے اور تثلیث ____ 343
- مسئلہ الوہیت ____ 343
- سورۂ فاتحہ جامع دعا ہے ____ 344
- صراط مستقیم کی دعا ____ 344
- صراط کا معنی ____ 345
- ہدایت پر ہدایت طلب کرنے کا مطلب ____ 345
- حضرت ابراہیم بن ادھم ؒ کا واقعہ ____ 346
- صراط مستقیم کا ایک اور معنی ____ 346
- قادیانیوں کا دھوکہ ____ 348
- انعام یافتہ حضرات ____ 349
- ایک علمی نکتہ ____ 350
- اللہ کی طرف اچھی چیز کی نسبت کرو ____ 350
- غضب اور ضلال کا اطلاق ____ 351
- غضب اور ضلالت کے مستحق ____ 352
- اللہ کا راستہ اور نیک حضرات قابل تقلید ہیں ____ 352
- کونسا فرقہ کامیاب ہوگا؟ ____ 353
- سب کے لیے ہدایت طلب کرو ____ 353

■ مقبول دعا کا طریقہ [illegible]
■ وضاحت [illegible]

357 دروسِ تفسیرِ ابنِ کثیر

■ "سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ" 358
■ سورۂ فاتحہ کی وجہ تسمیہ 359
■ فاتحہ کا نام "اُمُّ الْكِتَابِ" کیوں؟ 359
■ بعض علماء نے "اُمُّ الْكِتَابِ" نام پسند نہیں کیا 359
■ کیا "اُمُّ الْقُرْآنِ" نام صحیح ہے؟ 360
■ احرام کھولنے سے پہلے سر منڈانے کا مسئلہ 360
■ بعض انفرادی اور اجتہادی مسائل 362
■ اپنے اکابر کا احترام 363
■ سورۂ فاتحہ کے مختلف نام 364
■ سورۂ فاتحہ زہر میں بھی شفا ہے 365
■ سورۂ فاتحہ دم بھی ہے 365
■ کیا کیا چیز دم کر سکتے ہیں؟ 368
■ لوگوں کو اسلام کے قریب کرنے کا ایک طریقہ 369
■ اس زمانے کے لوگوں کا حال 369
■ قوم کی قرآن سے بے وفائی 371
■ سورہ "اَسَاس"، "وَاقِيَة"، "كَافِيَة" 372
■ یہ سورت مکی بھی ہے، مدنی بھی ہے 373

فہرست مضامین

- اختلاف صحابہ کی وجہ ___ [illegible]
- اکابر اور ائمہ کا ادب ___ [illegible]
- فاتحہ کا مکی ہونا راجح ہے ___ [illegible]
- فاتحہ کی آیات کی تعداد ___ 375
- کیا بسم اللہ مستقل آیت ہے؟ ___ 375
- سورۂ فاتحہ کے کلمات اور حروف ___ 376
- فاتحہ کو ام الکتاب کیوں کہتے ہیں؟ ___ 376
- مکہ کو ''ام القری'' کہنے کی وجہ ___ 376
- کیا بسم اللہ فاتحہ کا جز ہے؟ ___ 377
- ''سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ'' کی بحث ___ 377
- ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں فاتحہ کیوں نہیں لکھی گئی تھی؟ ___ 378
- کتابت وحی ___ 379
- سب سے پہلے اترنے والی سورت ___ 380
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اہمیت ___ 380
- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نماز باجماعت کی پابندی ___ 381
- اس صحابی کو ایک خاص سورت کی تعلیم ___ 382
- اس حدیث سے مستنبط مسائل ___ 382
- امام اعمش رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا واقعہ ___ 383
- وہ عظیم سورت یہ ہے ___ 384
- امام ابن کثیر رحمہ اللہ کی طرف سے ایک علمی تنبیہ ___ 384
- محمد بن جریر دو ہیں اور ان دونوں میں فرق ___ 386
- امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے حوالے سے حدیث گھڑنے والا واقعہ ___ 386
- میری طرف غلط مسائل کی نسبت ___ 387
- حدیث ابی رضی اللہ عنہ ___ 388

- حدیث عبد اللہ بن جابر رضی اللہ عنہ ____ 389
- کیا قرآن کا بعض حصہ بعض سے افضل ہے؟ ____ 390
- حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی فضیلت ____ 392
- حطیم اور حجر اسود پر بے ہنگم رش ____ 393
- سورۂ فاتحہ میں زہر کا دم ____ 393
- ڈسے ہوئے کے لیے عربی محاورہ ____ 394
- زبان سے برے کلمات ادا نہ کرو ____ 395
- سورۂ فاتحہ کا ایک خاص فرشتہ کے ذریعہ سے نزول ____ 395
- سارا قرآن نور ہے ____ 396
- قرآن، نبی اور مسلمان کے متعلق نور کا استعمال ____ 397
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اترنے والے دو نور ____ 397
- خاص فرشتے کے ذریعے فاتحہ کے اترنے کا مطلب ____ 397
- فاتحہ اور تلاوت قرآن کو نماز کا درجہ کیوں ملا؟ ____ 398
- فاتحہ کے زیادہ نام عظمت شان کی دلیل ہے ____ 399
- فاتحہ مضامین قرآن کا خلاصہ ہے ____ 399
- انسان کی زندگی کے تین دور ____ 399
- سورۂ فاتحہ آدھی اللہ کے لیے، آدھی بندہ کے لیے ____ 401
- والدین کی اولاد پر شفقت ____ 402
- اللہ کے تحت احکام کی مثال ____ 403
- عصمت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق اترنے والی آیات کی حکمتیں ____ 403
- رحمٰن اور رحیم کی رحمت کے مفاہیم ____ 404
- ماں کی اور رب کی رحمت کی مثال ____ 405
- صراط مستقیم پر استقامت ____ 406
- ہدایت کے چار مراتب ____ 406

فہرست مضامین

- تلاوت سے پہلے تعوذ ـــــــــــ 508
- حضور ﷺ کے کفار پر احسانات ـــــــــــ 509
- ایک طوائف پر احسان ـــــــــــ 510
- تعوذ کا فائدہ ـــــــــــ 510
- تعوذ کب پڑھیں؟ ـــــــــــ 511
- پہلا قول ـــــــــــ 511
- دوسرا اور راجح قول ـــــــــــ 511
- تیسرا قول ـــــــــــ 511
- سورۂ فاتحہ کی فضیلت ـــــــــــ 512
- مسئلہ قرأت فاتحہ خلف الامام ـــــــــــ 513
- غیر اللہ کے نام کا صدقہ، بچھڑا ـــــــــــ 515
- شوافع کی دوسری دلیل ـــــــــــ 516
- سورۂ فاتحہ میں بندے کا حصہ ـــــــــــ 516
- قرأت خلف الامام ـــــــــــ 519
- بعض احادیث کا صحیح معنی ـــــــــــ 523
- امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر بعض نامناسب اعتراضات ـــــــــــ 525
- امام ترمذی رحمہ اللہ کے نزدیک امام بخاری رحمہ اللہ فقیہ نہیں تھے ـــــــــــ 526
- موذنین اور قرآن پڑھنے والوں کی خدمات ـــــــــــ 526
- لوگوں کی اسلام سے بیزاری ـــــــــــ 527
- قرأت فاتحہ کی بقایا بحث ـــــــــــ 527
- کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟ ـــــــــــ 528
- جہری نمازوں میں فاتحہ امام کے پیچھے نہ پڑھے ـــــــــــ 530
- سری نمازوں میں بھی مقتدی پر فاتحہ نہیں ہے ـــــــــــ 531
- سونے سے پہلے فاتحہ اور سورۂ اخلاص کا فائدہ ـــــــــــ 531

- تلاوت قرآن سے پہلے تعوذ پڑھنا — [illegible]
- شیطان کی انسان سے دشمنی — [illegible]
- ہمارے ایک مجذوب کی مثال — [illegible]
- تلاوت کے بعد تعوذ پڑھنے کا فائدہ — [illegible]
- تلاوت سے پہلے تعوذ پڑھنا صحیح ہے — [illegible]
- رات کے وقت نماز میں تعوذ پڑھنا — [illegible]
- تعوذ کے مختلف کلمات — [illegible]
- نماز میں ثنا — [illegible]
- "هَمْزَة" اور "لَمْزَة" کا معنی — [illegible]
- ایمان پر موت کی علامتیں — [illegible]
- حضور ﷺ کی دعا — [illegible]
- شیطانی حملوں کے مختلف طریقے — [illegible]
- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے شیطان کو کیسے پکڑا؟ — [illegible]
- شیطان کے ستر ہزار جال — [illegible]
- غصہ دبانے کا عمل — [illegible]
- غصہ کی علامتیں اور علاج — [illegible]
- غصہ کرنا بڑی خطرناک چیز ہے! — [illegible]
- غصہ کا نبوی وظیفہ — [illegible]
- "لَاحَوْلَ" کا مطلب اور فائدہ — [illegible]
- صحابہ علیہم کے بعض جھگڑے انسانی تقاضے سے ہوئے تھے — [illegible]
- حضور ﷺ کی دو بیویوں میں غصہ — [illegible]
- احناف کے نزدیک تعوذ واجب ہے — [illegible]
- ابن سیرین رحمہ اللہ کا مذہب — [illegible]
- واجب ہونے کی دلیل — [illegible]

فہرست مضامین

- نماز کو خراب کرنے والی تین چیزیں
- لفظ شیطان کا اشتقاق
- "رَجِیْمٌ" کا معنی
- بسم اللہ قرآن کا جز ہے
- ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ کیوں؟
- ایک ضعیف روایت
- نماز میں بسم اللہ کا حکم
- بسم اللہ اسم اعظم ہے
- اسم اعظم میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی تحقیق
- "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ" کی فضیلت
- اسم اعظم کا فائدہ
- دعا قبول ہونے کی ایک مقبول حالت
- بسم اللہ سے رزق کی تنگی دور ہوتی ہے
- انبیاء کرام علیہم السلام کا علم لدنی ہوتا ہے
- قرآن کو کمانے اور کھانے کا ذریعہ بنانے کی مذمت
- قرآن کی من مانی ترجمانی
- تتمہ قصہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام
- ابو جہل کی اونٹنی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کا تتمہ
- حروف مقطعات کی تفسیریں
- نحوی ترکیب
- ہر کام "بِسْمِ اللہِ" سے شروع کریں
- اسم سے مراد مسمّٰی ہے یا غیر مسمّٰی
- اللہ کا ذاتی نام

- اللہ کے ناموں کی تعداد
- کسی کو قاضی الحاجات کہنا
- کسی کو مشکل کشا کہنا
- شرک کے وہم کی چیزوں سے بھی بچو
- ایک حدیث سے بہترین دلیل
- ضروری اصلاح
- بسم اللہ صرف دو پیغمبروں پر اتری
- خط لکھنے کا مسنون طریقہ
- بسم اللہ کے اترنے کی عظمت
- بسم اللہ کی برکت
- جہنم سے حفاظت کا عمل
- شیطان کو تکبر کرنے کا موقع نہ دو
- وضو میں بسم اللہ نہ پڑھنے کا نقصان
- حاکم کی اطاعت
- ایک صحابی رئیس لشکر کا واقعہ
- ائمہ مجتہدین کی خدمات کے فائدے
- قرآن و حدیث میں مشکلات اور ان کا حل
- صحبت سے قبل بسم اللہ کی فضیلت کی ایک حدیث کی تحقیق
- کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ
- کھانا کھانے کے بعد کی دعا
- خلاف شرع دعوتوں کا حکم
- صحبت سے پہلے کی دعا
- خدا سے مانگنے کے لیے وسیلے پکڑنا
- میری جائیداد کے ایک مقدمہ کا واقعہ

فہرست مضامین

- عذاب کی سنتا اور جانتا ہے
- شرکیہ باتیں
- صفتِ رحمت کا اطلاق
- مسیلمہ کذاب کا جھوٹ اور شیعوں کا تقیہ
- شیعوں کی گستاخیاں
- مولانا محمد علی جالندھری رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ
- اختلاف اور فتنوں کا اصل سبب
- درود کی جگہ انگوٹھے چومنا
- اللہ کے ناموں پر عمل بھی مقصود ہے
- اللہ کے ناموں سے مقصود
- اللہ تعالیٰ سب کی سنتا ہے
- دعا مانگنے کی صحیح حالت
- اللہ کا ذاتی نام مشتق ہے یا غیر مشتق
- ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾
- رشتے نسب سے ہوتے ہیں یا صہر کے ہوتے ہیں؟
- قرآن میں دو خاص نور
- سورۃ الفاتحہ کے بعض نام
- تعوذ کی اقسام
- شیطان سے پناہ کی ضرورت
- نماز میں فاتحہ کے شروع میں بسم اللہ آہستہ پڑھیں
- سورۂ فاتحہ جامع دعا ہے
- اکابر کی دعا میں عظمت
- کسی جھوٹے فرقے نے اپنے معبود کا نام اللہ نہیں رکھا
- کسی کو رب کہنا جائز نہیں

- غیر اللہ کی تربیت کی حد ہے — [illegible]
- ایک علمی نکتہ — [illegible]
- رب تو سب کی تربیت کرتا ہے — [illegible]
- جانوروں کے بچوں کی سمجھداری — [illegible]
- پتھر میں رزق پہنچانے کا واقعہ — [illegible]
- مخلوقات اللہ کی عبادت کیسے کرتی ہیں؟ — [illegible]
- آسمانوں کے دروازے بغیر اجازت نہیں کھلتے — [illegible]
- کسی کو "رحمٰن" یا "رحیم" کہنا — [illegible]
- آج کے زمانے میں بڑے ہونے کی پہچان — [illegible]
- نام بدل دینا — [illegible]
- اللہ کی رحمت کا اندازہ — [illegible]
- ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ — [illegible]
- قیامت کی ضرورت — [illegible]
- قیامت میں سب اختیار اور ملک اللہ کا — [illegible]
- قیامت کے دن سب کے بدلے چکا دیے جائیں گے — [illegible]
- کسی کو رؤف، رحیم، سمیع و بصیر کہنا — [illegible]
- مسیلمہ کذاب کے دعوے — [illegible]
- مرزا قادیانی کے مختلف دعوے — [illegible]
- مسیلمہ کذاب کا انجام — [illegible]
- "بِسْمِ اللّٰهِ" میں "الرَّحْمٰنِ" اور "الرَّحِيْمِ" دو نام کیوں آئے؟ — [illegible]
- حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کا فائدہ — [illegible]
- شیعوں کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے بغض — [illegible]
- ہماری قوم کی جہالت — [illegible]
- ہر آیت کو الگ الگ کر کے پڑھنا — [illegible]

فہرست مضامین

- ﴿اَلْحَمْدُ﴾ میں مختلف قراءتیں اور اعراب ... [illegible]
- حمد و ثنا کا مستحق حقیقی ... [illegible]
- ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ﴾ جامع کلمۂ شکر ... [illegible]
- مدح، حمد اور شکر میں فرق ... [illegible]
- مختلف اکابرین کے نزدیک تسبیح، تحمید اور تکبیر کی فضیلت ... [illegible]
- شکر نہ کرنے سے نعمت چھن جاتی ہے، واقعہ ... [illegible]
- شکر کا معنی ... [illegible]
- نعمتوں کا بے جا استعمال ... [illegible]
- سکندر بادشاہ کا واقعہ ... [illegible]
- حضور ﷺ کو مسکینی پسند تھی ... [illegible]
- دنیا میں اپنے سے کم تر اور دین میں اپنے سے برتر کو دیکھو ... [illegible]
- کمتر رکھنے میں حکمت ... [illegible]
- ایک بزرگ اور بادشاہ کا واقعہ ... [illegible]
- فضول خرچی کا ایک معیار ... [illegible]
- ”اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ“ کا ثواب ... [illegible]
- تہجد کا مزہ ... [illegible]
- باقیات صالحات ... [illegible]
- ایک عظیم کلمہ کا ثواب ... [illegible]
- حضور ﷺ کی شفاعت کبریٰ اور شفاعت صغریٰ ... [illegible]
- بدعتی حضور ﷺ کی شفاعت سے محروم ہوگا ... [illegible]
- بدعتی کی عزت نہ کرو ... [illegible]
- برائی کو روکنے کے تین طریقے ... [illegible]
- چند بدعات کا رد ... [illegible]
- کلمہ طیبہ اور الحمد کے فضائل ... [illegible]

- زبانی اقرار کے ساتھ دل سے اقرار بھی ایمان کے لیے شرط ہے
- بعض علماء کے نزدیک ایمان کی تعریف
- کلمہ طیبہ کے فضائل
- ﴿رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾
- رب کا معنی
- قاعدہ اعظم اور خاتونِ اوّل کون؟
- بعض مخصوص القاب
- ناجائز القاب
- کیا لفظ "رَبّ" اسم اعظم ہے؟
- ﴿الْعٰلَمِیْنَ﴾
- کتنے ہزار جہان ہیں؟
- کتے کے جھوٹے برتن کے جراثیم میں شریعت کی خصوصیات
- دین اسلام کی سائنس کی رو سے تصدیق
- اسلام کی طاقت
- حضور ﷺ کی بعثت کے مخاطب
- انسان اور جنات ایمان لانے کے مکلف ہیں
- کتنے ہزار عالم ہیں؟
- اللہ کی کرسی کی وسعت
- عالم اللہ کے وجود کی دلیل ہے
- ایک حکایت
- ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے
- حضور ﷺ سب کے لیے اور آخری نبی ہیں
- ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾
- حجاج بن یوسف کی اللہ سے امید

فہرست مضامین

- اللہ سے ڈرنے اور امید رکھنے کی مقدار
- تقویٰ کی حیثیت
- ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾
- آخرت پر ایمان کی ضرورت
- نیکی کی توفیق اور محرومی کون دیتا ہے؟
- آدمی گناہ سے کب بچتا ہے؟
- ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کی قراءت
- آخرت میں سب حکومت اللہ کی ہے
- "مالك" کا معنی
- قیامت کا دن کتنا لمبا ہوگا؟
- موت سے پہلے تیاری کرلو
- ﴿اِيَّاكَ﴾ اور ﴿نَسْتَعِيْنُ﴾ کی قراءتیں
- عبادت کا معنی
- حضور ﷺ سے محبت ہے تو اتباع سنت کریں
- بدعات سے محبت اور دعویٰ ایمانی
- صرف اللہ کی عبادت کرنے کا معنی
- دعا میں شرک
- خدا ہماری سنتا نہیں اور ان کی موڑتا نہیں
- محبت میں مبالغہ کا نقصان
- کیا ولایت اور امامت کا درجہ نبوت سے زیادہ ہے؟
- اللہ سب کی سنتا ہے
- کیا مقبول دعا کے لیے وسیلہ ضروری ہے؟
- دعا میں وسیلہ
- انگوٹھے چومنے کا مسئلہ

- سارے قرآن کا خلاصہ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ والی آیت میں ہے
- اللہ ہی عبادت کے لائق کیوں ہے؟
- پیروں کو رب بنانے کی مذمت
- گیارہویں، عرس اور قبروں کا طواف
- ماتحت الاسباب اور مافوق الاسباب مدد کا حکم
- کفار مکہ اور موجودہ لوگوں کا نظریہ
- معجزات اور کرامات کے ذریعہ دھوکہ

عرضِ ناشر

اس کائنات رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں: 1 ...... بیت اللہ، 2 ...... کتاب اللہ، 3 ...... اہل اللہ۔

اور اگر کسی جگہ پر ان تینوں کا اجتماع ہو تو مخلوق کے دلوں کا کھچ آنا امر بدیہی ہے، جس کا مشاہدہ مسجد الحرام میں بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درسِ قرآن کے حلقہ میں کیا جاسکتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی، رمضان ہو یا شوال، حج کا موسم ہو یا عمرے کا، حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کا درسِ قرآن مسجد حرام میں بلا ناغہ ہوتا ہے۔ مسجد حرام میں دوسرے مشائخ کے دروس بھی ہوتے ہیں، تاہم جس کثرت سے اور ذوق شوق سے لوگ حضرت مکی مدظلہ کے درس میں شرکت کرتے ہیں، دوسرے دروس میں یہ کچھ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ چنانچہ برصغیر پاک و ہند، بلکہ پوری دنیا میں جہاں بھی اردو دان طبقہ حرم شریف میں آتا ہے، حضرت مکی مدظلہ کے درس سے مستفید ہوتا ہے۔

حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درس کا یہ حسن ہے کہ وہ جہاں توحید خداوندی کے رسوخ اور شرک و بدعت کی تردید پر زور دیتے ہیں وہاں عشقِ رسول ﷺ اور سلف صالحین کی عقیدت واحترام پر حرف نہیں آنے دیتے، بلکہ اپنے اکابر کے طریق پر چلتے ہوئے جس کمال مہارت سے سامعین کو راہِ اعتدال پر گامزن کرتے ہیں یہ انہی کے درس کا خاصہ ہے۔

حضرتِ اقدس کے دروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی درستگی، فکرِ آخرت، اخلاص وتقویٰ، اخلاقِ حمیدہ اور سیرت وکردار کی بلندی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔

زیر نظر تفسیر ''انوار الحرم'' المعروف ''تفسیر مکی'' حضرت اقدس کے چند دروس کا مجموعہ ہے۔ جسے اس سے قبل اک اور ادارہ نے شائع کیا تھا اب اسے حضرت اقدس ہی کے حکم پر ''مکتبۃ الفقیر'' شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

اللہ رب العزت اس کتاب اور ''مکتبۃ الفقیر'' دونوں کو شرف قبولیت سے نوازے۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین ﷺ

اجازت ہو تو آکر میں بھی شامل ان میں ہو جاؤں
سنا ہے کل تیرے در پر ہجوم عاشقاں ہو گا

قارئین کرام! گزارش ہے کہ اشاعت کے اس کام میں کہیں کوئی کمی، کوتاہی محسوس ہو یا اس کی بہتری کے لیے تجاویز رکھتے ہوں تو مطلع فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں تا زیست اپنی رضا کے لیے یہ خدمت سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے اور اسے ہماری آخرت کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔

دعاؤں کا طالب:
فقیر سیف اللہ احمد نقشبندی مجددی
مکتبۃ الفقیر



حالاتِ صاحبِ تفسیر

نام ونسب:

محمد مکی حجازی ولد مولانا خیر محمد صاحب اور ولدیار محمد صاحب رحمہ اللہ۔[1]

ولادت:

مکہ مکرمہ محلہ مسفلہ رباط نواب آف بہاولپور میں ہوئی۔ 1942ء ہے یا 1943ء ہے۔ کیونکہ اس وقت تو ریکارڈ نہیں تھا، نہ مجھے آج تک ملا۔

خاندان:

خاندانی طور پر ہم بلوچ فیملی سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمارا آبائی وطن تحصیل علی پور ضلع مظفر گڑھ چاہ حقانی والا موضع عظمت پور ہے۔ اس کے بعد والد صاحب رحمہ اللہ جب مظاہر العلوم سہارنپور سے فارغ التحصیل ہو کر واپس آئے تو کچھ عرصہ یہاں رہے، یہاں زمینیں، بستی اور ہمارے گھر تھے جو دریا نے اپنی لپیٹ میں لے لیے، اس لیے انہوں نے ظاہر پیر کی طرف ہجرت کی۔ وہاں کے ایک سردار تھے سردار قادر خان مرحوم، ان کی دعوت پر وہ ظاہر پیر تشریف لے گئے اور پھر ظاہر پیر کو ہی اپنا مسکن بنا لیا۔ ظاہر پیر تحصیل لیاقت پور ضلع رحیم یار خان میں ہے۔

والد ماجد کا تعارف:

والد ماجد رحمہ اللہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ انہوں نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے چند دن پڑھا تھا، پھر

---

[1] ... چند سوالات حضرت کے ذاتی حالات کے متعلق احقر امداد اللہ انور نے پاکستان سے سعودی عرب بذریعہ موبائل فون حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی مدظلہ سے پوچھے تھے جو حضرت نے بیان فرمائے۔ ان کو انہی کی زبانی یہاں درج کیا جا رہا ہے۔ (امداد اللہ انور)۔

طبیعت کی خرابی کی وجہ سے دار العلوم دیوبند چھوڑ کر مظاہر العلوم سہارنپور چلے گئے اور بہت ساری کتابیں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں اور سنن ابو داؤد حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے والد حضرت مولانا یحییٰ کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی، جبکہ شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ ان کے ہم درس تھے۔ باقی علوم بھی آپ نے وہیں پڑھے تھے۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت کا تعلق حضرت شیخ خلیفہ غلام محمد دین پوری رحمۃ اللہ علیہ سے تھا جو مجاہد بھی تھے اور اپنے زمانے کے اکابر اولیاء اللہ میں سے تھے۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تقریباً ہر سال مکہ مکرمہ تشریف لاتے تھے، کبھی ایک سال قیام فرماتے، کبھی دو سال اور کبھی چھ ماہ، پھر پاکستان چلے جاتے تھے۔ مستقلاً وہ 1960ء میں ہجرت کر کے مکہ مکرمہ تشریف لے آئے اور اپنی تمام زندگی انہوں نے مکہ میں گذاری۔ 1974ء میں وفات پائی اور جنت المعلیٰ میں سیدنا حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے قریب دفن ہوئے۔

آپ آلِ سعود اور ملک عبد العزیز کے زمانے سے حرم شریف میں درس دیتے تھے، لیکن متواتر طور پر 1960ء سے لے کر 1974ء تک حرم میں درس دیا۔

اولاد:

میرے تقریباً دس بھائی پیدا ہوئے۔ پیدائش کے تقریباً ایک ماہ، دو ماہ، ایک سال یا دو سال کی عمر تک سب فوت ہو جاتے تھے۔ میں جب مکہ میں پیدا ہوا تو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس وقت مکہ مکرمہ میں ہی تھے۔ حاجی سلطان مرحوم تھے جو والد صاحب کے خصوصی عقیدت مند بھی تھے، مرید بھی تھے اور والد صاحب کی صحبت کی وجہ سے ہی اللہ نے ان کی بہت اصلاح فرمائی، آج ان کی اولاد بھی مکہ مکرمہ میں ہے۔ ماشاء اللہ! قاری عبد المالک صاحب ان کی اولاد میں سے ہیں، جو مسجد خیاط میں ہیں اور ان کی باقی اولاد مکہ کی اکثر مساجد میں خدمات سرانجام دے رہی ہے۔

جب میں پیدا ہوا تو انہوں نے آ کر خبر دی کہ آپ کا بچہ پیدا ہوا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا: ٹھیک ہے، اس کو نہلا دھلا کر کپڑے میں لپیٹ کر لے آؤ۔ حاجی سلطان صاحب مجھے لے گئے تو والد صاحب نے مجھے "عتبۃ الباب" یعنی حبشیوں کے دروازے کی چوکھٹ پر رکھ دیا اور کھڑے کھڑے دعا مانگی: اے اللہ! اگر میرے بچے

کی عمر تھوڑی ہے تو اس کو ابھی لے لیں، میں بہت صدمہ سہہ چکا ہوں یا پھر آپ اس کو عمر طویل بھی عطا فرمائیں۔ اس کو علیم وحلیم بھی بنائیں اور اس کو اپنے گھر کا خادم بنائیں کہ جب یہ بڑا ہو تو آپ کے گھر میں بیٹھ کر پڑھائے۔ یہ دعائیں انہوں نے اس وقت کیں۔ پھر خود ہی اٹھا کر طواف کرایا اور تحنیک کی۔

ابتدائی تعلیم:

میری ابتدائی تعلیم مکہ مکرمہ میں ہوئی، میں نے قرآن پاک یہیں حفظ کیا۔ مدرسہ عثمانیہ ہوتا تھا جو اس وقت حرم شریف کی بالکل دیوار کی اندرونی جانب میں تھا، میں نے وہیں قرآن پاک حفظ کیا، پھر چونکہ والد صاحب پاکستان آگئے تو میں بھی پاکستان آگیا اور والد صاحب سے ساری کتابیں پڑھتا رہا۔

جب کتابوں کی تکمیل ہوگئی تو حضرت نے مجھے مدرسہ حضرت گمانیہ حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب گمانوی رحمہ اللہ کی خدمت میں بھیج دیا، جو حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے شاگرد تھے۔ اور وہاں استاذ محترم مولانا منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ سے میں نے منطق اور دیگر علوم پڑھے اور حضرت گمانوی رحمہ اللہ سے فقہ اور حدیث پڑھی۔ پھر واپس اپنے مدرسے میں آگئے۔

والد صاحب کا طریقہ کار یہ رہا کہ ہر سال جب نئے سال درسِ حدیث شروع ہوتا تھا تو مجھے بھی وہ اس میں بٹھا دیتے تھے۔ مجھے دورہ حدیث والا سال بھی تین چار مرتبہ پڑھنے کا موقع ملا۔

شادی:

میری شادی تھوڑی عمر میں میری حقیقی چچا زاد سے ہوئی۔ ان سے اللہ نے ایک بچی لکھی تھی جو فوت ہوگئی اور ایک بیٹا دیا جس کا نام محمد عارف ہے، جو عرفات میں حج کے موقع پر پیدا ہوا تھا۔

اشتیاقِ علم:

1972ء میں جب والد صاحب کے مستقلاً بلانے پر میں سعودی عرب آیا تو ملک فیصل مرحوم کا زمانہ تھا، میں نے ان کو حضرت مفتی محمود رحمہ اللہ کے واسطے سے درخواست دی تھی تو انہوں نے مجھے مستقلاً فیملی سمیت اقامہ عطا فرمایا، میں اس اقامہ ملکی پر مستقل طور پر مکہ میں آگیا۔

میں چونکہ 1972ء میں پہنچ گیا تھا تو والد صاحب رحمہ اللہ کی زندگی میں ہی میں نے ان کے مقام پر بیٹھ کر پڑھانا شروع کردیا۔ اور درود س کی ترتیب ہمیشہ یہی رہی کہ فجر کی نماز کے بعد عربی میں اور مغرب سے عشاء تک

اردو میں درس ہوتا تھا۔ اور یہی ترتیب آج تک الحمد للہ! چلی آرہی ہے کہ صبح کے بعد درسِ حدیث اور تفسیر، مغرب کے بعد درسِ تفسیر ہوتا ہے۔ اور موسم حج میں درس ختم ہوجاتے ہیں، وعظ وارشاد اور دعوت وتبلیغ وغیرہ شروع ہوجاتے ہیں۔

کیا آپ کی یہ ملازمت حکومت کی تعیین ہے؟

نہیں! یہ ملازمت نہیں ہوتی، بلکہ تقریباً اس زمانے میں اشرف الدین مسجد الحرام حضرت شیخ عبداللہ بن حمید بہت بڑے سعودی عالم بھی تھے اور رئیس اشرف الدین بھی اور رئیس مجلس القراء الاعلیٰ بھی بنے۔ ان کے حکم سے ہمیں پڑھانے کی اجازت ملی۔ یہ نوکری نہیں ہوتی تھی۔ پھر بعد میں نئے نظام کے تحت بادشاہ کی طرف سے تقرر ہوا تو اس میں بھی الحمد للہ! میرا نام رکھا گیا۔

شیخ عبداللہ بن حمید رحمہ اللہ کی سفارش پر ہی مجھے شاہ فہد کی حکومت کے زمانے میں سعودی جنسیت سے نوازا گیا۔ یعنی اس میں چونکہ رباعی نام لکھے جاتے ہیں، اس لیے انہوں نے میرے نام سے مختلف "محمد" لیا اور والد صاحب کے نام سے "خیر" لیا اور دادا کے نام سے "محمد" اور پھر "محمد خیر محمد حجازی" لقب ہوگیا۔ یہ میرا سعودی نام ہے۔ اور میرا پہلا نام "محمد مکی حجازی" ہے جس کو لوگ جانتے ہیں۔

اساتذہ:

حضرت والد صاحب رحمہ اللہ، مولانا حبیب اللہ گمانوی رحمہ اللہ اور دیگر علماء...... جو حرم شریف میں بڑے بڑے علماء ہوتے تھے...... کی خدمت میں بھی کبھی کبھی استفادہ کرتے تھے اور دروس میں بیٹھ جاتے تھے۔ اور سندِ حدیث میں نے مولانا عبدالحق ہاشمی صاحب جو دار الحدیث کے مؤسس ہیں اور مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ سے بھی اجازتِ حدیث لی، مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ جو لکھنو کے تھے جن کا نام بڑا مشہور ہے، جنہوں نے معارف الحدیث اور دیگر کئی کتابیں لکھی ہیں، ان سے میں نے اجازتِ حدیث لی ہے۔ حرم شریف کے علاوہ میں مدرسہ صولتیہ میں بھی حدیث کا سبق پڑھاتا رہا ہوں۔

تبلیغی اسفار:

جہاں تک اسفار کا تعلق ہے تو...... الحمد للہ!...... میں نے ہندوستان کے متعدد سفر کیے، جو مختلف علاقوں میں تھے اور جہاں اللہ نے قبولیتِ تامہ عطا فرمائی۔ اسی طرح یورپ وانگلینڈ کا سفر میں ہر سال کرتا رہا، تقریباً دس

مرتبہ گیا۔ اسی طرح میں نے امریکہ کا سفر بھی پانچ چھ بار کیا ہے۔ اسی طرح ناروے اور ساؤتھ افریقہ کا بھی میں نے مکمل دورہ کیا ہے۔ ہانگ کانگ میں بھی تقریباً پانچ چھ بار گیا ہوں۔ پہلے میں تقریباً ہر سال جاتا تھا۔ ایک مرتبہ امام حرم الشیخ محمد السبیل کے ساتھ بھی میرا دورہ ہوا اور ایک امام حرم شیخ عمر سبیل کے ساتھ بھی میرا ہانگ کانگ کا دورہ ہوا۔

دروس وخطبات کی اشاعت:

چونکہ دروسِ حرم ریکارڈ ہوتے رہے، اسی سے اللہ نے یہ مہربانی کی کہ مختلف کتابیں بھی شائع ہونی شروع ہوگئیں:

- ....''دروسِ حرم'' کی چار جلدیں شائع ہوئیں۔
- ....اس کے بعد ''قصص الانبیاء'' دو جلدوں میں شائع ہوئی۔
- ....''منہاج المسلم'' بھی دو جلدوں میں شائع ہوئی۔
- ....اور ''خطباتِ مکی'' کے نام سے چار جلدیں شائع ہوئیں۔
- ....''اسلام میں عورت کا مقام'' بھی دو جلدوں میں شائع ہوئی۔
- ....اسی طرح ''ازواج النبی ﷺ'' ہے، وہ بھی شائع ہوگئی۔
- ....اور ''تفسیر مکی'' سورت فاتحہ پر پر میرے حرم کے دروس ہیں جن کو آپ نے ترتیب دیا ہے۔ اور اس کے بعد ''تفسیر مکی'' کا......ان شاء اللہ!......مکمل قرآن پاک کا سلسلہ پیش کیا جائے گا۔

دعا کریں اللہ اس محنت کو اخلاص کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچائے اور تفسیر کو مکمل کرنے کے لیے وسائل بھی عطا فرمائے اور ہمیں ہمت بھی عطا فرمائے کہ ہم زیادہ سے زیادہ کام کر سکیں۔

پہلا حج:

پہلا حج بچپن میں کیا تھا، تقریباً سات آٹھ سال کی عمر میں۔ پھر اب......الحمد للہ!......1973ء سے ہر سال حج کرتا ہوں۔

تلامذہ:

تلامذہ میں عرب کے حضرات بھی ہیں، انڈونیشیا کے بھی، ملائشیا وغیرہ کے بھی ہیں جو مستقل طور پر حدیث اور تفسیر کی کتابوں کے دروس میں شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح برونائی کے بھی ہوتے ہیں، نائجیریا کے بھی ہوتے ہیں اور سوڈان کے لوگ زیادہ ہوتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہیں اور ہمارے درسوں میں آکر شریک ہوتے ہیں۔

مستقل عنوانات پر خطابات:

ساری زندگی ہمارا بیان ہمیشہ توحید اور رد بدعات پر ہوتا ہے۔ تدریس میں بخاری شریف حرم میں پڑھائی اور سنن نسائی، سنن ابی داؤد بھی مجھے پڑھانے کا موقع ملا۔ اور تفاسیر میں مجھے تفسیر ابن کثیر، تفسیر جلالین، تفسیر بیضاوی اور تفسیر نسفی پڑھانے کا موقع ملا۔

تحل ہزہ کا مدرسہ:

تحل ہزہ کا مدرسہ حضرت والد صاحب نے بنایا تھا، ان کے زمانے میں بھی وہاں تین چار سو طالب علم پڑھتے تھے۔ پھر جب والد صاحب چھوڑ کر یہاں آگئے تو میں وہاں اکیلا رہ گیا تو ہم نے بھی اس کو جاری رکھا۔ الحمد للہ! اب بھی وہ مدرسہ قائم و دائم ہے، اس میں دو ڈھائی سو طلبہ بھی ہیں اور اساتذہ بھی ہیں۔ شعبہ کتب بھی ہے اور ساتھ میں ہم نے دار الشفاء کے نام سے فری ڈسپنسری بھی بنائی ہے، جہاں مفت علاج ہوتا ہے، اور ایک ایمبولینس بھی رکھی ہے۔ جس مریض کی طبیعت زیادہ خراب ہو تو اس کو کسی ہسپتال میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔

فتنوں کی سرکوبی:

سب سے زیادہ فتنہ قادیانیت اور اس کے بعد فتنہ بدعات اور رافضیت کے خلاف میری تمام زندگی کا پیشہ ہے اور اس سے بے شمار لوگوں کو فائدہ ہوا ہے۔ اللہ نے اس کو پوری دنیا میں پہنچایا بھی ہے۔

اور اس کے بارے میں ایک رؤیا مبارکہ بھی ہے کہ ایک شخص نے کعبہ میں آکر بتایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ حضور ﷺ تشریف فرما ہیں، خلفائے راشدین بھی تشریف فرما ہیں اور بھی بہت سارے علماء، صلحاء اور اولیاء کا مجمع ہے۔ ایک آدمی آپ کی "سیرت النبی" کا البم حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کرتا ہے کہ یہ محمد مکی

حجازی ہے، جس نے آپ کی سیرت پر تقاریر جمع کی ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! میں جانتا ہوں، اس کو پوری دنیا میں عام کردو۔ اس نے کہا: میں نے خواب دیکھنے کے بعد اپنی زندگی کا یہ مشن بنالیا ہے کہ سیرت النبی ﷺ کے البم بنا بنا کر تقسیم کررہا ہوں۔

یہ کراچی کے آدمی ہیں، کئی سال ہو گئے ہیں، انہوں نے اتنا کام کیا کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ پتا نہیں یہ خواب کے اثرات ہیں کہ مجھے اور کئی ساتھیوں نے بتایا کہ ہم مستقل کام کررہے ہیں۔

اسی طرح نیویارک کے ایک اور شخص ہیں جن کا نام محمد شفاقت ہے وہ مجھے پچھلے سال ایک دعوت میں ملے تو ان سے تعارف ہوا۔ دوستوں نے مجھے بتایا کہ یہ شخص جو آپ سے آج ملنے آیا ہے آپ اس کو نہیں جانتے، لیکن یہ صرف امریکہ میں ایک لاکھ کی تعداد میں آپ کے سیرت النبی ﷺ کے اور دوسرے البم تقسیم کرچکا ہے۔ اس نے مشین لگائی ہے، خود ریکارڈ کرتا ہے اور خود تقسیم کرتا ہے۔

الحمدللہ! اس سے لوگوں کی اصلاح ہورہی ہے اور لوگوں کو فائدہ ہورہا ہے۔ الحمدللہ! دنیا کے کونے کونے سے فون آتے ہیں کہ ہم نے آپ کی سیرت النبی ﷺ کی کیسٹ سنی تو اللہ نے ہماری زندگی بدل دی۔ ایسے کئی واقعات ہیں۔

ہمارے بریلوی حضرات کی شرارت کی وجہ سے ایک مرتبہ میرا حرم میں درس بند ہوا تو حرمین کے مشائخ نے کہا: پاکستان کے بریلویوں کو تکلیف ہے، ہمیں تو کوئی تکلیف نہیں ہے، لہٰذا انہوں نے کہا: شیخ! اردو میں درس نہ دیں، بلکہ صرف عربی میں دیں۔ تو میں صبح بھی عربی میں درس دیتا تھا اور شام کو بھی عربی میں درس دیتا تھا۔ تقریباً کوئی چھ ماہ یہ مسئلہ چلا، اس کے بعد مولانا دوست محمد قریشی رحمہ اللہ کوٹ ادو والے میرے پاس آئے ہوئے تھے، وہ عمرے پر تشریف لائے تھے اور حج کا ارادہ تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا: آج ایک بزرگ بیٹھے تھے اور بڑے درد سے کہہ رہے تھے کہ یار! لوگوں کے عقیدے صحیح ہورہے تھے، لوگ شرک و بدعات سے نکل رہے تھے، یہ کتنا بڑا ظلم کیا کہ اس اردو میں بیان کو بند کروادیا ہے۔ وہ درد کا اظہار بھی کررہے تھے اور دعا بھی کررہے تھے۔ دوسرے دن جب صبح کا درس دے کر ہم واپس آرہے تھے تو مولانا صاحب نے مجھے بتایا کہ آج مجھے وہی بزرگ ملے تھے، میں بھی طواف کرکے آرہا تھا، وہ بھی طواف کرکے آرہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا: مکی صاحب کو میرا سلام بھی کہہ دینا اور کہنا کہ آج میں نے بھی جاکر اللہ تبارک وتعالیٰ کی خدمت میں درخواست کردی ہے، ان شاء اللہ

آپ کا اردو والا درس بہت جلد شروع ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

اسی دن شام کو شیخ طٰہٰ عبد الواسع البرکاتی رحمہ اللہ...... جو ہمارے حرم میں تمام مدرسین کے بڑے تھے...... نے مجھے بلایا۔ میں گیا، میں نے کہا: کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا: آپ نے اب شام کو اردو میں درس دینا ہے۔ میں نے کہا: حضرت! اب تو چھ ماہ گذر گئے، اب تو میرے پاس شام کو بھی عربی والے آتے ہیں، اردو والے تو آتے نہیں۔ انہوں نے کہا: آئیں یا نہ آئیں، لیکن آپ نے اردو میں درس دینا ہے، باقی میں آپ کو عشا کے بعد بتاؤں گا۔ خیر! میں نے اردو میں آغاز کیا۔ پھر انہوں نے بتایا کہ آج ہم دفتر میں بیٹھے تھے کہ بادشاہ شاہ فہد نے خود فون کر کے پوچھا: مکی صاحب کا درس اردو میں کس نے بند کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا: ہم نے نہیں کیا۔ وہ اپنی مرضی سے ایسا کر رہے ہوں گے۔ تو شاہ فہد نے کہا: ان کا درس اردو میں فوراً شروع کروائیں اور مجھے مطلع کریں۔ اس لیے ہم نے آپ سے کہا کہ آج ہی شروع کر دو۔

پھر اس بزرگ کو ہم سارے حرم میں ڈھونڈتے رہ گئے، لیکن وہ نہیں ملے۔

رُباطِ مکی:

اسی طرح مدینہ منورہ میں جو "رُباط" والد صاحب رحمہ اللہ نے بنائی تھی...... الحمد للہ! ...... وہ قائم و دائم رہی اور آج بھی قائم و دائم ہے۔

ایک مرتبہ علامہ ارشد کے بھائی ایڈیٹر کائنات ولی اللہ اوحد جو بہاولپور کے تھے وہ اسی رباط میں رہے۔ بعد میں انہوں نے اس پر بڑا فیوچر بھی لکھا تھا اور اس کے فوٹو بھی لیے تھے۔ لکھا تھا کہ یہاں جتنی بھی رباطیں بنائی گئیں ان میں سے نوابوں کی رباطیں تو ختم ہو گئیں، لیکن فقیر کی رباط ابھی تک قائم و دائم ہے، اور باقاعدہ لنگر بھی چل رہا ہے۔

معمولاتِ یومیہ:

معمولاتِ یومیہ یہی ہیں کہ صبح عربی میں درس ہوتا ہے، مغرب کے بعد اردو میں درس ہوتا ہے۔

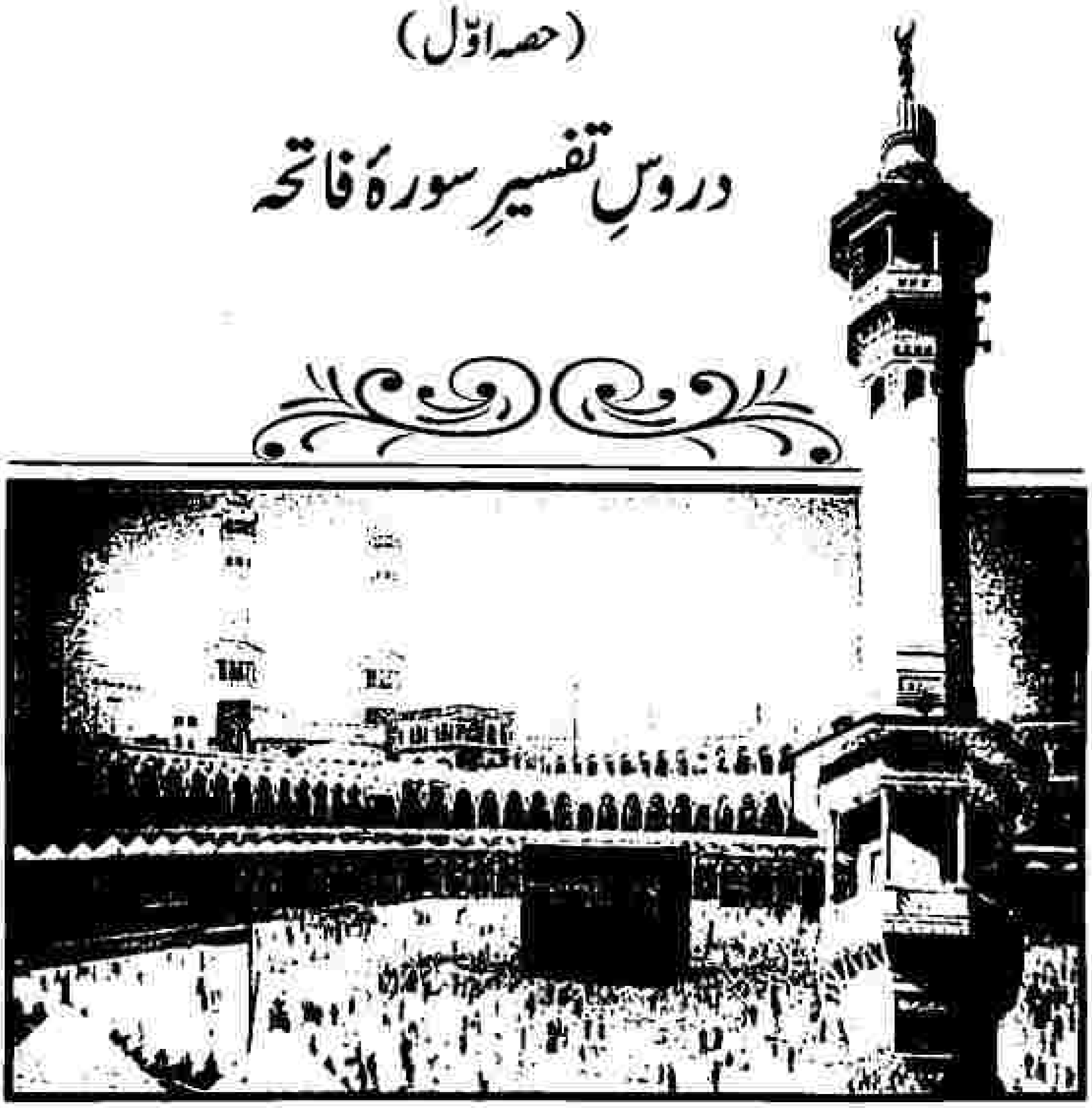
اولاد:

میرا ایک ہی بیٹا ہے محمد عارف۔ اس کو اللہ نے تین بیٹے دیے ہیں: ایک مصر میں ڈاکٹر ہے، ایک اور ڈاکٹر ہے جو ابھی امریکہ میں پڑھ رہا ہے اور ایک چھوٹا ہے وہ ابھی زیرِ تعلیم ہے۔

تفسیرِ انوارالحرم

(حصہ اوّل)

دروسِ تفسیرِ سورۂ فاتحہ



سُورَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ① الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ② مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ③ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ④ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ⑤ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ⑦﴾

''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا (ہے)۔ سب تعریفیں اللہ ہی کو لائق ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔ جو مالک ہیں روز جزا کے۔ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں۔ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما۔ ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام کیا، نہ کہ ان لوگوں کے راستے کی جن پر غضب نازل ہوا ہے اور نہ ان کے راستے کی جو بھٹکے ہوئے ہیں۔''

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى عَبْدِهٖ وَرَسُوْلِهٖ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ وَحُجَّةً عَلَى الْعِبَادِ اَجْمَعِيْنَ وَعَلٰى اٰلِ بَيْتِهِ الْاَطْهَارِ وَاَصْحَابِهِ السَّادَةِ الْاَبْرَارِ وَاَزْوَاجِهِ الطَّاهِرَاتِ الطَّيِّبَاتِ وَعَلٰى مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِهٖ وَسَارَ عَلٰى نَهْجِهٖ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ۔

اَمَّا بَعْدُ!

الحمدللہ! آج ہم اس مسجد میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر کی ابتداء کر رہے ہیں۔ اور ہر نماز کے اندر سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔

تلاوت کے شروع میں "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ" پڑھنا:

قرآن پاک کی تعلیم کے بارے میں حکم ہے کہ جب بھی قرآن کو پڑھنے لگیں تو سب سے پہلے ﴿اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ ○ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھیں۔ تعوذ کا معنی کیا ہے؟ تعوذ (اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ) کا معنی یہ ہے کہ میں اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں شیطان مردود سے۔

قرآن کی تلاوت سے پہلے تعوذ کیوں؟

ہر چیز کی ابتداء میں "بِسْمِ اللّٰہِ" پڑھنے کا حکم ہے۔ فرمایا:

((كُلُّ أَمْرٍ ذِيْ بَالٍ لَا يُبْدَأُ فِيْهِ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ أَقْطَعُ)) [الجامع الصغیر، حدیث: ۶۲۸۴]

"ہر کام جو شان والا ہو، اس کو "بِسْمِ اللّٰهِ" سے شروع نہ کیا جائے تو وہ بے برکت ہوتا ہے۔"

اسی لیے ہر کام میں "بِسْمِ اللّٰهِ" پڑھنی چاہیے۔ پانی پئیں گے تو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾، کھانا کھائیں گے تو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾، کپڑا پہنیں گے تو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾، کسی گھر میں داخل ہوں گے تو "بِسْمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا..."۔ غرض! ہر کام کے شروع میں "بِسْمِ اللّٰهِ" کا حکم ہے۔ لیکن قرآن پاک کی تعلیم میں حکم یہ ہے کہ پہلے "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" پڑھیں گے۔ تو یہاں پہلے تعوذ کا حکم ہے۔ حالانکہ کسی اور کام کے شروع میں ہمیں تعوذ پڑھنے کا حکم نہیں ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب:

سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہ حکم اللہ نے دیا ہے۔ اور مومن کے لیے اتنی بات ہی کافی ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝﴾ [النحل: ۹۸]

"جب تم قرآن پاک کی تلاوت کرو تو تم اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑو۔"

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۰، تفسیر الاستعاذة و أحكامها]

"إِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ" کا معنی:

﴿إِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ﴾ کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ جب تم قرآن پڑھ چکو تو "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" پڑھو، بلکہ اس کا معنی یہ ہے: "إِذَا أَرَدْتَ قِرَاءَةَ الْقُرْاٰنِ" کہ جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو تو پہلے "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" پڑھو۔ جیسے قرآن پاک میں ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ﴾ [المائدة: ۶]

"اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ دھو لو اور اپنے ہاتھ کہنیوں سمیت اور اپنے سر کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں سمیت دھوؤ۔"

یعنی "جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو۔" اس کا معنی یہ نہیں کہ جب نماز میں ہو تو صف کے اندر ہاتھ منہ دھونا شروع کر دو، بلکہ معنی یہ ہے کہ جب تم نماز کے ارادہ سے اٹھو تو پہلے وضو کرو، کیونکہ وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہاں معنی یہی ہے کہ جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو تو ﴿فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ﴾ یعنی اللہ کی پناہ پکڑو۔ کیونکہ اللہ کا حکم ہے: ﴿فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ﴾۔ اور اسی لیے علامہ ابن جریر رحمہ اللہ اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر کی ابتداء بھی "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" کے ساتھ کی ہے، کیونکہ انہوں نے کہا کہ جب ہم قرآن کی تفسیر لکھ رہے ہیں اور قرآن پڑھنے کی ابتداء بھی "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ" کے ساتھ ہے، لہٰذا ہم تفسیر بھی اسی کے ساتھ شروع کرتے ہیں۔ جبکہ باقی مفسرین نے اپنی تفسیر کی ابتداء "بِسْمِ اللّٰهِ" کے ساتھ کی ہے، کیونکہ جو بھی عظیم الشان کام ہو اس کی ابتداء "بِسْمِ اللّٰهِ" سے کرنی چاہیے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳ تفسير الاستعاذة و أحكامها]

"أَعُوْذُ" کا معنی کیا ہے؟

"أَعُوْذُ" کا معنی ہے: پناہ پکڑنا۔ اس کا مصدر "اَلْعَوْذُ" ہے۔ اس کے مقابلے میں لفظ "اَللَّوْذُ" ہے۔ اور ان دونوں میں فرق ہے:

- ..."اَلْعَوْذُ" کا معنی ہے "اَلْاِلْتِجَاءُ لِدَفْعِ الْمَضَرَّةِ" (اللہ سے التجاء کرنا کہ یا اللہ! ہمیں نقصان اور مصیبت سے بچالیجیے)۔
- ...اور "اَللَّوْذُ" کا معنی ہوتا ہے: "اَلْاِلْتِجَاءُ لِجَلْبِ الْمَنْفَعَةِ" (اللہ سے دعا کرنا کہ یا اللہ! یہ نعمت مجھے حاصل ہو جائے)۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۵ تفسير الاستعاذة و أحكامها]

"تَعَوُّذ" میں چار چیزیں ہیں:

جہاں بھی لفظ "أَعُوْذُ" یا "تَعَوُّذ" آئے گا وہاں پانچ چیزیں ضروری ہیں، ان کے بغیر مسئلہ حل ہی نہیں ہوتا۔ 1 ...... ایک "اَلْاِسْتِعَاذَة" ہوتا ہے، 2 ......ایک "مُسْتَعِيْذ" ہوتا ہے، 3 ......ایک "مُسْتَعَاذ مِنْهُ"، 4 ......ایک "مُسْتَعَاذ بِهٖ" 5 ......اور ایک "مُسْتَعَاذ لَهٗ" ہوتا ہے۔ ان پانچ چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ان کے بغیر "تعوذ" بنتا ہی نہیں۔

[تفسیر الرازی: ۱/ ۷۰، الباب الثاني في المباحث الفقهية...]

جیسے تشبیہ میں پانچ چیزیں ہوتی ہیں: تشبیہ، مشبہ، مشبہ بہ، وجہ تشبیہ اور آلہ تشبیہ۔ جب تک یہ پانچ چیزیں نہ ہوں تب تک تشبیہ ہی نہیں بنے گی۔ اس کی ایک مثال سمجھیں کہ "زَیْدٌ کَالْاَسَدِ" (زید ایسے ہے جیسے شیر)۔ اب اس میں زید کو شیر کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، زید مشبہ ہے، جس کے ساتھ تشبیہ دے رہے ہیں وہ مشبہ بہ ہے، آلہ تشبیہ حرف کاف ہے اور وجہ تشبیہ شجاعت اور بہادری ہے۔ کہ جس طرح شیر بہادر ہے اسی طرح زید بھی بہادر ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ وہ حیوان ہے۔ جب تک یہ پانچ چیزیں نہیں ہوں گی تو تشبیہ مکمل نہیں ہوگی۔

درود میں تشبیہ کا مسئلہ:

اللہ کی شان! یہ تشبیہ کے مسائل بڑے مشکل ہیں۔ آپ روزانہ نماز کے اندر درود شریف پڑھتے ہیں:

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ، اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ."

"اے اللہ! تو محمد ﷺ اور ان کی آل پر درود بھیج جس طرح تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آل ابراہیم علیہ السلام پر درود بھیجا۔ اے اللہ! تو محمد ﷺ اور ان کی آل پر برکت نازل فرما، جس طرح تو نے ابراہیم علیہ السلام اور ان کی آل پر برکت نازل فرمائی۔ بے شک تو تعریف والا، بزرگی والا ہے۔"

تو اب مشبہ حضور ﷺ ہیں اور مشبہ بہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اور قاعدہ وضابطہ ہے کہ مشبہ بہ مشبہ سے افضل ہوتا ہے۔ تو اس کا معنی تو یہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام افضل ہیں، حالانکہ حضور ﷺ تو سب سے افضل ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا اشکال ہے کہ حضور ﷺ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دے رہے ہیں، حالانکہ حضور ﷺ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے افضل ہیں، حضرت آدم علیہ السلام سے بھی افضل ہیں، حتیٰ کہ آپ ﷺ تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) [صحیح مسلم، حدیث: ۲۲۷۸، باب: تفضيل نبينا ﷺ على جميع...]

"میں تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں گا قیامت کے دن۔"

اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَا مِنْ نَبِيٍّ يَوْمَئِذٍ آدَمُ فَمَنْ سِوَاهُ إِلَّا تَحْتَ لِوَائِي.))

''قیامت کے دن ابا آدم علیہ السلام بھی میرے پرچم کے نیچے ہوں گے اور تمام انبیاء علیہم السلام بھی میرے پرچم کے نیچے ہوں گے۔'' [سنن الترمذی، حدیث: ۳۱۴۸، باب: ومن سورۃ بنی اسرائیل]

اشکال:

تو اب ''کَمَا صَلَّیْتَ'' کے اندر اشکال ہوتا ہے کہ تشبیہ تو افضل سے ہونی چاہیے؟

جواب 1

علماء نے اس مسئلہ پر چار چار سو صفحات کی کتابیں لکھی ہیں اور تین سو ساٹھ (360) جوابات دیے ہیں۔ آپ سب سے آسان اور بڑی بات یاد رکھیں کہ تشبیہ صرف صلوٰۃ (رحمتیں نازل کرنے) کے اندر ہے، تمام اوصاف کے اندر تشبیہ مراد نہیں ہے کہ جس طرح ان پر صلوٰۃ بھیجی ہے، آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی صلوٰۃ (رحمتیں) بھیجیں۔

جواب 2

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ تشبیہ ہمیشہ افضل کے ساتھ نہیں ہوتی، بلکہ کبھی مفضول کے ساتھ بھی ہوتی ہے۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں:

﴿مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ﴾ [النور: ۳۵]

''اس کے نور کی مثال کچھ یوں ہے جیسے ایک طاق ہو جس میں چراغ رکھا ہو۔''

اب کہاں اللہ کا نور اور کہاں وہ دیا اور چراغ جو ایک طاقچے میں رکھا ہوا ہو!!؟ اس کا اللہ کے نور کے ساتھ تو کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ پھر بھی اللہ نے اپنے نور کو طاقچے کے چراغ کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

جواب 3

بعض علماء کہتے ہیں: یہاں کاف تشبیہ کے لیے نہیں ہے، کاف تعلیل کے لیے ہے۔ یعنی اے اللہ! آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ویسے رحمت بھیجیں جس طرح آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر رحمت بھیجی۔

''تَعَوُّذ'' میں پانچ چیزوں کی تفصیل:

اسی طرح جہاں ''تَعَوُّذ'' ہوگا وہاں پانچ چیزیں ہوں گی: (۱)..... ''اَلْاِسْتِعَاذَة'' (پناہ مانگنا) (۲).....

"مُسْتَعِیذ" (پناہ مانگنے والا)، 3 ......"مُسْتَعَاذ بِہ" (جس کے ساتھ پناہ پکڑی جائے)، 4 ......"مُسْتَعَاذ مِنْہُ" (جس سے پناہ پکڑی جائے)، 5 ......اور "مُسْتَعَاذ لَہٗ" (جس کی وجہ سے پناہ پکڑی جائے)۔

تو جب ہم نے "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ" پڑھا تو اس کا پڑھنا "اَلْاِسْتِعَاذَۃ" ہے، اس میں "مُسْتَعِیذ" (پناہ پکڑنے والا) انسان ہے، "مُسْتَعَاذ بِہ" (جس کے ساتھ پناہ پکڑی جائے) اللہ تعالیٰ ہے، "مُسْتَعَاذ مِنْہُ" (جس سے پناہ پکڑی جائے) شیطان ہے اور "مُسْتَعَاذ لَہٗ" (جس کی وجہ سے پناہ پکڑی جائے) شیطان کی عداوت ہے۔ اس لیے جس وقت بھی "تَعَوُّذ" پڑھیں تو ذہن میں رکھیں کہ ہم پناہ پکڑ رہے ہیں "بِاللّٰہِ" اللہ کے نام کے ساتھ۔ کیونکہ پناہ اس وقت لی جاتی ہے جب دشمن طاقتور ہو، چونکہ شیطان قوی دشمن تھا تو ہم نے اس سے قوی تر یعنی اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑ لی۔ [تفسیر الرازی: ۱/ ۷۰، اَلْبَابُ الثَّانِي فِي الْمَبَاحِثِ الْعَقْلِيَّةِ...]

"تَعَوُّذ" کو مقدم کیوں کیا؟

اب رہا ہمارا سابقہ اشکال کہ "تَعَوُّذ" کو مقدم کیوں کیا؟ وجہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہے دفعِ مضرت (نقصان کو دور کرنا) اور ایک ہے جلبِ منفعت (فائدہ حاصل کرنا)۔ یوں سمجھیں کہ ایک مریض آتا ہے تو پہلی چیز اس کی بیماری کو دور کرنا ہے۔ یہ دفعِ مضرت ہے۔ اب اس بیماری کے بعد کمزوری بھی ہے تو اس کی دوا بعد میں دیتے ہیں۔ اور بیماری کی دوا پہلے دیتے ہیں۔ تو دفعِ مضرت مقدم ہے جلبِ منفعت سے۔

اسی طرح ایک تاجر نے ایک لاکھ ریال کا مال لیا، تو سب سے پہلے وہ دفعِ مضرت کی کوشش کرے گا کہ میرا رأس المال تو محفوظ ہو، بعد میں سوچے گا کہ نفع آئے۔

اور کبھی کبھی ایسے ہوتا ہے کہ منفعت تو قلیل ہے، لیکن مضرت کثیر ہے۔ مثلاً: ایک آدمی دوکاندار کے پاس چار پانچ سو کا سامان لینے کے لیے آیا تو اس دوکاندار کو کسی نے آکر کہا کہ تمہارے گھر کو آگ لگ گئی ہے۔ تو اب وہ فوراً گھر کی طرف دوڑے گا، کیونکہ گاہک کو سامان دینے میں نفع کم ہے اور گھر کو آگ لگنے میں مضرتیں زیادہ ہیں۔ یہاں بھی پہلے مضرت کا علاج کیا جائے گا اور منفعت بعد میں حاصل کی جائے گی۔ تو قرآن میں بھی دفعِ مضرت مقدم ہے کہ پہلے ہم شیطان اور اس کے وساوس سے تو بچیں۔ جب ہم اس سے ہی نہیں بچیں گے تو ہمیں قرآن پاک نے حاصل ہی کیا ہوگا؟ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے "تَعَوُّذ" کو ہر چیز سے مقدم کر دیا۔

"تعوذ" کا صیغہ مفرد کیوں؟

"اَعُوْذُ" کا صیغہ مفرد کیوں آیا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ حالانکہ پورے قرآن کے اندر، بلکہ آپ دیکھیں کہ اسی سورۂ فاتحہ کے اندر بھی دعا کے جتنے صیغے آئے ہیں وہ جمع کے ہیں۔ مثلاً:

﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝﴾ [الفاتحہ: ۴]

"(اے اللہ!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔"

﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝﴾ [الفاتحہ: ۵]

"ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما۔"

جواب:

علماء نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ شیطان کی معترتیں اور وساوس اتنی زیادہ ہیں کہ ہر آدمی الگ الگ اس سے پناہ مانگے، کیونکہ اس کے مقابلے میں جماعت اور فرد کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

پہلی مثال:

اور یہ بھی یاد رکھیں کہ "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ" میں جو پناہ پکڑی گئی ہے وہ اسم ذات کے ساتھ ہے، کیونکہ باقی اسماء مثلاً: "اَلرَّحْمٰنُ"، "اَلرَّحِیْمُ" اسمائے صفات ہیں۔ اس کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ دنیا میں قاعدہ ہے کہ ہر وہ چیز جس میں مضرت ہو اس میں تھوڑا سا نفع بھی ہوتا ہے۔ جیسے ایک زہر ہے، جس کا عربی میں نام "سم الفار" اور ہندی میں سنکھیا ہے۔ اور یہ اتنا شدید زہر ہے کہ اگر کوئی سوئی کے ناکے کے برابر بھی اس کو کھالے تو فوراً مر جائے، لیکن پھر بھی بعض لوگ اس کو استعمال کرتے ہیں۔ کئی ایسے بوڑھے بھی دیکھے تھے جن کی آنکھیں اور صحت اچھی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ سنکھیا زہر استعمال کرتے تھے، حالانکہ وہ زہر ہے۔

تو مطلب یہ ہے کہ یہ زہر جیسے نقصان دہ ہے ویسے ہی یہ صحت کے لیے، اعصاب کے لیے مفید بھی ہے اور انسان کی کمزوریوں کا علاج بھی ہے۔ جو اس کو استعمال کر کے ہضم کر گئے وہ ہر بیماری سے بچ گئے۔ میری یہ بات پڑھ کر کوئی اس کو استعمال نہ کرے، کیونکہ طبیب تو اس کے زہر کو ختم کرا کے اپنی نگرانی میں استعمال کراتے ہیں۔ اور ہم تو یہ معلوم بھی نہیں کر سکتے کہ یہ سنکھیا ہے یا نہیں؟ خالص ہے یا نہیں؟ انسانی استعمال کے لیے ہے یا نہیں؟ یہ بڑی

خطرناک چیز ہے۔ اللہ معاف کرے بعض لوگوں کو عادت بھی ہو جاتی ہے۔ میرے پڑوس میں دو بھائی تھے۔ ان کے سرخ چہرے تھے، حالانکہ غریب تھے، کپڑوں کو رنگ دیتے تھے، وہ سنکھیا کو منہ میں ڈال لیتے تھے، ہمارے سامنے توڑ توڑ کر کھاتے تھے، کہتے تھے: اب عادت پڑ گئی ہے۔ جیسے لوگ شراب کے عادی ہو جاتے ہیں، نشے کے عادی ہو جاتے ہیں، سگریٹوں کے عادی ہو جاتے ہیں، نہ پینے والوں کے کمرے کے اندر سگریٹ پی لیں تو وہ آدمی کمرے میں تین دن داخل بھی نہ ہو سکے، کیونکہ اس کے اثرات تین دن تک رہتے ہیں، حالانکہ پینے والے کو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بعض اوقات پورے کمرے میں اتنا دھواں ہوتا ہے جیسے پرانے زمانے میں ریل کے انجن ہوتے تھے، ویسے پورا کمرہ معلوم ہوتا ہے۔

دوسری مثال:

اور اسی طرح سانپ کو دیکھیں کہ اللہ نے اس کے اندر کتنا زہر رکھا ہے! لیکن اللہ کی شان کہ اس کے سر میں منکا ہے وہ زہر کا تریاق، زہر کو توڑنے والا ہے اور انتہائی مفرح قلب، دل کو سکون دینے والی چیز ہے۔ اب یہ نہ کرنا کہ سانپ پکڑنے لگیں اور سانپ ڈس جائے اور آپ کہیں کہ مولانا مکی صاحب نے کہا تھا۔ وہ سانپ کونسا ہے جس کے سر میں وہ منکا ہوتا ہے یہ ہمیں پتا نہیں ہے، کیونکہ سانپوں کی تو ہزاروں قسمیں ہیں۔

تیسری مثال:

اور دیکھیں! آگ جلا دیتی ہے، لیکن اگر آگ نہ ہو تو کھانا کیسے پکے؟ گاڑیاں کیسے چلیں؟ سردیوں کے اندر دن کیسے کٹیں؟ تو معلوم ہوا کہ ہر نقصان والی چیز کے اندر کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور ہے۔

شیطان کی مضرت:

لیکن شیطان منحوس بدبخت ایسا ہے کہ اس کے اندر مضرت ہی مضرت ہے، منفعت تو اس کے اندر ہے ہی نہیں۔ دنیا میں آپ کا کوئی دشمن ہوتا ہے تو آپ اس کی وجہ سے الرٹ ہو جاتے ہیں، ہوشیار ہو جاتے ہیں۔ اس دشمن کا کوئی نہ کوئی تو فائدہ ہوا کہ آپ ہوشیار ہو گئے۔ اور آپ سمجھتے ہیں کہ اگر آپ سے ذرا سی غفلت ہوئی تو نقصان کا خطرہ ہے۔ ہر دشمن کی دشمنی میں اور ہر ضرر والی چیز کے ضرر کے ساتھ منفعت بھی ہوتی ہے، لیکن ایک شیطان بدبخت ہے جس میں ضرر ہی ضرر ہے، فائدہ تو ہے ہی نہیں۔ اور شیطان کی مضرت کاملہ اور مطلقہ ہے کہ کامل بھی ہے اور ہر لحاظ

سے بھی ہے۔اس لیے ہم اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اس سے پناہ پکڑتے ہیں۔

علماء فرماتے ہیں: ایک مضرت ثوبی ہے کہ کپڑے وغیرہ پھٹ گئے، ایک مضرت جسمی ہے کہ ٹانگ وغیرہ ٹوٹ گئی اور ایک مضرت روحی ہے اور روح ایمان ہے۔ اگر ایمان نہیں ہوگا تو بندہ مردہ ہوگا۔ تو شیطان کی مضرت روح الروح ہے کہ وہ انسان کی ایمانیات پر حملہ کرتا ہے اور انسان کو جہنم کا حق دار بنا دیتا ہے۔ اس لیے اتنے بڑے دشمن کے مقابلے میں ہمیں اللہ سے پناہ پکڑنی تھی، کیونکہ شیطان کے شر سے بچانے والی اللہ کی ذات کے علاوہ کوئی اور چیز تھی ہی نہیں۔

حضرت عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا واقعہ:

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ’’تلبیسِ ابلیس‘‘ (جس کے اندر انہوں نے شیطانی حملوں کے بارے میں لکھا ہے۔ اس کو پڑھنا چاہیے۔ اس کتاب) میں لکھا ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ رات کے وقت بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کر رہے تھے کہ یکدم روشنی ہوگئی اور آواز آئی کہ اے عبدالقادر! ہم آپ سے خوش ہیں۔ جاؤ ہم نے آپ سے تمام شریعت اور عبادت معاف کر دی ہے۔ جب یہ آواز آئی تو شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے فوراً کہا: ’’اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ‘‘ تو شیطان بھاگا اور ظاہر بھی کر دیا کہ میں شیطان تھا۔ تو عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے فرمایا: تم مجھے گمراہ کرنا چاہتے تھے؟ شیطان نے کہا کہ اس طریقے سے تو میں نے کئی عابدوں کی گردنیں توڑ ڈالیں، لیکن تم عالم بھی تھے، لہٰذا تمہارے علم نے تمہیں بچالیا۔ تو عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے ’’اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ‘‘ پڑھا اور فرمایا: بدبخت! مجھے میرے علم نے نہیں بچایا، میرے اللہ نے بچایا ہے۔ تم مجھے دھوکا دے رہے ہو۔ تو شیطان نے کہا: میرے پاس ستر ہزار نورانی جال ہیں، میں لوگوں کو ان میں پھنساتا ہوں۔ عالم کو علم کی مار دیتا ہوں، عابد کو عبادت کی مار دیتا ہوں اور متقی کو تقویٰ کی مار دیتا ہوں، لیکن اللہ نے آپ کو بچانا تھا تو آپ میرے حملے سے بچ گئے ہیں۔

تنبیہ:

یہی وجہ ہے کہ ہمارے بعض لوگ صوفی بننا چاہتے ہیں اور بغیر کسی علم کے وہ عبادت وریاضت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ تو صاف ظاہر ہے کہ اس کے اثرات تو ہوں گے۔ دیکھو! اگر آپ آگ کے ساتھ بیٹھو گے تو آپ کا جسم گرم ہوگا اور اگر آپ اے سی کے ساتھ بیٹھو گے تو آپ کا بدن ٹھنڈا ہوگا، اسی طرح جب آپ اہل اللہ کے ساتھ بیٹھیں گے تو اللہ

کے ذکر کی برکات تو آئیں گی، لیکن چونکہ علم نہیں ہوتا تو ایسے لوگوں کو شیطان ایک منٹ میں بھٹکا دیتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ بجائے دین پر رہنے کے اسلام سے بھی نکل جاتا ہے۔ وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تو بالکل آسمان کے قریب پہنچ گئے اور وہ اڑنا شروع کر دیتے ہیں، پھر وہ بھٹک بھی سکتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے اللہ کی پناہ پکڑی۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ شیطان ہمیں دیکھ سکتا ہے اور ہم شیطان کو نہیں دیکھ سکتے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾ [الاعراف: ۲۷] (وہ اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھ سکتے ہیں، لیکن تم ان کو نہیں دیکھ سکتے)۔ اب جو دشمن نظر نہ آئے وہ تو بڑا خطرناک ہوتا ہے، کیونکہ نظر آنے والے کے مقابلے میں ہم بھی کچھ کریں گے، اس کا مقابلہ کریں گے اور جو نظر نہیں آتا اس کے مقابلے میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اس لیے ہم نے اس تعوذ سے اس اللہ کی پناہ پکڑی جس کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ ۖ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ۖ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ [الانعام: ۱۰۳] (نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں، اور وہ تمام نگاہوں کو پا لیتا ہے۔ اس کی ذات اتنی ہی لطیف ہے، اور وہ اتنا ہی باخبر ہے)۔ لہٰذا ہم اللہ کی پناہ کے سوا اور کہیں بچ نہیں سکتے تھے، اس لیے پڑھا: "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ"۔

[تفسیر الرازی: ۱/ ۷۷، الباب الثانی فی المباحث العقلیۃ]

شیطان کا معنی:

لفظ شیطان کی لغوی تحقیق میں علماء کے دو قول ہیں:

1 ...... بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے اندر نون اصلی نہیں ہے، یہ "شَاطَ يَشِيطُ" سے ہے۔ اس کا معنی ہے احتراق یعنی جلنا۔ اور شیطان بھی انسان کی دشمنی میں ہر وقت جل رہا ہے۔

2 ...... اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ نون اصلی ہے تو مادہ "شَطَنَ يَشْطُنُ" ہوگا اور معنی ہوگا "بَعُدَ" یعنی دور ہوا۔ تو دور کس بات سے ہوا؟ ملاء اعلیٰ سے بھی دور، اللہ کی رحمت سے بھی دور اور انسان کی محبت سے بھی دور۔ اس لیے شیطان مردود کہلایا۔ اسی لیے اللہ نے شیطان کو حکم دیا:

﴿فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ۝ وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ۝﴾ [الحجر: ۳۴، ۳۵]

"نکل جاؤ یہاں سے، قیامت تک تجھ پر میری لعنت ہے۔"

اور لعنت کا معنی ہے اللہ کی رحمت سے دور ہو جانا۔ جب اللہ کی رحمت سے دور ہوا تو باقی کیا بچا؟ اس لیے شیطان

کو مردود کہتے ہیں۔[تفسیر ابن کثیر:۱/۱۵،تفسیر الاستعاذۃ و احکامہا]

”رَجِیْم“ کا معنیٰ:

”رَجِیْم“،”رَجْم“ سے ہے،بروزن”فَعِیْلٌ“ بمعنی”مَفْعُوْلٌ“ ہے۔معنیٰ ہے پتھر مارا ہو،اور مراد ہے کہ مردود ہوا۔[تفسیر ابن کثیر:۱/۱۵،تفسیر الاستعاذۃ و احکامہا]

قرآن کو”مُتَرَجَّم“ کہنا:

ہمارے بعض بھائی ترجمہ والے قرآن کو غلطی سے”مُتَرَجَّم“ کہہ دیتے ہیں تو”نَعُوْذُ بِاللّٰہِ“ اس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ وہ قرآن جس کو پتھر مارے گئے۔اور یہ معنیٰ غلط ہے۔لہٰذا آپ یوں کہو:”مُتَرْجَم“ بغیر شد کے۔

علم کی اقسام:

علماء نے فرمایا:علوم دو قسم کے ہوتے ہیں:ایک علومِ ضارہ اور دوسرے علومِ نافعہ ہوتے ہیں۔اس کو یوں کہہ لو کہ بعض علوم رحمانی ہوتے ہیں اور بعض علوم شیطانی ہوتے ہیں۔گانا بجانا،موسیقی اور ناچنا یہ بھی تو علم ہے،ہر کوئی اٹھ کر کھڑا ہو جائے اور اچھلنا شروع کر دے تو اس کو ناچنا تھوڑا ہی کہیں گے۔اسی طرح علم نجوم،علم جفر یہ سارے علوم ہیں،لیکن علومِ ضارہ ہیں،علومِ نافعہ نہیں ہیں۔

علومِ نافعہ:

علوم نافعہ وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق آدمی کے دین سے ہو،ایمان سے ہو،عبادات سے ہو،اخلاق سے ہو،اس کی دنیاوی بھلائی سے ہو،آخرت کی بھلائی سے ہو اور وہ اسلام کے خلاف نہ ہو۔یہ علومِ نافعہ ہیں۔جتنے علومِ ضارہ ہیں ان سب کا پرنسپل ابلیس،یعنی شیطان ہے۔

شیطان کے سب کارنامے ناری ہیں:

علماء نے بڑی عجیب بات لکھی ہے کہ شیطان آگ سے بنا ہے،نار سے بنا ہے تو جتنے بھی علوم ضارہ ہیں،ناریہ ہیں وہ سب شیطان نے کافروں کو سکھائے ہیں۔اس لیے تو علومِ ناریہ میں،ہائیڈروجن بم بنانے میں،میزائل بنانے میں کافر سب سے آگے ہیں،کیونکہ ان کا تعلق آگ سے ہے۔وہ کافروں کو سکھاتا ہے،وہ ہمیں کیسے سکھائے

گا؟ کیونکہ اس کو پتا ہے کہ جب سے حضور ﷺ آئے ہیں اس وقت سے ہمیں (شیاطین کو) میزائل لگنے شروع ہو گئے۔ جیسا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ جنات کا قول نقل کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۖ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا﴾ [الجن: ۹]

"اور یہ کہ ہم پہلے سن گن لینے کے لیے آسمان کی کچھ جگہوں پر جا بیٹھا کرتے تھے، لیکن اب جو کوئی سننا چاہتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ ایک شعلہ اس کی گھات میں لگا ہوا ہے۔"

یعنی جنوں نے جا کر شیطان سے کہا کہ آسمانوں پر سخت سیکورٹی ہو گئی ہے، اگر ہم قریب جانے کی کوشش کرتے ہیں تو شہاب ثاقب سے ہمیں مارا جاتا ہے۔ اس شیطان نے کہا: اچھا! زمین میں کوئی بہت بڑا واقعہ ہو گیا ہے، جلدی سے جاؤ اور دیکھو کہ کیا ہوا ہے؟ حالانکہ ہم پہلے اوپر جاتے تھے اور ملائکہ کی باتیں سنتے تھے۔

ان شیاطین کے فضا میں ٹھکانے تھے۔ یہ کافر لوگ بھی کہتے ہیں کہ ہم نے بڑی ترقی کر لی ہے کہ ہم چاند پر پہنچ گئے ہیں، مریخ پر پہنچ گئے ہیں۔ اب تو نیا سیارہ بھی دریافت کر لیا ہے۔ حالانکہ جناب! انسان جنات سے بھی کمزور ہیں۔ وہ شیطان بھی کہتے ہیں کہ ہم نے بھی آسمانوں پر چوکیاں لگائی ہوئی تھیں۔ وہاں فرشتوں کی بات سنتے اور آکر اپنے گروہ کو خبر دے دیتے کہ کل فلاں جگہ بارش ہو گی۔ ایک سچی خبر دیتے اور ساتھ دس جھوٹی خبریں بھی دے دیتے تھے۔ اگر کوئی بات غلط نکلتی تو پھر کہہ دیتے کہ شاید ہمارے سمجھنے میں کوئی بات رہ گئی ہو۔

اب جب وہ اوپر نہیں جا سکتے تو انہوں نے کہا:

﴿وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا﴾ [الجن: ۱۰]

"اور یہ کہ ہمیں یہ پتہ نہیں تھا کہ آیا زمین والوں سے کوئی برا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے پروردگار نے ان کو راہ راست دکھانے کا ارادہ فرمایا ہے۔ (جس کی وجہ سے ہمارا آسمان پر جانا بند کر دیا گیا ہے)۔"

غزوہ بدر میں شیطان کی شرارت اور فرار:

غزوہ بدر میں کفار ایک ہزار کا لشکر لے کر نکلے۔ ابلیس کو پتا تھا کہ ایک ہزار کے لشکر کا مقابلہ معمولی جماعت نہیں کر سکتی۔ تو اس موقع کو شیطان نے غنیمت سمجھا اور شیطان ایک سردار کی شکل میں (جس کا قبیلہ جنگجو تھا اور جس سے قریش کو ڈر لگتا تھا کہ اگر ہم مکہ سے نکلے تو وہ قبیلہ مکہ پر قابض ہو جائے گا۔ تو اسی شکل میں) آیا کہ تمہیں کوئی غم کرنے کی ضرورت نہیں، میں بھی تمہارے ساتھ ہوں، تم مسلمانوں کو مٹا دو۔ اب ابوجہل مطمئن ہو گیا کہ ان کا

خطرہ بھی ٹل گیا ہے، بلکہ وہ ہمارے ساتھ بھی جانے کے لیے تیار ہیں۔

جب میدانِ بدر کے قریب آئے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام اور دوسرے فرشتے اترے تو چونکہ شیطان دیکھ سکتا ہے، اس لیے شیطان لعین اپنی سواری کو آہستہ آہستہ پیچھے کرنے لگا۔ ابوجہل نے کہا: کہاں جاتے ہو؟ آخر! ابوجہل نے شیطان کو پکڑ لیا تو اس وقت شیطان نے کہا:

﴿إِنِّي بَرِيٓءٌ مِّنكُمْ إِنِّيٓ أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّيٓ أَخَافُ ٱللَّهَ﴾ [الانفال: ۴۸]

"میں تمہاری کوئی ذمہ داری نہیں لے سکتا، مجھے جو کچھ نظر آرہا ہے وہ تمہیں نظر نہیں آرہا۔ مجھے اللہ سے ڈر لگ رہا ہے۔"

میں تو ڈرتا ہوں، میں تو آگے نہیں جاتا۔ ابلیس کو بات سمجھ آگئی کہ اب ملائکہ آگئے ہیں، قریش کا بچنا مشکل ہے۔ ایک فرشتہ بھی آجاتا تو کافی تھا، لیکن اللہ نے تین ہزار فرشتے اتار دیے۔ اس لیے ابلیس لعین وہاں سے بھاگا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۳۲۴، الانفال: الآیۃ: ﴿وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ ٱلشَّيْطَٰنُ أَعْمَٰلَهُمْ﴾]

صوفیاء کا کلام:

بعض علماء نے عجیب بات لکھی ہے کہ شیطان کے اندر تین عین تو موجود تھے، لیکن ایک عین موجود نہیں تھا اس لیے وہ مار کھا گیا...... یہ تصوف کی بات ہے، لیکن یاد رکھیں! صوفیاء کا کلام شریعت میں حجت نہیں ہوتا۔ جیسے ایک بہت بڑے صوفی بزرگ گزرے ہیں، انہوں نے "أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" کو مقدم کرنے کی وجہ لکھی کہ "أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" میں پہلا حرف "الف" ہے۔ اور "الف" حروفِ تہجی میں پہلے نمبر پر آتا ہے، ﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ میں پہلا حرف "باء" ہے۔ اور "باء" "الف" کے بعد آتا ہے۔ ان کا اپنا انداز ہے۔

ایک پٹھان کی تقریر:

حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ایک پٹھان تقریر کر رہا تھا اور مجھے بس اس پر افسوس ہے کہ اس کا لہجہ پٹھانوں والا تھا، ورنہ اتنی اچھی تقریر آج تک کوئی کر ہی نہیں سکا۔ میں نے کہا: خان! کیا تقریر کی ہے؟ کاش! لہجے میں بھی تھوڑی نرمی ہوتی۔ شاہ جی فرماتے ہیں: کوئی اس کو مولوی مانے یا نہ مانے، میں تو اس کو مولوی مانتا ہوں۔ کیونکہ تقریر کے دوران اس سے کسی نے مسئلہ پوچھا کہ قادیانی نے نبوت کا جو دعویٰ کیا ہے، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو اس نے کہا: دیکھو! تم قرآن پڑھتے ہو، "باء" سے شروع کرتے ہو اور

''وَالنَّاسِ'' کی ''سین'' پر ختم کرتے ہو تو ''بس'' میرا نبی آ گیا، اب یہ کہاں سے آ گیا؟ شاہ جی فرماتے ہیں: جو تفصیل اس نے بیان کی ایسی تفصیل کسی کا باپ بھی بیان نہیں کر سکتا۔

بے نمازی کے کان میں شیطان کا پیشاب:

ابلیس لعین ہر گناہگار کو گناہ میں مبتلا کرنے کے بعد لعنت بھی بھیجتا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ جب صبح کی نماز کا وقت ہو تو شیطان آ کر تھپکیاں دیتا ہے کہ سو جاؤ۔ آنکھ کھل بھی جائے تو کہتے ہیں کہ ابھی تو بیس منٹ ہیں، دس منٹ ہیں تو آنکھ لگ سکتی ہے، پھر سلا دے گا۔ جب جماعت ہو جاتی ہے اور نماز کا وقت ختم ہو جاتا ہے تو اس کے کان میں پیشاب کر کے چلا جاتا ہے۔ جو اللہ کو سجدہ نہ کرے وہ میرے پیشاب کا مستحق ہے۔ اس کا احساس ہمیں ہو یا نہ ہو، لیکن یہ ضرور ہے کہ انسان نماز سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

((ذُكِرَ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ، فَقِيلَ: مَا زَالَ نَائِمًا حَتَّى أَصْبَحَ، مَا قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ، فَقَالَ: بَالَ الشَّيْطَانُ فِي أُذُنِهِ)) [بخاری، حدیث: ۱۱۴۴، باب: إذا نام ولم يصل بال...]

''حضور ﷺ کے پاس ایک شخص کا ذکر آیا تو کہا گیا کہ وہ سوتا رہا یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور نماز کیلئے کھڑا نہ ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ شیطان نے اس کے کان میں پیشاب کر دیا ہے۔''

جہنم میں دوزخیوں کا شیطان سے مباحثہ:

اس لیے کہتے ہیں کہ جب جہنمی جہنم میں اس ابلیس شیطان کو دیکھیں گے تو جہنمی کہیں گے کہ اس کو تو خوار کرو، اسی نے ہمیں گمراہ کیا تھا۔ سارے اکٹھے ہو کر اس کو پکڑیں گے، وہ کہے گا کہ پہلے میری بات سنو، اس کے بعد جو مرضی آئے تم سزا دو۔ میرا قصور کیا ہے؟ میں نے تمہیں برائی کی طرف بلایا، جبکہ اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر علیہم السلام بھیجے، انہوں نے تمہیں نیکی کی طرف بلایا تم نے ان کی بات تو سنی نہیں، میری بات سنی۔ تم اپنے آپ کو ملامت کرو، مجھے کیوں ملامت کر رہے ہو؟ جیسے کسی شاعر نے کہا:

؎ مجھے تعجب ہے اس انسان پر
کارِ بد خود کرے، لعنت کرے شیطان پر

تو شیطان کہے گا کہ میں نے تو تمہیں شر کا راستہ دکھایا تھا، لذت تو تم نے خود اٹھائی تھی، میں نے تو تمہیں شراب پینے کا

راستہ دکھایا تھا، میں نے تھوڑا کہا تھا کہ تم گناہ میں اتنے آگے بڑھ جاؤ کہ شیطان بھی پیچھے رہ جائے۔

شیطانی وساوس:

اس لیے علماء نے فرمایا: "أَعُوذُ بِاللهِ" پڑھنے میں یہ حکمت ہے کہ قرآن پڑھنے سے پہلے ہم اللہ کی پناہ میں آجائیں، تاکہ شیطان کے حملے سے بچ جائیں۔ اب جب ہم نے "أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" پڑھا تو ہم قوی ترین کی پناہ میں آگئے، اب شیطان کا حملہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳، تفسیر الاستعاذۃ و أحکامہا]

ورنہ تو وہ بد بخت ایسا ہے کہ دور رہ کر بھی وسوسہ ڈال دے۔ اور وسوسہ بھی کیسے ڈالتا ہے؟ دیکھو! حضرت آدم علیہ السلام کو وسوسہ کیسے ڈالا؟ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى﴾ [طٰہٰ: ۱۲۰]

"پھر شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا۔ کہنے لگا: اے آدم! کیا میں تمہیں ایک ایسا درخت بتاؤں؟ جس سے ہمیشہ کی زندگی اور وہ بادشاہی حاصل ہو جاتی ہے جو کبھی پرانی نہیں پڑتی۔"

شیطان نے کہا: جنت عام مقام نہیں ہے، اگر تم نے اس کے اندر ہمیشہ رہنا ہے تو پھر تمہیں اس درخت کو کھانا ہوگا جس سے منع کیا گیا ہے۔ یعنی ان کو جنت کے نام پر دھوکا دے رہا ہے۔ اگر کوئی نماز پڑھ رہا ہے تو اس کو نماز سے دھوکا دے گا کہ دیکھو! تمہیں لوگ دیکھ رہے ہیں، تم نماز کو تھوڑا اور لمبا کرو۔ بندہ اس کے دام میں آگیا تو نماز برباد ہوگئی۔ اللہ پاک ہمیں شیطانی وساوس اور اس کے حملوں سے محفوظ فرمائے۔

شیطان سے پناہ کی وجہ:

اللہ نے ہمیں صرف شیطان سے پناہ مانگنے کا کیوں کہا ہے؟ حالانکہ دشمن تو اور بھی بہت ہیں۔ مسلمان کے لیے سارے کافر دشمن ہیں، چاہے وہ یہودی ہوں، عیسائی ہوں، چاہے وہ آپس میں دوست ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى أَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ [المائدۃ: ۵۱]

"اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو یار و مددگار نہ بناؤ۔ یہ خود ہی ایک دوسرے کے یار و مددگار ہیں۔"

انسان کی اپنی ذاتی دشمنیاں بھی ہوتی ہیں اور انسان کو ایذاء پہنچانے والے دوسرے جانور بھی ہیں۔ سانپ

ہیں، بچھو ہیں اور دوسری بلائیں بھی ہیں، لیکن صرف شیطان سے پناہ مانگنے کی وجہ کیا ہے؟ اس کو علماء کی اصطلاح کے اندر "سِرُّ التَّخصِیص" کہتے ہیں کہ اس کو خاص کرنے کا راز کیا ہے؟

علماء نے اس کی وجہ لکھی ہے کہ دنیا کے اندر انسان کے پاس تین چیزیں ہیں: مال، جان، ایمان۔ اگر جان کو کچھ نقصان آجائے تو مال کو اس پر قربان کر دینا چاہیے اور اگر ایمان کو کچھ نقصان آنے لگے تو مال، جان اور اولاد سب کچھ اس پر قربان کر دو، کیونکہ ایمان زیادہ قیمتی ہے اور شیطان ایمان پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ باقی دشمن جان اور مال پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ تو چونکہ اس کا نقصان زیادہ ہے، اس لیے حکم فرمایا: "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ" پڑھو، کیونکہ اگر شیطان نے ایمان کو ختم کر دیا تو کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ اور شیطان تو کھلا دشمن ہے۔ فرمایا:

﴿إِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ﴾ [یوسف:۵]

"البتہ شیطان انسان کا صریح (واضح اور کھلا) دشمن ہے۔"

اس نے کہا تھا کہ میں ان کے دائیں سے، بائیں سے، آگے سے اور پیچھے سے غرض ہر طرف سے حملہ کروں گا تو پھر آپ اکثر لوگوں کو ایمان والا نہیں پائیں گے۔

عجیب نکتہ!

بعض بزرگوں نے عجیب نکتہ بیان کیا ہے کہ شیطان نے چار جانبوں کا نام لیا، لیکن دو جانبوں کا نام نہیں لیا، یعنی اس نے اوپر اور نیچے کی جانب کا نام نہیں لیا۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ ضروری تو نہیں ہے کہ ساری جانبوں کا ذکر کیا جاتا، جیسے قرآن میں ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ [البقرۃ:۱۱۵]

"اور اللہ ہی کی ہے مشرق اور مغرب۔ سو جس طرف تم منہ کرو، وہاں ہی اللہ متوجہ ہے۔"

مشرق اور مغرب کا رب اللہ ہے تو کیا شمال اور جنوب کا مالک کوئی اور ہے؟ تو جیسے وہاں مقصد یہ ہے کہ تمام جانب کا مالک اللہ ہے اسی طرح یہاں بھی تمام جہات مراد ہیں کہ شیطان نے کہا کہ میں اس کی آنکھوں سے بھی گناہ کرواؤں گا، اس کی زبان سے بھی، اس کی شرمگاہ سے بھی اور اس کے ہاتھوں سے بھی گناہ کرواؤں گا۔ میں اس کے پورے بدن کو ہر طرف سے حملے میں جکڑوں گا۔

اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اللہ نے اس کو ہمت ہی نہیں دی کہ وہ اوپر اور نیچے کا کہتا، وگرنہ تو کوئی بھی اس کے حملے سے نہ بچ سکتا۔ مثلاً: اگر بہت بڑا گڑھا کھدا ہوا ہو تو جتنا بڑے سے بڑا جوان ہو وہ گرے گا اور ہلاک ہوگا۔ اور اوپر کی طاقت اس لیے نہیں دی کہ کیونکہ ساری رحمتیں اوپر سے آتی ہیں۔

شیطان کی بات اثر کیسے کرتی ہے؟

شیطان کی بات اثر کیسے کرتی ہے؟ کہ وہ ہمیں گمراہ کرتا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس کے سب سے بڑے دو طریقے ہیں: (۱)...... ایک تو یہ شبہات کے ساتھ گمراہ کرتا ہے۔ (۲)...... دوسرا شہوات کے ساتھ گمراہ کرتا ہے۔ شبہ بالنسبت، شبہ بالنسب، شبہ بالدلالت ہوں گے۔ سب سے پہلے تو یہ شبہ ڈالے گا کہ یہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے، یہ تو بندوں کا کلام ہے۔ ﴿إِنْ هَذَآ إِلَّآ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ﴾ [الانعام:۲۵] (یہ کچھ نہیں، مگر پہلے لوگوں کی قصے کہانیاں ہیں)۔ یہ کہتے ہیں اور ہمیں سنا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی سنا سکتے ہیں۔ اب یہ اصل میں شبہ ڈال رہا ہے۔

بعض دوسرے شیطانی شبہات:

اسی طرح بہت سارے شیطانی شبہات ہوتے ہیں۔ مثلاً:

(پہلا شبہ) اگر یہ اللہ کا کلام ہے تو اس میں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ اللہ ایک حکم دیتے ہیں پھر اس کو توڑ دیتے ہیں؟ کیا اللہ کو پہلے پتا نہیں ہوتا؟ انسانوں سے تو غلطی ہو سکتی ہے اور وہ اپنے قوانین بدل سکتے ہیں، لہٰذا یہ اللہ کا کلام نہیں ہے۔ لیکن مسلمانوں نے کہا: نہیں! نہیں! یہ تو اللہ کا کلام ہے۔

(دوسرا شبہ) جب شیطان کا یہ وار نہ چلا تو شیطان کہتا ہے کہ تم جو حدیث پڑھتے ہو یہ تو ڈھائی سو سال بعد لکھی گئی ہے۔ اتنے عرصے میں لوگوں کو کوئی بات کیسے یاد رہی؟ گویا! انکارِ حدیث کا فتنہ انہی شبہات سے پیدا ہوا۔ (ان دونوں شبہات کے جوابات ہماری کتاب "اسلام پر کفار کے اعتراض" میں دیکھیں۔ انور) وہ کہتا ہے کہ دیکھو! حدیث میں آیا ہے: ((لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلَاةَ حَائِضٍ إِلَّا بِخِمَارٍ))[1] (حائضہ عورت کی نماز دوپٹہ کے بغیر ہوتی ہی نہیں)۔ دیکھو! یہ حدیث رسول ﷺ ہے کہ اگر عورت حیض والی ہو تو وہ سر پر دوپٹہ رکھ کر نماز پڑھ لے۔ ادھر

[1] سنن أبي داود، حديث: ۶۴۱، باب: المرأة تصلي بغير...!

آپ کہتے ہیں کہ حیض والی عورت نماز نہیں پڑھ سکتی۔ اب شیطان نے شبہ ڈال دیا۔ حالانکہ یہاں حائض کا معنی بالغ ہے، حیض والی عورت نہیں ہے۔ تو معنی یہ ہوگا کہ جو عورت بالغہ ہے اس کی نماز دوپٹہ کے بغیر نہیں ہوگی اور اگر چھوٹی ہے تو اس کی ہو جائے گی۔

(تیسرا شبہ) اور اسی طرح وہ یہ شبہ ڈالتا ہے کہ قرآن میں ہے: ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ﴾ [البقرۃ: ۲۲۲] (آپ سے حیض والی عورتوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجیے کہ وہ گندگی ہے، ان سے دور رہو، جب تک کہ وہ پاک نہ ہوں)۔

شیطان شبہ ڈالتا ہے کہ حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ((كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُبَاشِرُنِي وَاَنَا حَائِضٌ))[1] (حضور ﷺ مجھ سے مباشرت فرماتے تھے اور میں حیض والی ہوتی تھی)۔ جبکہ قرآن کہتا ہے کہ قریب بھی نہ جاؤ اور حضور ﷺ مباشرت فرماتے تھے۔ تو مسلمان کہتا ہے کہ اتنی شان والے نبی ﷺ کے بارے میں کیسے کہوں کہ وہ حیض والی حالت میں مباشرت کرتے تھے؟ (حالانکہ یہاں مباشرت کا معنی جماع نہیں ہے، صرف ساتھ سونے کے معنی میں ہے۔) یہ دشمن کی چال ہے۔ جب آدمی دشمنی پر آ جائے تو اس کو ہر خوبی بھی عیب لگتی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر الزام:

ایک آدمی نے حرم کے اندر مجھے ایک خط لکھا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کو اس وقت تک سامنے نہیں بٹھایا جب تک کہ ان کی ڈاڑھیاں نہیں آ گئیں۔ تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو لڑکوں کا شوق تھا...... نَعُوْذُ بِاللّٰهِ ثُمَّ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ!...... کتنے بڑے امام اور فقیہ پر بہتان ہے؟ حالانکہ وہ حضور ﷺ کے فرمان پر عمل کر رہے تھے کہ جیسے غیر محرم پر نظر کرنا حرام ہے اسی طرح وہ لڑکے جن کی ڈاڑھیاں نہیں نکلی ہیں ان کو بھی بری نظر سے دیکھنا حرام ہے۔ تو امام صاحب رحمہ اللہ کے تقویٰ کا یہ عمل ہے، لیکن الٹی سمجھ والا اپنا بغض نکالتا ہے۔

شبہ کا جواب:

اسی طرح شیطان نے شبہ ڈالا کہ حضور ﷺ نے حیض کی حالت میں مباشرت کی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ

[1] [بخاری، رقم: ۳۰۰، باب: الغسل، النفی...]

جس طرح لفظ مباشرت جماع کے لیے آتا ہے اسی طرح "اِلْتِقَاءُ الْبَشْرَةِ بِالْبَشْرَةِ" (بندے کا بندے کے ساتھ ملنا۔اس) کو بھی مباشرت کہا جاتا ہے۔تو بی بی عائشہ ﷞ کا مقصد یہ تھا کہ اسلام یہودیت والا مذہب نہیں کہ جب عورت کو حیض آئے تو اس کو گھر سے نکال دو، الگ کر دو، کھانا الگ، برتن الگ ہر چیز الگ، کیونکہ وہ پلید ہو چکی ہے۔ بلکہ اسلام نے کہا: میاں بیوی ایک بستر کے اندر سو سکتے ہیں، ان کے بدن بدن سے مل جائیں تو کوئی گناہ نہیں، لیکن مجامعت حرام ہے، مطلقاً "اِلْتِقَاءُ الْبَشْرَةِ" حرام نہیں ہے۔

کئی دفعہ لفظ تو ایک ہوتا ہے، لیکن اس کے معانی کئی ہوتے ہیں۔ جیسے "عَيْنٌ" چشمہ کو کہتے ہیں جو زمین سے پھوٹے، سورج کو بھی کہتے ہیں اور گھٹنے کی ہڈی کو بھی "عَيْنٌ" کہتے ہیں۔اب ہم کیسے سمجھیں کہ لفظ "عَيْنٌ" کا کون سا معنی مراد ہے؟ اس لیے سیاق وسباق کو دیکھ کر ترجمہ کرنا ہوگا۔جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَى أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝﴾ [القمر:۱۲] (اور ہم نے زمین کو پھاڑ کر چشموں میں تبدیل کر دیا۔ اور اس طرح (دونوں قسم کا) سارا پانی اس کام کے لیے مل گیا جو مقدر ہو چکا تھا)۔یہاں "عُيُونٌ" "عَيْنٌ" کی جمع ہے بمعنی چشمہ۔

اگر کہیں "تَجَسَّسَ الْعَيْنُ" (عین نے جاسوسی کی) ہو تو اس کا معنی ہوگا جاسوس نے جاسوسی کی۔اور اگر کہیں "اِنْكَسَرَتِ الْعَيْنُ" (عین ٹوٹ گئی) ہو تو اس سے گھٹنے کی ہڈی مراد ہے۔اس لیے سیاق وسباق کو دیکھ کر ترجمہ کرنا ہوگا۔خدا کی شان کہ کبھی عبارت بھی ایک ہوتی ہے اور لفظ بھی ایک ہوتا ہے، صرف لحن بدل جانے سے معنی بدل جاتا ہے۔جیسے "کیا بات ہے" ایک لفظ ہے، لیکن جب آپ اس کی ادائیگی کریں گے تو انداز کے مختلف ہونے سے معنی مختلف ہو جائے گا۔مثلاً کسی کو کہیں: "کیا بات ہے؟" (عام سوالیہ انداز سے) تو اس کا معنی اور ہے، "کیا بات ہے؟" (تیز غصے سے) تو اس کا معنی اور ہے، "کیا بات ہے!" (تعریف کرنے اور تعجب کے انداز میں) تو اس کا معنی اور ہے۔تو انداز کے بدلنے سے معنی بدل گیا۔

اس لیے حدیثِ رسول ﷺ کو سمجھنا علماء کا کام تھا، صحابہ کی فہم چاہیے تھی۔ ایک مرتبہ حضرت عمر ﷜ حضور ﷺ کو تورات دکھا رہے تھے اور حضرت ابو بکر ﷜ محمد مصطفیٰ ﷺ کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔تو حضرت ابو بکر ﷜ نے فرمایا: عمر! کیا کر رہے ہو، دیکھتے نہیں ہو؟ حضرت عمر ﷜ نے جب حضور ﷺ کے چہرے کو دیکھا کہ غصے سے سرخ ہو رہا ہے (چونکہ حضرت عمر ﷜ منانہ بھی جانتے تھے) تو انہوں نے فوراً کہا: "رَضِينَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَ بِالْإِسْلَامِ دِينًا وَ بِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا وَ رَسُولًا" (ہم اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ

کے نبی ہونے پر راضی ہیں) تو حضور ﷺ نے فرمایا: تم قرآن کے ہوتے ہوئے تورات پڑھ رہے ہو؟ آج اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو میری اتباع کرتے۔ اس لیے یاد رکھیں! شیطان اس قسم کے شبہات ڈال کر گمراہ کرتا ہے۔ [مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۱۹۴، باب: الاعتصام بالکتاب والسنۃ...]

شہوات کے ذریعے گمراہی:

اور دوسرا وہ شہوات کے ذریعے گمراہ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک آدمی کو پیاس لگی ہے، اس نے سوچا کہ یہ پانی پینا کیسا ہے؟ (حلال ہے یا حرام؟) تو شیطان کہتا ہے: پیاس بجھاؤ، کسی سے کیا پوچھتے ہو؟ ہر آدمی جوانی کی حالت میں کہتا ہے کہ فیشن کروں اور میرے ساتھ پریاں ہوں، میں ان کے ساتھ اڑتا پھروں۔ شیطان کہتا ہے کہ اپنی خواہشات کو پورا کرو، کیونکہ اگر یہ چیزیں گناہ تھیں تو اللہ نے بنائی ہی کیوں ہیں؟ اگر حسن و جمال کو دیکھنا منع ہوتا تو اللہ اسے پیدا ہی نہ کرتا۔

مال و دولت کے ذریعہ گمراہی:

امام غزالی رحمہ اللہ نے "ذَنْبُ الْغُرُوْرِ" (کتاب) میں شیطان کے گمراہ کرنے کے اور ذرائع بھی لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک "تَغْرِیْرٌ بِالدُّنْیَا، تَغْرِیْرٌ بِصِفَاتِ اللّٰہِ" ہے۔

"تَغْرِیْرٌ بِالدُّنْیَا" یہ ہے کہ شیطان کہتا ہے کہ دیکھو! تمہارے پاس دس ہزار ریال آ گئے ہیں تو مولوی کہتے ہیں کہ ہر سال زکوۃ نکالو تو اتنے ریال، پیسے تو کم ہو جائیں گے، دس سال کے بعد اتنے ریال پیسے ہو جائیں گے، اتنے کم ہو جائیں گے اور اگر یہی ریال اور پیسہ بینک کے اندر ڈال دو تو بعض بینک والے سات فیصد دیتے ہیں، بعض بارہ فیصد دیتے ہیں اور بعض اس سے بھی زیادہ دیتے ہیں تو تمہیں ہر سال پندرہ ہزار یا بیس ہزار ملتا رہے گا اور اصل پیسہ بھی محفوظ رہے گا۔ تو یہ "تَغْرِیْرٌ بِالدُّنْیَا" ہے۔

دوسرا وہ یہ کہتا ہے کہ پوری دنیا کا اصول ہے کہ نقد ادھار سے بہتر ہے اور یہ مولویوں والی بات تو ادھار پر ہے، جبکہ ہمارے ہاں تو نقد ہے۔ رشوت لو تو نقد پیسہ ملتا ہے، دو نمبری کرو تو نقد پیسہ ملتا ہے...... ہمارے ہاں ایک افسر تھا وہ مدعی سے بھی پیسے لیتا تھا اور مدعی علیہ سے بھی لیتا تھا۔ اس سے کسی نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ پیسے میں کسی کے پاس امانت رکھوا دیتا ہوں، تاکہ جس کے حق میں فیصلہ کروں تو اس سے لیتا ہوں اور دوسرے کو واپس کر دیتا ہوں،

تاکہ کہیں کہ امانت دار افسر ہے..... شیطان نے کہا کہ مولوی تو کہتے ہیں کہ مروگے تو حوریں ملیں گی۔ لیکن جب مرنے کے بعد ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو حوریں کہاں سے آئیں گی؟ یہ سب دھوکہ ہے، اس لیے ابھی پریوں سے فائدہ اٹھالو، یہ مولوی تو تمہیں ان حوروں سے بھی محروم کردیں گے۔ اس کو "تَغْرِيرٌ بِالدُّنْيَا" (دنیا کے ذریعہ سے دھوکہ دینا) کہتے ہیں۔

اور شیطان کہتا ہے: آخرت میں زیادہ ملے گا اس کا پتا نہیں، لیکن تم اس تھوڑے سے تو فائدہ اٹھاؤ۔ پھر تو کسان بھی کاشتکاری بند کردے، کیونکہ وہ بھی تو چھ مہینے کی امید پر بیٹھا ہوتا ہے۔ ایک آدمی باغ لگا رہا ہے، اس پر محنت کررہا ہے، پانچ سات سال کے بعد اس پر پھل آنا شروع ہوگا تو اب وہ کہے کہ یہ بے وقوفی والی بات ہے۔ تو یہ شیطان کا دھوکہ ہے۔ اگر منافع کثیر اور وہ بھی ہمیشہ رہنے والا ہو تو اس کے مقابلے میں دنیا کے تھوڑے سے نقصان کو برداشت کرلیا جاتا ہے۔

اور ایک ہے "تَغْرِيرٌ بِصِفَاتِ اللّٰهِ" کہ بندے کو شیطان دھوکہ دیتا ہے کہ دیکھو! اللہ "رَحْمٰنٌ، رَحِيْمٌ، سَتَّارُ الْعُيُوْبِ" اور "غَفَّارُ الذُّنُوْبِ" ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو دنیا کے اندر خوب کھاؤ پیو اور آخر میں توبہ کرلینا، اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے۔ تو اللہ کی صفاتِ رحمت سے بندے کو گمراہ کرتا ہے اور بندے کو اللہ کی صفاتِ جلال اور قہر کی طرف جانے ہی نہیں دیتا کہ اللہ "عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ" بھی ہیں، "سَرِيْعُ الْحِسَابِ" بھی ہیں اور قرآن کریم میں ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ﴾ [البروج: ۱۲] (بے شک تیرے رب کی پکڑ سخت ہے) بھی ہے۔ اس لیے بڑے سے بڑا ڈاکو، زانی، شرابی کیوں نہ ہو جب آپ اس سے بات کریں گے تو وہ کہے گا کہ اللہ بخشنے والا ہے، اللہ ہماری بھی سنتا ہے۔ اس کی زبان پر فوراً یہی آئے گا۔ یہ بھی شیطانی دھوکہ ہے۔

جہادِ اقدامی کے خلاف شیطان کا دھوکہ:

اسی طرح شیطان کے اور شبہات بھی ہیں، حتیٰ کہ جدید دنیا کے اندر مسلمانوں کا اچھا خاصہ پڑھا لکھا طبقہ بھی اس میں پڑا ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام میں جہادِ دفاعی تو ہے، لیکن اقدامی اور ابتدائی جہاد نہیں ہے۔ (اگر ابتدائی جہاد کو مان لیں تو یورپ والے ناراض ہو جائیں گے) کوئی اگر تم پر ظلم کرے یا تمہارے ملک پر حملہ کرے تو تم دفاع کرو، لیکن یہ نہیں کہ ابتداء کرکے کافروں سے لڑو۔ دیکھو! حضور ﷺ مدینہ گئے تو ان لوگوں کو جہاد کرنے کی اجازت ملی جن پر ظلم کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ﴾ [البقرۃ: ۱۹۱]

(اور تم ان سے مسجد حرام کے پاس اس وقت تک لڑائی نہ کرو جب تک وہ خود اس میں تم سے لڑائی شروع نہ کریں)۔

حالانکہ یاد رکھو! اسلام کے اندر ابتدائی جہاد بھی ہے۔ کافروں سے کبھی بھی نہ ڈرو، کیونکہ حق حق ہے اور باطل باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حکم دیا:

﴿قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ [التوبۃ:۲۹]

''لڑو ان لوگوں سے جو یقین نہیں رکھتے اللہ پر اور نہ پچھلے (آخرت کے) دن پر۔''

﴿قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً﴾ [التوبۃ:۱۲۳]

''[اے ایمان والو!] ان کافروں سے لڑو جو تم سے قریب ہیں۔ اور ہونا یہ چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی محسوس کریں۔''

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی صفت ہی یہی بیان کی:

﴿مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ [الفتح:۲۹]

''محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ کافروں کے مقابلے میں سخت ہیں (اور) آپس میں ایک دوسرے کے لیے رحم دل ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآن کے اندر حکم ہی یہی دیا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ﴾ [الممتحنۃ:۱]

''اے ایمان والو! میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست مت بناؤ۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا﴾ [فاطر:۶]

''یقین جانو کہ شیطان تمہارا دشمن ہے، اس لیے اس کو دشمن ہی سمجھتے رہو۔''

ان ساری آیات کا آپ انکار کرو گے؟ قرآن صحتِ بدن کا بھی محافظ ہے اور صحتِ ایمان کا بھی محافظ ہے۔ اس لیے کہتے ہیں کہ اسلام کا مادہ ''سلامتی'' ہے، ایمان کا مادہ ''امن'' ہے۔ اس لیے اسلام صحتِ ابدان، صحتِ اجسام اور صحتِ ارواح کا محافظ ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ جب حضور ﷺ نے شاہانِ عجم کو خط لکھے تو ان کے اندر ان کو خطاب فرمایا: ((أَسْلِمْ

تَسْلَمْ))[1] (اسلام لے آؤ ہر چیز سے محفوظ ہو جاؤ گے)۔
اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی مسلمان ہو جائے تو اس کی جان و مال، عزت و آبرو تم پر حرام ہیں۔
اگر کسی آدمی کو خدانخواستہ کوئی زخم ہو جائے اور وہ زخم بڑھ رہا ہو، سرطان ہو رہا ہو، کینسر ہو رہا ہو تو جو اچھا ڈاکٹر اور حکیم ہوگا وہ فوراً کہے گا کہ اس کو کاٹو کہ اس عضو کے بغیر بندہ زندہ تو رہے گا۔ اگر اس زخم کو چھوڑ دیں تو زہر پورے بدن کے اندر سرایت کر جائے گا۔ اسلام کے اندر جہاد بھی آپریشن ہے۔ یہ نہیں کہ تم میرا آپریشن کرو گے تو میں تمہارا آپریشن کروں گا۔ یہ کوئی عقل والی بات تو نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ کے حکم کو تبدیل کر دینا یہ بھی شیطان کا دھوکہ ہے۔

مرتد کے لیے شیطانی شبہ:

جیسے ایک آدمی مرتد ہو گیا، اسلام سے ہٹ گیا تو شیطان کہتا ہے: ٹھیک ہے، شخصی آزادی ہے، مذہبی آزادی ہے، یہ اس کا حق ہے۔ اور اسلام کہتا ہے: ((مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ))[2] (جو اپنا دین تبدیل کرے گا کہ اسلام سے ہٹ گیا تو اس کو قتل کر دو)۔ لہٰذا شیطان کہتا ہے کہ یہ مذہبی آزادی کے خلاف ہے۔

جواب:

اب اس کا جواب سمجھیں کہ جتنے بھی احکامات ہیں وہ دو قسم پر ہیں: ایک امورِ تشریعی ہیں اور ایک امورِ تکوینی ہیں۔
امورِ تکوینی جیسے کسی کا پیدا ہونا، مرنا اس کے اندر سب برابر ہیں۔ اللہ نے آسمان کو حکم دیا تو وہ بن گیا، اللہ تعالیٰ آسمان کو حکم دیں گے کہ پھٹ جا تو وہ پھٹ جائے گا۔ یہ سارے تکوینی امور ہیں۔
امورِ تشریعی سے مراد اوامر، نواہی، حلال اور حرام یہ ساری چیزیں ہیں۔ یہ صرف مومن کے لیے ہوتے ہیں، کافر کے لیے نہیں ہوتے۔ اب اگر کسی نے اسلام قبول کر لیا تو اب اس پر احکام لاگو ہوں گے اور اگر وہ اسلام کو چھوڑ کر نکل رہا ہے تو گویا وہ باغی ہے اور باغی کی سزا تو ہر قانون میں قتل ہے۔ اسلام نے یہ تو کبھی نہیں کہا کہ کافر مسلمان نہیں ہوتا تو اس کو قتل کر دو، کیونکہ: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ [البقرۃ: ۲۵۶] (دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے)۔
کبھی کبھی جب وہ دین کی اصل میں شبہات ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوتا تو پھر وہ دین کے لانے والے میں شبہ ڈالتا ہے کہ بات تو ٹھیک ہے، لیکن لانے والا ٹھیک نہیں۔ اس لیے مخالف لوگ انبیاء ﷺ کو مجنون اور دیوانے

[1] [الجامع البخاری، حدیث: ۷، كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلَى رَسُوْلِ اللهِ ﷺ؟]
[2] [الجامع البخاری، رقم: ۳۰۱۷، بَابٌ: لَا يُعَذَّبُ بِعَذَابِ اللهِ]

کہتے تھے۔ اسی طرح جب انبیاء علیہم کے بعد علمائے دین حق لائیں گے تو ان کے بارے میں بھی شبہ ڈالے گا کہ بات تو ٹھیک ہے، لیکن یہ وہابی ہیں، ہیں تو یہ سنی، لیکن متعصب قسم کے سنی ہیں، یہ انبیاء علیہم کے گستاخ ہیں اور یہ اولیاء اللہ کے گستاخ ہیں۔ یہ اس شیطان کے حملوں کے طریقے ہیں۔ اس لیے ہم اس سے پناہ پکڑیں۔

شیطان کو پیدا کیوں کیا؟

خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ اللہ اس بدبخت کو پیدا ہی نہ کرتا یا جب اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا تو اس کو ختم کر دیتے۔

جواب:

شیطان کا وجود بھی ضروری ہے، کیونکہ اللہ نے یہ دنیا بنائی ہے، یہ دار الامتحان ہے۔ اور امتحان تب ہوگا جب دن ہو اور رات ہو، کذب ہو اور صدق ہو۔ اگر سارے سچے ہوں تو پھر امتحان کس چیز کا؟ امتحان تو اس وقت ہوگا جب حق کا باطل سے مقابلہ ہوگا، نور کا ظلمت سے مقابلہ ہوگا۔ شیطان ہوگا تو مقابلہ ہوگا، اگر شیطان کا وجود ہی نہ ہو تو پھر مقابلہ کس بات کا؟ مثال کے طور پر: ایک آدمی ہے اس کو اللہ نے قوتِ مردی سے محروم رکھا ہے۔ اب اگر وہ دعویٰ کرے کہ ساری رات خوبصورت عورت میرے کمرے میں رہی اور ہم اکیلے تھے، لیکن مجال ہے کہ میں نے اس کو چھیڑا ہو۔ تو یہ بہادری تو نہ ہوئی، ثواب تو تب ہے کہ قوت ہے، لیکن پھر بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔

اصول ہے کہ دشمن جتنا قوی ہوگا آدمی اتنی زیادہ محنت کرے گا۔ بعض ملک ہیں ان کی بڑے ملک سے ٹکر ہے۔ اس نے دیکھا کہ دشمن مضبوط ہے، اس کے مقابلے کی تیاری کرے گا اور اگر چھوٹا سا ملک ہے تو پھر تیاری نہیں کرے گا کہ اس کو تو ایک پھونک ماریں تو ختم ہو جائے گا، اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ اس لیے دشمن کا ہونا قوت کا ذریعہ ہے۔ شیطان ہے تو مومن مقابلہ کرے گا کہ میرا دشمن بڑا قوی ہے، ہر وقت اس کے مقابلہ کی تیاری کروں اور اللہ کی پناہ پکڑوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مجھ پر غالب آجائے۔

ایک لطیفہ، ایک حکایت:

بعض علماء نے کہا کہ بعض اوقات ایک چیز کو انفرادی طور پر دیکھا جائے تو وہ شر ہوتی ہے، لیکن اجتماعی طور پر دیکھا جائے تو وہ خیر ہوتی ہے۔ مثلاً: کسی محبوب کے چہرے پر تل کا سیاہ نشان ہو تو بڑا خوبصورت لگتا ہے، لیکن اگر

اس کو علیحدہ کر کے دیکھو تو وہ ایک داغ ہے اور جب داغ کو پورے بدن کے سامنے رکھ کر دیکھا گیا تو اس پر شاعر نے بخارا اور سمرقند بھی قربان کر دیا۔ شاعر عامر نے کہہ دیا تھا کہ میں اپنے محبوب کے تل کے بدلے سمرقند اور بخارا کو بھی قربان کر دوں۔ تیمور لنگ نے اس شاعر کو بلوایا کہ ان شہروں کو بناتے صدیاں گزر گئی ہیں اور تم نے ان شہروں کو اپنے محبوب کے تل کے بدلے قربان بھی کر دیا ہے؟ شاعر نے کہا کہ جناب! اسی لیے تو بھوکے پھر رہے ہیں، روٹیوں کے محتاج ہیں۔ کیونکہ اتنے بڑے بڑے ملک قربان کر دیتے ہیں۔ تو بادشاہ نے ہنس کر ٹال دیا۔ تو وہ عتاب سے بچ گیا۔

ایک مثال:

جیسے مالی کے پاس بڑی سی قینچی ہوتی ہے جس سے وہ شاخ کو کاٹتا ہے، ادھر سے ادھر کاٹتا ہے۔ کوئی دیکھے گا تو کہے گا کہ بے وقوف آدمی ہے کہ اس نے محنت کی، باغ لگایا اور جب شاخیں تیار ہو گئیں، یہ بڑی قینچی کو لے کر آیا اور کاٹنا شروع کر دیا۔ ہماری نظر اس بڑے پودے پر ہوتی ہے، لیکن مالی کی نظر باغ پر ہوتی ہے، ہماری نظر موجودہ زمانے پر ہوگی، لیکن مالی کی نظر آنے والے زمانہ پر بھی ہوگی کہ اگر میں نہیں کاٹوں گا تو پودا خراب ہوگا، اگر کاٹوں گا تو شاخیں بڑھیں گی۔ تو جس کی نظر پوری چیز پر ہوتی ہے تو وہ خیر کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اور اگر انفرادی ضرورت ہو تو وہ چیز شر بن جاتی ہے۔

شیطان کے وجود پر اعتراض:

بڑے بڑے اسکالرز یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن شروع تو "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" سے ہوا، یہ بتاؤ کہ شیطان ہے کہاں؟ اس کے وجود کی دلیل کیا ہے؟ ہمیں تو شیطان کہیں نہیں ملا، ہمیں تو نظر ہی نہیں آیا، ہم نے زمین کا چپہ چپہ ڈھونڈ ڈالا ہے، ہم نے ستاروں پر کمندیں ڈال دی ہیں، ہم چاند پر پہنچ گئے، مریخ پر پڑتول رہے ہیں، ہم نے زمین کے گرد چکر لگا لیے ہیں، ہمارے پاس اتنے وسائل ہیں، ہم اس ملک پر سیٹلائٹ کھڑی کر کے اس کے ایک ایک گھر کی سوئی تک دیکھ لیتے ہیں، لیکن ہمیں شیطان نہیں ملا تو دلیل کیا ہے کہ شیطان کا وجود ہے؟

جوابات:

اللہ نے فرمایا کہ شیطان جن ہے۔ اور جنوں کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

﴿اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾ [الاعراف:۲۷]

''وہ اور اس کا جتھہ تمہیں وہاں سے دیکھتا ہے جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔''

اللہ کے قرآن میں یہ بات ہے کہ جن ہیں، شیطان ہیں، لیکن ہم نہیں دیکھ سکتے۔ ملائکہ ہیں، اگر وہ اپنی شکل میں ہوں تو ہم نہیں دیکھ سکتے، انسان کی شکل میں ہوں تو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ جن کبھی بلی بن جاتے ہیں، کبھی بکری بن جاتے ہیں تو ہم دیکھ سکتے ہیں، لیکن جب اپنی اصل شکل میں ہوں تو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارے علماء کے پاس کتنے جن پڑھتے تھے۔ طلباء کے ساتھ بھی رہے اور کسی طالب علم کو پتا بھی نہیں چلا کہ یہ جن ہے، حالانکہ اکٹھے کھا رہا ہے، پی رہا ہے، سو رہا ہے، کھیل رہا ہے اور طلباء کو پتا ہی نہیں کہ یہ جن ہے۔ جب کبھی یہ بات ظاہر ہوئی تو پتا چلا کہ یہ جن تھا۔

اس لیے یاد رکھیں! ہمارا ایمان قرآن پر اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان پر ہے۔ حضور ﷺ جنوں کے پاس تشریف لے گئے اور حضور ﷺ نے جنوں کو خطاب فرمایا، جن مسلمان ہوئے اور جنوں نے قرآن سنا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ﴾ [الجن:۱، ۲] (اے پیغمبر!) کہہ دو: میرے پاس وحی آئی ہے کہ جنات کی ایک جماعت نے (قرآن) غور سے سنا، اور (اپنی قوم سے جا کر) کہا: ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے! جو راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اس لیے ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں)۔ باقاعدہ قرآن کے اندر ایک سورت کا نام بھی ''سورۃ الجن'' رکھا۔

ہمارا ایمان ہے کہ اگر ایک آدمی کا نفس زکیہ ہے، یعنی متقی اور پرہیزگار ہے، وہ اکیلے کمرے کے اندر بیٹھا ہے، اس کے دل کے اندر گناہ کا خیال آرہا ہے۔ یہ گناہ یا تو اس کا نفس اس کے دل میں ڈالے، لیکن اس کا نفس زکیہ ہے، کیونکہ نفس امارہ تو ہے نہیں، یا پھر کوئی دوسرا بندہ خیال ڈالے، حالانکہ وہاں تو وہ اکیلا ہے۔ اب مطلب یہ ہے کہ کوئی تیسری چیز ہے جو غیر محسوس ہے اور وسوسہ ڈال رہی ہے تو وہ غیر محسوس چیز شیطان ہی تو ہے۔

شیطان دکھانے کا لطیفہ:

بعض دفعہ بڑی عمر کے اندر بندے کا دماغ ہل جاتا ہے۔ تو ایک بڑی عمر کے آدمی تھے، وہ شیطان کے منکر ہو گئے تھے کہ شیطان کا وجود ہی نہیں ہے۔ ایک طالب علم کچھ شرارتی تھا۔ وہ ایک شیشہ لے آیا تو جب اس نے کہا کہ مجھے دکھاؤ شیطان کہاں ہے؟ تو طالب علم نے شیشہ سامنے کر دیا کہ دیکھ لو۔ وہ ہوشیار تھا، اس نے کہا کہ میں اس

شیطان کا نہیں کہہ رہا، بلکہ مجھے آدم علیہ السلام کے وقت والا شیطان دکھاؤ، یہ تو چودھویں صدی کا شیطان ہے۔ تو طالب علم بھی ہوشیار تھا، اس نے کہا کہ آپ نسل دیکھتے جائیں، ہو سکتا ہے کہ نسل وہاں تک جا ملے۔

ضروری نہیں ہوتا کہ جو چیز ہمیں نظر نہ آئے ہم اس کا انکار کر دیں۔ ہمیں تو روح بھی نظر نہیں آتی، ہمیں تو گلاب کی خوشبو بھی نظر نہیں آتی تو کیا اس کا انکار کر دیں گے؟ کہ ہمیں نظر ہی نہیں آتی تو اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ آپ ڈاکٹر حضرات ہیں، بہت ساری چیزیں آنکھوں سے نظر نہیں آتیں، لیکن جب مائیکروسکوپ یعنی خورد بین کے نیچے لاتے ہیں تو وہ نظر آ جاتی ہیں۔ اگر وہ آلات نہ ہوں تو وہ چیزیں نظر نہیں آتیں۔ اس لیے اللہ نے ہمیں پہلے بتلا دیا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے جو غیر محسوس ہے اور نظر بھی نہیں آتا۔

''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ'' سے شیطان کے بھاگنے کی وجہ:

''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ'' میں آخر ایسی کیا تاثیر ہے کہ یہ پڑھیں تو شیطان بھاگ جاتا ہے، اتنا بڑا دشمن صرف اس سے بھاگ جاتا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟

''تَعَوُّذ'' (اَعُوْذُ بِاللّٰہِ) کا خاصہ ہی یہی ہے کہ شیطان بھاگ جائے۔ اس کی مثال سمجھیں! ملیریا کب ہوتا ہے؟ جب موسم خزاں ہو، موسم بہار میں ملیریا نہیں ہوگا۔ اور جب موسم خزاں ہو تو گرمی ہوگی اور دوا بھی وہ دے رہے ہیں جس میں خشکی ہے۔ اس لیے علماء نے فرمایا: ''تَعَوُّذ'' (اَعُوْذُ بِاللّٰہِ) کا خاصہ ہی یہی ہے کہ شیطان بھاگ جاتا ہے۔ یوں سمجھیں! دو بچے لڑ رہے ہیں: ایک کی عمر آٹھ سال اور ایک کی عمر پندرہ سال ہے۔ پندرہ سال والا آٹھ سال والے کو مار رہا ہے، کیونکہ وہ بڑا ہے۔ اب چھوٹا چیختا ہے اور اس کا باپ بھاگ کر آتا ہے تو بڑا لڑکا بھاگ جاتا ہے، کیونکہ اس کو پتا ہے کہ اب یہ مجھے مارے گا، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ بھاگ جاؤں۔ اور میں نے جو مارنا تھا مار لیا، یہی بہت ہے۔ اسی طرح جو آدمی ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ'' پڑھتا ہے تو وہ دعا کر رہا ہے کہ ہم قوی (اللہ) کی پناہ میں آ جائیں اور اللہ کی ذات تو شیطان سے بھی قوی ہے، تو شیطان بھاگتا ہے، کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ یہ بندہ اللہ کی پناہ میں آ گیا ہے۔ اور اللہ کا قاعدہ ہے: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ [البقرۃ: ۱۵۲] (تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا)۔

ایک آدمی حج پر جا رہا ہو، تم اس سے کہو کہ حاجی صاحب! ہمیں بھی یاد رکھنا۔ تو کیا مطلب کہ تسبیح لے کر تمہارا نام لینا شروع کر دے؟ نہیں، بلکہ معنی یہ ہوتا ہے کہ ہمارے لیے کعبہ میں دعا کرنا، مدینہ شریف میں دعا کرنا۔ تو اللہ کے یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میں تجھے نفع دوں گا۔ تو جب آدمی ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ'' پڑھتا ہے تو یہ بھی یاد کرتا ہے۔ اب اللہ

تعالیٰ ہمیں کیا فائدہ پہنچاتے ہیں؟ ہمیں دشمن کے شر سے بچا لیتے ہیں۔

علماء نے کہا کہ عقل کا بھی یہی قاعدہ ہے کہ جب دشمن قوی ہو تو پناہ بھی قوی کی ہو، تب بچ سکیں گے، وگرنہ نہیں بچ سکیں گے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ شیطان ہمیں نظر نہیں آتا، غیر محسوس ہے، اس لیے شیطان بڑا خطرناک ہے۔ اب ہم اس کی پناہ میں چلے جائیں جس کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ یعنی جب ہم اللہ کی پناہ میں چلے گئے تو اللہ کو تو جن بھی نہیں دیکھ سکتے اور وہ سب کو دیکھ سکتا ہے۔ اس لیے جب ہم "أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" پڑھیں گے تو اس "تَعَوُّذ" کا خاصہ یہ ہے کہ ہم اللہ کی پناہ میں آجائیں گے، اللہ کی حفاظت میں آجائیں گے۔ اور اس کلمہ کا اثر یہ ہوگا کہ شیطان دور ہو جائے گا۔

سابقہ مضامین کا تعلق "تَعَوُّذ" سے تھا اور اس کے اندر علماء کے جو اقوال، توجیہات اور حِکم تھیں وہ...... اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ!...... ہم نے پڑھی ہیں۔ اور اب ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کے متعلق کچھ بیان کریں گے۔ کیونکہ آپ جب بھی قرآن کی تلاوت کریں گے تو سب سے پہلے تعوذ ہوگا، اس کے بعد تسمیہ یعنی ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ہوگا۔ اسی طرح نماز کی ہر رکعت میں آپ سورۂ فاتحہ سے پہلے تسمیہ پڑھیں گے۔

"بِسْمِ اللّٰهِ" تمام علوم کا خلاصہ ہے:

سب سے پہلے تو یہ سمجھیں کہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ قرآن کی مختصر آیت ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ اللہ نے تمام علوم کا دریا قرآن کو بنایا ہے تو قرآن پاک علوم اولین و آخرین کا مجموعہ ہے۔ اولین و آخرین سے مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے اور بعد میں جتنی کتابیں آئی ہیں، جو اللہ نے علوم اتارے ہیں ان سب علوم کا جامع اللہ کا قرآن ہے۔ یوں سمجھیں کہ موتی تو ہر کتاب کے اندر تھے، لیکن ان سب موتیوں کو قرآن میں پرو دیا گیا ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ تمام اولین و آخرین کے علوم کا جامع قرآن ہے اور پورے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ ہے۔ اسی لیے سورۂ فاتحہ کی شان ہے کہ وہ ہر نماز میں اور ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔ اور اسی سورۂ فاتحہ کو اللہ نے ﴿سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ﴾ (بار بار پڑھی جانے والی سات آیات) اور ﴿وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ﴾ [الحجر: ۸۷] فرمایا۔ تو سارے علومِ دینیہ کا خلاصہ قرآن میں ہے، قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں ہے اور سورۂ فاتحہ کا خلاصہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ میں ہے۔

[نزہۃ المجالس و منتخب النفائس: ۱/ ۱۲۰]

"بِسْمِ اللّٰہِ" کا خلاصہ "ب" میں:

بعض علماء تو اپنے ذوق کے مطابق ترقی کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ساری "بِسْمِ اللّٰہِ" کا خلاصہ صرف "ب" میں ہے۔ اور بعض علماء نے اور زیادہ ترقی کی، ان کا اپنا ذوق اور اپنے خیالات ہیں، کوئی شریعت کا حکم نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس "ب" کا خلاصہ اس نقطہ میں ہے جو "ب" کے نیچے ہے۔ [نزہۃ المجالس ومنتخب النفائس: ۱/ ۱۲۰]

"ب" کا مطلب:

"ب" کا ایک معنی تو یہ ہے کہ "ب" "اِسْتِعَانَتْ" کے لیے ہوتی ہے، لیکن یہاں اصل یہ ہے کہ "اِلْصَاق" کے لیے ہے۔ یعنی ایک بندے کا اللہ سے تعلق جڑ جائے۔ اسی لیے تو قرآن آیا ہے، اسی لیے تو انبیاء علیہم السلام آئے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام ہمیں کوئی فیکٹریاں لگانے کا طریقہ بتانے کے لیے یا زراعت سکھانے کے لیے تو نہیں آئے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ [الذاریات: ۵۶] (اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں)۔ اور اس عبادت کا طریقہ کون بتائے گا؟ انبیاء علیہم السلام اور اللہ کی کتابیں۔ اور عبادت کا مقصد یہ ہے کہ عبد اور معبود کے درمیان ایک تعلق ہو جائے، کیونکہ جب وہ تعلق ہو گیا تو سب کچھ آ گیا۔ لہٰذا ساری ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کا خلاصہ "ب" میں آ گیا۔

"ب" کے نقطے کا مطلب:

اور نقطے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک ایسی چیز ہے جو تفرد یعنی ایک ہونے پر دلالت کر رہی ہے۔ تو نقطہ دلالت کر رہا ہے کہ اللہ کی ذات "وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ" ہے۔

نقطہ بڑھانے یا گھٹانے سے فرق:

خدا کی قدرت کہ اس نقطہ کے بارے میں، اس صفر کے بارے میں علماء نے اپنے ذوق کے مطابق بڑی عجیب بات لکھی ہے کہ یہ جو نقطہ ہے، صفر ہے۔ اگر اس کے ساتھ (بائیں طرف) ایک لگا دیں تو یہ دس بن جائے گا۔ آگے صفریں بڑھاتے جائیں تو سو بن جائے گا، ہزار بن جائے گا اور اسی طرح بڑھتا جائے گا، لیکن اگر یہی بہت سی صفریں ایک کے ادھر (بائیں طرف) لگا دیں تو کچھ بھی نہیں بنے گا۔

سنت کی اہمیت، بدعت کی مذمت:

اسی لیے فرمایا کہ اگر ہمارے اعمال قرآن وسنت کے مطابق ہیں تو بڑھتے جائیں گے اور اگر قرآن وسنت کے خلاف ہیں تو گویا کہ وہ پہلی صفریں ہیں جن کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ لہٰذا بدعات کے اندر عمل جتنا ہی مزین کیوں نہ ہو، خوبصورت کیوں نہ ہو، لیکن قرآن وحدیث سے، اجماع سے اور خیر القرون سے ثابت نہیں ہے تو وہ بدعت ہے اور بدعت مردود ہے۔

اس لیے علماء نے فرمایا کہ ﴿بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ ایک چھوٹی سی آیت ہے، لیکن اس کی بڑی عظمت اور شان ہے۔

"بِسْمِ اللّٰہِ" میں اللہ کے تین نام:

"بِسْمِ اللّٰہِ" میں اللہ کے تین نام ہیں: ایک "اَللّٰہُ"، ایک "اَلرَّحْمٰنُ" اور ایک "اَلرَّحِیْمُ" ہے۔

"بِسْمِ اللّٰہِ" کے متعلق نحوی بحث:

علماء قواعد کے نزدیک "بِسْمِ اللّٰہِ" میں "ب" حرف جار ہے اور یہ جار مجرور کس کے متعلق ہیں؟ اس کے بارے میں لمبی تقریریں ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ فعل مقدر "أَقْرَأُ" اور "أَشْرَعُ" کے متعلق ہیں۔ اور فعل بھی موخر ہے، مقدم نہیں ہے۔ "بِسْمِ اللّٰہِ أَقْرَأُ"، "بِسْمِ اللّٰہِ أَشْرَعُ"۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۸ات فَصْلٌ: فِيْ فَضْلِهَا (اَلْبَسْمَلَة)]

ہر کام کے شروع میں "بِسْمِ اللّٰہِ" پڑھیں:

ایک روایت مبارکہ ہے (بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے اندر ایک راوی ضعیف ہے، لیکن اس کے متابعات موجود ہیں اور جب کسی روایت کے متابعات موجود ہوں تو وہ روایت حسن کے درجہ میں پہنچ جاتی ہے۔) کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ أَمْرٍ ذِيْ بَالٍ لَا يُبْدَأُ فِيْهِ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ أَقْطَعُ)) [الجامع الصغیر، حدیث: ۶۲۸۴]

"ہر وہ کام جو شان والا ہو، اس کو "بِسْمِ اللّٰہِ" سے شروع نہ کیا جائے تو وہ بے برکت ہوتا ہے۔"

اسی لیے ہمیں ہر چیز میں حکم ہے کہ ہم اس کو "بِسْمِ اللّٰہِ" سے شروع کریں۔ اس لیے علماء فرماتے ہیں: "بِسْمِ اللّٰہِ

أَشْرَعُ" یعنی کھانا شروع کرتا ہوں، لکھنا شروع کرتا ہوں، پینا شروع کرتا ہوں، حتیٰ کہ جب اللہ کے گھر میں داخل ہوں تو پڑھیں:

((بِسْمِ اللهِ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِ اللهِ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي ذُنُوبِي وَافْتَحْ لِي أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ))

[سنن ابن ماجہ، حدیث: ۷۷۱، بابُ الدُّعَاءِ عِنْدَ دُخُولِ الْمَسْجِدِ]

اسی طرح جب مسجد سے نکلیں تو یہ پڑھیں:

((بِسْمِ اللهِ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِ اللهِ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي ذُنُوبِي، وَافْتَحْ لِي أَبْوَابَ فَضْلِكَ))

[سنن ابن ماجہ، حدیث: ۷۷۱، بابُ الدُّعَاءِ عِنْدَ دُخُولِ الْمَسْجِدِ]

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو بہت بڑی عظمتوں سے نوازا ہے۔

مخلوق میں اسم مؤثر نہیں، ذات مؤثر ہے:

دوسرا لفظ "اِسْم" ہے۔ یہ مفرد ہے۔ اس کی جمع "أَسْمَاءُ" ہے۔ یاد رکھیں! خالق اور مخلوق میں، عابد اور معبود میں کتنا بڑا فرق ہے کہ مخلوق میں صرف نام مؤثر نہیں ہوتا۔ اگر ایک آدمی کو صدر یا وزیر اعظم سے کام پڑ جائے اور وہ ایک تسبیح لے کر اس کا نام لینا شروع کر دے: صدر صاحب! صدر صاحب! صدر صاحب! تو کام بن جائے گا؟ نہیں۔ کیونکہ مخلوق میں اسم مؤثر نہیں ہوتا، ذات مؤثر ہوتی ہے۔ اس کے پاس جائیں تو کچھ کام کر دے گا، ورنہ نہیں ہوگا۔

اللہ کی ذات میں اسم مؤثر ہے:

یہ اللہ کی شان ہے کہ اسم ہی مؤثر ہے۔ یعنی ذات تک تو ہماری رسائی ہی نہیں، ہم اس کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ﴾ [الانعام: ۱۰۳] (نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں)۔

دیکھیں! جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی: ﴿رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرْ إِلَيْكَ﴾ (میرے پروردگار! مجھے دیدار کرا دیجیے کہ میں آپ کو دیکھ لوں۔ اے اللہ! جیسے مجھے کلام سے نوازا ہے، اسی طرح مجھے دیدار سے بھی نواز دیں۔ ﴿قَالَ لَنْ تَرَانِي﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے۔ ﴿وَلَكِنِ انْظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي﴾ البتہ پہاڑ کی طرف نظر اٹھاؤ، اس کے بعد اگر وہ اپنی جگہ برقرار رہا تو تم مجھے دیکھ لو گے۔ ﴿فَلَمَّا تَجَلَّى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَى صَعِقًا﴾ [الاعراف: ۱۴۳] (پھر جب ان کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اس کو

ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے)۔ اس لیے اللہ کی شان ہے کہ وہاں اسم ہی مؤثر ہے۔

دلیل:

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ [الاعراف:۱۸۰] اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں، سو ان ناموں سے اللہ ہی کو پکارا کرو، کیونکہ ذات تک رسائی مشکل ہے۔

اللہ کے ناموں کی تعداد:

اس لیے حدیث مبارکہ میں آتا ہے:

((إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ اسْمًا مِائَةً إِلَّا وَاحِدًا، مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ))

''اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں، یعنی ایک کم سو، جو شخص ان کو یاد کرے وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

[صحیح البخاری، حدیث:۷۳۹۲، باب: إِنَّ لِلّٰهِ مِائَةَ اسْمٍ إِلَّا وَاحِدًا]

اور ایک روایت میں ہے:

((مَنْ حَفِظَهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ)) [صحیح مسلم، حدیث:۶۷۷۲، بَابٌ فِي أَسْمَاءِ اللّٰهِ تَعَالٰى...]

تو اللہ کے ننانوے نام صحیح احادیث مبارکہ میں ہیں۔ علماء نے اللہ کے ناموں پر کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً: ''اَلْاَسْنٰى فِي الْاَسْمَاءِ الْحُسْنٰى'' بعض نے ایک ہزار نام لکھے ہیں اور بعض نے تین ہزار نام لکھے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے کمالات کی کوئی حد نہیں:

اور بعض نے کہا کہ جیسے اللہ تعالیٰ کے کلمات ہیں جن کی کوئی حد نہیں، اسی طرح اللہ کے کمالات کی بھی کوئی حد نہیں اور اسماء کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾

[الکہف:۱۰۹]

''(اے پیغمبر (ﷺ)! لوگوں سے) کہہ دو: اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے سمندر روشنائی بن جائے تو میرے رب کی باتیں ختم نہیں ہوں گی کہ اس سے پہلے سمندر خشک ہو چکا ہوگا۔ چاہے اس سمندر کی کمی پوری کرنے کے لیے ہم ویسا ہی ایک اور سمندر کیوں نہ لے آئیں۔''

لہٰذا جیسے کمالاتِ ربی کی کوئی حد نہیں، اسی طرح اسماءِ ربی کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ صحیح احادیث کے اندر ہمیں صرف ننانوے نام ملے ہیں۔

اسمائے حسنیٰ میں شعبوں کی تقسیم:

بعض علماء نے ایک اور بات لکھی ہے۔ (یہ مسئلہ نہیں، یہ ذوق اور سمجھانے کے لیے ہے۔ انہوں نے کہا:) جیسے دنیا کے اندر مختلف محکمے ہوتے ہیں اور ان کے نام ہوتے ہیں، اسی طرح کائنات کے نظام کو چلانے کے لیے جتنے دوائر ہیں ان کے نام اسماء میں ہیں۔ مثلاً:

''رَزَّاقٌ'' رزق سے ہے تو رزق کا معاملہ اسی کے ذمے ہے۔ تو گویا! جتنے رزق کے مسائل ہیں وہ اسم ''رَزَّاقٌ'' کے تابع ہیں۔ اور فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾ [الذاریات:٥٨] (اللہ خود ہی سب کو رزق پہنچانے والا، نہایت قوت والا ہے)۔

اور پھر ان اسماء کے احکامات کے مطابق اللہ نے ملائکہ کی ڈیوٹیاں رکھی ہیں۔ فرمایا: ﴿فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا﴾ [النازعات:٥] (پھر جو حکم ملتا ہے اس (کو پورا کرنے) کا انتظام کرتے ہیں)۔

اسی طرح دیکھیں! جتنے رحمت کے شعبے ہیں وہ ''اَلرَّحْمٰنُ'' اور ''اَلرَّحِيْمُ'' کے تابع ہیں، مجرمین کو سزا دینے کا شعبہ ہے تو وہ ''اَلْمُنْتَقِمُ''، ''اَلْجَبَّارُ''، ''اَلْقَهَّارُ'' اور ''اَلْعَزِيْزُ'' کے تابع ہے۔

اس لیے علماء نے فرمایا کہ اللہ نے اپنے اسماء کے اندر تاثیر رکھی ہے۔

حلِ مشکلات کا طریقہ:

بعض علماء کہتے ہیں کہ بندے کو جس قسم کی مشکل ہو اسی جیسے اسم سے مانگنا شروع کر دے تو اللہ اس کا مسئلہ حل کر دیں گے۔ مثلاً:

- ...اگر رزق کی تنگی ہے تو ''یا رَزَّاقُ، یا رَزَّاقُ!'' پڑھے۔
- ...اور اگر گھر کے اندر جھگڑے ہیں، نا چاقیاں ہیں تو لطف و کرم ''یا لطیفُ!'' کے اندر ہے۔ تو ''یا لطیفُ، یا لطیفُ!'' پڑھے۔
- ...میاں بیوی میں جھگڑا ہو گیا، محبت نہیں رہی یا ایک کو نفرت ہے تو ''یا وَدُوْدُ، یا وَدُوْدُ!'' پڑھ کر دعا مانگے تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔

اس لیے اللہ کے اسماء کے اندر بھی ایک تاثیر ہے۔ ﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ [الاعراف: ۱۸۰] اس لیے ہمیں حکم دیا گیا کہ کبھی دعا مانگنی ہو تو اسماء اللہ کے ذریعے سے مانگو۔

اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ اللہ نے "تَوَسُّل بِالْاَسْمَاءِ" کا حکم دیا تھا، "تَوَسُّل بِالْاَمْوَاتِ" کا حکم تو نہیں دیا تھا۔ اس لیے توسل یا تو اعمال صالحہ سے ہوگا جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔

"تَوَسُّل بِالْاَعْمَالِ" کی دلیل:

تین آدمی تھے، بارش شدید آگئی، آندھی طوفان چل پڑا، وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے ایک غار کے اندر گھس گئے۔ خدا کی شان کہ ہوا اتنی تیز چل رہی تھی کہ پتھر گرا اور غار کا دروازہ بند ہو گیا۔ اب انہوں نے کہا کہ عجیب بات ہے کہ ہم تو جان بچانے کے لیے بھاگے تھے کہ طوفان سے اور بارش سے بچ جائیں، اب اور مسئلہ آ گیا کہ اتنی بڑی چٹان آگئی کہ ہم سب مل کر بھی اس کو نہیں ہٹا سکتے، ہم تو ایسے ہی مر جائیں گے۔ کب تک آدمی بغیر خوراک اور پانی کے زندہ رہے گا؟ جب بہت زیادہ پریشان ہوئے تو کہنے لگے کہ اور تو کوئی حل نہیں ہے، ایک ہی حل ہے کہ اللہ ہمیں اپنی قدرت کے ساتھ اس قید خانہ سے نکال دے۔ ایسا کرو کہ اگر زندگی کے اندر کوئی اچھا عمل کیا ہے تو اس کو یاد کرو اور ہر آدمی اپنے اس عمل صالح کے ذریعے دعا مانگے۔

ان میں سے ایک آدمی نے کہا: یا اللہ! میرے دل کی کیفیات تو جانتا ہے، احوال بھی تیرے سامنے ہیں کہ میری زندگی میں ایک لڑکی تھی جس سے مجھے محبت تھی، عشق تھا، میں اس پر اس قدر فدا ہو چکا تھا کہ میرا اس کے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہو گیا، میں اس کو حاصل کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ لڑکی بالکل میرے قریب نہیں آتی تھی، میں جتنے حیلے آزما سکتا تھا آزمائے، لیکن لڑکی نے بالکل توجہ نہیں کی۔ (بعض لڑکیاں باحیاء ہوتی ہیں) کچھ عرصہ گزرنے کے بعد میں مایوس ہو گیا، لیکن اس کی محبت میرے دل سے نہیں نکلی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ میری ساری جائیداد لگ جائے، لیکن لڑکی کو حاصل کرلوں۔

کیونکہ عشق عشق ہے۔ عشق کے اندر تو عقل کا کام نہیں ہوتا۔ اسی لیے بعض لوگ کہتے ہیں عشق کے اندر تین لفظ ہیں "عین"، "شین"، "قاف"۔ انہوں نے کہا جب عشق ہوتا ہے تو "عین" سے عقل ختم ہو جاتی ہے، "شین" سے شرم ختم ہو جاتی ہے اور "قاف" سے قرار ختم ہو جاتا ہے۔ جو ایسا ہو تو سمجھو کہ عاشق ہے۔ چودھویں صدی کا عاشق نہ ہو۔ چودھویں صدی کے عاشق کو دو دن تھانے کے اندر بند کر دو تو عشق بھول جاتا ہے۔ ان کے پاس عشق نکالنے کے آلات ہوتے ہیں۔

یہ تو سچے عشق کی بات ہے، جو کیا نہیں جاتا، بلکہ ہو جاتا ہے۔

تو اس آدمی نے کہا کہ میں ایک دن بیٹھا ہوا تھا کہ وہی لڑکی جس کے لیے میں سرگردان تھا میرے پاس آ گئی اور مجھے کہا: بات سنو! تم جانتے ہو نا! کہ تم نے مجھے حاصل کرنے کے لیے کتنے پاپڑ بیلے ہیں، لیکن میں نے انکار کیا، اب میں اتنی مجبور ہوں کہ میری ماں بستر پر مر رہی ہے، مجھے اتنے پیسوں کی ضرورت ہے، اتنے پیسے مجھے دے دے اور تیری جو تمنا ہے اس کو پورا کرنے کے لیے میں تیار ہوں، میں مجبور ہوں۔ میرے تو دل کی مراد بر آئی۔ میں نے اس کو پیسے دیے تو اس نے کہا کہ ابھی تو میری ماں بستر مرگ پر ہے، لیکن میرا وعدہ ہے کہ میں تیرے پاس آؤں گی۔ میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ پیسے لے کر چلی گئی اور اپنی ماں کا علاج کیا۔ اس کی ماں بچ گئی۔

کئی دنوں کے بعد تنہائی کے وقت وہ آ گئی اور کہا کہ دیکھو! میں نے وعدہ جو کیا تھا، لہٰذا میں آ گئی ہوں۔ بہر حال اب میں آپ کے حوالے ہوں، اب جو آپ چاہیں مجھ سے فائدہ اٹھائیں۔ میں جب اس کو کمرے میں لے گیا اور اس کے لیے بڑا انتظام کیا تھا۔ جب میں نے اس کو بستر پر بٹھایا تو وہ رونے لگی، میں نے کہا: روتی کیوں ہو؟ میں نے کوئی زبردستی تھوڑی کی ہے؟ پکڑ کر تو نہیں لایا؟ تم نے خود مجھ سے سودا کیا ہے۔ اس نے کہا: بات تو ٹھیک ہے، لیکن میں اس پر رو رہی ہوں کہ اللہ کو شاید یہی منظور تھا کہ عصمت تار تار ہوتی تھی۔ بجائے اس کے کہ کسی کا میرے ساتھ نکاح ہوتا اور حلال طریقے سے میں اس کے سپرد ہوتی تو میرے دل میں اللہ کا خوف آ گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ اٹھو! اس نے کہا: کیا بات ہے؟ میں نے کہا: جو کچھ میں نے تمہیں دیا تھا وہ بھی میں نے تجھے اللہ کے لیے معاف کیا اور مزید پیسے بھی لے جاؤ۔ آج کے بعد میں تم پر کبھی بری نظر بھی نہیں ڈالوں گا۔ یا اللہ! اگر واقعی! تیرے ڈر سے میں نے اپنے آپ کو گناہ سے بچایا تھا اور یہ عمل تیری رضا کے لیے کیا تھا تو یہ غار کھل جائے۔ تو تھوڑا سا غار کھل گیا، لیکن اتنا کھلا کہ نکل نہیں سکتے تھے۔

اب دوسرے بندے نے کہا: یا اللہ! تو جانتا ہے کہ میں روزانہ شام کو جب مال مویشی لے کر گھر آتا تھا تو ان کا دودھ نکالتا تھا، پھر دودھ کو صاف کرتا تھا، پھر اس دودھ کو گرم کرتا تھا اور جب تک والد اور والدہ کو دودھ نہ پلاتا تب تک نہ بچوں کو دیتا اور نہ خود پیتا تھا...... سب سے پہلے والدین کا حق ہے جنہوں نے ہمیں پالا ہے، پوسا ہے، پلایا ہے، بچپن سے بچے کی دیکھ بھال کرتے ہیں، جب وہ غوں غاں کرتا ہے تب سے اس کی ہر فرمائش پوری کرتے ہیں۔ علماء نے عجیب بات لکھی ہے کہ انسان کہتا ہے کہ میں سب سے اچھا ہوں، لیکن اولاد کے بارے میں یہ تمنا ہوتی ہے کہ مجھ سے بھی

اچھی بنے اور نام کمائے۔ وگرنہ کسی دوسرے کے لیے آدمی نہیں چاہتا کہ مجھ سے اچھا بنے، اولاد کے مقابلے میں انسان اپنے آپ کو بھی مٹا دیتا ہے کہ وہ ترقی کرے...... اس دوسرے آدمی نے کہا کہ رضائے والدین کے لیے میں اپنے بچوں کو بھی اس وقت تک دودھ نہیں دیتا تھا جب تک کہ والدین نہ پی لیتے۔ تو ان کا بڑھاپا تھا، میں ان کو ایک ایک دودھ کا گلاس دے کر سلا دیتا تھا۔ ایک دن میں دیر سے آیا تو دونوں سوئے ہوئے تھے تو میں کھڑا ہو گیا کہ ان کو دودھ پلا دوں گا، پھر دوسرے کام کروں گا، لیکن کھڑے کھڑے ساری رات گزر گئی۔ صبح کو اذانوں کے وقت آنکھ کھلی تو میں نے ان کو دودھ پلایا۔ یا اللہ! اگر اس عمل میں تیری رضا تھی تو ہم سے اس مصیبت کو ختم کر دے۔ تو چٹان تھوڑی سی ہٹ گئی، لیکن ابھی اس سے نکل نہیں سکتے تھے۔

تیسرے آدمی نے کہا کہ میں نے اپنے پاس ایک آدمی کو مزدور رکھا تو اس نے اس وقت مزدوری نہیں لی۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس کے پانچ چھ ماہ کے پیسے میرے پاس جمع ہو گئے، لیکن وہ اللہ کا بندہ غائب ہو گیا۔ اب میں مزدوری کس کو دوں؟ تو میرے مولیٰ! تو جانتا ہے کہ میں نے اس کے پیسے سے کچھ مال خریدا، کچھ بکریاں خریدیں اور کاشت کے اندر کچھ حصہ ڈالا اور اس پر تین چار سال گزر گئے۔ اس کے بعد وہ بندہ واپس آیا اور کہا کہ میں نے مزدوری لینی تھی وہ دے دو۔ مہربانی کرو۔ میں نے کہا: میں نے تمہیں پہچان لیا ہے اور تمہارا فلاں نام ہے۔ میں نے کہا: یہ بکریاں بھی تمہاری ہیں، یہ پیسے بھی تمہارے ہیں اور فلاں فلاں چیز بھی تمہاری ہے۔ اس نے کہا: مذاق نہ کرو۔ میں نے کہا: مذاق نہیں ہے، تم جو پیسہ چھوڑ گئے تھے میں نے کام کے اندر لگا دیا۔ اللہ نے اس کے اندر برکت دی تو یہ تیرا نصیب ہے۔ تو میں نے سب کچھ اس کو دے دیا۔ وہ دعائیں کرتا ہوا گیا۔ کتنا خوش ہو گیا ہوگا؟ کہ آیا تو تنخواہ کے لیے تھا، لیکن کافی مال لے کر جا رہا تھا۔ اے اللہ! اگر میں نے یہ سب کچھ تیری رضا کے لیے کیا تھا تو اس غار سے پتھر کو ہٹا دے۔ تو اس غار کا منہ کھل گیا اور وہ تینوں باہر آ گئے۔

"تَوَسُّل بِالْأَعْمَالِ الصَّالِحَة" کا کوئی منکر نہیں ہے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۳۴۶۵، باب: حدیث الغار]

"تَوَسُّل بِالذَّاتِ" اور اس کی دلیل:

اور ایک ہے "تَوَسُّل بِالذَّاتِ" کہ کسی اللہ والے کے پاس جا کر کہیں کہ ہمارے لیے دعا کریں۔ یہ جائز ہے۔ جب بھی کوئی مشکل ہو، بندہ کسی اہل اللہ کے پاس جا کر کہتا ہے کہ دعا کریں تو جائز ہے۔ جیسا کہ امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ

کے دور میں قحط پڑ گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو استسقاء کے لیے ساتھ لے گئے اور ساتھ یہ الفاظ کہے: یا اللہ! جب تک سرکار دو عالم ﷺ دنیا میں تھے ہم آپ ﷺ کو کہتے تھے اور آپ دعا فرماتے تھے تو بارشیں آجاتی تھیں، اب ہم حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو لے آئے ہیں جو حضور ﷺ کے چچا ہیں، ان کی برکت سے ہم پر رحم کر۔ یہ توسل بالذات ہے۔ اس کے اندر کسی قسم کا کوئی جھگڑا نہیں۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۰۱۰، باب: سُؤَالِ النَّاسِ الإِمَامَ الاسْتِسْقَاءَ...]

ایک ہے آدمی کے فوت ہو جانے کے بعد اس سے دعا کرانا اس سے علماء نے منع فرمایا ہے کہ اس سے آدمی اس کو ''مستقل بالذات'' مؤثر سمجھ لیتا ہے۔ اگر اس کو مؤثر بالذات نہ بھی سمجھتا ہو تب بھی معصیت کر رہا ہے، ایک ایسا عمل کر رہا ہے جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا ہے۔

اللہ کے ناموں کا دعا میں استعمال:

اسی طرح ''تَوَسُّل بِالْأَسْمَاءِ'' ہے۔ اس کے اندر بھی کسی کا کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جیسے: ''یَا رَحْمٰنُ! یَا رَحِیْمُ! یَا جَبَّارُ! یَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ! یَا أَکْرَمَ الْأَکْرَمِیْنَ! یَا أَجْوَدَ الْأَجْوَدِیْنَ! یَا حَیُّ! یَا قَیُّوْمُ! یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِکْرَامِ!''

اسمِ اعظم سے دعا:

جیسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ایسا ہے جو اسم اعظم ہے، جس کے وسیلے سے مانگا جائے تو دعا قبول ہوتی ہے۔ [سنن أبي داود، حدیث: ۱۴۹۵، باب: الدُّعَاءِ]

صحیح حدیث مبارک ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِيْنَ، فَإِنَّهُ لَمْ يَدْعُ بِهَا رَجُلٌ مُسْلِمٌ فِي شَيْءٍ قَطُّ إِلَّا اسْتَجَابَ اللّٰهُ لَهُ)) [سنن الترمذي: حدیث: ۳۵۰۵]

''لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِيْنَ. (تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تیری ذات پاک ہے۔ میں ہی ظلم کرنے والوں میں سے ہوں)۔ کوئی مسلمان اسے پڑھ کر دعا کرے گا تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی دعا قبول فرمائیں گے۔''

اسی لیے علماء فرماتے ہیں: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کے اندر پہلے ''اِسْمِ'' آیا ہے، یہاں کسی کی بجائے ''اِسْمِ'' کے اندر بھی تاثیر ہے۔ اور جیسے جیسے اللہ کے اسماء ہیں ویسے ویسے اللہ نے ان کے اندر تاثیر رکھی ہے، لیکن

شرط یہ ہے کہ اخلاص ہو اور اللہ کا نام لے کر دعا مانگنے والا ہو۔ اگر آپ سارے نام لیتے جائیں، لیکن دل کے اندر سے آواز نہیں نکل رہی، قلب غافل سے مانگ رہے ہو تو نہ مانگنا بہتر ہے۔

دعا میں بے توجہی کا نقصان:

بعض علماء نے اس کی مثال دی کہ کسی کو ڈاکٹر صاحب کے پاس کچھ کام ہے۔ اب ڈاکٹر صاحب سامنے ہوں اور اس کا منہ دوسری طرف ہو اور ڈاکٹر صاحب سے دوائی مانگ رہے ہوں۔ اگر ڈاکٹر ہمت والا ہوگا تو اسی وقت تھپڑ مار کر باہر نکال دے گا اور اگر ڈاکٹر بہت ڈھیلا ڈھالا بھی ہوگا تو کہے گا: کیوں میرا وقت ضائع کر رہے ہیں؟ آپ تشریف لے جائیں۔ تو اسی طرح آدمی خدا سے مانگ رہا ہو اور دل بتوں میں اٹکا ہوا ہو تو کیا دعا قبول ہوگی؟

ریاء کی عبادت:

جیسے کسی شاعر نے کہا:

بزمیں چوں سجدہ کردم ز زمیں ندا برآمد
کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

"جب میں زمین پر سجدہ کرتا ہوں تو زمین چیختی ہے کہ اے بندے! تو ریا، دکھلاوے کے سجدے کے ساتھ مجھے خراب کر رہا ہے۔"

لوگوں کو دکھانے کے لیے لمبے لمبے سجدے کرتا ہے کہ جناب پہنچا ہوا بزرگ ہے، ایک گھنٹے میں دو رکعت پڑھی ہیں۔ اگر گھر میں ہو تو فرض بھی نہیں پڑھتا۔

اللہ کا نام لینے سے نقصان ختم:

اس لیے سمجھیں کہ اسمائے حسنیٰ کے اندر عجیب تاثیر ہے! حتیٰ کہ ایک دعا میں بہت ہی عجیب تاثیر ہے!! "بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِي لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ"[1] (اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں کہ جس کے نام کی برکت سے زمین و آسمان کی کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی اور وہی سننے والا جاننے والا ہے)۔ اس "بِسْمِ اللّٰهِ" میں بھی وہی اسم ہے اس کے پڑھنے سے آپ کو کوئی چیز نقصان نہیں دے گی۔

---

[1] سنن أبي داود، حديث: ٥٠٨٨، باب ما يقول إذا أصبح

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا زہر کھانے کا واقعہ:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ جب جنگِ روم ہوئی اور مسلمانوں کو فتح ہوگئی تو روم کے کچھ جرنیل قیدی ہو گئے۔ اس دور کے اندر صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس محلات تو تھے نہیں تو ان کے قیدیوں کو اپنے خیمے میں رکھا۔ ایک رومی جرنل نے کہا: خالد! بات سنو! ہم متحارب دشمن ہیں۔ آپ ہمارے دشمن اور ہم آپ کے دشمن ہیں۔ ہم نے جنگیں لڑی ہیں، آپ کو فتح ہوئی۔ اور جنگوں کے اندر تو فتح و شکست ہوتی رہتی ہے...... جیسے عربی کا مقولہ ہے: "اَلْحَرْبُ سِجَالٌ بَيْنَنَا" (جنگ تو یہ ہے کہ کبھی اس نے کھینچ لیا اور کبھی اس نے کھینچ لیا)...... تو اس رومی نے کہا کہ مجھے آپ کا جنگی طریقہ کار بہت پسند آیا! میں بہادر دشمن کی قدر کرتا ہوں۔ آپ نے روم فتح کر لیا ہے اور ہمارے لوگ تمہارے قیدی ہیں، تمہاری خدمت کریں گے۔ ہمارے لوگوں کے پاس ایک خاص قسم کا زہر ہوتا ہے آج تک اس کے ذائقہ کا پتا نہیں چل سکا، آدمی فوراً مر جاتا ہے۔ وہ دشمن کے کھانے یا پینے کی چیزوں میں ڈال دیتے ہیں تو زبان کو لگنے کی دیر ہے، بندہ زندہ نہیں بچتا، لہٰذا کبھی بھی ان کے ہاتھ سے کھانا نہیں کھانا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ مسکرائے اور فرمایا: کیا وہ زہر تمہارے پاس بھی ہے؟ اس نے کہا: ہاں! وہ زہر میرے پاس ہے۔ فرمایا: دکھاؤ! وہ کیسا ہوتا ہے؟ تو اس رومی جرنیل نے اپنی انگوٹھی کے اندر خانہ بنایا ہوا تھا اس میں زہر تھا، تا کہ اگر قید ہو جائیں تو ختم ہو جائیں گے اور راز نہیں کھلے گا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے وہ زہر لے کر پانی میں ڈالا اور تین دفعہ پڑھا:

"بِاسْمِ اللهِ رَبِّ الْأَرْضِ وَالسَّمَاءِ، بِاسْمِ اللهِ الَّذِي لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهِ دَاءٌ"

اور وہ زہریلا پانی پی لیا تو آپ کو کچھ بھی نہیں ہوا۔

[معرفة الصحابة لابي نعيم، حديث: ٢٣٩٣، خَالِدُ بْنُ الْوَلِيدِ الْمَخْزُومِيُّ...]

اللہ کے اسماء میں اتنی تاثیر ہے۔ شرط یہ ہے کہ پڑھنے والا مخلص ہو، صدق مقال ہو اور اکل حلال ہو پھر اللہ کے نام کی لذت دیکھیں کہ کتنی لذت ہے؟

خدا کی یاد کا فائدہ:

علماء نے فرمایا کہ "اسم" کے اندر فائدہ ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ﴾ [البقرة: ١٥٢]

"مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ اور میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔"

مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ:

✦ "اذْكُرُونِي فِي الرَّخَاءِ أَذْكُرْكُمْ فِي الْبَلَاءِ" (میرے بندے! تو خوشی اور فراخی میں مجھے یاد رکھ، میں تجھے تنگ دستی میں تجھے یاد کروں گا)۔

✦ "اذْكُرُونِي بِالْإِجَابَةِ أَذْكُرْكُمْ بِالْإِحْسَانِ" (جب تمہیں کوئی حاجت پیش آئے تو تم مجھ سے دعا کرو تو میں بھی تمہاری دعائیں قبول کر کے تمہاری مشکل حل کر دوں گا)۔

[تفسیر الرازی: ۱/ ۱۴۳، البقرۃ: الآیۃ: فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ]

ایک صحابی کی دعا:

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ﴾ [الانعام: ۱۷]

"اگر اللہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچائے تو خود اس کے سوا اسے دور کرنے والا کوئی نہیں۔"

حضور ﷺ نے ایک صحابی کو دیکھا جو یوں دعا مانگ رہے ہیں:

اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ أَنِّي أَشْهَدُ أَنَّكَ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ الْأَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِي لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ.

"اے اللہ میں تجھ سے اس وسیلے سے مانگتا ہوں کہ میں نے گواہی دی ہے کہ تو اللہ ہے، تیرے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ تو تنہا اور بے نیاز ہے۔ جو نہ کسی کی اولاد ہے اور نہ ہی کوئی اس کی اولاد ہے اور نہ ہی کوئی اس کے برابر ہے۔"

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس نے اللہ سے اسم اعظم کے وسیلے سے دعا کی ہے۔ اگر اس کے وسیلے سے دعا کی جائے تو قبول کی جاتی ہے اور اگر کچھ مانگا جائے تو عطاء کیا جاتا ہے۔ (کیونکہ اللہ کے اسماء آ گئے، صفات آ گئیں)۔

[الترمذی، حدیث: ۳۴۷۵، باب جَامِعِ الدَّعَوَاتِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ]

اسی لیے جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو خط لکھا تو اس کی ابتداء یوں تھی:

﴿إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ ۝﴾ [النمل: ۳۰]

"یہ سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہے اور اس میں یہ (مضمون) ہے (اول) بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔"

انبیاء علیہم السلام کے خطوط کی ابتداء بھی اسی اسم مبارک سے ہے۔

اسم اعظم کی برکت سے تخت حاضر ہو گیا:

اسی طرح جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے ساتھیوں پر نظر ڈال کر فرمایا تھا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ﴾ [النمل: ۳۸] (اے اہلِ دربار! تم میں سے کون ہے جو اس عورت کا تخت ان کے تابع دار بن کر آنے سے پہلے ہی میرے پاس لے آئے؟) ﴿قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ﴾ [النمل: ۳۹] (ایک قوی ہیکل جن نے کہا: آپ اپنی جگہ سے اٹھے بھی نہ ہوں گے کہ میں اس سے پہلے ہی اسے آپ کے پاس لے آؤں گا، اور یقین رکھیے کہ میں اس کام کی پوری طاقت رکھتا ہوں (اور) امانت دار بھی ہوں)۔ آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ﴾ [النمل: ۴۰] (جس کے پاس کتاب کا علم تھا، وہ بول اٹھا: میں آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے ہی اسے آپ کے پاس لے آسکتا ہوں)۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ "عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ" سے مراد اسم اعظم ہے۔

[تفسیر روح المعانی: ۱۰/ ۱۹۸، النمل: الآیۃ: قال الذی عندہ علم من الکتاب]

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا سکھلائی:

((أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَأَعُوْذُ بِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ))

"اے اللہ! میں آپ کی رضامندی کی پناہ چاہتا ہوں۔ آپ کی ناراضگی سے اور آپ کے درگزر کی پناہ چاہتا ہوں آپ کی سزا سے۔" [ابو داؤد، حدیث: ۸۷۹، بَابٌ: فِي الدُّعَاءِ فِي الرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ]

اس لیے یاد رکھیں! ساری دنیا میں اس کی ذات کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اللہ کے اسماء کے اندر برکت اور تاثیر ہے اس اسم کو پکارنے سے اللہ تعالیٰ ہمارے مشاغل اور مسائل کو حل فرما دیتے ہیں۔

اس لیے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ میں پہلے "اِسْمِ" آیا، پھر "اللّٰهِ" آیا، پھر "الرَّحْمٰنِ" آیا اور پھر "الرَّحِيْمِ" آیا ہے۔

فہم قرآن کی شرائط:

قرآن کو سمجھنے کے لیے شرط یہ ہے کہ انسان پوری طرح متوجہ ہو، جگہ پاک ہو اور دل ودماغ کو پاک رکھے، کیونکہ ہمیشہ یاد رکھیں! پاک چیز پاک برتن میں ٹھہرتی ہے۔ دودھ کتنا پاک ہوتا ہے، لیکن گندے برتن کے اندر ڈالو تو دودھ خراب ہو جائے گا، کیونکہ وہ گندی جگہ رہ ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح اللہ کا قرآن پاک ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے دل ریا سے اور شہرت سے پاک ہوں۔

اس لیے بعض علماء نے لکھا ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ قرآن کا علم دیں یا حدیث کا علم دیں وہ کسی بڑے آدمی کو اپنے سے بڑا سمجھے تو اس نے قرآن کی توہین کی ہے، کیونکہ وہی بڑا ہے۔ اگر وہ دوسرا شخص بڑا ہوتا تو اللہ اس کے دل میں قرآن کو رکھتے۔

اللہ کی صفات:

ترتیب دیکھیں! پہلے "اللہ"، پھر صفت "الرَّحْمٰنِ"، پھر "الرَّحِیْمِ" ہے۔ دیکھیں! جب پہلے کوئی نہیں تھا صرف "اللہ" تھا۔ فرمایا: "هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ." اور پھر جب کچھ نہیں ہوگا صرف اس کی ذات ہوگی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْإِكْرَامِ ۝﴾ [الرحمن: ۲۶، ۲۷]

"اس زمین میں جو کوئی ہے، فنا ہونے والا ہے۔ اور (صرف) تمہارے پروردگار کی جلال والی، فضل و کرم والی ذات باقی رہے گی۔"

اس لیے علماء نے فرمایا: وہ اول جس سے پہلے کچھ نہیں، وہ آخر جس کے بعد کچھ نہیں۔ سب کچھ فانی ہے اور وہ باقی ہے۔ "هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ" دائم ہے، جس پر کبھی فنا نہیں آئے گی، وہ صرف اللہ کی ذات ہے۔ اسی طرح ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ میں غور کریں۔ سب سے پہلے اللہ، کیونکہ جب کچھ نہیں تھا تو اللہ تھا۔ اسی نے عالم دنیا بنایا، اب عالم دنیا کے ساتھ تعلق کی صفت ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ہے۔ اور ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کا تعلق عالم آخرت کے ساتھ ہے، کیونکہ قیامت میں رحمت والی صفت صرف مومنوں کے ساتھ ہوگی۔ تو اسی ترتیب سے لائے۔ سب پہلے "اللہ"، پھر صفت "الرَّحْمٰنِ" دنیا میں، اس کے بعد پھر آخرت آئے گی تو صفت "الرَّحِیْمِ" لائے۔

بعض علماء فرماتے ہیں: "الرَّحْمٰنِ" اور "الرَّحِیْمِ" صفتِ مشبہ کا وزن ہے، لیکن یہ صفتِ مشبہ نہیں ہے، بلکہ یہ

مبالغہ کا صیغہ ہے کہ بہت رحمت کرنے والا، سب سے زیادہ رحمت کرنے والا۔

اللہ کی رحمت کی وسعت:

اور خدا کی رحمت کا تو یہ عالم ہے کہ فرمایا:

((إِنَّ رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي)) [صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۵۳، بابُ قَوْلِهِ تَعَالَى: وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا...]

''میری رحمت میرے غضب پر سبقت کرگئی۔''

اور ایک روایت میں ہے: ''إِنَّ رَحْمَتِي غَلَبَتْ غَضَبِي'' (میری رحمت میرے غضب پر غالب ہوگئی۔) اس لیے علماء نے فرمایا ہے کہ اللہ نے رحمت کے سو درجے بنائے ہیں، صرف ایک درجہ اللہ نے انسانوں میں بانٹا اور قیامت کے دن اللہ اس ایک کو ملا کر سو فیصد رحمت کا اظہار فرمائیں گے۔

غلبۂ رحمت کی ایک دلیل:

اسی طرح جہاں صفتِ جلال کا ذکر کیا وہاں اللہ نے رحمت کو بھی ذکر کیا۔ فرمایا: ﴿الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طٰہٰ: ۵] (وہ بڑی رحمت والا عرش پر قائم ہے)۔ حالانکہ کہنا چاہیے تھا: ''اَلْعَزِيْزُ''، ''اَلْجَبَّارُ''، ''اَلْقَهَّارُ'' لیکن رحمت کی صفت غالب ہے اس لیے ''الرَّحْمٰنُ'' فرمایا۔

عرش کے نیچے لوح پر لکھا ہوا ہے: ''إِنَّ رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي'' (میری رحمت میرے غضب پر سبقت کرگئی)۔ اس کو عرش کے نیچے رکھا۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۵۳، بابُ قَوْلِهِ تَعَالَى: وَلَقَدْ سَبَقَتْ...]

اس لیے علماء نے فرمایا: چاہے تشریعیات ہوں یا تکوینیات ہوں، وہاں صفت رحمت غالب ہے۔ تکوینیات سے مراد کھانا، پینا اور مرنا وغیرہ ہیں۔ یعنی اس دنیا کے اندر چاہے مسلمان ہیں یا کافر ہیں اس دنیا کے دسترخوان سے سب کھا رہے ہیں۔ تو تکوینیات کے اندر بھی رحمت کا غلبہ ہے کہ ہر کوئی کھا رہا ہے۔

سو سال کے گناہ بھی رحمتِ باری سے معاف ہو جاتے ہیں:

اسی طرح تشریعی امور کہ یہ حلال ہے، حرام ہے، یہ جائز ہے، ناجائز ہے۔ ایک آدمی سو سال گناہ کرے، شراب پیئے، زنا کرے، جھوٹ بولے اور پھر توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر کافر ہے اور

[البخاری، حدیث: ۱۹۳۰، بابُ مَا جَاءَ فِي قَوْلِ اللهِ تَعَالَى: وَهُوَ الَّذِي...]

مسلمان ہو جائے تو اس کے گناہ بھی معاف فرما دیتے ہیں۔ اگر چہ وہ پہلے شرک کرتا ہے، قبروں کو پوجتا ہے، آگ کو، چاند کو پوجتا رہا ہے، لیکن جب دل سے ایک دفعہ پڑھ لیا: ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ'' تو اسلام میں آ گیا اور سارے گناہ معاف ہو گئے۔

مومن ہے تو اس کے بارے میں فرمایا:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۖ﴾ [الانعام: ۱۶۰]

''جو شخص کوئی نیکی لے کر آئے گا اس کے لیے اس جیسی دس نیکیوں کا ثواب ہے۔''

اگر تم نیکی کا کام کرو گے تو تمہیں دس گنا ثواب دوں گا اور اگر غلطی کرو گے تو تمہارا ایک گناہ لکھوں گا۔ تو اللہ کی رحمت غالب ہے اللہ کے غضب پر۔

رحمت کے غالب ہونے کی ایک اور مثال:

اسی طرح مثلاً: ایک آدمی نے ارادہ کیا کہ صبح کی نماز حرم میں پڑھیں گے، لیکن نہیں پڑھ سکا۔ اللہ پاک فرماتے ہیں: نیکی لکھ لو۔ میرے بندے نے نیت تو کی تھی۔ فرشتے عرض کرتے ہیں: اس نے یہ کام تو کیا ہی نہیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس نے ارادہ تو کیا تھا۔ اسی طرح جب بندہ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ فرماتے ہیں کہ مت لکھو! جب تک کہ برائی نہ کرے۔ برائی کا ارادہ کیا پھر چھوڑ دیا تو پھر بھی (اللہ فرماتے ہیں:) نیکی لکھ دو کہ میرے ڈر سے چھوڑ دیا۔ وجہ کیا ہے؟ کہ رحمت غالب ہے۔

اور بھی نیکی کو بڑھا دیتے ہیں۔ مسجدِ حرام کے اندر نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کا ہے۔ وجہ کیا ہے؟ کہ رحمت غالب ہے۔

''بِسْمِ اللّٰهِ'' میں ایک عجیب نکتہ!

جب ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ﴾ پڑھو تو غور کرو کہ اس کے اندر اسمِ ذاتی اور اسمِ جلال ایک ہے، صفاتِ رحمت دو کا ذکر ہے اور صفات کے صیغے بھی مبالغہ کے ہیں، تا کہ واضح ہو کہ میرے بندے تو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ﴾ تو پڑھ، میرے ساتھ تعلق تو جوڑ۔ بندہ کہتا ہے کہ میں گندہ ہوں تو اللہ فرماتے ہیں: میں تو ''رَحْمٰن'' ہوں، ''رَحِيم'' ہوں۔

اللہ کی رحمت سے شرک کے سوا ہر گناہ کی معافی ہے:

صحیح حدیث مبارکہ میں ہے کہ اے میرے بندے! تو قیامت کے دن میرے پاس آئے ساری زمین تیرے گناہوں سے بھر جائے، لیکن تو میرے ساتھ شریک نہ کرے تو میں تیرے سارے گناہ معاف فرما دوں گا۔ وجہ کیا ہے؟ کہ رحمت غالب ہے۔ اس لیے پہلی پہلی آیات کے اندر رحمت ہے۔

''بِسْمِ اللّٰہِ'' سورۂ فاتحہ کا جز نہیں:

اس بات میں سارے علماء کا اتفاق ہے کہ ''سورۂ نمل'' کی آیت: ﴿إِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾ قرآن کا جزء ہے۔ سورۂ فاتحہ سے پہلے جو ﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾ ہے وہ سورۂ فاتحہ کا جزء ہے یا نہیں اس میں ائمہ کا اختلاف ہے:

امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے ساتھ کچھ ائمہ کرام ہیں، وہ فرماتے ہیں: ﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾ سورۂ فاتحہ کا جزء ہے۔ اس لیے جہاں وہ سورۂ فاتحہ کو جہراً پڑھتے ہیں وہاں ''بِسْمِ اللّٰہِ'' کو بھی جہراً پڑھتے ہیں۔ باقی ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''بِسْمِ اللّٰہِ'' مستقل آیت ہے، لیکن سورۂ فاتحہ کا جز نہیں ہے۔ اس لیے وہ سورۂ فاتحہ کو تو جہراً پڑھتے ہیں، ''تعوذ'' اور ''تسمیہ'' کو جہراً نہیں پڑھتے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۶، تفسیرُ الاستعاذۃ و أحکامُہا]

''بِسْمِ اللّٰہِ'' اس امت کی خصوصیت ہے:

اللہ تعالیٰ نے جتنی آسمانی کتابیں اتاری ہیں ان سب کی ابتداء ''بِسْمِ اللّٰہِ'' سے کی ہے، لیکن یہ نہیں کہ بعینہٖ ﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾ کے الفاظ تھے، کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا: جس طرح میری امت پر اللہ کے دیگر احسانات ہیں ان میں ایک احسان یہ ہے کہ ﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾ صرف ہمیں ملی ہے اور کسی کو نہیں ملی۔

علمائے کرام نے ان دونوں باتوں کو جمع کیا ہے کہ جتنی بھی آسمانی کتابیں اتری ہیں وہ اللہ کے نام سے اتری ہیں، لیکن ﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾ صرف امتِ محمدیہ ﷺ کو ملی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب صلح حدیبیہ ہوئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾ لکھی تو سہیل بن عمرو نے کہا کہ ہم نہیں مانتے، تم ''بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ'' لکھو۔ لہٰذا اللہ کے نام سے شروع کرنا یہ پہلے سے چلا آرہا ہے، اور جتنی کتب سماویہ ہیں: تورات، زبور اور

انجیل سب کی ابتداء اللہ کے نام سے ہوئی ہے۔

ہر نماز میں سورۂ فاتحہ ضروری ہے:

اسی لیے علماء نے فرمایا کہ سارے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں ہے، اسی لیے سورۂ فاتحہ بار بار پڑھی جاتی ہے۔ چاہے فرض ہے، واجب ہے، سنت ہے، نوافل ہیں، تہجد ہے، اشراق ہے اور اوابین ہیں سب کے اندر سورۂ فاتحہ پڑھی جائے گی، بلکہ نماز ہی ادا نہیں ہوتی جب تک سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے۔ حدیث مبارک میں ہے:

((لَا صَلَاةَ إِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ)) [المعجم الاوسط حدیث:۲۲۶۲]

"سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔"

اگر جماعت میں ہے اور امام نے پڑھی تو مقتدی کی طرف سے ہوگئی، کیونکہ وہ بھی اسی کی اقتداء میں ہے، لہٰذا نماز کے اندر سورۂ فاتحہ تو آ گئی۔

خلاصہ قرآن:

سارے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں ہے، ساری سورۂ فاتحہ کا خلاصہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ میں ہے، ساری "بِسْمِ اللّٰهِ" کا خلاصہ "ب" میں ہے، "ب" کا خلاصہ اس کے نقطے میں ہے اور نقطہ میں توحید ہے۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ چھوٹی سی آیت کتنی بڑی اکسیر کا درجہ رکھتی ہے!! اللہ پاک مجھے اور آپ کو سمجھنے اور سمجھانے کی توفیق دے۔ [نزہۃ المجالس ومنتخب النفائس:۱/۱۲۰]

ملحدین کا ایک اعتراض:

اس پر بعض اعدائے دین نے اعتراض کیا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قرآن کے جو تیس پارے ہیں ان کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں آ جائے اور پھر پوری سورت کا خلاصہ "بِسْمِ اللّٰهِ" میں آ جائے؟ کیونکہ اسلام کے دشمنوں کو انتظار ہوتا ہے کہ اعتراض کرنے کا کوئی موقع ملے، اس لیے وہ سلمان رشدی جیسوں کو لیتے ہیں (کیونکہ یہ ان کے اندر کا آدمی ہے) کہ شاید یہ ہمیں کچھ ایسی باتیں بتلائے کہ ہم مسلمانوں پر اعتراض کر سکیں۔ اس لیے انہوں نے علماء کی بات پر اعتراض کیا کہ یہ بات اصول کے خلاف ہے کہ بہت بڑی چیز بہت چھوٹی چیز کے اندر کیسے آ سکتی ہے، کثیر قلیل میں کیسے آ سکتا ہے؟

جواب

جواب سمجھیں کہ بعض چیزیں حسی ہیں اور بعض معنوی ہیں۔ معنوی چیز کو حسی چیز پر قیاس کرنا غلط ہے۔ آپ دیکھیں! کھجور کی گٹھلی کتنی چھوٹی سی ہوتی ہے؟ اس کو جب زمین میں دفن کرتے ہیں تو اسی سے ایک کونپل نکلتی ہے، پھر اس سے ایک تناور درخت بنتا ہے اور اس پر کھجوریں لگتی ہیں تو گویا اس چھوٹی سی گٹھلی کے اندر اس تناور درخت کا مادہ سمایا ہوا تھا تو وہ درخت نکلا۔ یہ تو مشاہدہ ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ایک اور تشبیہ دی ہے کہ ایک چھوٹی سی آنکھ ہے، اس کی پتلی کتنی چھوٹی سی ہے!! لیکن جب اسی سے ہم آسمان پر نظر ڈالتے ہیں، سورج پر نظر ڈالتے ہیں، چاند پر نظر ڈالتے ہیں اور کسی بلڈنگ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ تو نہیں ہوتا کہ وہ ہمیں اتنی نظر آئے جتنی یہ پتلی ہے۔ تو اتنی بڑی چیز کا اتنی چھوٹی سی چیز کے اندر آنا کثیر کا قلیل میں سماتا ہے۔

جب یہ ہو سکتا ہے تو یہ کون سی عجیب بات ہے کہ پورے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں نہ آئے؟

دین کا خلاصہ تین چیزیں ہیں:

حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ بطور مثال فرماتے تھے کہ اللہ کا دین سیکھنا ہو یا سکھلانا ہو تو نیت کی بات ہے۔ نیت انسان کی درست ہو تو سیکھنا اور سکھلانا آسان ہے۔ اس کی مثال دیتے تھے کہ بالفرض والمحال اگر میں پلیٹ فارم پر کھڑا ہوں، میرا ایک پاؤں پلیٹ فارم پر ہو اور دوسرا ٹرین پر ہو، ٹرین نے چلنا شروع کر دیا ہو اور مجھے کوئی کہے کہ مجھے دین سکھا دو تو دین اتنی دیر میں بھی سمجھایا جا سکتا ہے۔ فرمایا: دین کے اندر تین چیزیں ہیں: عبادت خدا کی ہو، اطاعت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو اور خدمت اللہ کی مخلوق کی ہو۔ ان تین چیزوں کا نام دین ہے۔

خالق کی عظمت اور مخلوق پر شفقت کا نام ہی دین ہے:

عرب علماء نے اس کو اور بھی مختصر کر دیا ہے کہ اصل دین کا خلاصہ دو چیزوں میں منحصر ہے: "عَظَمَةُ الْخَالِقِ" اور "شَفَقَةُ عَلَى الْخَلْقِ" کہ دل میں خالق کی عظمت ہو اور مخلوق کی شفقت ہو اس چیز کا نام دین ہے۔ کیونکہ جب آپ کے دل میں بادشاہ کی عظمت ہے اور وہ آپ کو بلائے تو آپ سارے کام چھوڑ کر اس کی طرف جائیں گے۔ جس کی جتنی عظمت ہوگی، اس کے کام میں اتنی ہی تعمیل ہوگی۔ اگر اللہ کی عظمت دل میں بیٹھ جائے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ

پکارنے والا پکارے "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ"، "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" اور ہم نہ جائیں؟ تو اس کا مطلب ہے کہ اللہ کی عظمت ہمارے دلوں میں صحیح طرح بیٹھی ہی نہیں ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ یہ حلال ہے، یہ حرام ہے۔ اگر اللہ کی عظمت دل میں ہوتی تو ہم حرام کے قریب کیسے جاتے؟ اولیاء جوذکر اور مشقتیں کراتے ہیں وہ اس لیے کہ اللہ کی عظمت دل میں بیٹھ جائے۔ اور جب اللہ کی عظمت دل میں یقین کی شکل میں آجاتی ہے تو نافرمانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری بات کہ اللہ کی مخلوق پر شفقت ہوگی تو کسی گرتے ہوئے اور کسی بیمار کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟ کسی مسکین کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟ اب آپ کو جذبہ آئے گا، آپ زکوۃ بھی دیں گے، صدقہ بھی دیں گے، خیرات بھی دیں گے، ہمسائے کے حقوق بھی ادا کریں گے، مریض کی عیادت بھی کریں گے اور اگر فوت ہوا تو اس کے جنازے میں بھی شریک ہوں گے، کیونکہ یہ اللہ کی مخلوق پر شفقت ہے۔

اس لیے یاد رکھیں! کثیر قلیل میں سما سکتا ہے۔ اسی لیے علماء نے فرمایا کہ پورے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں ہے اور سورۂ فاتحہ کا خلاصہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ میں ہے۔

"بِسْمِ اللّٰهِ" کا خلاصہ "ب" میں ہے:

پھر علماء نے فرمایا کہ ساری ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کا خلاصہ "ب" میں ہے، حالانکہ وہ ایک حرف ہے۔ تو فرمایا کہ "ب" کا معنی "اِلْصَاق" ہوتا ہے کہ کسی چیز کے ساتھ ملانا۔ یا "ب" "مُصَاحَبَتْ" کے لیے یا "اِسْتِعَانَتْ" کے لیے استعمال ہوتی ہے یا "ب" "تَبَرُّکْ" کے لیے استعمال ہوتی ہے تو "ب" کا اصل معنی "اِتِّصَال" و "اِلْصَاق" ہے کہ مخلوق کو خالق کے ساتھ جوڑ دینا، ملا دینا۔ اسی کا نام تو دین ہے۔

نوافل سے قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے:

اسی لیے حضور ﷺ کی حدیث ہے کہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرا بندہ میری عبادت کرتے، نوافل پڑھتے ہوئے میرے اتنا قریب آجاتا ہے کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ وہی سنتا ہے جو میں سنوانا چاہتا ہوں، وہ وہی دیکھتا ہے جو میں دکھلانا چاہتا ہوں، وہ وہیں چلتا ہے جہاں میں چلانا چاہتا ہوں، وہ وہی پکڑتا ہے جو میں پکڑانا چاہتا ہوں اور وہ وہی چھوڑتا

ہے جو میں چھڑانا چاہتا ہوں۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۶۵۰۲، باب التواضع]

اللہ والوں کی خوشی کا راز:

جیسے کسی اللہ والے کو کسی نے کہا کہ مجھے آپ کو دیکھتے ہوئے اتنا عرصہ ہوگیا ہے میں نے آپ کو پریشان نہیں دیکھا۔ جب بھی دیکھتا ہوں تو آپ خوش بیٹھے ہوتے ہیں، خوشی ہی خوشی ہے، غم آپ کے قریب ہی نہیں آیا۔ کوئی ہمیں بھی وظیفہ بتائیں۔ حضرت نے فرمایا: جب دنیا کا سارا کام میری منشاء کے مطابق ہو رہا ہے تو مجھے کیا غم ہے؟ مجھے غم تو تب ہوتا ہے کہ جب میں کسی کام کا کہتا کہ یہ کام کرو اور وہ نہ کرتا۔ جب سب کچھ میری رضا کے مطابق ہو رہا ہے تو پھر میں کیوں غم کروں؟ مرید نے کہا کہ سب کچھ اللہ کی رضا کے مطابق ہوتا ہے، آپ کی کیا رضا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہم نے اپنی رضا کو اللہ کی رضا میں فنا کر دیا ہے۔ میری اپنی رضا تو ہے ہی نہیں، میری رضا وہی ہے جو اس کی رضا ہے۔ اور جو اس نے کیا اس پر میں راضی ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور رضائے خداوندی:

اسی لیے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا جا رہا تھا اور آپ کی مدد کے لیے آپ کی خدمت میں فرشتے آئے تو آپ علیہ السلام نے مدد لینے سے انکار کر دیا۔ آخر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا: ہمیں بھی اللہ نے بھیجا ہے، ہم اللہ کے حکم کے بغیر کیسے آسکتے ہیں؟ لیکن اگر آپ ہم سے مدد نہیں لیتے تو کم از کم اللہ سے دعا کر لیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو خود ہی بچا لیں۔ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام مسکرائے اور فرمایا: جبرائیل! ایک بات بتاؤ۔ انہوں نے کہا: فرمائیں۔ فرمایا: جو سارا کچھ ہو رہا ہے، اللہ جانتے ہیں یا نہیں؟ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا: اللہ کو سب پتا ہے، اس کو ذرہ ذرہ کا علم ہے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: جب اللہ کو پتا ہے اور وہ جلانے پر راضی ہے تو ہم جلنے پر راضی ہیں۔ کنڈی تو اس کے دروازے کی کھٹکھٹائی جاتی ہے جس کو پتا نہ ہو کہ دروازے پر دوست کھڑا ہے یا دشمن کھڑا ہے؟ جس کو سارا پتا ہو تو دروازہ کھٹکھٹانے کا کیا فائدہ ہے؟

[شعب الایمان، حدیث: ۱۰۴۵، الرجاء من اللہ تعالیٰ، التبصرۃ لابن الجوزی: ۱/ ۱۲۱]

جب بندہ اپنی رضا کو اللہ کی رضا میں داخل کر دیتا ہے تو بندے کا مقام یہ ہوتا ہے۔ بعض بزرگوں کی بعض باتیں

ایسی ہی ہوتی ہیں جو دوسرے لوگوں کو سمجھ نہیں آتیں۔ ان کے کلام کے اندر بھی کئی باتیں ہوتی ہیں۔

"ب" کے اور معانی:

اس لیے علماء نے فرمایا کہ "ب" کا ایک معنیٰ "اِسْتِعَانَتْ" ہے۔ یعنی ہر کام اللہ کی مدد سے ہوگا، کوئی کام بھی اللہ کی مدد کے بغیر نہیں ہوگا، اگر "ب" کا معنیٰ "مُصَاحَبَتْ" لیں تو کوئی کام اس کی محبت اور مصاحبت کے بغیر نہیں ہو سکتا، اگر "ب" کا معنیٰ "تَبَرُّكْ" لیں تو اللہ کے نام کے علاوہ تبرک کس سے پکڑا جا سکتا ہے؟ اور اگر "اِلْصَاقْ" کا معنیٰ مراد لیں تو یہ "اِرْتِبَاطٌ بَيْنَ الْخَالِقِ وَالْمَخْلُوْقِ" ہے کہ بندے کو خالق سے جوڑنے والی ہے۔ جب بندے کا خدا سے تعلق ہو جائے تو پھر کسی کی ضرورت ہی نہیں۔ جیسے آپ کا بڑے ڈاکٹر سے تعلق ہو تو آپ چھوٹے ڈاکٹروں کو پوچھتے ہی نہیں ہیں۔ تمام انبیاء علیہم السلام بھی اسی لیے آئے کہ مخلوق اپنے خالق سے جڑ جائے۔ اسی لیے ہر حال میں اس کی اطاعت ہونی چاہیے۔ بعض علماء اور آگے بڑھ گئے اور انہوں نے فرمایا: "ب" کا خلاصہ اس کے نقطے میں ہے جو "ب" کے نیچے ہے۔

نکتہ:

کسی نے شبلی رحمہ اللہ سے پوچھا: "أَأَنْتَ شِبْلِيٌّ؟" (کیا آپ شبلی ہیں؟) تو فرمایا: نہیں، میں وہ نقطہ ہوں جو اس کے نیچے ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ "ب" کے نقطے میں سارے قرآن کا خلاصہ کیسے ہے؟ تو علماء نے فرمایا کہ یہی ایک نقطہ ہے جو ایک پر دلالت کر رہا ہے اور وہ ایک اللہ ہے۔ جب ہمیں یہ سبق حاصل ہو گیا تو گویا پورے قرآن کا خلاصہ اس سے مل گیا۔ کیونکہ سارے انبیاء علیہم السلام توحید کے لیے ہی آئے ہیں۔

اپنی خودی کی نفی کردو:

بعض علماء اور اولیاء نے اس کو دوسری طرح سمجھایا ہے کہ نقطہ صفر ہے کہ اپنے آپ کو یہ سمجھو کہ میں کچھ نہیں۔ اگر میں کچھ بنوں گا تو اللہ کی استعانت اور مدد سے بنوں گا۔ اس کی مدد، اتصال اور ارتباط کے بغیر میں کچھ نہیں، میں ضعیف اور مجہول انسان ہوں، اس کی مدد کے بغیر میری کیا حیثیت ہے؟ جب اللہ کی مدد اور استعانت آئے گی تو بندے کو مقام ملے گا۔ کہیں مقامِ نبوت ملا، کہیں مقامِ رسالت ملا، کہیں مقامِ صدیقیت ملا، کہیں مقامِ صالحیت

ملا، کہیں مقامِ شہادت ملا اور کہیں مقامِ عظمت وقرابت ملا۔ یہ کس کی مدد سے ملا؟ اللہ کی مدد سے ملا، ورنہ میں کچھ نہیں، میں تو صفر ہوں۔ اور صفر کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟

عجیب نکتہ!

اسی کے اندر علماء نے لکھا ہے کہ یہیں پر غور کرو تو ہمیں سنت اور بدعت بھی سمجھ میں آجائے گی۔ اس طرح کہ اگر بائیں طرف سے صفر لگاتے جاؤ تو اس کا معنی ایک ہی ہوگا۔ مثلاً: کرہ نمبر 01 (ایک)۔ اس صفر کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اور اگر وہ دائیں طرف لگی ہوتی تو اس کی کوئی حیثیت ہوتی۔ مثلاً: کرہ نمبر 10۔ معلوم ہوا کہ اگر اپنے آپ کو اللہ اور رسول ﷺ کے ساتھ جوڑ لیا تو اللہ صفریں دائیں طرف لگائیں گے کہ پانچ نمازیں پڑھو گے تو ثواب پچاس نمازوں کا ہوگا، سات سو گنا بھی بڑھا دیں گے اور حرم میں آؤ گے تو لاکھ کا ثواب دیں گے۔ اور اگر تم بدعات میں آجاؤ گے تو نتیجہ صفر ہوگا۔ تو علماء نے فرمایا: اس ایک نقطے کے اندر اللہ کی کتنی حکمتیں اور آیات ہیں۔

''بِسْمِ اللّٰهِ'' کا حاصل:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کے اندر چار چیزیں ہیں: ''بِسْمِ''، ''اَللّٰهِ''، ''اَلرَّحْمٰنِ'' اور ''اَلرَّحِيْمِ''۔ لفظ ''اِسْم'' سے اشارہ ہے کہ دنیا میں مخلوق کے اسم سے کچھ نہیں ملے گا۔ اگر ملے گا تو اس ذات سے ملے گا جس کا صرف نام لو تو بھی فائدہ ہوگا۔ اور جتنے اسماء ہیں وہ تمام مخلوں کے نام ہیں۔ اگر ہمیں دشمن نے ستایا تو ہم نے کہا: ''یَا مُنْتَقِمُ''، ''یَا قَهَّارُ''۔ اگر ہم سے گناہ ہو گئے اور ہم لوگوں سے ڈر رہے ہیں کہ کہیں ہماری پردہ دری نہ ہو جائے تو پڑھتے ہیں: ''یَا سَتَّارُ''۔ اگر کسی مشکل میں پھنس گئے تو پڑھتے ہیں: ''حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ'' اور اگر کوئی غم ہے تو پڑھتے ہیں: ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ''۔ یہاں نام لینے سے بھی فائدہ ہو رہا ہے۔ اسی طرح ''یَا حَيُّ! یَا قَيُّوْمُ! یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ! یَا لَطِيْفُ!'' ہیں۔ نام لینے میں بھی برکات ہیں۔

قرآن پاک میں ہے جو نص قطعی ہے اس کا تو کوئی انکار نہیں کرتا کہ ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ [البقرۃ:۱۵۲] (تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد رکھوں گا) اللہ نے فرمایا: تم میرا نام ''یَا اَللّٰهُ! یَا رَحْمٰنُ!'' وغیرہ لے کر مجھے یاد کر رہے ہو تو میں بھی تمہارا ذکر کروں گا۔ اب اللہ کے ذکر کا معنی یہ تھوڑا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا نام لے لیں گے، بلکہ معنی یہ ہے کہ میں تمہیں نفع پہنچاؤں گا، فائدہ پہنچاؤں گا۔

تین باتوں میں مغالطہ:

تین چیزیں ہیں جن کے اندر لوگ بڑے الجھے ہوئے ہیں: ''تَعَطُّل''، ''تَسَبُّب'' اور ''تَوَکُّل''۔ ''تَعَطُّل'' کا معنی کیا ہوتا ہے؟ جیسے آپ کہتے ہیں کہ فلاں کو معطل کر دیا گیا، یعنی چھوڑ دیا گیا، ایک ہے ''تَسَبُّب'' اس کا معنی ہے اسباب اپنانا اور ''تَوَکُّل'' کا معنی ہے اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھنا۔

بعض صوفی ''تَعَطُّل'' کرتے ہیں کہ اللہ نے جو چیزیں پیدا کی ہیں ان کو چھوڑ دو، لیکن اسلام نے اس سے منع کیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ)) [المصنف لابن أبي شيبة: ۳/ ۲۵۳]

''اسلام میں رہبانیت (تَعَطُّل) نہیں ہے۔''

تو بعض لوگ بالکل ''تَعَطُّل'' میں آ گئے کہ اسباب سے بالکل فائدہ نہ اٹھاؤ۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اور بعض لوگوں نے ''تَسَبُّب'' کو سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ محنت کریں گے تو ہوگا، اس میں اللہ کا کیا دخل ہے؟ یہ تو ہماری محنت ہے، ہم نے ہل چلایا، بیج ڈالا اور کاشت کیا۔ تو آگے جا کر ان کے دو گروہ بن گئے: بعض سرمایہ دار بن گئے اور بعض سوشلسٹ بن گئے۔ تو وہ ''تَسَبُّب'' کے دھوکہ میں آ گئے۔

اسلام کی راہ اعتدال:

اسلام ہمیں درمیان کا راستہ دکھاتا ہے کہ نہ ''تَعَطُّل'' کرو کہ سب کچھ چھوڑ دو، کوئی ضرورت نہیں کھانے کی، پینے کی۔ اس سے بھی منع ہے۔ نہ ''تَسَبُّب'' کو اختیار کرو کہ اسباب پر ساری زندگی ہے، اللہ کا دھیان کچھ نہیں۔ اللہ نے فرمایا: سب بھی اختیار کرو، لیکن ''تَوَکُّل'' بھی اختیار کرو۔ استعانت اللہ کی ہوگی۔ اسی پر بزرگوں نے فرمایا کہ اپنے اونٹ کا گھٹنا بھی باندھ دو اور اللہ پر توکل کرو۔ اگر تمہارے پاس زراعت ہے، بالکل کرو، صنعت ہے، علم ہے، بالکل حاصل کرو، لیکن ہر چیز کے ساتھ مدد اللہ سے مانگو اور توکل اللہ تعالیٰ پر کرو۔

اس لیے حضور ﷺ نے اس ساری بات کو تین لفظوں میں سمجھا دیا، فرمایا:

((إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَاِذَا تَوَكَّلْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ))

''جب مانگو اللہ سے مانگو، جب مدد چاہو اللہ سے چاہو اور جب بھروسہ رکھو اللہ پر بھروسہ رکھو۔''

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۵۱۶]

جب مانگو تو اللہ سے مانگو، کیونکہ مانگنے والے سے کیا مانگنا؟ ایک آدمی بھیک مانگ رہا ہو اور اس سے جا کر بھیک مانگو تو یہ کوئی عقل کی بات ہے؟ بلکہ اس سے مانگو جو مانگنے والا نہیں ہے، بلکہ دینے والا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذوقِ یقین:

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا وفد آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ [ھود:٦]

"اور کوئی (رزق کھانے والا) جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو۔"

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے قرآن سنا اور خاموشی سے چلے گئے تو ان کے ساتھیوں نے کہا کہ ہم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگنے آئے تھے۔ تو انہوں نے فرمایا: جب اللہ فرماتے ہیں کہ ہر جاندار کو ہم رزق دیتے ہیں تو پھر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیوں مانگوں؟

[الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ۹/۷، ھود: الآیۃ: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا]

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ:

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کی بادشاہت کے زمانہ میں ایک آدمی ان سے کچھ لینے کے لیے آیا تو بادشاہ (حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ) نے اعزاز و اکرام کیا اور اس کو خصوصی مہمان خانہ میں ٹھہرایا، کیونکہ وہ دوست تھا۔ تو اس کو بادشاہ نے اپنے ساتھ والا بیڈ روم دیا کہ میرا دوست ہے تو میں اس کا اعزاز کروں، اس کا اکرام کروں۔ جب تہجد کی گھڑی آئی تو اس کو کچھ آواز آئی اور اس نے کان لگائے تو بادشاہ کے کمرے سے آواز آرہی ہے، اس کا سر سجدے میں ہے اور وہ اللہ سے مانگ رہا ہے کہ یا اللہ! میرے ملک پر رحم فرما، یہ عطا فرما، رحمتیں عطا فرما اور رزق کی فراوانی عطا فرما۔ وہ بادشاہ کی دعائیں سنتا رہا۔ اس کے بعد اس نے بادشاہ کے پاس دو تین دن قیام کیا، پھر اس سے اجازت مانگی۔ بادشاہ نے کہا: تم میرے بے تکلف دوست ہو، اتنے عرصے سے تم آئے نہیں، اب آئے تھے تو کوئی کام تھا؟ اس نے کہا کہ آیا تو ایک کام کے لیے تھا، لیکن اب میرا کام ہو گیا۔ بادشاہ نے کہا: تم نے وہ کام بتایا ہی نہیں تو وہ کام کیسے ہو گیا؟ تو اس نے بتایا کہ میرے حالات خراب تھے، میں آپ سے کچھ مانگنے کے لیے آیا تھا، لیکن میں نے رات کو دیکھا کہ آپ خود بھی کسی اور سے مانگ رہے ہیں تو میں نے سوچا کہ میں بھی اسی سے کیوں نہ مانگوں جس سے بادشاہ مانگ رہا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ ہاں! دینے والا تو اللہ ہی ہے۔ تو اس نے کہا کہ میں بھی اسی

سے ہی لوں گا، مجھے آپ کے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔

حاصلِ کلام:

اس لیے یاد رکھیں! ہر چیز اللہ کے توکل سے حاصل کریں، اسی سے مسلمان اور کافر میں فرق ہے۔ موت مسلمان کے گھر میں بھی آتی ہے اور کافر کے گھر میں بھی، رزق مسلمان کو بھی ملتا ہے اور کافر کو بھی، غم مسلمانوں کو بھی آتا ہے اور کافروں کو بھی، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ مسلمان کو جب بھی مصیبت آتی تو وہ کہتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ﴾ [النساء:۷۹]

"(اے انسان!) تجھ کو جو کوئی خوشحالی پیش آتی ہے وہ محض اللہ کی جانب سے ہے اور جو کوئی بدحالی پیش آوے وہ تیرے ہی سبب سے ہے۔"

جب راحت ملتی ہے تو کہتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ [النحل:۵۳] (اور تمہارے پاس جو کچھ بھی نعمت ہے وہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہے)۔ موت آتی ہے تو کہتا ہے: اللہ کا فیصلہ ہے، اس کو کون ٹال سکتا ہے؟ وہ ان چیزوں کا تعلق اللہ سے جوڑے گا، لیکن کافر ان چیزوں کا تعلق اسباب کے ساتھ جوڑے گا۔

"بِسْمِ اللّٰهِ" کا سبق کیا ہے؟

یاد رکھیں! "بِسْمِ اللّٰهِ" نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ ہر چیز اللہ کی مدد اور استعانت سے حاصل کرنی ہے۔ دیکھیں! چھوٹی سی آیت کے اندر کتنی بڑی اکسیر ہے۔ پانی پینے لگو تو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھو، کھانا کھانے لگو تو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھو، کپڑے پہننے لگو تو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھو، مسجد میں قدم رکھنے لگو تو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ یا "بِسْمِ اللهِ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللهِ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ، وَافْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ فَضْلِكَ." پڑھو۔ تو ہمیں ہر وقت اس چھوٹی سی آیت سے یہ سبق مل رہا ہے کہ کھانا حاصل ہوا ہے تو اسی کی طرف سے، پینا حاصل ہوا ہے تو اسی کی طرف سے، صحت ہے تو اسی کی طرف سے اور طاقت ہے تو اسی کی طرف سے۔ ہر چیز اسی کی استعانت سے حاصل ہو رہی ہے۔

بعض علماء نے ایک اور بات بھی لکھی ہے، اگر چہ وہ حدیث میں نہیں ہے، لیکن بزرگوں کے تجربات ہیں۔ بعض لوگوں کے ذہنوں پر اتنا جماد ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ ہمیں یہ لفظ قرآن و حدیث کے اندر دکھاؤ۔

حضور ﷺ کا ارشاد اللہ کا حکم ہے:

جیسے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک بی بی کو بھنوؤں کے چننے اور ان کو باریک کرنے سے منع فرمایا کہ اللہ کا حکم ہے تو وہ بی بی چلی گئی اور دو دن کے بعد آئی اور کہا کہ آپ تو صحابی ہیں، میں نے تو سارے قرآن کے اندر دیکھا، لیکن میں نے کہیں بھی نہیں پایا کہ بھنویں نہ بناؤ، کسی جگہ نہیں لکھا ہوا کہ بالوں کو لمبا نہ کرو، سنگھار نہ کرو۔ تو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: معلوم ہوتا ہے کہ تو نے تو قرآن پڑھا ہی نہیں۔ اس نے کہا: کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟ آپ نے فرمایا: اگر پڑھا ہوتا تو سمجھ بھی آ گئی ہوتی، یہ بتاؤ ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝﴾ [الحشر:۷] (اور رسول ﷺ تمہیں جو کچھ دے دیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس چیز (کے لینے) سے تمہیں روک دیں تم رک جایا کرو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ تعالیٰ (مخالفت کرنے پر) سخت سزا دینے والا ہے۔) قرآن پاک میں ہے یا نہیں ہے؟ تو اس نے کہا کہ ہاں یہ قرآن پاک میں ہے۔

اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ [النساء:۸۰] (جو رسول کی اطاعت کرے، اس نے اللہ کی اطاعت کی)۔ کیا یہ قرآن میں ہے؟ اس نے کہا جی ہے۔

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝﴾ [آل عمران:۱۳۲] (اور اللہ اور رسول کی بات مانو، تاکہ تم سے رحمت کا برتاؤ کیا جائے)۔ کیا یہ بھی قرآن میں ہے؟ اس نے کہا: جی ہے۔

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ [النساء:۵۹] (پھر اگر کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو تو تم اس امر کو اللہ تعالیٰ اور رسول کے حوالے کر دیا کرو)۔ اور کیا یہ بھی قرآن میں ہے؟ اس نے کہا: جی ہے۔

تو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان چیزوں سے اللہ کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے تو گویا یہ قرآن میں ہے۔ تو اب اس عورت کو بات سمجھ آئی۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۴۸۸۶، باب: وما آتاكم الرسول فخذوه]

فراخئ رزق کا وظیفہ:

بہرحال بات ہو رہی تھی کہ بعض علماء نے فرمایا کہ اس آیت کے اندر اتنی تاثیر ہے کہ جس آدمی کے رزق میں تنگی

ہے، کاروبار میں تنگی ہے وہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کو جس قدر ہو سکے کثرت سے پڑھے۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھتا رہے۔ یہ ایسی آیت ہے۔ جیسے اردو میں محاورہ ہے کہ ہتھیلی پر سرسوں جمانا۔ یقین کامل ہو تو آپ ایک مہینہ کے اندر انقلاب دیکھیں گے۔ جس شخص نے اس کو یقین کے ساتھ پڑھا وہ ضرور برکت حاصل کرے گا۔

''بِسْمِ اللّٰهِ'' میں دنیا و آخرت کی سب بھلائیاں ہیں:

اس میں لفظ ''اللّٰہ'' ہے۔ فرمایا: آپ پوری کائنات پر نظر ڈالیں تو وجودِ باری تعالیٰ پر نظر پڑے گی۔ اور جب وجودِ باری تعالیٰ پر نظر ڈالیں گے تو وجودِ کائنات کے بارے میں علم ہوگا۔ آگے صفت ''الرَّحْمٰنِ'' ہے کہ اس کی رحمت مسلمانوں پر بھی ہے اور کافروں پر بھی ہے۔ اس سے دنیاوی فوائد حاصل ہوں گے۔ اور جب ''الرَّحِيْمِ'' پر نظر ڈالیں گے تو سارے فوائدِ اخروی وہاں سے حاصل ہوں گے۔ اس لیے ان تین چیزوں کے اندر ساری چیزیں آگئیں: فوائدِ دنیاوی بھی آگئے اور فوائدِ اخروی بھی آگئے۔ اس کے بعد غور کریں کہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ میں لفظ ''اللّٰہ'' ایک ہے اور صفتِ رحمت کے دو لفظ ہیں۔ تو یہ اس بات کی دلیل ہوئی جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''إِنَّ رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي'' (میری رحمت میرے غضب پر سبقت کرگئی)۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۵۳، باب: قَوْلِهِ تعالیٰ: وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا...]

''تعوذ'' اور ''تسمیہ'' کا مقصد:

اس درس کے اندر ہم نے اب تک دو چیزیں پڑھ لیں: ''أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' اور ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ''۔ تو یاد رکھیں! ہر بندے کے اندر دو جذبے ہوتے ہیں: جذبۂ غضب اور جذبۂ محبت۔ اللہ نے ہمارے اندر جو غضب رکھا ہے تو اس کو نکالنے کے لیے کوئی راستہ ہوگا۔ جیسے قوتِ شہوانیہ رکھی تو اس کو نکالنے کا حل دیا کہ شادی کرلو۔ اگر ایک سے گزارہ نہیں ہے تو دو کرلو، تین کرلو، چار کرلو۔ اب قوتِ غضبیہ نکالنے کے لیے ہمیں ''أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' سکھایا کہ تیرا غصہ تیری عداوت تین چیزوں سے ہو: شیطان سے بھی عداوت ہو، شیطان کے دوستوں سے بھی عداوت ہو اور شیطانی اعمال سے بھی عداوت ہو۔ یہ ہمیں تعوذ نے سبق دیا۔ اور ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کے اندر جذبہ محبت ہے۔ تو محبت کس سے ہو؟ فرمایا: ''رَحْمٰنِ'' سے، ''رَحْمٰنِ'' کے دوستوں سے محبت ہو تب جا کر تم مکمل انسان بنو گے۔ اس کے اندر اللہ نے ہمیں سبق دیے جو اخلاقی بھی ہیں، روحانی

بھی ہیں، سیاسی بھی ہیں، مادی بھی ہیں، دنیاوی بھی ہیں اور ان کے فوائد اخروی بھی ہیں۔

اس لیے حدیث مبارک کے اندر آیا کہ جس کام کو "بِسْمِ اللّٰهِ" سے شروع نہ کرو وہ کام بالکل ناقص ہوتا ہے۔ مکمل تب ہوگا جب ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کو پڑھو گے۔ جب کھانے پر ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کو پڑھا تو اس کھانے میں شیطان دخل نہیں دے سکتا، اس کھانے میں شریک نہیں ہوسکتا، حتیٰ کہ وہاں جتنے شیطان ہوتے ہیں ان کو کہا جاتا ہے کہ یہاں سے بھاگ جاؤ، یہاں سے تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ اور جس چیز پر "بِسْمِ اللّٰهِ" نہیں پڑھی اس پر شیطان کا تصرف ہوگا۔ تو اللہ نے ہمیں یہ دو نعمتیں عطا فرمائی ہیں: ایک کا نام "تَعَوُّذ" اور دوسرے کا نام "تَسْمِيَة" ہے۔

تنبیہ:

گذشتہ مضامین میں تعوذ اور تسمیہ کے بارے میں چند مباحث، حکم اور تفصیلات پڑھیں اور آج سورۃ فاتحہ کے بارے میں پڑھیں گے۔ تاکہ اللہ کے قرآن کو سنتے ہوئے یا پڑھتے ہوئے جب اس کو سمجھیں گے تو قرآن دل میں اترے گا اور اثر کرے گا۔

اہلِ عرب پر اللہ کا خاص احسان:

عرب لوگوں پر اللہ کی نعمت ہے کہ ان کو لغت پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اس کا مطلب جو واضح ہوتا ہے سمجھ لیتے ہیں، باریکیاں ان کو ان کے علماء سمجھاتے ہیں۔ جب قرآن پڑھا جا رہا ہوتا ہے تو ان کو اس کا مطلب سمجھ میں آجاتا ہے۔

ہندوستان میں فہمِ قرآن کا ذوق:

جیسے ہندوستان میں اب...... ماشاء اللہ...... یہ سلسلہ شروع ہو چکا ہے کہ رمضان کے اندر امام تراویح کے اندر جتنا قرآن پڑھتے ہیں، اس کا خلاصہ بیان کرتے ہیں، تاکہ لوگوں کو پتا چلے کہ آج ہم نے کیا سنا ہے؟ اور تاکہ تراویح کا معنیٰ بھی پورا ہو جائے۔

تراویح ترویحہ سے ہے۔ معنیٰ ہے آرام و سکون۔ تو چار رکعت کے بعد اس کا خلاصہ بھی ہو جاتا ہے اور آرام بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً چار رکوع پڑھے، کیونکہ ہمارے ہاں ایک رکوع پر رکعت ہو جاتی ہے۔ اس لیے تو رکوع کو رکوع کہتے

ہیں، کیونکہ رکوع ہو جاتا ہے۔ تو وہ ان چار رکوع کا خلاصہ بیان کردے۔ اس سے تفصیل سمجھ نہیں آئے گی، لیکن کچھ نہ کچھ تو سمجھ آ جائے گا، جو نہ سمجھنے سے کروڑ درجہ بہتر ہے۔

تفسیر فاتحہ کی ضرورت:

اس ضمن میں ہم نے سوچا کہ چونکہ سورۂ فاتحہ ہر رکعت کے اندر پڑھی جاتی ہے تو اس کا معنی آ جائے، تا کہ ہماری نماز اچھی ہو جائے۔

نماز ہی دین کی اساس ہے:

عبادات میں نماز بنیادی چیز ہے۔ فرمانِ رسول عربی ہے:

((اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ)) [شعب الایمان، حدیث: ۲۸۰۷]

''نماز دین کا ستون ہے۔''

اور کہا گیا ہے:

((مَنْ أَقَامَہَا فَقَدْ أَقَامَ الدِّیْنَ وَمَنْ ھَدَمَہَا فَقَدْ ھَدَمَ الدِّیْنَ))

''جس نے اس ستون کو مضبوطی سے پکڑ لیا گویا پورا دین کھڑا ہو گیا اور جس نے اس کو گرا دیا گویا اس نے پورے دین کو گرا دیا۔'' [عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، ج: ۷، باب: قول اللہ تعالی: منیبین الیہ]

اور یہ بھی کہا گیا ہے:

''اَلصَّلٰوۃُ صِلَۃٌ بَیْنَ الْعَبْدِ وَبَیْنَ الرَّبِّ''

''نماز بندے اور رب کو جوڑنے والی ہے۔''

اگر نماز درست ہے تو اللہ سے تعلق بھی درست ہے، اگر یہ کمزور ہو تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تو اللہ سے تعلق اس وقت ہوگا جب نماز ہوگی، اگر نماز مضبوط نہیں ہوگی تو صلہ اور تعلق مضبوط نہیں ہوگا۔ اس لیے نماز کو معراج کہا گیا ہے۔

''نماز آنکھوں کی ٹھنڈک ہے'' کی عجیب تشریح!

ایک حدیث مبارک میں آتا ہے:

((وَجُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ)) [سنن النسائی، حدیث: ۳۹۴۰، باب: حب النساء]

''اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں بنائی گئی۔''

حضور ﷺ نے نماز کو راحت القلب نہیں فرمایا، راحتِ جان نہیں فرمایا، بلکہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک فرمایا ہے۔ یہ لفظ کہنے کی کیا وجہ تھی؟ علماء نے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ نماز میں احسان کا درجہ ہے کہ ((أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ)) (تم ایسے اللہ کی عبادت کرو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو) تو دیکھنے کا تعلق آنکھوں سے ہوتا ہے۔ تو جس کو ایسی نماز نصیب ہو جائے تو آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔ قرآن میں ہے:

﴿وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝﴾ [القیٰمۃ: ۲۲، ۲۳]

''بہت سے چہرے تو اس روز بارونق ہوں گے۔ اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنظُرُونَ ۝ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ۝﴾ [المطففین: ۲۲، ۲۳، ۲۴]

''[قیامت کے دن] نیک لوگ بڑی آسائش میں ہوں گے۔ آرام دہ نشستوں پر بیٹھے نظارہ کر رہے ہوں گے۔ ان کے چہروں پر نعمتوں میں رہنے سے جو رونق آئے گی، تم اسے صاف پہچان لو گے۔''

وجہ کیا ہے کہ جب اللہ کا دیدار ہو گا تو اس کے اثرات کیسے چہرے پر مرتب نہیں ہوں گے؟ اس لیے فرمایا:

﴿تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ۝﴾ [المطففین: ۲۴]

''اے مخاطب! تو ان کے چہروں میں آسائش کی بشاشت پہچانے گا۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝﴾ [عبس: ۳۸]

''اس روز کتنے چہرے تو (ایمان کی وجہ سے) چمکتے دمکتے ہوں گے۔''

قیامت کے دن ایسے چہرے بھی ہوں گے جو کھلے ہوئے ہوں گے، ہنسنے والے ہوں گے اور خوشیاں ان کے چہروں پر ٹپک رہی ہوں گی۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

بہت ساری دینی جماعتوں کی آج بھی یہی کوشش ہوتی ہے کہ لوگوں کی نماز ٹھیک ہو جائے، کیونکہ اگر یہ ٹھیک ہو گئی تو پورا دین ٹھیک ہو گیا، پورے اعمال ٹھیک ہو گئے۔ اگر نماز ٹھیک ہو گئی تو اللہ سے بندے کا تعلق جڑ گیا اور

جب بندے کا اللہ سے تعلق جڑ جائے، جب مخلوق اپنے خالق سے جڑ جائے تو نماز ٹھیک ہوگی اور نماز تب ٹھیک ہوگی جب بندے کو پتا ہو کہ میں نماز میں کیا پڑھ رہا ہوں؟ نماز میں حلاوت اور کشش کیسے پیدا ہوگی؟ راحت کیسے پیدا ہوگی؟ ہم نماز پڑھتے ہیں، لیکن اس کو سمجھتے نہیں ہیں، محض الفاظ دہرا لیتے ہیں، لیکن ہمیں پتا نہیں ہوتا کہ کیا پڑھ رہے ہیں؟ اور نماز میں بعض ایسی غلطیاں کرتے ہیں جن سے نماز نہیں ہوتی۔ قرآن پاک کے بعض اعراب میں اگر غلطی ہو جائے تو نماز ختم ہو جاتی ہے، بلکہ بعض اعراب کی غلطی سے بندہ کافر ہو جاتا ہے۔ جیسے اسی سورۂ فاتحہ میں آپ پڑھتے ہیں:

﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾[الفاتحہ:٦]

''رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے۔''

''أَنْعَمْتَ'' میں ''تَ'' پر زبر ہے۔ اگر پیش پڑھ کر ''أَنْعَمْتُ'' پڑھ لیا تو معنی کیا ہوگا کہ جن پر میں نے انعام کیا ہے۔ تو نتیجہ کیا نکلے گا کہ بندہ کافر ہو جائے گا۔ کبھی ایک اعراب سے اور کبھی ایک حرف سے بھی معنی بدل جاتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا نماز میں دل نہیں لگتا۔ یاد رکھیں! نماز پڑھنا فرض ہے، چاہے دل لگے یا نہ لگے۔ باقی دل کیسے لگے گا؟ جوں جوں اصلاح ہوگی دل لگ جائے گا۔ اور اصلاح کیسے ہوگی؟ جب آپ قرآن پڑھیں گے اور آپ کو ہر ہر لفظ کا پتا ہو کہ اس کا معنی کیا ہے؟ دیکھیں! ہم ''اَللّٰهُ اَكْبَرْ'' کہتے ہیں تو کتنے بھائی ہیں کہ جن کو اس کا معنی ہی نہیں آتا۔ اب ''اَكْبَرْ'' بظاہر اسم تفضیل کا صیغہ ہے کہ اللہ بہت بڑا ہے۔ تو کیا معنی...... معاذ اللہ!...... کوئی اور چھوٹا خدا بھی ہے؟

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝﴾[المدثر:٣]

''اپنے رب کی بڑائی بیان کرو، اپنے رب کو بڑا سمجھو۔''

اب یہ کیسے ہوگا؟ جب بندے کو ''اَللّٰهُ اَكْبَرْ'' کا معنی ہی نہ آتا ہو تو اس کا دل کیسے لگے گا؟ اب اس کو یہ بھی پتا نہیں کہ تسبیح ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ'' کا کیا معنی ہے؟ تسبیح اور تحمید میں کیا فرق ہے؟ ''تَبَارَكَ'' کا کیا معنی ہے؟ ''جَدُّكَ'' کا کیا معنی ہے؟ تو نماز کیسے اچھی ہوگی؟

ایک بڑے پیر کو عید کی نماز بھی نہیں آتی تھی:

ایک دفعہ عید کے موقع پر بہت بڑا اجتماع تھا۔ بریلوی بھی بہت تھے اور دیوبندی بھی بہت تھے اور دونوں کے

امام آ گئے۔ دونوں طرف کے لوگوں کی خواہش تھی کہ ہمارا امام نماز پڑھائے۔ اب اندیشہ پیدا ہو گیا کہ لوگ لڑ پڑیں گے۔ وہاں ایک پیر صاحب بھی آئے ہوئے تھے اور وہ بہت بڑے گدی نشین بھی ہیں۔ لوگوں نے سوچا کہ لڑائی سے بچنے کا کوئی نہ کوئی حل ہونا چاہیے۔ تو چند ایک نے کہا کہ مولوی صاحب! مہربانی کرو، یہاں خوشی کے دن خون خرابہ نہ ہو جائے، تم دونوں نماز نہ پڑھاؤ۔ جب یہ سید بھی ہے، پیر بھی ہے اور اصول بھی ہے کہ جب قریشی موجود ہو تو کوئی اور امام کیوں بنے؟ تو ان دونوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ تو پیر صاحب کے پاس گئے کہ اب اس فتنہ کا حل یہ ہے کہ آپ نماز عید پڑھا دیں۔ اس نے کہا: کوئی عالم پڑھا دے، میں مناسب نہیں سمجھتا...... وجہ یہ تھی اس کو نماز عید آتی ہی نہیں تھی...... اب بظاہر تو وہ تواضع کر رہے تھے، لیکن لوگوں نے ان کو کھڑا کر دیا...... نماز آئے گی تو پڑھائیں گے۔ اب اس غریب کو پتا نہیں تھا کہ نماز عید کی تکبیریں کتنی ہیں؟ اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ چھوڑنے ہیں یا باندھنے ہیں؟...... تو اب یہ ہوا کہ اللہ کی مہربانی سے اس نے چار تکبیروں سے نماز عید پڑھائی۔ اس نے سمجھا کہ جیسے جنازے کے اندر چار تکبیریں ہوتی ہیں ایسے ہی عید ہے۔

جنازہ میں فاتحہ پڑھنے والوں کا رد:

ایک آدمی مولوی صاحب کے پاس جنازہ پڑھ کر قریب آیا اور کہا کہ میں نے آپ کے ساتھ نماز جنازہ پڑھی ہے، آپ نے نماز کے اندر سورہ فاتحہ نہیں پڑھی۔ اس نے کہا: میں جاہل آدمی ہوں اور ابتداء ہی سے ہم نے جن آدمیوں سے دین سیکھا ہے خوش قسمتی سمجھو یا بدقسمتی سمجھو کہ انہوں نے ہمیں یہی سمجھایا ہے، اس لیے میں نہیں پڑھتا۔ اس نے کہا کہ یہ تو ٹھیک نہیں، کیونکہ جنازہ نماز ہے اور بڑی نماز میں چار رکعت ہوتی ہیں اور یہاں چار تکبیریں ہوتی ہیں اور نماز بغیر فاتحہ کے نہیں ہوتی۔ تو اس نے کہا: آپ ایک دفعہ کیوں فاتحہ پڑھتے ہیں؟ جب چار دفعہ تکبیریں ہیں تو فاتحہ بھی چار دفعہ پڑھا کریں۔ ہم تو آئندہ چار دفعہ پڑھیں گے۔ اس نے کہا کہ نہیں ایک دفعہ پڑھنی ہے۔ تو اس مولوی صاحب نے کہا: جب چار دفعہ نہیں تو پھر ایک دفعہ بھی نہیں، کیونکہ یہ نماز تو ہے نہیں، نماز تو بغیر رکوع وسجود کے ہوتی نہیں ہے۔ اگر کوئی نماز بغیر رکوع وسجود کے دکھا دیں تو پھر میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔ تو اس کو صلوٰۃ کہا گیا ہے، وگرنہ ایک دعا ہے، تا کہ یہ اس کی بخشش کا ذریعہ بھی اور مانگنے والوں کی بخشش کا ذریعہ بھی بن جائے۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بعض اوقات ایسے ہوتا ہے کہ میت کی بخشش جنازہ پڑھنے والوں کی وجہ سے ہو جاتی ہے اور بعض میتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی نماز جنازہ پڑھنے والے ان میتوں کی وجہ سے بخشے جاتے ہیں۔

نماز کا ترجمہ ضرور سیکھیں:

بہر حال! میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم جو کچھ نماز میں پڑھتے ہیں ہمیں اس کا مطلب اور ترجمہ آ جائے۔ اور اس کا آسان حل یہ ہے کہ کوئی نماز مُتَرجَم نماز لے لیں۔ اور یہ بھی خیال رکھیں کہ بعض حضرات نماز مُتَرجَّم کہہ دیتے ہیں۔ یہ غلط ہے، بلکہ نماز مُتَرجَم ہے۔ اگر جیم کے شد کے ساتھ پڑھیں تو معنی ہو گا کہ پتھر ماری ہوئی اور بغیر شد کے پڑھیں تو معنی ہو گا ترجمہ کی ہوئی۔ تو دیکھیں! چھوٹے سے فرق سے کتنا بڑا فرق پیدا ہو گیا۔

ویسے تو میرا عقیدہ ہے کہ جو اس کے دروازے پر آیا وہ واپس نہیں جائے گا۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے نماز سیکھنے کا حکم تو دیا ہے۔ لہٰذا مترجم نماز کی کتاب لیں اور جو نماز میں الفاظ پڑھے جاتے ہیں اس کے ترجمے کو بار بار دہرائیں۔ ایک دفعہ سے ترجمہ نہیں آئے گا۔ جہاں اشکال پیدا ہو، سمجھ نہ آئے تو اپنے علماء سے رجوع کر لیں کہ حضرت! میں نے ترجمہ لے کر یاد کر لیا ہے، لیکن یہ تھوڑا سا سمجھ نہیں آ رہا، سمجھا دیں۔

دوسرا علیحدگی کے اندر آپ نماز پڑھتے ہیں اور جو سورتیں یاد ہیں اکثر ان کو نماز میں دہراتے رہتے ہیں، ان کا ترجمہ بھی قرآن کی تفسیر میں دیکھیں اور بار بار دہرائیں، چاہے آپ کو پہلی دفعہ سمجھ آ جائے۔ جوں جوں ترجمہ دیکھو گے تو قرآن کا معجزہ دیکھنا کہ قرآن کی ایک حلاوت پیدا ہو گی، قرآن سینے میں اترنا شروع ہو جائے گا۔

میں نے اپنے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ ۹۰ سال کی عمر میں قرآن کا ترجمہ لے کر بیٹھے ہوتے تھے۔ تو میں بھی اپنی جہالت سے ہنستا تھا کہ 80 سال جس بندے نے قرآن کی تفسیر پڑھائی ہو، اب قرآن کا ترجمہ لے کر بیٹھے ہوئے ہیں، جس نے کوئی تفسیر نہ چھوڑی ہو، مخطوطات بھی پڑھ ڈالے ہوں وہ ترجمہ والا قرآن لے کر ترجمہ دیکھ رہا ہے۔ تو مجھے اشکال پیدا ہوتا تھا تو میں سوچتا کہ اصل بات یہ ہے کہ ان کو اپنے استاد سے محبت بڑی تھی، کیونکہ وہ تفسیر عثمانی کا ترجمہ تھا، (اور علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ میرے والد رحمۃ اللہ علیہ کے استاد تھے۔) تاکہ میرے استاد کو ثواب پہنچے۔ تو میں نے ایک دفعہ پوچھ لیا کہ حضرت! اتنا عرصہ ہو گیا، کیا ابھی بھی آپ کو ضرورت ہے کہ آپ ترجمہ والے قرآن کو دیکھیں؟ کہنے لگے: بیٹا! اللہ کی شان ہے کہ اللہ نے ان کو اتنا علم دیا تھا کہ جو مسئلہ ساری تفسیروں سے حل نہیں ہوتا ان کے ترجمے سے حل ہو جاتا ہے، لیکن تمہیں علم ہو تو ان کے ترجمے سے فائدہ اٹھاؤ گے، جب تمہیں خود کچھ نہیں آتا کہ ''ہی'' اور ''بھی'' میں کیا فرق ہے؟ جب تمہیں علم ہو کہ مفعول مطلق کیا ہوتا ہے؟ مفعول مالم یسم فاعلہ کیا ہوتا ہے؟ بدل الکل، بدل البعض اور بدل الاشتمال کیا ہوتا ہے؟ مفعول معہ کیا ہوتا ہے؟ جب پتا ہو گا تو ترجمے سے فائدہ اٹھاؤ

گے۔ یہ طوطے کی طرح ہوا کہ آپ اس کو زبان سکھادیں، وہ کہتا رہتا ہے: چوری، چوری۔ حالانکہ اس کو پتا نہیں ہوتا کہ چوری کس سے بنتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ہم بھی لفظ پڑھتے ہیں، لیکن ان کا مطلب نہیں آتا۔ جس گھر میں نماز درست ہوجائے گی فساد ختم ہوجائے گا۔ تجربہ کرکے دیکھ لیں، لیکن شرط یہ ہے کہ بیگم کو نماز کا کہنے کی ہمت ہو۔ ایک آدھ دن روٹی نہ ملے تو صبر کرلینا۔ لیکن عورت بڑی سمجھدار ہوتی ہے روٹی پھینکے گی، دے گی تو نہیں، آپ کے گلے سے نکالے گی۔ آدھی کچی ہوگی اور آدھی پکی ہوگی۔

علم تکرار کرنے سے آتا ہے:

گھر والوں کی نمازیں درست کرو۔ اور اس کا طریقہ آسان ہے کہ مترجم نماز لے لیں۔ امام کعبہ کو دیکھتے ہو کہ کتنی دیر رکوع اور سجود کرتے ہیں، اتنی دیر لگاؤ۔ حالانکہ وہ جلدی کرتے ہیں، کیونکہ ان کے پیچھے مخلوق ہے، کوئی ضرورت والا ہے۔ نماز کے فرائض یاد کریں، پھر واجبات یاد کرائیں۔ ایک دن میں یاد نہ کرائیں۔

ہم والد صاحب کی خدمت کرتے تھے۔ اس وقت ہم نے دورہ حدیث کرلیا تھا تو والد صاحب کہتے کہ باب "تتبع" سناؤ۔ ہم کہتے کہ عجیب بات ہے! ہم نے پڑھ لیا ہے اور یہ ہم سے پہلی کلاس کا باب سن رہے ہیں۔ پھر دوسرے دن پوچھتے: "یَعْلَمُ" کیا صیغہ ہے؟ "یُفْلِحُوْنَ" اور "یَفْلَحُوْنَ" میں کیا فرق ہے؟ اب ہم جواب دیتے تھے، لیکن دل میں سوچتے کہ ابھی تک ہمیں بچہ سمجھا ہوا ہے۔ اب آکر ہم پر راز کھلا کہ ان کی یہ محنتیں تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ یہ نالائق طالب علم ہیں، پڑھیں گے تو نہیں، ان سے یہ سنو، تاکہ اس کو دہراتے رہیں۔ تو اس کا فائدہ یہ ہوا کہ پینتیس سال پہلے جو ہم نے پڑھا تھا وہ آج بھی...... الحمدللہ!...... یاد ہے۔

باء و تاء و کاف و لام وَاوْ مُنذُ، مُذْ، خَلَا
رُبَّ، حَاشَا، مِنْ، عَدَا، فِیْ، عَنْ، عَلٰی، حَتّٰی، اِلٰی

آج بھی شعر یاد ہے۔ حالانکہ قرآن تھوڑا ہے؟ بس کیا ہے کہ بار بار اساتذہ نے یاد کرواکے، رٹا لگواکے، گھول کر ذہن میں ڈال دیا ہے۔ نیند میں بھی کبھی "ضَرَبَ، یَضْرِبُ" یاد آجاتا ہے۔

اباجی کا شوقِ علم:

میرے والد صاحب خود سناتے تھے کہ میں یہ باب پڑھ رہا تھا اور کتے نے کاٹا اور بوٹی نکال لی، خون بہتا رہا۔ جب مدرسہ میں آیا تو لڑکوں نے کہا کہ یہ آپ کو کیا ہے؟ میں نے کہا کہ مجھے پتا ہی نہیں لگا۔ یہ شوق ہوتا تھا۔

صحیح نماز کی برکات:

اس طرح گھر میں نماز پڑھاؤ۔ جس دن تمہارے گھر نماز درست ہوگئی سارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے، تمہارے گھر کے اندر برکات بھی ہوں گی، اللہ تعالیٰ رزق میں بھی برکتیں ڈالیں گے اور اولاد کی صحت و عمل میں بھی برکتیں ڈالیں گے۔ اور گھر میں جو تناؤ ہوتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ذکر نہیں آیا، جب اللہ کا ذکر آیا تو پریشانی ختم ہوئی۔ میرے مدنی پاک ﷺ کو کوئی پریشانی آتی تو فوراً نماز پڑھتے۔ اللہ اکبر!

دیکھیں! آپ کا آئی جی سے رابطہ ہو، پھر تھانیدار آپ کو بلائے تو آپ کہتے ہیں: جاؤ جاؤ! میں نے آئی جی سے رابطہ کرلیا ہے۔ تو اسی طرح جب اللہ سے تعلق ہو گیا تو مخلوق کی کیا طاقت ہے کہ آپ اس سے ڈرتے پھریں۔

سورۂ فاتحہ پہلی سورت کیسے ہے؟

اب سمجھیں کہ سورۂ فاتحہ قرآن کی سب سے پہلی سورت ہے۔ آپ کہیں گے کہ قرآن کی تو پہلی سورت ''سورۃ العلق'' ہے، اس کے بعد ''سورۃ المدثر'' ہے تو ''سورۂ فاتحہ'' پہلی سورت کیسے ہوئی؟

جواب:

صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ جو کامل سورت سب سے پہلے حضور ﷺ پر اتری وہ سورۂ فاتحہ ہے۔ سورۃ العلق کی تو اوّل اوّل چند آیات اتری ہیں، مکمل نہیں اتری تھی۔ اور نماز میں سب سے پہلے پڑھی جانے والی سورت بھی سورۂ فاتحہ ہے۔ اسی طرح دیکھیں! سورۂ فاتحہ جس طرح فاتحہ ہے وہاں اللہ نے اس کو ''اَلْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ'' بھی فرمایا ہے اور اس کا نام ''سَبْعٌ مَثَانِيْ'' بھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝﴾ [الحجر: ۸۷]

''اور ہم نے تمہیں سات ایسی آیتیں دے رکھی ہیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور عظمت والا قرآن عطا کیا ہے۔''

سورۂ فاتحہ کے کئی نام ہیں:

اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا: جس طرح اس سورت کا نام ''فَاتِحَةٌ'' ہے اسی طرح ''شَافِيَةٌ'' بھی ہے، ''رَافِعَةٌ'' بھی ہے، ''كَافِيَةٌ'' بھی ہے، ''كَنْزٌ'' بھی ہے اور ''اُمُّ الصَّلٰوةِ'' بھی ہے۔ سورۂ فاتحہ کے کئی نام ہیں جو

ہمیں روایات میں ملتے ہیں۔تو سورۂ فاتحہ عظیم سورت ہے۔

دو نور:

صحیح حدیث مبارک میں ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے مجھے دو نور عطا فرمائے ہیں۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ وہ دو نور کیا ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کی آخری آیات۔
[صحیح مسلم، حدیث: ۸۰۶، بَابُ فَضْلِ الْفَاتِحَةِ، وَخَوَاتِيمِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ]

سورۂ فاتحہ سے عذاب ٹل گیا:

اسی طرح حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کسی مقام پر اللہ کا عذاب نازل ہونے کا فیصلہ ہوگیا اور اس بستی میں ایک بچے نے فاتحہ شروع کی تو اللہ نے فرمایا: ملائکہ! اس بستی سے عذاب اٹھالو، میں اس بستی پر عذاب نازل نہیں کرتا جہاں فاتحہ پڑھی جائے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک آدمی کو قبر میں عذاب ہورہا تھا، اس کا بچہ مسجد میں گیا، مدرسہ میں گیا۔ جب اس نے پڑھنا شروع کیا: ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝'' اللہ نے فرمایا: اس بندے سے قبر میں عذاب ہٹالو، مجھے حیا آتی ہے کہ اس کا بچہ فاتحہ پڑھے اور میں اس پر عذاب بھیجوں۔

یہ شان والی سورت ہے۔ اس کی عظمتوں کا اندازہ اسی کو ہوسکتا ہے جو اس کے معانی کو سمجھتا ہے۔

سارا قرآن فاتحہ کی شرح ہے:

بعض علماء نے فرمایا: غور کریں تو سارے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا: غور کریں تو پورے قرآن کا متن سورۂ فاتحہ ہے، باقی سارے قرآن میں اللہ نے اسی سورت کی شرح بیان فرمائی ہے۔

سورۂ فاتحہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم کا دم اور ہدیہ لینا:

قرآن فرماتا ہے:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الاسراء: ۸۲]

''اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے حق میں شفا اور رحمت ہے۔''

اگر قرآن روحانی بیماریوں کی شفا ہے تو جسمانی بیماری کیا حیثیت رکھتی ہے؟

صحیح حدیث مبارک میں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کا بستی سے گزر ہوا، انہوں نے ان بستی والوں سے کہا کہ ہم مسافر ہیں، مہمان ہیں۔ اور ان صحابہ نے بستی والوں سے مہمانی مانگی تو انہوں نے انکار کر دیا۔ انہوں نے آ کر ایک طرف ڈیرہ لگا لیا۔ صحابہ کرام کی مقدس جماعت تھی کہ جو کچھ ہے اس پر گزارہ کریں۔ جب رات کا کافی حصہ گزرا تو بستی کے دو آدمی آئے جو بڑے پریشان تھے، انہوں نے کہا: ''هَلْ مِنكُمْ كَاهِنٌ؟'' (بھائی! کیا تم میں کوئی بندہ ہے جو منتر پڑھتا ہو؟) ہمارے سردار کو بچھو نے ڈنگ مار لیا ہے، وہ تڑپ رہا ہے اور کوئی دوائی نہیں، کوئی پڑھنے والا نہیں، ہم نے کہا کہ شاید تم میں کوئی پڑھنے والا ہو؟ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں دم کرتا ہوں۔ انہوں نے کہا: آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ انہوں نے فرمایا: مہربانی کوئی نہیں، ہم عوض لیں گے، تیس بکریاں لوں گا۔ میں پڑھوں گا، تمہارا سردار ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہارا سردار ٹھیک نہ ہوا تو نہ دینا۔

(یہاں سے مولوی صاحبان مسئلہ نکالتے ہیں کہ سب سے حلال وہی ہے جو تعویذ کا پیسہ ملے، حالانکہ یہ تعویذ نہیں ہے، یہ تو سورۂ فاتحہ ہے۔ تعویذ میں اختلاف ہے کہ لکھ کر گلے میں ڈالا جائے یا نہیں؟ راجح یہی ہے کہ نہیں، پڑھ کر دم کرنے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔) انہوں نے کہا: ہمیں منظور ہے۔ سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا تو ان کا سردار ٹھیک ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے تیس بکریوں کا وعدہ کیا ہے۔ اس سردار نے کہا: بالکل دے دو۔ اب وہ صحابی آئے تو بڑے خوش کہ اللہ پاک نے ہمارے لیے کیسے اسباب پیدا فرما دیے کہ یہ دعوت نہیں کرتے تھے، اللہ نے ان سے ہمیں تیس بکریاں دلوائیں۔ اب ان کو کھاتے ہیں۔ کچھ صحابہ نے کہا: ٹھیک ہے، لیکن کچھ صحابہ جو زیادہ محتاط تھے انہوں نے کہا: ہم نہیں کھاتے۔ اس صحابی نے کہا: کیوں میں نے یہ کوئی چوری کی ہیں؟ انہوں نے کہا: ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھیں گے۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے۔

کچھ بکریاں ذبح کر کے انہوں نے کھا لیں اور کچھ ساتھ لے کر آئے اور سارا واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے کیا پڑھا تھا؟ انہوں نے عرض کی: سورۂ فاتحہ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تمہیں کیسے پتا چلا کہ سورۂ فاتحہ پڑھنے سے بیمار ٹھیک ہو جائے گا؟ اس نے کہا: یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا تھا کہ اس کا نام شافیہ ہے تو یہ شفا دینے والی ہے تو اسی بات کو سامنے رکھ کر میں نے اس کو پڑھ دیا تو اللہ نے اس کو ٹھیک کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ٹھیک ہے جو تم نے لیا ہے وہ تم پر حلال ہے، اگر تمہارے پاس کچھ ہو تو میرا حصہ بھی دے

دو۔[صحیح البخاری، حدیث:۵۰۰۷، باب: فضل فاتحۃ الکتاب]

یہ حضور ﷺ نے ان کے اطمینانِ قلب کے لیے فرمایا، تا کہ صحابہ کے دل میں کسی قسم کی میل باقی نہ رہے کہ اگر اس میں شبہ ہوتا تو حضور ﷺ اس کے اندر کیسے حصہ ڈالتے؟ حضور ﷺ نے خود اس کو قبول فرمایا۔

ہر بیماری سے شفایاب ہونے کے دو طریقے:

میرا اپنا واقعہ ہے۔ اس کو پیری نہ بنانا، میں ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ بہر حال ایک آدمی جس کو میں جانتا نہیں تھا، اس نے مجھے خط لکھا کہ میں کینسر کا مریض ہوں اور آپ کا نام سنا ہے، میں آپ کو نہیں جانتا اور آپ مجھے نہیں جانتے۔ آپ مہربانی کریں! میرا فلاں افسر جو ہے وہ آپ کا نام بڑے ادب سے لیتا ہے۔ اس کو ایک خط بھیج دیں کہ اس بندے کو ایک مہینہ کی چھٹی دے دیں، اس لیے کہ چھٹی ملنی بہت مشکل ہے، کیونکہ میں بیماری کی وجہ سے بہت چھٹیاں لے چکا ہوں۔ اب میری تمنا ہے کہ میں عمرہ کرلوں۔ میں نے خط لکھ دیا کہ چلو! کسی غریب کا بھلا ہوتا ہے تو ٹھیک ہے۔ بعد میں میرے دماغ سے وہ بات نکل گئی۔ وہ بندہ آکر مجھے ملا، وہیل چیئر پر تھا، اس نے کہا کہ اللہ نے مہربانی کی ہے، مجھے چھٹی مل گئی ہے، چلو! عمرہ کرلوں، کسی وقت موت آجاتی ہے۔ یہ ایک تمنا تھی، حسرت تھی۔ میں نے کہا کہ میں آپ کو ایک چیز بتاتا ہوں کہ جتنے دن آپ آئے ہو، اس پر عمل کرو۔ اس نے کہا کہ فرمائیں! میں نے کہا کہ زم زم پیو اس نیت کے ساتھ کہ یہ شفا ہے اور ڈول کے ساتھ نہیں، بلکہ کنویں پر جا کر وہاں کھڑے ہو کر اتنا پیو اتنا پیو کہ یقین ہو جائے کہ اس سے زیادہ پیوں گا تو باہر نکل پڑے گا۔ اور اس کو سر پر، بدن پر اور جہاں جہاں کینسر کے اثرات ہیں اس پر بھی ڈالو۔

اور دوسرا عمل ایک بزرگ نے لکھا تھا کہ اگر کوئی بندہ بڑے سے بڑے موذی مرض کے اندر مبتلا ہو، جس کا کوئی علاج نہ ہو تو فجر کی نماز میں دو رکعت سنت پڑھنے کے بعد، ابھی فرض نہ پڑھے ہوں، اس دوران اگر کوئی بندہ درود شریف پڑھنے کے بعد ۴۱ مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھے اس نیت سے کہ یہ شفا ہے۔ اور اس کے پڑھنے کے دو طریقے لکھے ہیں:

⭘....ایک تو یہ کہ پہلے الگ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ پڑھیں، پھر ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ آخر تک پڑھیں۔

⭘....اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ''بِسْمِ اللّٰهِ'' کو سورۂ فاتحہ سے ملا کر پڑھیں اور ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ کی

میم پر زیر پڑھ کر اس کو "اَلْحَمْدُ" کی لام کے ساتھ ملا کر پڑھیں۔ مثلاً: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

اور آخر میں "اٰمِيْن" ضرور پڑھیں۔ اور یہ بھی خیال رکھیں کہ جب ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ امین پڑھیں تو مد پوری کھینچیں۔ پھر اس کے بعد درود شریف پڑھیں اور فرض کے بعد اس بیماری سے شفا کی دعا کریں۔ تو جتنی موذی بیماری ہو اور جس کا پوری دنیا میں علاج نہ ہو اس کو اگر آپ کر لیں تو...... اِنْ شَآءَ اللّٰهُ!...... شفا ہو گی۔ میں نے ان کو بتایا۔

پھر مجھے بات بھول گئی۔ میں کوئی پیر تو نہیں۔ میرے دماغ میں تھا کہ یہ قرآن ہے، اس کے شفا ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اگر بزرگوں نے لکھا ہے تو ٹھیک لکھا ہو گا۔

ایک مہینے کے بعد وہ بندہ ملا۔ جب پہلے ملا تھا تو وہیل چیئر پر تھا، اب وہ مجھے چلتے ہوئے ملا، کہنے لگا: اللہ کا شکر ہے کہ اب میں تین چار طواف چل کر کرتا ہوں، میرا وزن بھی بڑھ رہا ہے اور میری طبیعت بھی بحال ہو رہی ہے۔ واپس گیا اور دوبارہ چیک اپ کرایا تو ڈاکٹروں نے کہا کہ تمہیں تو کینسر ہے ہی نہیں، تمہاری پہلی رپورٹ غلط ہے یا تم بندے اور ہو۔ اس نے کہا: میں بندہ وہی ہوں۔ تو انہوں نے کہا: پھر کینسر کا علاج کیسے ہو گیا؟ اس نے کہا کہ یہ علاج مکہ میں ہوتا ہے، یہاں تو نہیں ہوتا اور میرا علاج تو وہیں ہوا ہے۔ باقی تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ اللہ کے قرآن کا اور اس سورت کے شفا ہونے کا ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ یقین ہو۔

سب سے پہلی سورت نماز میں پڑھی جانے والی فاتحہ ہے اور ام المسئلہ یعنی سب سے بہترین دعا اور سوال بھی فاتحہ ہے۔

سورۂ فاتحہ درخواست بھی ہے:

مثلاً: آپ کو کوئی پریشانی ہو تو آپ درخواست لکھیں تو ایک ہو گا درخواست لکھنے والا اور ایک وہ ہو گا جس کو درخواست لکھی جائے، یعنی مکتوب الیہ۔ پھر درخواست کسی خاص محکمے کی طرف لکھیں گے۔ اگر آپ ڈاکٹر ہیں تو محکمہ صحت والوں کو لکھیں گے اور اگر آپ ماسٹر ہیں تو ایجوکیشن میں لکھیں گے۔ اور چوتھی چیز کہ درخواست لکھنے والا اپنا بھی کچھ تعارف کراتا ہے کہ آپ کا فرمانبردار، آپ کا نیاز مند، آپ کا چاہنے والا، آپ کا دعا گو فلاں۔ اس کے بعد اپنا کام لکھتا ہے کہ میرا کام کیا ہے۔ یہ ساری چیزیں ہوں گی تب درخواست مکمل ہو گی۔

اب دیکھیں! سورۂ فاتحہ مسئلہ ہے اور لکھنے والا گویا پڑھنے والا ہے، چاہے لکھ کر درخواست کریں چاہے زبانی سوال کریں۔ اور کس کو لکھے گا؟ اللہ کی ذات کو۔ تو اب کون کون سے نکتے کو متوجہ کرتا ہے؟ تو علماء نے فرمایا کہ اگر دیکھا جائے تو اللہ کی ایک ایک صفت محکمہ کا تصور ہے۔ سب سے بڑی چیز کہ اس کے اندر اسم "اللہ" آ گیا اس کے لیے ضرورت ہے طاقت کی کہ طاقت ہوگی تو ملک بنائے گا۔ تو وہ کون ہے؟ اللہ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا﴾ [البقرة:١٦٥]

"تمام تر طاقت اللہ ہی کو حاصل ہے۔"

تو تمام مخلوق کو پیدا کرنے والا اللہ ہے۔

دوسری صفت ربوبیت ہے، اس کے بعد رحمتِ عامہ اور اس کے بعد رحمتِ تامہ کہ پوری کامل رحمت، جیسے ﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾ میں آ گئی۔ اب یہ دیکھا کہ اس کو پکار رہے ہیں تو کچھ اپنا بھی تو تعارف کرائیں تو ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور کسی سے مدد مانگتے ہی نہیں اور کسی کی طرف توجہ کرتے ہی نہیں، نہ کسی کو مدد دینے کے قابل تصور کرتے ہیں اور نہ عبادت کے لائق تصور کرتے ہیں۔ معبود بھی آپ ہی کی ذات ہے اور مدد کرنے والی بھی آپ ہی کی ذات ہے۔ تو یہ سارا کچھ کہنے کے بعد ہم نے درخواست کی: ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ کہ یا اللہ! ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما۔ اب صراطِ مستقیم کن کا راستہ ہے؟ فرمایا: ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ "الَّذِينَ أَنْعَمْتَ" میں کون تھے؟ تو اس کا جواب دوسری آیت میں ہے۔ فرمایا:

﴿وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا﴾ [النساء:٦٩]

"اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے: یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صلحاء اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔"

تو اس میں ہمیں یہ بھی سمجھ آ گئی کہ پہلے اسم جلالہ (اللہ) ہے، جو پیدا کرنے والا ہے۔ اور پیدا کرنے کے بعد باقی رکھتا ہے۔ اب گھر کو رکھتا ہے تو صفتِ ربوبیت ہے، پھر فوائدِ دنیاوی ہیں تو وہ صفتِ رحمٰن سے تقاضہ مل رہا ہے اور پھر فوائدِ اخروی ہیں تو وہ صفتِ رحیمیت سے ہمیں سبق مل رہا ہے۔ اور پھر اس کے انصاف پر یقین ہے: ﴿مٰلِكِ

يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ پھر اپنے تعلق کا اقرار ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ یہ سارا کچھ کرنے کے بعد کہ اس کے خالق ہونے کا اقرار، اس کی صفتِ ربوبیت کا اقرار، اس کی رحمتِ عامہ کا اقرار، اس کے ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ ہونے کا اقرار، اس کے معبود ہونے کا اقرار اور اس کی نصرت فرمانے اور نفع نقصان کے مالک ہونے کا اقرار۔ پھر ہم نے درخواست کی صراطِ مستقیم کی اور مستقیم کون سا راستہ ہے؟ جس پر تیرے انعام والے لوگ چلے ہیں۔ وہ کون ہیں؟ ''اَلنَّبِيِّيْنَ''، ''اَلصِّدِّيْقِيْنَ''، ''اَلشُّهَدَاءِ'' اور ''اَلصّٰلِحِيْنَ'' تو اس میں ہمیں سمجھ آیا کہ اے اللہ! ہم اس وقت آپ سے دنیاوی بھلائی نہیں مانگ رہے، ہم آخرت کی بھلائی مانگ رہے ہیں، کیونکہ ﴿الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ جتنے لوگ ہیں وہ دینی لوگ ہیں، دنیاوی لوگ نہیں ہیں۔ ہم یہ نہیں مانگ رہے کہ ہم فیکٹری لگالیں، مل لگالیں یا اتنے پیسے مل جائیں یا بینک بیلنس اور بڑھ جائے، بلکہ ہم تجھ سے اخروی فائدہ مانگنا چاہتے ہیں، اس پٹری پر آنا چاہتے ہیں جو ہمیں سید ھا جنت کی طرف لے آئے۔

اب دیکھیں! سورۂ فاتحہ کا نام ''اُمُّ الْمَسْئَلَة'' بھی ہے کہ سب سے بہتر سوال اور سب سے بہتر دعا کرنا اور مانگنے کا طریقہ صرف سورۂ فاتحہ میں ہے۔ اس سے جامع کوئی دعا اور طریقۂ سوال نہیں ہوسکتا۔ اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ سب سے جامع، مانع، کامل اور مکمل دعا سورۂ فاتحہ ہے۔ اسی سے ہمیں معلوم ہوا کہ جس سے ہم نے مانگنا ہو اس کی پہلے حمد وثنا بیان کی جاتی ہے، اس کی قدرتوں کا اعتراف کیا جاتا ہے، پھر اس کے انصاف پر یقین رکھا جاتا ہے اور پھر اس کی صفات کو جوش دلایا جاتا ہے، تاکہ رحمت جوش میں آئے اور ہم اپنا سوال لے کر کامیاب ہوجائیں۔ اسی لیے اللہ نے یہ سورۂ فاتحہ ایسی نعمت عطا فرمائی ہے جس کا کوئی مقابلہ نہیں۔

فضیلتِ سورۂ فاتحہ:

سابقہ مضامین کے اندر عرض کیا تھا کہ سورۂ فاتحہ عظیم سورت ہے۔ ترتیبِ قرآن کے اعتبار سے اور نماز میں بھی پہلے پڑھی جانے والی سورت ہے۔ اسی طرح سب سے پہلے کامل سورت جو اتری وہ سورۂ فاتحہ ہے۔

سورۃ الفاتحہ کے کچھ نام:

اسی طرح عرض کیا تھا کہ یہ ''فَاتِحَة'' بھی ہے، ''شَافِيَة'' بھی ہے، ''رَاقِيَة'' بھی ہے، ''كَافِيَة'' بھی ہے،

"کنز" بھی ہے اور "أُمُّ الْمَسْئَلَةِ" بھی ہے۔

آدابِ درخواست:

اس کی مثال عرض کی تھی کہ جب آدمی درخواست لکھتا ہے تو ایک کاتب ہوتا ہے اور مکتوب الیہ ہوتا ہے کہ درخواست لکھنے والا اور جس کی طرف درخواست لکھی گئی ہے۔ اور پھر یہ درخواست کس محکمے سے تعلق رکھتی ہے؟ اور چوتھی بات کہ بندہ درخواست وصول کرنے والے کو اپنا تعارف کراتا ہے کہ میں کون ہوں؟ اسی طرح جس کو درخواست لکھتا ہے اس کے منصب کا بھی خیال رکھتا ہے۔

سورۂ فاتحہ ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے:

پھر بنیادی چیز کہ درخواست کا مقصد کیا ہے؟ اس کے لیے علماء نے فرمایا کہ سب سے جامع اور افضل دعا سورۂ فاتحہ ہے۔ اس لیے دیکھیں! یہ ہر نماز میں ہے، چاہے فرض نماز ہے، واجب ہے، سنت ہے، نفل ہے، تہجد ہے، اشراق ہے یا صلوۃ التسبیح ہے۔ سب میں پڑھی جاتی ہے، ﴿سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ﴾ ہے۔

اس لیے علماء نے فرمایا کہ کاتب سے مراد نماز پڑھنے والا اور مکتوب الیہ اللہ ہے اور اس کے مناصب بیان کر دیے کہ سارے محامد اللہ کے ہیں اور تمام جہان کا پالنے والا اللہ ہے۔ اس کی صفت رحمانیت اور رحیمیت بیان کرتے ہیں۔ پھر اپنا تعارف ہے کہ ہم کون ہیں؟ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ ہم تیرے عبد اور تیری عبادت کرنے والے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگنے والے ہیں۔

اس کے بعد اپنا مقصد بیان کرتا ہے کہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت عطا فرما۔ سیدھی راہ سے مراد ان لوگوں کی راہ جن پر تیرا انعام ہے، نہ کہ وہ جن پر تیرا غضب ہے اور نہ وہ جو بھٹکے ہوئے ہیں۔ تو مثبت اور منفی دونوں اعتبار سے ہماری دعا ہو گئی۔ تو اس سے بڑی کوئی جامع دعا ہو سکتی ہے؟

سورۂ فاتحہ میں بندے کا حصہ:

اسی لیے صحیح حدیث ہے کہ جب آدمی کہتا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (سب تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں جو مربی ہیں تمام عالمین کے) تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "حَمِدَنِيْ عَبْدِيْ" (میرے بندے نے میری حمد و تعریف بیان کی)

اور جب بندہ پڑھتا ہے: ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ (جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں) اللہ کی صفت بیان کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "أَثْنٰى عَلَيَّ عَبْدِي" (میرے بندے نے میری ثنا بیان کی) میری صفات رحمانیت اور رحیمیت کا تذکرہ کیا۔

اور جب بندہ کہتا ہے: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (جو روز جزا کا مالک ہے) تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "مَجَّدَنِي عَبْدِي" (میرے بندے نے میری تقدیس بیان کی)

اسی طرح جب بندہ کہتا ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یہ میرے اور بندے کے درمیان ہے کہ وہ عبد ہے اور میں معبود ہوں، وہ مدد مانگنے والا اور میں مدد کرنے والا ہوں۔

بندہ کہتا ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یہ خالص میرے بندے کے لیے ہے۔ "وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ" (میرے بندے نے جو کچھ مجھ سے مانگا ہے میں نے اس کو دے دیا ہے)

[صحیح مسلم، حدیث:۳۹۵، باب: وُجُوبِ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ فِي كُلِّ رَكْعَةٍ]

جامع دعا:

یہ اتنی بڑی جامع دعا ہے کہ اس میں حمد بھی ہے، ثنا بھی ہے، تمجید بھی ہے، اقرارِ صفات اور رحمتِ عامہ بھی ہے اور اقرارِ رحمتِ خاصہ بھی ہے اور اپنی عبدیت کا اعتراف بھی ہے اور اس کے نفع و نقصان کے مالک ہونے کا اقرار بھی، اس اس کی مالکیت اور عدالت پر بھی ایمان ہے۔ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ اسی کی ذات ہے اور پھر اس سے راستہ مانگا ہے۔

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾

[الفاتحۃ: ۶ تا ۷]

یا اللہ! ہمیں صراطِ مستقیم عطا فرما۔

صراطِ مستقیم کی دعا مانگنے کی وجہ:

یاد رکھیں! صراطِ مستقیم کی دعا کیوں مانگی ہے؟ "صِرَاطَ الْمُوَحِّدِيْنَ" کی دعا کیوں نہیں مانگی؟ اس پر علماء کرام

نے لکھا ہے کہ ہم نے صراطِ مستقیم کی دعا مانگی ہے، جس کا معنی سیدھا راستہ ہے کہ ایک کے مقابلہ میں زیادہ راستے ہیں۔ اس لیے ضروری نہیں ہوتا کہ ہر تعدد صحیح نہ ہو۔

مذاہب اربعہ حق ہیں:

اس لیے یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ تعددِ مذاہب کہ امام ابوحنیفہ ؒ، امام مالک ؒ، امام احمد بن حنبل ؒ، اور امام شافعی ؒ کے یہ چار مذاہب کہاں سے آگئے ہیں؟ کیا یہ حضور ﷺ کے زمانے میں تھے؟ لوگوں کے دماغوں میں یہ شبہ ڈالا جارہا ہے۔ حالانکہ اس زمانہ میں صاحبِ شریعت ﷺ خود موجود ہیں تو کسی مسلک کی اور کسی دوسرے سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ ضرورت تو تب پیش آتی ہے جب وہ موجود نہ ہوں، جب حضور ﷺ وفات پا گئے تو لوگ صحابہ ؓ سے پوچھتے تھے اور صحابہ ؓ میں سے بھی چند ایک سے پوچھتے تھے۔

حضور ﷺ کے ہزاروں صحابہ ہیں، لیکن حضور ﷺ نے یمن میں حضرت معاذ بن جبل ؓ کو بھیجا، اسی طرح بڑے بڑے صحابہ ہیں جن کا فتویٰ چلتا تھا۔ علامہ ابن قیم ؒ نے لکھا ہے کہ ۱۴۹ (ایک سو انچاس) صحابہ ؓ ہیں اور ۱۴۹ میں سے زیادہ تر وہ ہیں جنہوں نے ایک دو سے زیادہ فتوے نہیں دیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت بھی یہ بات نہیں تھی کہ جس کی مرضی میں جو آئے وہ کرلے۔ وہ مخصوص صحابہ ؓ سے رجوع کرتے تھے۔

یہ دھوکہ دینے والی بات ہے کہ کیا حضور ﷺ کے زمانے میں یہ چار امام موجود تھے؟ پھر تو بخاری و مسلم بھی حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں تھیں تو یہ کس پر عمل کرتے ہیں؟ یہ تو بے وقوفوں والا سوال ہے۔ بھائی! اس وقت صحاح ستہ تو نہیں تھیں، لیکن احادیث تو موجود تھیں، ان کو صحاح ستہ میں جمع کیا گیا۔ اسی طرح حضور ﷺ کے زمانہ میں یہ مسائل موجود تھے، لیکن ان کا تفقہ کے اعتبار سے ان چار اماموں نے استنباط کیا ہے کہ انہوں نے ان احادیث کو بھرکرامت کے لیے موتی نکال دیے۔ لہٰذا تعدد کا ہونا گمراہی کی دلیل تو نہیں ہے۔

آپ نے بڑے بڑے شہروں میں دیکھا ہوگا کہ سڑکیں منتخب ہوتی ہیں کہ اس پر لوکل بس چلے گی، اس پر کوئی اور بس نہیں آسکتی، کیونکہ اور گاڑیاں آئیں گی تو ٹریفک رک جائے گی اور جو لوکل بس پر جانے والے ہیں ان کو دیر ہوجائے گی۔

اور دوسرا ٹریک ہے، اس پر بجلی والی گاڑیاں چل رہی ہیں۔ اور ایک ٹریک ہے، اس پر عام گاڑیاں چل رہی

ہیں اور ساتھ ایک فٹ پاتھ ہے اس پر لوگ پیدل جا رہے ہیں۔ سڑک تو ایک ہی ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ یہ چار لائنیں کیسے بنا ئیں؟ حالانکہ سڑک تو ایک ہے۔ تو عقلمند کہے گا کہ بس پر بیٹھو تو ادھر آؤ، پیدل چلو تو ادھر چلو۔ یہ سارے رستے تو اسی منزل پر جا رہے ہیں۔

اسی طرح چاروں ائمہ کے راستے مختلف ہیں، لیکن منزل ایک ہے۔ اور وہ چاروں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں داخل ہوں گے۔ اس لیے یہاں "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" لائے۔ اور "الْمُسْتَقِيمَ" کی ضد "الْاِعْوِجَاجُ" ہے کہ یا اللہ! ہمیں اس راستے کی ہدایت عطا فرما جو بالکل سیدھا ہو، اس میں ٹیڑھا پن نہ ہو۔ اگر ٹیڑھا پن آ گیا تو پھر آدمی گمراہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ دعا کی۔

اس کا بدل آگے آ گیا:

﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ [الفاتحہ:٦]

"رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے۔"

(1)...... دین کی دعا مانگیں:

اس بدل سے دو فائدے ہو گئے:

ایک فائدہ یہ کہ یا اللہ! جو ہم دعا کر رہے ہیں:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ [الفاتحہ:٥]

"ہمیں سیدھے (دین کے) راستے کی ہدایت عطا فرما۔"

دنیا تو عقل سے بھی کما لیں گے، آپ سے دین کے راستے کو مانگ رہے ہیں۔ کیونکہ "مُنْعَمٌ عَلَيْهِمْ" کون لوگ ہیں؟ انبیاء ﷺ، صدیقین، شہداء اور صالحین رحمہم اللہ ہیں۔ ان کا راستہ دولت تو نہیں ہوتا، ان کا راستہ تو دین ہوتا ہے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ دینی دعا مانگی ہے، دنیاوی دعا نہیں مانگی۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا استغناء:

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے زمانہ میں ان کے ایک مرید نے ان کی خدمت میں کچھ اشرفیاں پیش کیں۔ حضرت نے فرمایا: فقیر کو ضرورت نہیں ہے۔ تو اس نے کہا کہ آپ کو ضرورت نہیں، لیکن مدرسہ کو تو ضرورت ہے۔

آپ نے فرمایا: مدرسہ کو ضرورت ہے اور مدرسہ تو آپ نے بھی دیکھا ہوا ہے، اس کے لیے میرے پاس آنے کی کیا ضرورت ہے؟ مدرسہ میں چلے جائیں اور وہاں جمع کرادیں۔ یہ تمہاری ملک ہے، تم ہی جمع کراؤ، میری ملک نہیں ہے۔ تو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے وہ پیسے نہ لیے تو وہ مرید بھی کوئی پکا عاشق تھا۔ جب حضرت نماز پڑھانے کے لیے گئے تو اس نے وہ اشرفیاں حضرت کے جوتے کے اندر رکھ دیں، حضرت کے پیچھے نماز پڑھی اور جب حضرت نے سلام پھیرا تو وہ بھی سلام پھیر کر چلا گیا۔ حضرت جب نماز پڑھ کر باہر نکلے تو چونکہ سنت یہ ہے کہ جوتا پہننے سے پہلے اس کو تھوڑا سا ہلایا جائے کہ اگر خدانخواستہ اس میں کوئی بچھو ہے، موذی کیڑا ہے تو نکل جائے۔ حضرت نے جب جوتا ہلایا تو وہ ساری اشرفیاں چھن چھن کر باہر نکل پڑیں۔ حضرت کھڑے ہو گئے اور فرمایا: اے بھائی! یہ دنیا بھی عجیب چیز ہے!! جو اس سے بھاگتا ہے یہ اس کے پاؤں پڑتی ہے اور جو اس کے پیچھے بھاگتا ہے اس کو بھگاتی رہتی ہے۔

[ارواحِ ثلاثہ یعنی حکایاتِ اولیاء، ص: ۲۰۹، ۲۱۰]

ہمارے والد صاحب کا استغناء:

میں نے اپنے والد صاحب کو دیکھا کہ ایک آدمی نے نوٹوں کی گڈی جس میں سو سو والے نوٹ تھے آپ کی خدمت میں پیش کی تو آپ نے فرمایا: کیا ہے؟ اس نے کہا: یہ زکوٰۃ کے پیسے ہیں۔ فرمایا: میں تو زکوٰۃ کا مستحق نہیں، میں زمیندار آدمی ہوں، خود زکوٰۃ دیتا ہوں۔ اس نے کہا: میں جانتا ہوں، لیکن آپ لوگوں کو جانتے ہیں، طلبہ کو جانتے ہیں، آپ ان کو تقسیم فرمادیں۔ والد صاحب نے لے کر پھینک دیے اور فرمایا: پورے حرم میں تمہاری ڈیوٹی کرنے والا میں ہی تمہیں نظر آیا ہوں؟ تمہاری زکوٰۃ ہے، تم خود ہی جا کر تقسیم کرو، یہ میری ذمہ داری تو نہیں ہے۔

تو اللہ والے لوگ اتنی احتیاط کرتے ہیں۔ اور آج کل تو احتیاط کا دور بھی ختم ہو گیا ہے، آج کل مولوی ایک منٹ میں صدقہ کو زکوٰۃ بنادیں اور زکوٰۃ کو صدقہ بنادیں۔

ناجائز حیلہ:

میں نے سنا ہے، دیکھا تو نہیں کہ ہمارے علاقے میں بھی ایک مولوی تھا، وہ زکوٰۃ نکالتا تھا، اور زکوٰۃ کے جو پیسے بنتے تھے اس کو پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر گندم کی بوری میں رکھ دیتا تھا۔ ایک غریب آدمی کو بلوایا اور کہا کہ بابا! یہ جو کچھ ہے سب تمہارا ہے، تم لے جاؤ۔ اب ایک بوڑھا آدمی کہتا کہ اڑھائی من کی بوری میں کیسے لے جاؤں؟ میں سواری کا بندوبست کرتا ہوں۔ تو وہ کہتا کہ ہاں! تم جاؤ، سواری کا بندوبست کرو، میری جان چھڑاؤ، بس اس کے

اندر جو کچھ ہے میں نے زکوۃ میں دیا۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے۔ جب وہ جانے لگا تو اس کو بلایا کہ ادھر آنا دیکھو! آج کل گندم کا کیا بھاؤ ہے؟ اس نے کہا: سو روپے۔ تو اڑھائی من کے کتنے ہوئے؟ اڑھائی سو ہوئے۔ تو اس نے کہا: بابا! تین سو لو اور یہ گندم مجھے بیچ دو، کہاں سے سواری لاؤ گے اور اٹھاتے پھرو گے؟ پریشانی ہوگی، تکلیف ہوگی۔ وہ غریب سوچتا کہ چلو اٹھانے کا جھگڑا تو ختم ہوا۔ اس سے تین سو کی گندم خرید کر پھر گھر رکھ لی، اب حلال ہو گیا۔ میں نے زکوۃ بھی ادا کردی ہے۔ اب تو میں نے اس کو خریدا ہے۔ آج کل تو لوگ اس طرح بھی کرتے ہیں۔

ایک چالاک شخص کا حیلہ:

میں نے ایک پڑھے لکھے آدمی کو دیکھا کہ وہ ہم مولویوں کا بھی استاذ نکلا۔ اس کا لاکھوں کا اکاؤنٹ تھا۔ اس نے مسئلہ سمجھ رکھا تھا کہ زکوۃ تب آتی ہے جب مال پر سال گزر جائے۔ مثال کے طور پر: اس پر زکوۃ آتی تو وہ یوں کرتا کہ چیک کاٹ کر سارے پیسے بیوی کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیتا۔ اس وقت ان پیسوں پر سال بھی نہیں گزر رہا ہوتا تھا اور جب بیوی کے پاس گیارہ مہینے پورے ہونے لگتے تو وہ خاوند کو دے دیتی۔ لیکن پہلے والے لوگ ان باتوں سے ڈرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ رزق حلال نصیب فرمائے۔ تھوڑا ہو، لیکن حلال ہو، اس میں کوئی آمیزش نہ ہو تو اسی میں خیر ہے، اسی میں برکتیں ہیں اور اسی میں رحمتیں ہیں۔

صحیح معاملات:

سچی بات تو یہ ہے کہ اس دور میں کوئی دنیا دار رزق حلال کماتا ہے اور حرام سے بچتا ہے تو وہ ولی اللہ ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا:

((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْأَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ))

''سچا اور امانت دار تاجر قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔''

[سنن الترمذی، حدیث:۱۲۰۹، باب: ما جاء في التجار...]

یہ درجہ دیانت داری کی وجہ سے ملا۔ تہجد پڑھ لینا بڑی آسان بات ہے، اشراق پڑھ لینا بڑی آسان بات ہے، کعبۃ اللہ کا طواف کر لینا بڑی آسان بات ہے اور دو دو گھنٹوں کی لچھے دار تقریریں کر لینا بڑی آسان بات ہے، لیکن دین معاملات کا نام بھی ہے تو حلال کھانا بڑا مشکل کام ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں احتیاط:

غالباً حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں (واللہ اعلم) مدرسے کو تعمیرات کے ضمن میں پانچ کروڑ کی ضرورت تھی، انہوں نے اشتہار لکھا یا اخبار میں دیا (واللہ اعلم) بہرحال! ایک سیٹھ نے ایک کروڑ کا چیک کاٹا اور خط لکھا کہ باقی چار کروڑ بھی میں دوں گا، آپ کسی سے نہ مانگیں، لیکن میری شرط یہ ہے کہ آپ جو مدرسہ بنوائیں تو کسی آرکیٹیکٹ کو بلوائیں، نقشہ بنوائیں۔ مہتمم مدرسہ نے جب وہ چیک دیکھا اور وہ خط پڑھا تو فرمایا کہ جس نے بھیجا ہے اس کو واپس کر دیا جائے۔ ہے کوئی مائی کا لعل جو ایک کروڑ واپس کر دے؟ جب پیسے واپس گئے تو سیٹھ گھبرا گیا، وہ دوڑا دوڑا آیا اور کہا کہ میں نے کیا خطا کی؟ فرمایا: تم نے پیسے دینے کے ساتھ ساتھ اپنی شرطیں بھی لکھ دیں۔ جب تمہاری شرط باقی ہے تو اس چیک میں ابھی تمہارا حق باقی ہے، جب تمہاری ملک سے نکلا ہی نہیں تو ہم تمہارا پیسہ کیوں ضائع کریں؟ آپ لکھتے کہ میری رائے یہ ہے، پھر مدرسہ جانے اور مدرسہ کا کام جانے۔

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ اور احتیاط:

مولانا یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے ترمذی شریف کی شرح بھی لکھی ہے۔ کراچی کے بہت بڑے بزرگ اور محدث گزرے ہیں۔ اللہ ان کی قبر پر کروڑ ہا رحمتیں نازل فرمائے۔ اصل تو آپ افغانستان کے تھے۔ بہت تیز بولتے تھے۔ میں حضرت کی خدمت میں رہا ہوں۔ میرے استاذ تو نہیں، لیکن ادباً اور احتراماً میرے استاذ تھے اور بڑے ہی شفیق تھے۔ میں جب مدرسے میں ہوتا تو باقاعدہ مدرسہ میں اعلان کیا جاتا کہ کئی صاحب میرا ذاتی مہمان ہے، مدرسہ کا مہمان نہیں، لہٰذا ان کے کھانے کے پیسے میری تنخواہ سے کاٹے جائیں، مدرسے سے نہیں۔ ان کے زمانے میں یہ احتیاط ہوتی تھی۔ اب اگر مدرسے میں نہ ٹھہرتے پھر بھی ناراض ہوتے۔ ہمارا ابھی طالب علمی کا زمانہ تھا، ہم نے بھی طریقے بنائے ہوئے تھے کہ جب بھی آتے تو ہم بڑے ادب کے ساتھ جا کر ملتے اور حضرت ہمیں کمرہ الاٹ فرما دیتے۔ اس میں ہم اپنا اٹیچی کیس رکھ دیتے، کچھ ایک دو کپڑے لٹکا دیتے۔ اس کے بعد سارا دن دوستوں سے گپ شپ لگاتے رہتے۔ جب فارغ ہوتے تو شام کو آ کر سو جاتے۔ اور حضرت کبھی طلبہ سے پوچھتے تو ان کو طلبہ بتاتے کہ کئی صاحب کا سامان تو ادھر ہی ہے۔ حضرت فرماتے: پھر ادھر ہی ہوں گے۔ ادھر کئی صاحب تو دوستوں کے ساتھ گپیں لگا رہے ہیں۔

بہر حال! کسی نے آ کر حضرت کو دس لاکھ روپے کا چیک دیا۔ حضرت نے فرمایا: کیا ہے؟ کہا: صدقہ کی مد میں مدرسہ کے لیے ہے۔ حضرت نے فرمایا: ہمارے مدرسہ کا بجٹ پورا ہو گیا ہے۔ اس نے کہا: حضرت! اگر آپ کے مدرسہ کا بجٹ پورا ہو گیا ہے تو آپ جس مدرسہ کو مستحق سمجھتے ہیں اس میں بھجوا دیجیے گا۔ فرمایا: یہ میرا کام نہیں ہے، یہ تمہاری ڈیوٹی ہے کہ مستحق کو تلاش کرو۔ وہ آدمی کہنے لگا: حضرت! ایسے لوگ بہت کم آتے ہیں جو دس دس لاکھ روپے پیش کریں، آپ اس کو ٹھکرا رہے ہیں۔ حضرت صاحب جلال میں آ گئے اور فرمایا: ایسے مولوی بھی بہت کم ملیں گے جو دس لاکھ روپے پھینک دیں، اٹھو اور مدرسہ سے نکل جاؤ، تیرے جیسے کئی سیٹھ میں نے دیکھے ہوئے ہیں۔ وہ بے چارہ پریشان کہ یہ کیسا مولوی ہے؟ یہ استغناء ہے۔

A.K بروہی اور ختم نبوت کا مقدمہ:

قادیانیت کے خلاف ختم نبوت کا مقدمہ تھا، A.K بروہی کو وکیل رکھنا تھا اور اس کی فیس بیس لاکھ روپے سے بھی زیادہ تھی۔ A.K بروہی حضرت کی مسجد میں کبھی کبھی جمعہ کے لیے آتے تھے۔ اب ختم نبوت والوں نے سوچا کہ اتنا پیسہ کہاں سے لائیں؟ لہٰذا وہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: حضرت! اگر آپ مہربانی کر دیں اور اس سے بات کریں تو شاید وہ کچھ رعایت کر دے۔

A.K بروہی جمعہ کی نماز کے بعد حضرت سے مل کر ہی جاتے تھے۔ حضرت کو آ کر سلام کیا تو حضرت نے فرمایا کہ اچھا ہوا کہ تم آ گئے ہو، یہ بتاؤ کہ جنت لینا چاہتے ہو یا بیس لاکھ لینا چاہتے ہو؟ اس نے کہا: حضرت! میں ایسا کچا سودا تو نہیں کرتا کہ جنت کو بیس لاکھ کے لیے چھوڑ دوں۔ میں خود وکیل آدمی ہوں، گھاٹے کا سودا میں کبھی نہیں کرتا، مجھے تو جنت چاہیے۔ تو حضرت نے فرمایا: تم یہ ختم نبوت کا مقدمہ خود لڑو، جب تم حضور ﷺ کی عزت کے لیے مقدمہ لڑو گے تو کیا حضور ﷺ تمہارے لیے شفاعت نہیں کریں گے؟ اس نے کہا: بالکل میں یہ مقدمہ لڑوں گا، اپنے کرایہ سے جاؤں گا اور اپنے خرچے پر ہوٹل میں رہوں گا اور یہ کیس لڑوں گا۔ آج ہم ان لوگوں کے قصے تو بیان کرتے ہیں، لیکن اب ایسے لوگ نصیب نہیں ہوتے۔

مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق غلط فہمی:

یورپ ہو، ہانگ کانگ ہو وہاں جلسہ عصر کو ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ مسلمان دور سے آتے ہیں، دو دو گھنٹے، تین تین

گھنٹے کی ڈرائیو ہوتی ہے۔ لوگوں نے واپس بھی تو جانا ہوتا ہے۔ ہانگ کانگ میں ایک جلسے کے بعد ہم سمندر کے کنارے بیٹھے تھے۔ مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی صاحب بھی تھے، قاری محمد طیب قاسمی بھی تھے، ڈکٹور سید عنایت اللہ صاحب بھی تھے، عدنان بھی تھے۔ مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی صاحب مجھے پکڑ کر باہر لے گئے۔ میں نے کہا: مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا: شوق کی کیا بات ہے؟ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ میں نے کہا: یہ سمندر کا کنارہ ہے، مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔ فاروقی صاحب نے فوراً کہا کہ میں سویٹر نکال کر دیتا ہوں۔ اسی دوران بیٹھے بیٹھے پتا نہیں مجھے کیا سوجھی؟ (اللہ مجھے معاف کرے اور ان کے درجات بلند کرے) میں نے کہا: فاروقی صاحب! مجھے آپ سے ایک گلہ ہے۔ کہنے لگے: کیا گلہ ہے؟ میں نے کہا: میں تو جانتا نہیں ہوں، لیکن بہت سارے لوگوں نے شکایت کی ہے کہ آپ لوگوں کے پاس چندہ آتا ہے اور آپ کے پاس کوئی حساب کتاب نہیں ہے۔ پتا نہیں جائز خرچ ہوتے ہیں یا ناجائز خرچ ہوتے ہیں؟ میں نے سنا ہے کہ آپ نے ان پیسوں سے زمین لے لی ہے، جائیداد بنا لی ہے، حالانکہ لوگ آپ کو پیسے دین کے لیے دیتے ہیں۔ تو مجھے کہا کہ مکی صاحب! جس آدمی کو اپنی زندگی کے ایک منٹ کا بھی پتا نہ ہو، جو زندگی کو ہتھیلی پر لے کر پھرتا ہو کہ نا جانے کہاں سے گولی آئے گی؟ تو وہ پیسے کھا کر کیا کرے گا؟ یہ بالکل ہم پر الزام ہے، میرا بھائی سعودی عرب میں دمام کے علاقہ میں ملازمت کرتا ہے، اس بے چارے نے اپنے پیسوں کے ساتھ زمین خریدی ہے اور اس کے نام کے ساتھ بھی فاروقی لگ جاتا ہے تو میں کیا کروں؟ ورنہ میں نے چندے سے ایسی حرکت نہیں کی۔

علماء اور خدمتِ دین:

اس لیے جو ہم نے دعا مانگی اس کا تعلق دین سے تھا، دنیا سے نہیں تھا۔ دنیا تو فانی ہے۔ بعض لوگ مولویوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ جو لوگ قرآن پڑھا سکتے ہیں، حدیث پڑھا سکتے ہیں، فقہ، منطق اور فلسفہ پڑھا سکتے ہیں، کیا وہ دوکان پر بیٹھ کر پیسہ نہیں کما سکتے؟ کیا ان کی عقل کم ہے؟ پھر ان کی نوکری چوبیس گھنٹے کی ہے، گرمی ہے، سردی ہے، مسجد میں آتا ہے، نماز پڑھنی ہے، پڑھانی ہے۔ تم تو کہتے ہو کہ آج سر بھاری لگ رہا ہے، تھوڑا ریسٹ کرلوں، لیکن مولوی بے چارے نے تو ہر حال میں مسجد میں جانا ہے، اذان دینی ہے، نماز پڑھانی ہے۔ اور اگر مدرسہ ہے تو صبح شام بیٹھے ہیں۔ اگر اعتراض کی نظر سے نہ دیکھیں تو جو چوبیس گھنٹے بیٹھے ہیں اس کے بھی تو کچھ حقوق ہوں گے؟ اس دعا سے ہمارا ایک مقصد متعین ہو گیا کہ ہماری دعا دین کے لیے ہے، دنیا کے لیے نہیں ہے۔

(2)......دعا کا دوسرا فائدہ:

دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اشتباہ ہی نہیں رہا کہ ہمیں انعام یافتہ لوگوں کے راستے پر چلا۔ اور انعام یافتہ انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین رحمہم اللہ ہیں۔ اب وجودِ انعام دوامِ انعام کو مستلزم نہیں ہوتا۔ (یہ تھوڑا سا مشکل مسئلہ ہے، لیکن تھوڑی سی کوشش کریں گے تو سمجھ میں آ جائے گا) آج اگر کسی پر انعام ہے تو ضروری نہیں ہے کہ اس پر یہ انعام ہمیشہ رہے۔ جیسے حدیث رسول ﷺ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''يُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِنًا وَيُمْسِي كَافِرًا'' (ایک ایسا وقت آ جائے گا کہ) صبح کو بندہ مسلمان ہوگا اور شام کو کافر ہوگا)۔ یعنی وہ انعام دوام کا نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کافر ہو جائے۔ تو ہم نے انعام کی دعا مانگی تھی۔ وجودِ انعام دوامِ انعام کو مستلزم نہیں ہوتا۔

[صحیح مسلم، حدیث:۱۱۸، باب: الْحَثِّ عَلَى الْمُبَادَرَةِ بِالْأَعْمَالِ...]

اس دعا میں کیا طلب کیا گیا؟

تو آگے فرمادیا:

﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ [فاتحہ:۷]

''نہ (رستہ) ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو (رستے سے) گم ہو گئے (گمراہ ہو گئے)۔''

اصل میں ان ''مُنْعَمٌ عَلَيْهِمْ'' کی طرف اشارہ ہے کہ ان ''مُنْعَمٌ عَلَيْهِمْ'' پر نہ تیرا غضب نازل ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے، بلکہ ہمیشہ آخر وقت تک انعام والے رہے۔ ہم ان کا راستہ تجھ سے مانگتے ہیں۔ لہٰذا دعا اثباتاً بھی آئی اور نفیاً بھی آئی۔ اثبات کیا کہ ''مُنْعَمٌ عَلَيْهِمْ'' لوگوں کا راستہ دکھا اور نفی یہ کہ نہ ان پر تیرا غضب ہے اور نہ وہ گم کردہ راہ ہیں۔ ہم ان لوگوں کا راستہ مانگ رہے ہیں۔

مرزائیوں کا فریب:

یاد رکھیں! مرزا قادیانی اور اس کے پیروکار لوگوں کو یہاں دھوکہ دیتے ہیں کہ دیکھو! ہر نماز میں بندے پڑھتے ہیں:

﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ [فاتحہ:۶،۵]

اور ''مُنْعَمٌ عَلَيْهِمْ'' کون لوگ ہیں؟ ان کے بارے میں قرآن میں ہے:

﴿مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ﴾ [النساء:۶۹]

مرزا کہتا ہے: جب بندہ اطاعت کرکے، عبادت کرکے صالحین میں شمار ہوسکتا ہے، صدیقین میں شامل ہوسکتا ہے اور شہداء میں شامل ہوسکتا ہے تو نبیوں میں شامل کیوں نہیں ہوسکتا؟ اس لیے وہ کہتا ہے کہ دیکھو! نبوت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ وہ لوگوں کو اس طرح گمراہ کرتے ہیں۔

فریب کا رَدّ:

یاد رکھو! یہاں معیت کا سوال ہے، عینیت کا سوال نہیں ہے۔ عینیت کا مطلب یہ ہے کہ گویا کہ وہ کہہ رہا ہے کہ مجھے نبی بنادو۔ (نعوذ باللہ!) اور ایک مطلب یہ ہے کہ مجھے ان کا ساتھ نصیب فرمادیں۔

حضور ﷺ کی حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کو تسلی:

جیسے حضور ﷺ کے خادم حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ ہیں۔ ایک دن حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور ان کا چہرہ غم سے اترا ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے پوچھا: تجھے کیا ہوا؟ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ جانتے ہیں کہ مجھے آپ کے ساتھ کتنی محبت ہے؟ جب میں گھر میں ہوتا ہوں اور آپ کے دیدار کا جذبہ آتا ہے تو دوڑ کر آجاتا ہوں، لیکن چند دنوں سے میں سوچ رہا ہوں کہ دنیا میں جب مجھے تڑپ ہوتی ہے تو میں آپ کی زیارت کرلیتا ہوں، لیکن میرے آقا! جب آپ جنت میں جائیں گے، آپ کا درجہ تو سب سے اونچا ہوگا اور ہمارا درجہ آپ سے نیچے ہوگا تو وہاں اگر میں آپ کو نہیں دیکھوں گا تو میری زندگی کیسے گزرے گی؟ میرے لیے تو جنت میں رہنا مشکل ہوجائے گا۔ جس جنت میں حضور ﷺ کا دیدار نہ ملے ایسی جنت کا کیا فائدہ؟ تو ان کی اس بات پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ [النساء: ۶۹]

''اور جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے تو وہ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے: انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین رحمہم اللہ۔ اور وہ کتنے اچھے ساتھی ہیں۔''

[المعجم الاوسط، حدیث: ۴۷۷]

اور حضور ﷺ نے فرمایا:

((اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۶۱۶۸، باب: علامة حب الله عز وجل]

''بندہ جس کے ساتھ محبت کرتا ہے اللہ اس کے ساتھ اس کو ملا ئیں گے۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ ان کو بھی قیامت کے معیت نصیب ہوگی۔ تو یہاں بھی معیت کی دعا ہے۔

اگر کوئی اطاعت سے نبی بن سکتا ہے تو صحابہ سے زیادہ اطاعت کرنے والا کون ہے؟ جن کی اطاعت اور ایمان کا اللہ خود گواہ ہے۔ پھر تو صحابہ بھی نبی بن جاتے، نہ کہ تیرھویں صدی میں مغل خاندان میں پیدا ہونے والا عرضی نویس غلام احمد قادیانی نبی بن جائے، جس نے ابتداء ہی جھوٹے کام سے کی۔ اپنی کتابوں میں کیسے کیسے جھوٹ بولے، کیسے کیسے جھوٹے دعوے کیے، جو خود اس کی تحریروں کی روشنی میں جھوٹے نکلے۔ دیکھیں! عرضی نویس بھی سچ لکھتے ہیں؟ طلاق نامہ لکھواؤ تو تین طلاقیں لکھ دیتے ہیں، دینے والا چاہے ایک دے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے پیسے لیے ہیں، کام تو پکا کریں۔ ایک طلاق سے تو رجوع ہو جائے گا۔

صالحین میں شمولیت:

اولیاء نے بڑی عجیب بات کہی ہے کہ اللہ کا حکم ہے نماز، روزہ، زکوۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ جب میں صحیح اعتقاد رکھتے ہوئے ان پر چلوں گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنی رحمت سے مجھے جنت دیں گے۔ تو صالحین میں آ گیا۔ فرمایا:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً ۖ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ [النحل: ۹۷]

''جس شخص نے بھی مومن ہونے کی حالت میں نیک عمل کیا ہوگا، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، ہم اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے، اور ایسے لوگوں کو ان کے بہترین اعمال کے مطابق ان کا اجر ضرور عطا کریں گے۔''

جو آدمی اعتقاداً نیک کام کرے گا تو وہ صالحین میں آجائے گا اور اللہ اپنی رحمت سے اس کو جنت عطا فرمائیں گے۔

شہید کو شہید کیوں کہتے ہیں؟

اور ایک ہے مشاہدہ اور پکی بات، جیسے ایک آدمی ٹیپ ریکارڈ پر ریکارڈ کر رہا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں تو یہ مشاہدہ ہے۔ اور یہ شہداء کا درجہ ہے۔ اس لیے شہید کو شہید کہتے ہیں کہ اللہ اس کو سارے مدارج دکھا دیتے ہیں۔ ان کی

ارواح جنت کے اندر سیریں کر رہی ہوتی ہیں۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ وہ اپنی جان قربان کر کے اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اللہ کا دین حق ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا مقام صدیقیت:

اب مشاہدہ سے یقین بڑھ جائے تو یہ صدیقیت کا مقام ہے۔ ایک بات یاد رکھیں! تمام صحابہ رضی اللہ عنہم صدیق ہیں، صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تو صدیق اکبر ہیں۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم صدیق، عادل ہیں اور معیارِ حق ہیں۔ جیسے دیکھیں! ہمارے علاقہ میں دریائے سندھ ہے۔ وہ اوپر سے آتا ہے اور پہلے اٹک میں آتا ہے، پھر چلتے چلتے سندھ کے علاقہ میں آتا ہے۔ جب اٹک میں پانی نہ پہنچے تو سندھ میں کیسے آئے گا؟ تو اگر اللہ کا دین صحابہ میں ہی نہیں پہنچا تو پھر آگے کیسے پہنچے گا؟ اس لیے یاد رکھیں! صحابہ رضی اللہ عنہم معیارِ حق اور ایمان کا نمونہ ہیں، اسلام کا ماڈل ہیں۔ اللہ نے فرمایا: ﴿اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ [البقرة: ۱۳] (تم بھی اسی طرح ایمان لے آؤ جیسے دوسرے لوگ (صحابہ رضی اللہ عنہم) ایمان لائے ہیں)۔

علم کے مراتب:

صدیقیت سے بلند مقام نبوت کا ہے۔ اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ ایک علم ہوتا ہے اور ایک یقین ہوتا ہے۔ اور ایک علم الیقین ہوتا ہے اور ایک حق الیقین ہوتا ہے۔ یہ مدارج ہیں۔

جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا:

﴿رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰي وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ۭ﴾ [البقرة: ۲۶۰]

''میرے پروردگار! مجھے دکھایے کہ آپ مردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟ اللہ نے کہا: کیا تمہیں یقین نہیں؟ کہنے لگے: یقین کیوں نہ ہوتا؟ مگر (یہ خواہش اس لیے کی ہے) تا کہ میرے دل کو پورا اطمینان حاصل ہو جائے۔''

یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس سورت میں ایسی جامع دعا آ گئی کہ ''مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ'' کے اندر سارے درجات آ گئے ہیں کہ ان لوگوں کی معیت نصیب ہو گی، لیکن معیت ان کی اس وقت نصیب ہو گی جب ان جیسی شکل وصورت اور عبادات ہوں گی۔

"خَلق" اور "خُلق" کی وضاحت:

ایک ہے "خَلق" اور ایک ہے "خُلق"۔ "خَلق" انسان کی ظاہری صفات کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا، ظاہری صورت ہوگئی کہ کسی کو لمبا بنایا، کسی کو درمیانہ بنایا، کسی کو چھوٹا بنایا، کسی کو گورا بنایا، کسی کو خوبصورت بنایا اور کسی کو بدصورت بنایا۔ یہ "خَلق" ہے۔ اور جو مخفی صفات ہیں وہ "خُلق" ہے۔ اب "خَلق" کو بدلنا تو ہمارے بس میں نہیں کہ ایک آدمی کا لمبا قد ہے، اس کو چھوٹا کیسے کریں گے؟ چھوٹا قد ہو تو اس کو لمبا کیسے کریں گے؟ بدصورت ہے تو لاکھ کریمیں لگوائیں وہ وہی رہے گا۔ گورا ہے تو گورا ہی رہے گا، کالا ہے تو کالا ہی رہے گا۔ اس کی تبدیلی تو ہمارے بس میں نہیں ہے۔

فلاسفۂ یونان اور ہندوؤں کا نظریہ:

"خُلق" (صفاتِ مخفیہ) کی تبدیلی ممکن ہے یا نہیں؟ یونان کے فلاسفہ، افلاطون، بقراط اور بڑے بڑے فلسفی تو کہتے ہیں کہ اخلاق بھی تبدیل نہیں ہوتے۔ اس لیے ان کے ہاں محاورہ ہے کہ اگر تم سن لو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے یہ تو مان لو، لیکن اگر سنو کہ فلاں بندے کی عادت تبدیل ہوگئی تو یہ نہ مانو۔ اور کچھ فلاسفہ ایسے ہیں جو کہتے ہیں: تبدیلی ممکن ہے، لیکن اس پر مشقت بڑی ہے کہ اس بندے کو لوگوں سے الگ رکھیں، کھانا پینا چھوڑ دے، شہوانیت چھوڑ دے، نفس کو سزا دے، ایک ٹانگ پر کھڑا رہے، رگڑے لگیں گے تو پھر شاید کچھ تبدیلی ہوگی۔ اس لیے جو ہندومت، بدھ مت اور برہمن وغیرہ ہیں یہ سارے اسی فلسفے کے مارے ہوئے ہیں کہ سر منڈا کر پھریں گے، گوشت نہیں کھائیں گے، جوگی بنے پھرتے ہیں، دودھ نہیں پیتے، بس تھوڑا سا پرشاد بنے گا وہ کھالیں گے۔ وہ اسی چکر میں ہیں کہ اخلاق کو ٹھیک کرنے کے لیے محنت ضروری ہے۔

عاملوں کی دھوکہ بازیاں:

ایک آدمی نے مجھے کہا کہ ایک پیر صاحب ہیں۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہیں تو خدا کی قدرت ہے کہ ایسی روشنی پیدا ہوتی ہے کہ بالکل مکہ مدینہ دکھا دیتے ہیں۔ میں نے کہا: اس کے اندر کوئی پیری والی بات نہیں ہے۔ تم آنکھیں بند کرو، میں تمہاری آنکھوں پر زور دیتا ہوں، دیکھو! روشنی نظر آتی ہے یا نہیں؟ بس پھر ایک تصور دے دوں۔ کہا کہ ایک مرتبہ مجھے عمل دیا کہ قبرستان میں جا کر ایک ٹانگ پر پڑھنا اور ڈراؤنی آوازیں آئیں گی، لیکن ڈرنا نہیں ہے، پھر جن تابع

ہو جائیں گے۔ تو بس ایسے ہوا کہ دنیا گھومنے لگ گئی۔ میں نے کہا کہ تم ابھی ایک ٹانگ پر کھڑے ہو جاؤ، ابھی دنیا گھومنے لگ جائے گی۔ آدمی جب ایک ٹانگ پر کھڑا ہو، قبرستان میں ہو اور رات بھی اندھیری ہو تو ڈراؤنے خیالات نہیں آئیں گے تو اور کیا آئے گا؟ اس میں پیری مریدی کی کیا بات ہے؟

یہودی کا اعتراض، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جواب:

علماء نے فرمایا: دو عالَم ہیں: ایک عالَمِ اصغر اور ایک عالَمِ اکبر۔ گویا! انسان ایک پورا عالم ہے۔ یعنی جو چیزیں پورے عالم میں موجود ہیں وہ انسان میں بھی موجود ہیں۔ جیسے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اقوال و آثار کے اندر بات آتی ہے کہ ان کے پاس ایک یہودی آیا اور آکر پوچھا: ہم نے آپ کا قرآن سنا ہے، اس میں ہے کہ جنت میں چار نہریں ہوں گی۔ اللہ نے اس کا تذکرہ کیا ہے کہ شراب کی بھی نہر ہوگی، دودھ کی بھی نہر ہوگی اور پانی کی بھی نہر ہوگی۔ اور یہ بھی آپ کی کتابوں میں موجود ہے کہ ان تمام کا منبع تحت العرش ہے۔ اور اسی طرح بعض روایات کے اندر آتا ہے کہ دنیا کے اندر بھی جو چار نہریں ہیں: جیحون، سیحون، نیل اور فرات۔ ان کے بارے میں بھی آتا کہ ان کا اصل بھی جنت ہے۔ بہر حال اس یہودی نے کہا کہ ان چاروں کا مرکز ایک ہے کہ عرش کے نیچے سے نکل رہی ہیں تو آگے جا کر یہ مختلف کیسے بن گئیں؟ ایک دودھ کی نہر بن گئی، ایک شہد کی، ایک شراب کی اور ایک پانی کی کیسے بن گئی؟ حالانکہ منبع ایک ہے اور چار چیزیں تو مختلف ہیں؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: دیکھو! تم انسان ہو۔ کبھی تمہارے کان سے بھی پانی بہتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں! اور تمہاری ناک سے؟ اس نے کہا: ہاں اور آپ نے کہا: گلے سے؟ اس نے کہا: ہاں پانی آتا ہے۔ اور آنکھوں سے؟ اس نے کہا: ہاں پانی نکلتا ہے۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان سب کا منبع ایک دماغ ہے تو ان کے ذائقے مختلف اور جدا جدا ہیں۔ اگر اللہ نے تیرے اندر چار نہریں مختلف ذائقے کی چلا دی ہیں تو کیا وہ جنت کے اندر یہ چار نہریں چلانے پر قادر نہیں ہے؟

انسان میں کمالِ تخلیق:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝﴾ [الانفطار: ۷]

”جس نے تجھے (انسان) بنایا، پھر تیرے اعضا کو درست کیا اور پھر تجھے (مناسب) اعتدال پر بنایا۔“

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ [التین: ۴]

''ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے۔''

دیکھو! جتنا بڑا جانور ہو وہ گردن جھکا کر پانی پیے گا، لیکن انسان کی گردن کو اللہ نے بنایا کہ یہ صرف میرے آگے جھکنے کے لیے ہے۔ بڑے سے بڑے جانور ہیں، لیکن وہ حسب منشا اپنا کھانا بنا کر نہیں کھا سکتے۔ شیر کو دیکھو! بندے کا گوشت کھائے گا، جانور کا کھائے گا، لیکن یہ نہیں کر سکتا کہ وہ بریانی بنائے یا اس کے مختلف قسم کے پیکٹ بنائے۔ یہ شرف صرف انسان کو ملا ہے۔ جب تک ہی ہی نہ ہو اس وقت تک انسان کو کھانا کھانے میں مزہ نہیں آتا۔ میں ایک مرتبہ ہندوستان میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا تو وہاں یورپین لڑکیاں بھی کھانا کھا رہی تھیں۔ ان کی ناک سے ایسے پانی بہہ رہا تھا جیسے نل سے پانی بہتا ہے، چقندر کی طرح سرخ ہو رہی ہیں، لیکن مزہ آ رہا ہے، کھا رہی ہیں۔ میں نے کہا: یہ کس عذاب میں مبتلا ہو گئی ہیں؟ انہوں نے کبھی ایسا کھانا نہیں کھایا ہوگا، کیونکہ وہاں ابلا ہوا کھانا کھاتے ہیں کہ صحت صحیح رہتی ہے۔ اس لیے جوڑوں کا درد انہی کو ہوتا ہے، سب سے زیادہ موٹے وہی ہوتے ہیں اور بے حیائی بھی ان میں سب سے زیادہ ہے۔ ویسے تندرست ہیں اور دنیا کی بزدل ترین قوم بھی یہی ہے۔ تاریخ میں بھی ایسے بزدل نہیں دیکھے ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بڑا خوبصورت پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿نَحْنُ خَلَقْنَاكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُونَ﴾ [واقعہ: ۵۷]

''ہم نے تمہیں (اوّل بار) پیدا کیا ہے (جس کو تم بھی تسلیم کرتے ہو) پھر تم تصدیق کیوں نہیں کرتے؟''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ﴾ [الدھر: ۲۸]

''ہم ہی نے ان کو پیدا کیا ہے اور ہم ہی نے ان کے جوڑ بند مضبوط کیے۔''

یہ جوڑ کیسے مضبوط بنائے کہ سو سال گزر جائیں پھر بھی اپنی جگہ کھڑا ہے۔ اگر لوہے کا لگائیں تو وہ بھی ٹوٹ جائے۔ اگر چلنے سے پاؤں گھستے ہوتے تو ہم گھٹنوں تک گھس چکے ہوتے اور اگر بیٹھنے سے آدمی کی جلد گھستی ہوتی تو پتا نہیں آدمی کہاں تک پہنچ چکے ہوتے۔ بڑے سے بڑے پل گھس جاتے ہیں۔ کہتے ہیں: اب اس کا متبادل

جائیں، اب یہ استعمال کے قابل نہیں رہے۔ لیکن اللہ نے جتنی تیری عمر رکھی ہے اور تیری جو چیز بنائی اتنی عمر تک ہے یہ تم خود خراب کر دیتے ہو، اس کا غلط استعمال کرتے ہو۔ ایک گاڑی ہو، اس کو دو سو میل پر بھگانا شروع کر دو تو جلدی ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ اگر اس کو صحیح طرح استعمال کریں گے تو وہ دس سال نکال لے گی۔ تو اللہ نے ہمیں جو دماغ دیا ہے، آنکھیں دی ہیں، عقل دی ہے، پاؤں دیے اور اعصاب دیے ہیں اگر ان کو غلط استعمال کیا تو خراب ہو جائیں گے۔ تو یہ نظامِ تخلیق "خَلق" سے ہے، اس میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔

جدید تہذیب کی ڈسی ہوئی عورتیں اور لڑکے:

ایک حدیث مبارکہ میں ہے:

((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَعَنَ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ وَالْمُتَنَمِّصَاتِ مُبْتَغِيَاتٍ لِلْحُسْنِ مُغَيِّرَاتٍ خَلْقَ اللهِ)) [سنن الترمذی، حدیث: ۲۷۸۲]

"نبی اکرم ﷺ نے گودنے (جسم پر سوئی سے نشانات لگا کر سرمہ وغیرہ لگانے) والی، گدوانے والی اور (پلکوں کے) بالوں کو اکھیڑ کر زینت وحسن حاصل کرنے والیوں پر لعنت بھیجی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیز کو بدلتی ہیں۔"

اور بعض عورتیں دانتوں میں فاصلہ رکھتی ہیں، تاکہ حسن معلوم ہو۔ بعض لوگ اس میں ہیرے رکھوا دیتے ہیں، تاکہ چمکتے ہوئے معلوم ہوں۔ بالوں سے بال جوڑ دو اس پر بھی اللہ کے رسول نے لعنت کی ہے۔ جو اللہ نے بال دیے ہیں ...... بڑے ہیں یا چھوٹے ہیں...... اس پر اللہ کا شکر ادا کریں۔

نئی تہذیب کی بدحالی:

اور آج کل بالوں کو کتوا کر بوائے کٹ بنا دینا، تاکہ معلوم ہو کہ لڑکا ہے۔ اور سب سے ماڈرن وہ سمجھے جاتے ہیں جو پینٹ پہنے ہوئے ہوں اور وہ پھٹی ہوئی ایسے جیسے کسی کتے نے پھاڑا ہوا ہے۔ اگر وہ صحیح سالم ہو تو بوائے تو بن رہا ہے۔ اللہ نے ان کو ایسا لباس نصیب کیا ہے۔ پہلے تو ہم سنتے تھے کہ گھڑیاں واٹر پروف ہوتی ہیں اب تو پینٹ بھی واٹر پروف ہے۔ دو سال تک اندر پیشاب کرتے رہو، سارا اندر رہے گا۔ نہ دھلنے کی ضرورت اور نہ صفائی کی ضرورت ہے۔ وہ چوس لیتی ہے۔ دیکھو! انگریز کو اللہ نے کیسا لباس پہنایا ہے؟ یہ مستقل اللہ کا ایک عذاب ہے۔ ہمارے ہاں مثل ہے کہ اس سونے کو آگ لگاؤ جو کان پھاڑ دے کہ سونا اتنا بھاری نہ پہنو۔ تو ایسے کپڑے کو بھی آگ

لگاؤ۔ ایسا کپڑا ہو جس میں بندہ بندہ نظر آئے، نہ کہ بندر نظر آئے۔

آپ تو وہ کپڑا پہنیں گے جس میں کسی مائیکل جیکسن کا نام ہو، کسی ماڈرن لڑکی کا نام ہو، تا کہ بنیان دیکھ کر بندہ اندازہ لگالے کہ جناب کا شجرہ نسب کیا ہے؟ یہ تہذیب نہیں ہے۔ اکبر الہ آبادی نے کہا تھا:

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

یہ کوئی تہذیب نہیں۔ اصل تہذیب محمد مصطفیٰ ﷺ کی ہے۔ لباس تو وہ ہوتا ہے جو تجھے ستر دینے والا اور راحت دینے والا بنے۔ اگر وہ عذاب دینے والا ہے اور تیرے اعضا کو کھولنے والا ہے تو وہ اچھا لباس نہیں ہے۔ آپ میری باتوں میں نہ آیا کریں، آپ تو مجھے دقیانوسی اور ملاں ہی سمجھتے ہوں گے۔ آپ خود دیکھیں کہ ٹائٹ پینٹ پہن کر نماز پڑھو اور ایک شیشہ رکھ لو اور غور کرو، آپ کیسے نظر آتے ہیں؟ آپ کے پیچھے جو صف نماز پڑھ رہی ہے اس کو آپ کیا کیا دکھا رہے ہیں؟...... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ...... اللہ ہمیں معاف فرمائے۔ ہم اتنے بگڑ گئے کہ ہم نہ لباس میں ہیں، نہ معاشرت میں ہیں، نہ کھانے میں اور نہ پینے میں۔ بدترین قسم کا پیزا ہو، ہمارا نوجوان شوق سے کھائے گا، کیونکہ اس کا نام پیزا ہے۔ اس میں گندی قسم کی مچھلی ہو اور اس میں پندرہ سال پہلے کی چیز پڑی ہوئی ہو، کھاتے ہوئے ہوا آرہی ہو، پھر بھی کھائے گا۔ اور اس کو لینے کے لیے لائنیں لگی ہوتی ہیں۔ اس برگر میں ہوتا کیا ہے؟ اگر اس کو گھر میں بنائیں تو اس پر اتنے پیسے بھی خرچ نہ ہوں۔

کبھی آپ نے گھر میں کہا ہے کہ یہ کھانا چھوڑ دو اور ہمیں وہ کھانا بنا کر دو جو حضور ﷺ نے کھایا ہو۔ جو بڑے بڑے عاشق ہیں، بتائیں کہ حضور ﷺ نے خوشی کے موقع پر جو ہریسہ کھایا وہ کیا تھا؟ وہ گوشت کس طرح پکایا جاتا تھا؟ حضور ﷺ نے روٹی اور لبن کس طرح استعمال کیا ہے؟ کبھی آپ نے حضور ﷺ کی تہذیب کے بارے میں تحقیق ہی نہیں کی ہوگی۔ جو عاشق رسول ہوتے تھے تو جو شام کی روٹی بچی تھی اس کو کپڑے میں لپیٹ دیتے اور صبح کو کھاتے کہ اس روٹی کا زمانہ حضور ﷺ کے قریب ہے۔ ان کے عشق کا یہ عالم تھا۔

حضرت ہزاروی رحمہ اللہ کی سادگی اور قناعت پسندی:

میں نے حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی رحمہ اللہ کو دیکھا جو کئی مرتبہ پاکستان کی اسمبلی کے ممبر بنے۔ کوئی روکھا سوکھا مولوی نہیں تھا، نیشنل اسمبلی کے ممبر بنے، بڑے بڑے نوابوں کو شکست دی۔ ان کو دیکھا کہ سوکھی روٹی کو چائے

میں ڈبو ڈبو کر کھا رہے ہیں۔ میں نے کہا: حضرت! یہ کیا کر رہے ہیں؟ میں ناشتہ بنواتا ہوں۔ فرمایا: میں نے یہ رات میں خریدی تھی، بچ گئی تو تھیلے میں رکھ لی تھی اور سوچا کہ دوسرا ناشتہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ چائے منگالی ہے، بڑا اچھا لطف دے رہی ہے، آپ بھی میرے ساتھ کھالیں۔

مولانا ہزاروی رحمہ اللہ کی جرأت:

اور یہ اتنے دلیر تھے کہ اپنے وقت کا ڈکٹیٹر اور اقتدار کی سب سے بڑی کرسی پر بیٹھنے والا آدمی شراب پی رہا تھا تو مولانا نے پوچھا کہ یہ کیا پی رہے ہو؟ اس نے مولانا کو چڑانے کے لیے یا بات بدلنے کے لیے کہا کہ میں شیرنی کا دودھ پی رہا ہوں۔ تو مولانا نے کہا: نہیں تم سورنی کا پیشاب پی رہے ہو، جس کو اللہ نے حرام کیا ہو، وہ شیرنی کا دودھ نہیں ہوسکتا اور اللہ نے اس کو خنزیر کے گوشت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہ جرأت والے لوگ تھے، لیکن چائے کے ساتھ خشک روٹی کھا رہے ہیں۔ اس سے ان کی عظمتوں میں کوئی فرق نہیں آیا، ان کی شان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

نہرو کی سادگی:

چلو! آپ نہرو کو تو مانتے ہوں گے؟ کیونکہ بڑا پولیٹکل مائنڈ گزرا ہے اور پرائم منسٹر رہا ہے۔ نہرو کے طالب علمی کے دور میں اس کے کپڑے اٹلی اور پیرس میں ڈیزائن ہوتے تھے۔ اتنا بڑا آدمی تھا۔ جب لیڈر بن گیا تو کھدر کا پائجامہ، کرتا اور کھدر کی ٹوپی تھی۔ صحافیوں نے پوچھا: مسٹر نہرو! یہ آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ اس نے کہا: پہلے ہم کپڑوں سے پہچانے جاتے تھے اور اب کپڑے ہم سے پہچانے جاتے ہیں۔ اب مجھے وہ کپڑے پہننے کی کیا ضرورت ہے؟

اللہ کی قدرت کا کمال:

ہمیں اسلام کہتا ہے کہ تم اپنے آپ کو ایسا جوہر اور موتی بناؤ کہ یہ ہیرا کیا چیز ہے؟ ہم نے تمہیں خوبصورت پیدا کیا اور تمہارا پورا پورا بنایا کہ ہر انگوٹھے کی لکیروں کے نقوش مختلف ہیں۔ اس لیے آج دنیا چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ انگوٹھا لگواؤ۔ اللہ کے قرآن میں تو چودہ سو سال پہلے آگیا:

﴿بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝﴾ [القیامۃ: ۴]

''ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کی پوریوں تک درست کردیں۔''

ان کے خطوط ایک دوسرے کے ساتھ نہیں ملتے ہیں۔ جو خدا اس پر قادر ہے وہ تمہارے مرنے کے بعد دوبارہ

بنانے پر بھی قادر ہے۔ یہ "خَلق" ہے، اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

حضور ﷺ کے اخلاقِ کاملہ:

اور ایک ہے "خُلق" اس کا معنی عادات، اعمال اور افعال ہے۔ جیسے اللہ نے میرے مدنی ﷺ کی تعریف میں فرمایا: ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ۝﴾ [القلم: ۴] (اور بے شک آپ اخلاق (حسنہ) کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں۔)"

اس آیت کے اندر "عَلٰی" کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو استعلاء کے لیے آتا ہے۔ "ب" اور "فِی" کا لفظ استعمال نہیں فرمایا۔ جس کا معنی ہے: اے میرے مدنی! آپ خلقِ عظیم پر مستوی ہیں۔ گویا! خلقِ عظیم آپ کی سواری بن گئے، آپ کے تابع بن گئے۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ)) [سنن البیہقی، حدیث ۲۰۵۷۱]

"اللہ نے مجھے اس لیے بھیجا کہ مکارمِ اخلاق کو پورا کروں۔"

کیا انسانی اخلاق میں تبدیلی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اس میں فلسفی لوگ کہتے ہیں کہ "خَلق" تبدیل نہیں ہوتا۔ اور وہ ایک حدیث سے بھی استدلال کر لیتے ہیں کہ حدیث میں آتا ہے کہ جب تم سن لو کہ فلاں جگہ سے پہاڑ ہٹ گیا ہے تو اس کو مان لو اور جب تم سنو کہ فلاں بندے کی عادت بدل گئی ہے تو نہ مانو۔[۱] اس لیے فلسفی لوگ کہتے ہیں کہ بندے کی جو عادات ہیں وہ تبدیل نہیں ہوتیں۔

ایک ہندو جوگی اور اولیاء کے دل کی حالت:

اسی طرح وہ ایک واقعہ لکھتے ہیں، ہمارے ہی دور کی بات ہے، میں نے بھی سنا کہ ایک ہندو جوگی تھا، وہ دین پور شریف (ضلع رحیم یار خان) میں آیا اور خلیفہ غلام محمد رحمہ اللہ ...... جو اپنے دور کے بہت بڑے بزرگ اور مجاہد تھے، جہاں حضرت تھانوی رحمہ اللہ بھی جاتے تھے، حضرت مدنی رحمہ اللہ بھی جاتے تھے۔ اتنے بڑے آدمی تھے..... تو وہ ہندو ان کی خدمت میں کچھ دن رہا۔ پھر ایک دن حضرت سے ملا کہ میں کچھ دن آپ کے لنگر میں رہا ہوں، آپ کی بڑی مہربانی، باوجود اس کے کہ میں ہندو ہوں، کافر ہوں، لیکن یہاں مجھے کسی نے چھیڑا نہیں کہ تم ہندو ہو کر ہمارے پاس کیسے آ گئے؟ تو اب مجھے اجازت دیں میں جا رہا ہوں۔ تو حضرت نے فرمایا: کیوں آئے تھے؟ اور کیسے جا رہے ہو؟ اس نے کہا: اصل بات یہ

[۱] [مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۲۷۴۹۹]

ہے کہ میں اللہ والے کی تلاش میں ہوں، لیکن وہ مجھے ملتا نہیں، جہاں بھی میں سنتا ہوں کہ اللہ والا ہے، بزرگ ہے، پیر ہے، شیخ ہے، میں وہاں پہنچ جاتا ہوں، لیکن میں جب وہاں توجہ کرکے دیکھتا ہوں تو ان کے دل میں سیاہ داغ دیکھتا ہوں۔ جب ان کے دل کالے ہیں تو میرا دل کیسے صاف کریں گے؟ میں تو کوئی ایسا اللہ والا تلاش کر رہا ہوں جس کا دل منور ہو، اس لیے میں ان سے بغیر ملے چلا جاتا ہوں۔

حضرت نے فرمایا: تم یہاں بھی آئے ہو، ہمارا دل بھی دیکھا؟ اس نے کہا: حضرت! میں نے غور کیا ہے، لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ آج تک میں نے اتنے بڑے پیروں، بزرگوں کو بھی دیکھا، ان کے دل میں بڑا داغ ہے، آپ کے دل میں بھی داغ ہے، لیکن چھوٹا سا ہے۔ اگر نہ ہوتا تو میں آپ کے پاس رہ جاتا۔ تو حضرت نے فرمایا: تم نے یہ مقام کیسے حاصل کرلیا ہے؟ اس نے کہا: نفس کی مخالفت سے کہ نفس چاہتا ہے کہ دودھ پیوں تو میں کہتا ہوں کہ نہیں نہیں دودھ نہیں پلانا، پانی پر گزارہ کرو۔ بازار میں جارہا ہوں تو گوشت کی عمدہ خوشبوئیں آتی ہیں، دل کہتا ہے کہ کھالوں، لیکن میں کہتا ہوں: خبردار! دال پر گزارہ کرو۔ بیٹھے بیٹھے خیال آتا ہے کہ کھانا کھاؤں، لیکن میں کہتا ہوں: نہیں تجھے بھوکا ماروں گا۔ جو اندر سے دل چاہتا ہے، اس کی مخالفت کرتا ہوں تب اس مقام پر پہنچا ہوں کہ اندر کی بصیرت روشن ہوگئی۔ تو حضرت دین پوری رحمہ اللہ نے فرمایا: اب اپنے نفس پر غور کرو کہ کیا تمہارا نفس مسلمان ہونا چاہتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ حضرت نے فرمایا: اس نفس کی مخالفت کرو، ورنہ تمہارا یہ مقام آج ختم ہوجائے گا، کیونکہ یہ مقام تمہیں مخالفتِ نفس سے ملا ہے۔ اس نے کہا: آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے۔ آپ نے کلمہ پڑھایا اور وہ مسلمان ہوگیا۔

اس کے بعد آپ نے اس کو کہا کہ اب اپنے نفس کے چکر میں نہ رہنا، اب تم نے اللہ کے احکامات کو ماننا ہے۔ اور آپ نے فرمایا کہ اب مراقبہ کرکے فقیر کا دل دیکھو تو وہ پھر مراقبہ میں بیٹھ گیا۔ اور اس نے کہا: حضرت! اب آپ کا دل تو بالکل روشن ہے۔ فرمایا: پہلے بھی داغ نہیں تھا، اور جہاں جہاں تم نے مراقبہ کیا اور داغ نظر آیا تو وہ تمہارے کفر کا عکس پڑتا تھا، کیونکہ جو چیز شیشے کے سامنے رکھو گے تو وہی نظر آئے گی۔

یہود و نصاریٰ کا نظریہ اخلاق:

بہرحال میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگ کہتے ہیں: اخلاق میں تبدیلی ناممکن ہے، ہاں! اگر نفس کو مشقت میں ڈالو تو تبدیلی ممکن ہے۔

باقی یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ اخلاق میں تبدیلی تو آسکتی ہے، لیکن ہمیں اس کے درست کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھانسی پر چڑھ گئے اور وہ ہمارا کفارہ ادا کر گئے، لہٰذا ہم جہنم میں جائیں گے ہی نہیں۔ اس لیے دیکھیں کہ یورپ والوں کے ہاں حلال، حرام، نکاح اور زنا کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ وہ اس کو حقوقِ انسانی، آزادی اور مساوات کہتے ہیں۔ اس چکر میں آکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی پر چڑھا دیا اور اپنے سارے گناہ معاف کرا ڈالے کہ اب مزے کریں۔

یہودی کا نظریہ:

یہودیوں نے کہا کہ ہم نے جہنم میں جانا ہی نہیں ہے، ہم نے تو صرف جنت میں جانا ہے، حتیٰ کہ وہ کہتے تھے: ﴿نَحۡنُ أَبۡنَٰٓؤُاْ ٱللَّهِ وَأَحِبَّٰٓؤُهُۥۚ﴾ [المائدۃ:۱۸] (ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں)۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ تم سب اللہ کے بیٹے کیسے ہو گئے؟ کہتے ہیں: بیٹے حضرت عزیر علیہ السلام تھے ہم تو اس کے دوست ہیں تو ہم بھی بیٹے ہوئے۔ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کے محبوب ہوئے تو ہم اللہ کے محبوب بن گئے۔ اور بیٹا اچھا ہو یا برا ہو کوئی آدمی اپنے بیٹے کو آگ میں تو نہیں ڈالتا۔

اور ان کے بعض سنجیدہ آدمیوں نے کہا کہ شاید ہم اتنی دیر کے لیے جہنم میں چلے جائیں جتنی دیر کے لیے ہمارے بڑوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی۔ ﴿وَقَالُواْ لَن تَمَسَّنَا ٱلنَّارُ إِلَّآ أَيَّامٗا مَّعۡدُودَةٗۚ﴾ [البقرۃ:۸۰] (اور یہودیوں نے کہا: ہمیں گنتی کے چند دنوں کے علاوہ آگ ہرگز نہیں چھوئے گی) یعنی چند دن عذاب ہوگا۔

جب ان کا یہ عقیدہ ہے تو ان کو اخلاق بدلنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو جنت کے ٹھیکیدار ہیں۔ اسی لیے یہودیت کا ایک نظریہ یہ ہے کہ ماسوا یہودیوں کے کوئی انسان ہے ہی نہیں اور باقی سارے حیوان اور نیچی قومیں ہیں، ان کو انسان کہنا ہی نہیں چاہیے۔ اسی لیے کوئی ہندو بنے بن سکتا ہے، عیسائی بنے بن سکتا ہے، سکھ بنے بن سکتا ہے، لیکن یہودی نہیں بن سکتا۔

یہودیوں کی تعداد کم کیوں ہے؟

وہ صرف اس کو یہودی مانیں گے جس کی ماں یہودی ہو، وہ دو نمبر کا بھی یہودی نہیں مانتے۔ اس لیے وہ قوم پورے عالم سے تکرار رہی ہے کہ ہماری تعداد بھی تھوڑی ہے اور پورے عالم کو ہم نے کنٹرول کرنا ہے۔ ہمارے مقابلہ میں کون ہے؟ ان کو اس چیز نے آکر اخلاقیات سے محروم کر دیا کہ مسلمانوں کو قتل کر دو، بلڈوزر چلا دو، فلسطین

کے ان نہتے مسلمانوں پر بم برسا دو، حالانکہ ان کے پاس کچھ نہیں، وہ نہتے ہیں، ان کے پاس صرف غلیل اور پتھر ہیں، کیونکہ ان کے دماغ میں ایک بات ہے کہ ہم جنتی ہیں، ہمیں اخلاق کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے تمام عالم کا نظریہ اس وجہ سے بھٹکا ہے۔

اسلام کے نزدیک انسان کی اصلاح ہوسکتی ہے:

لیکن اسلام کہتا ہے کہ اخلاق میں تبدیلی ہوسکتی ہے جس کو اصلاح اور تزکیہ کہتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی بگڑا سے بگڑا انسان توبہ کرلے تو اس کی اصلاح ہوجاتی ہے، اس کے اخلاق سیئہ کو اخلاق حسنہ سے بدلا جاسکتا ہے۔ اگر ایک آدمی بے نمازی ہے تو نمازی بن سکتا ہے۔ ایک آدمی حرام کھاتا ہے تو اصلاح ہوسکتی ہے کہ وہ حرام کھانے سے بچ جائے۔ ایک آدمی چوری کا عادی ہے تو اصلاح ہوسکتی ہے کہ وہ چوری کی بجائے امین بن جائے۔

اور اسی طرح اگر آپ اس بات کو منطقی اور عقلی اعتبار سے دیکھیں تو بھی انسان کی اصلاح ہوسکتی ہے، کیونکہ انسان کے اندر تین طرح کی قوتیں ہیں: (۱)......قوتِ حیوانیہ یا قوتِ شہوانیہ، (۲)......قوتِ غضبیہ اور (۳)......قوتِ عقلیہ۔ یہ تین معروف قوتیں ہیں۔ ویسے تو اللہ نے انسان میں بہت ساری قوتیں رکھی ہیں: قوتِ فکریہ، قوتِ عملیہ اور قوتِ نظریہ ہے۔ اللہ نے انسان کو بہت ساری نعمتوں سے نوازا ہے۔ شرط یہ ہے کہ انسان تو بنے۔ اگر انسان اپنے آپ کو انسان ہی نہ بنائے تو کیا حاصل ہوگا؟ اس لیے آپ نے پہلی پہلی وحی پر غور کیا کہ اللہ نے فرمایا:

﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ① خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ② اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ③ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ④ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ⑤﴾ [العلق:۱تا۵]

"اے پیغمبر ﷺ آپ پر (جو) قرآن (نازل ہوا کرے گا) اپنے رب کا نام لے کر پڑھیے (یعنی جب پڑھیے تو "بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کہہ کر پڑھیے)۔ جس نے مخلوقات کو پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ آپ قرآن پڑھیے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے (جو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور ایسا ہے) جس نے (لکھے پڑھوں کو) قلم سے تعلیم دی۔ اور عموماً انسان کو (دوسرے ذرائع سے) ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا۔"

خدا کی قسم! اگر ان پانچ آیتوں پر غور کرو تو انسان کی دنیا بدل جائے۔ ہمیں سب سے پہلا حکم ملا: "اِقْرَأْ"، تو جس قوم کو سب سے پہلے پڑھنے کا حکم دیا پھر بھی وہ قوم اس حکم پر عمل نہ کرکے جاہل ہے۔ اتنی بدقسمت ہے۔

اب بھی اگر آپ کسی ملک میں جائیں امریکہ، پیرس اور فرانس جائیں، ان کے لڑکے لڑکیاں کسی جگہ بیٹھے ہیں،

کوئی نہ کوئی میگزین، کوئی نہ کوئی اخبار، لٹریچر کھول کر پڑھ رہے ہیں اور ہمارا اچھے سے اچھا اور معزز آدمی ائیر ہوسٹس کے بدن پر غور کرتا رہتا ہے کہ متناسب ہے یا نہیں اور بدصورت ہو تو بے چارے منہ گندا کر کے بیٹھ جاتے ہیں کہ یہ اچھی نہیں ہے۔ جب یہ حال ہے تو ہم کیا ترقی کریں گے؟ لوگ کہتے ہیں کہ مقابلہ کریں گے۔ اللہ کے بندے تم کوکا کولا نہیں بنا سکتے تو تم جنگ لڑو گے؟ کوئی عقل کرو۔ تم برگران کے کھاتے ہو، پیزا ان کا کھاتے ہو، کوکا کولا اور پیپسی ان کی پیتے ہو، تم کپڑے ان کے پہنتے ہو، کہاں کا جہاد اور کس چیز کا جہاد کرو گے؟ جہاد علم سے ہوگا، ظلم سے نہیں ہوگا۔ یہ لڑنا مرنا، دہشت گردی یہ جہاد ہے؟ علم کا مقابلہ علم سے کریں، جہل سے نہ کریں۔ اس لیے پہلا پہلا حکم ہے ''اِقْرَاْ'' کہ پڑھو۔

تخلیقِ انسانیت پر غور کرو:

اور دوسری صفت ربوبیت کہ جس نے تجھے پیدا کیا۔ اب تخلیق کس نے کی ہے؟ کافروں نے تحقیق کرتے کرتے جینز ڈھونڈ نکالے، تیرے مادے کے اندر جو جرثومات ہیں اس پر جو لکھا گیا ہے اس کو پڑھ لیا ہے، لیکن کیا تم نے بھی تخلیقِ انسانی پر غور کیا ہے؟ حالانکہ مسلمان کو پہلا حکم ہی یہی ملا تھا کہ پڑھو۔ تم نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ 'عَلَق' کیا ہے؟ انسان کی تخلیق کا مادہ کیا ہے؟ تم نے کبھی غور کیا ہی نہیں۔ حالانکہ حکم ہی یہی ملا تھا کہ تم پیدائش پر غور کرو۔ اور یہ تمہیں کہاں سے ملے؟ سیکھنے سے ملے۔

﴿الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝﴾[العلق:۴]

''جس نے قلم کے ذریعے سے سکھلایا۔''

اور آگے فرمایا:

﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝﴾[العلق:۵]

''جس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔''

لیکن اگر آپ سیکھنا نہ چاہیں، آپ قلم کی بجائے ہاکی شروع کریں، قلم کی بجائے آپ فٹ بال شروع کر دیں تو علم کیسے آئے گا؟ دیکھو! ظالموں کی کیسی سازش ہے کہ ایک کمپنی کے اشتہار کے لیے پچاس پچاس ملین ڈالر ایک فٹ بالر کی قیمت ہے۔ تو بے وقوف کہے گا کہ کیوں پڑھوں؟ فٹ بال کیوں نہ کھیلوں؟ اگر میرا نام آ گیا تو میں بھی اس

طرح کمالوں گا۔ ہمارے لوگ بھی ان کالباس بناتے ہیں اور ان کی شکلیں بناتے ہیں، کیونکہ ان کے دماغ کے اندر بٹھایا ہی یہی گیا ہے۔ حالانکہ اللہ نے فرمایا کہ تخلیقِ انسانی پر غور کرو۔

قرآن کے اعجاز پر کفار کی گواہی:

کائنیز کا ایک ڈاکٹر دنیا کا بڑا ڈاکٹر ہے، جو مسلمان ہو گیا ہے اور باقاعدہ اس کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ اس نے کہا کہ میں نے جب لفظ "عَلَق" پر غور کیا تو میں نے سوچا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کائنیز کے اتنے بڑے ڈاکٹر ہیں کہ چودہ سو سال پہلے انہوں نے بتلا دیا کہ وہ نطفہ پہلے ایک جونک کی شکل اختیار کرتا ہے۔ میں نے اسی بحث پر کئی پی ایچ ڈی کر ڈالے، لیکن جب میں نے "عَلَق"، "مُضغَة"، "كَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا" پر غور کیا تو میں نے سوچا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ یا تو بہت بڑے ڈاکٹر تھے یا پھر اللہ کے سچے نبی علیہ السلام تھے۔ جبکہ ان کے زمانے میں نہ کوئی میڈیکل یونیورسٹی تھی اور نہ ہی کوئی وسائل تھے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سچے نبی ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ نے ان کو بتلایا، وگرنہ ان کو ان باریکیوں کا کیا پتا تھا کہ وہ نطفہ کیا ہوتا ہے؟ کہاں ہوتا ہے اور کیسا ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ﴾ [المؤمنون:١٣]

"پھر ہم نے اس کو نطفہ سے بنایا جو کہ (ایک مدت معینہ تک) ایک محفوظ مقام (رحم) میں رہا۔"

اور اسی طرح فرمایا کہ جب آدمی جنابت میں ہو تو سارے بدن کا غسل کرے، کیونکہ سارے بدن میں گردش کرتا ہے۔ اس لیے آپ دیکھیں کہ میاں بیوی ملنے کے بعد ہٹ جاتے ہیں تو تھک جاتے ہیں کہ سارے بدن پر اس کے اثرات ہوتے ہیں۔ اس لیے سارے بدن پر غسل رکھا، تا کہ فریش ہو جائیں۔ ہم نے قرآن پر غور نہیں کیا، وگرنہ اللہ نے تو فرما دیا ہے:

﴿الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ [العلق:٤]

﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرة:٢٣٩]

"تم خدا تعالیٰ کی یاد اس طریق سے کرو کہ جو تمہیں سکھلایا ہے جس کو تم نہ جانتے تھے۔"

﴿وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل:٨]

"اور ایسی ایسی چیزیں بناتا ہے جن کی تمہیں خبر بھی نہیں۔"

لیکن ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔

انسان میں تین قوتیں:

اسلام کہتا ہے کہ انسان کے اندر مذکورہ بالا تین قوتیں ہیں۔ اب اگر غور کریں تو ان تینوں قوتوں کی تین تین صورتیں بنیں گی: افراط ہوگا، تفریط ہوگی یا اعتدال ہوگا۔ یہ یاد رکھنا! تاکہ سمجھ میں آ جائے۔
افراط کا معنی ہے حد سے بڑھ جانا، تفریط کا معنی ہے حد سے نیچے گر جانا اور اعتدال کا معنی ہے کہ نہ کمی اور نہ زیادتی۔

غصہ کی قوت:

قوتِ غضبیہ کا افراط یہ ہے: ''صَرْفُهَا فِيْ مَا لَا يَنْبَغِيْ'' (قوت کو نامناسب جگہ میں استعمال کرنا)۔ آدمی قوتِ غضب کو ایسی جگہ استعمال کرے جہاں استعمال نہ کرنا بہتر ہو اور جہاں قوتِ غضبیہ کو استعمال کرنا بہتر ہو وہاں استعمال نہ کرے۔ اس لیے امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مَنِ اسْتُغْضِبَ وَلَمْ يَغْضَبْ فَهُوَ جِدَارٌ.''

''جس آدمی کو غصہ دلایا جائے اور اس کو غصہ نہ آئے تو وہ دیوار ہے (وہ بندہ تو نہ ہوا)۔''

اور فرمایا:

''قَالَ الشَّافِعِيُّ رحمہ اللہ: مَنِ اسْتُغْضِبَ وَلَمْ يَغْضَبْ فَهُوَ حِمَارٌ.''

''جس آدمی کو غصہ دلایا جائے اور وہ غصہ نہ کر سکے تو وہ گدھا ہے۔''

[احیاء العلوم: ۳/۱۸۵، کِتَابُ آدَابِ الْأُلْفَةِ وَالْأُخُوَّةِ...]

اس کے اندر غصہ ہی نہیں یا پھر اس کو وہاں استعمال کر رہا ہے جہاں استعمال کرنا جائز ہی نہیں ہے۔ جیسے باپ سے لڑ رہا ہے، غصہ کر رہا ہے، ماں کی بے عزتی کر رہا ہے یا بہن کی بے عزتی کر رہا ہے۔ اور ہمارے بچے بھی عام طور پر کہہ دیتے ہیں کہ غصہ سے پاگل ہو رہا تھا۔ حالانکہ غصہ میں کوئی پاگل نہیں ہوتا، یہ غصہ بڑا سمجھدار ہوتا ہے۔

غصہ میں تین طلاقیں:

جیسے آدمی آ جاتے ہیں کہ میں نے غصہ میں تین طلاقیں دے دیں۔ میں کہتا ہوں کہ کام پکا ہو گیا۔ وہ کہتے ہیں:

غصے میں طلاق دی تھی۔ میں کہتا ہوں: بھلا! کوئی محبت میں بھی طلاق دیتا ہے؟ پوری دنیا کے اندر کوئی ایسا آدمی تلاش کر کے لاؤ جو اپنی بیوی کو یہ کہے کہ آج مجھے آپ کے حسن پر اتنا پیار آرہا ہے کہ میں آج آپ کو ہدیہ طلاق دیتا ہوں۔ کوئی ایک مثال مجھے دو۔

غصہ میں اعتدال:

ایک بچہ آٹھ سال کا ہے اور دوسرا دس سال کا دونوں لڑ رہے ہیں، بڑا لڑکا غصہ میں مار رہا ہے تو چھوٹے بچے نے شور مچایا کہ ابو، ابو! جب ابو آ گئے تو دس سال والا بھاگ گیا۔ تو غصہ عقل والا ہے یا پاگل ہے؟ اگر وہ غصہ میں پاگل تھا تو پھر کھڑا رہتا۔ حالانکہ پہلے مار رہا تھا، لیکن جب اس کا ابو آ گیا تو اس کو پتا ہے کہ یہ مجھے طمانچہ مارے گا تو میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ کبھی آپ کو بڑے پر غصہ آیا؟ غصہ نیچے والے پر آتا ہے، جس کی وجہ سے تنخواہ ملتی ہے اگر وہ سر کھا جائے تب بھی آپ خاموشی سے کھڑے رہیں گے، کوئی بڑا افسر آ جائے اور آپ کو ڈانٹنا شروع کر دے تو آپ کو غصہ نہیں آئے گا، بلکہ آپ چہرے پر تکلف کر کے مسکراہٹ بھی لے آئیں گے۔ چاہے دل میں کہہ رہے ہوں کہ بڑا بدتمیز ہے، لیکن کیا کریں سینئر ہے۔ تو یہ قوتِ غضبیہ ہے۔

اب اسلام کیا چاہتا ہے؟ اسلام نہ افراط چاہتا ہے اور نہ تفریط چاہتا ہے، اسلام اعتدال کا قائل ہے کہ اگر غصے کو اس کے محل میں استعمال کرو گے تو یہ شجاعت ہے۔ مثلاً: آپ کھڑے ہوں اور کوئی خنزیر آپ کو مارنے کے لیے بھاگتا ہوا آئے تو کیا آپ اس کو کہیں گے کہ آیئے! آیئے! ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ!'' تو یہ عقل ہوگی یا بے وقوفی ہوگی؟ لیکن اگر آپ تلوار یا بندوق لے کر ڈٹ جائیں گے تو یہ شجاعت ہوگی۔ اگر غصہ کو اس کے محل میں استعمال نہیں کریں گے تو یہ بزدلی کہلائے گی۔ مطلب یہ ہوا کہ نہ حد سے بڑھیں اور نہ بالکل ختم کر دیں۔ ازالہ کی بجائے امالہ کر دیں۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ گھر کے اندر ڈنڈا لٹکتا رہے، لیکن مارو نہیں، بلکہ اس کو پتا چلے کہ اس کو کسی وقت غصہ آ سکتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ جناب فارغ ہیں، پھر بیگم کی چپل اور آپ کا سر ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اعتدال:

اسی لیے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ میدان میں مرحب پہلوان کے مقابلہ میں اترے اور مرحب نے کہا:

قَدْ عَلِمَتْ خَیْبَرُ أَنِّيْ مَرْحَبُ
شَاكِي السِّلَاحِ بَطَلٌ مُجَرَّبُ

''پورا خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں۔ اسلحہ پوش، بہادر اور تجربہ کار ہوں۔''

تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

أَنَا الَّذِي سَمَّتْنِي أُمِّي حَيْدَرَهْ

كَلَيْثِ غَابَاتٍ كَرِيهِ الْمَنْظَرَهْ

''میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے اس شیر کی طرح جو جنگلوں میں ڈراونی صورت ہوتا ہے۔'' [صحیح مسلم، حدیث: ۱۸۰۷، باب: غزوة ذي قرد وغيرها]

یہ مبارزت ہوتی تھی کہ مرحب کے چیلنج کا مقابلہ کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اعتدال:

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ ہے کہ تلوار لے کر نبی ﷺ کو قتل کرنے کے لیے جا رہے تھے، لیکن جب مسلمان ہو گئے تو وہی غصہ کیسے اعتدال پر آیا کہ عرض کیا: یا رسول اللہ (ﷺ)! یہ بتائیں کہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں اور کافر جھوٹے نہیں ہیں؟ تو پھر ہم کیوں ایسی کمزوری دکھائیں کہ ہم اپنی عبادات اور نمازیں چھپ کر پڑھیں؟ حمزہ اٹھو! یا رسول اللہ (ﷺ)! ایک طرف حمزہ ہو گا اور ایک طرف عمر ہو گا، آپ درمیان میں ہوں گے۔ آج دیکھتے ہیں کہ قریش کیسے ہمارا مقابلہ کرتے ہیں؟ اب غضب ہے، لیکن اعتدال میں آ گیا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ [الفتح: ۲۹]

''اور جو لوگ آپ کے صحبت یافتہ ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں تیز ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔''

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا اعتدال:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سیف اللہ، اللہ کی تلوار ہیں۔ جس نے دنیا کی بڑی بڑی جنگجو قوموں کے چھکے چھڑا دیے، اسلامی زندگی میں کسی مسلمان کو تھپڑ بھی نہیں مارا۔ جس نے قیصر و کسریٰ کو للکارا، ان کے تخت پاؤں کے نیچے روند ڈالے، ساٹھ آدمیوں کو لے کر ساٹھ ہزار پر حملہ کر دیا۔ وہاں غضب کا یہ عالم اور آپس میں رحمت کا یہ عالم ہے کہ کبھی مسلمان کو تھپڑ بھی نہیں مارا۔ یہ ہے قوتِ غضبیہ کا اعتدال۔

کفار کا فلسفۂ اخلاق:

اور ایک ہے "خُلق" یعنی صفات معنویہ کہ کس آدمی کا حسنِ معاشرت ہے، اخلاق ہے، حسنِ معاملہ ہے۔ یونانی فلسفہ اور ان کے تابع بدھ مت، ہندو ہو گئے، وہ اس طرف گئے ہیں کہ ان کے اندر تبدیلی نہیں ہو سکتی، مگر مشقت کے ساتھ۔ اس لیے وہ لوگوں کو رہبانیت میں لے گئے کہ پہاڑوں میں رہو، شادی نہ کرو، گوشت نہ کھاؤ، دنیا سے کٹ جاؤ، سر سے بال منڈوا دو، اپنی جوانی کو بالکل ملیامیٹ کر دو۔ کبھی ایک ٹانگ پر کھڑے ہیں اور کبھی دریا میں کھڑے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ان مشقتوں کے بعد تو ممکن ہے کہ آدمی کے اخلاق کی اصلاح ہو جائے، وگرنہ ممکن نہیں۔

اخلاقِ اسلامی اور گروہ بندی:

لیکن اسلام کہتا ہے کہ اخلاق کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے بھیجا ہی اس لیے ہے کہ میں مکارم اخلاق کا منتہیٰ امت تک پہنچا دوں۔ [سنن البیہقی، حدیث ۲۰۵۷۱]۔ اب اخلاق کی اصلاح کیسے ہو گی؟ ایک جماعت ہے جس کو علماء کہا جاتا ہے اور ایک دوسری جماعت ہے جس کو صوفیاء کہا جاتا ہے۔ علماء میں بھی بعض بھٹک گئے وہ علماء سوء کہلائے اور جو حق پر رہے وہ علماء حق کہلائے۔ اسی طرح صوفیاء میں بھی بعض حق پر رہے اور حقیقتاً صوفی ہیں، صفاء والے ہیں، متبع سنت مصطفیٰ ﷺ ہیں، ان کا کوئی عمل شریعت اور سنت کے خلاف نہیں ہوتا۔ ان میں بھی بعض گمراہ ہو گئے، فرقہ حلولیہ بن گئے اور بعض جھوٹے صوفی بن گئے۔ بعض لوگوں نے اپنی شکل صوفیوں والی بنا کر اپنے آپ کو صوفی بنا دیا، حالانکہ وہ جانتے ہی نہیں کہ تصوف کیا چیز ہے؟

علماء کی ذمہ داری:

ان دو گروہوں کے پاس اصلاح ہو گی۔ علماء سے تنظیم شریعت ہو گی اور صوفیاء سے اصلاحِ باطن ہو گا کہ ان سے رذائل اخلاق ختم کر کے ان سے اچھے اخلاق پیدا کرے۔ اب اس کی تربیت کا انداز کیا ہو گا؟ جیسے علماء اپنے مبتدی طلبہ کو پہلے قواعد پڑھائیں گے، صرف پڑھائیں گے، نحو پڑھائیں گے، اس کو معانی پڑھائیں گے، اس کو کچھ اصول پڑھائیں گے پھر اصول تفسیر پڑھائیں گے، اس کو کچھ فقہ کی کتابیں پڑھائیں گے، پھر ابتدائی حدیث کی کتابیں پڑھائیں گے اور پھر اصول تفسیر پڑھائیں گے۔ آہستہ آہستہ اس کو اوپر لے جائیں گے، تاکہ وہ ہر چیز سمجھتا جائے اور وہ علم کے دروازے سے داخل ہو، اوپر سے چھلانگ لگا کر نہ آئے۔ بہت سے لوگوں کی بات ٹھیک ہوتی ہے، لیکن

آئے ہوئے اوپر سے ہیں۔ ان کی بنیاد نہیں ہوتی، اس لیے وہ علم کو سمجھ نہیں پاتے۔

صوفیاء کے ہاں اصلاح کا طریقہ:

اور صوفیا کا کام ہوتا ہے کہ اس میں دیکھیں کہ کیا بری عادتیں ہیں؟ جھوٹ بولنے کی عادت ہے، زنا کی عادت ہے، شرابی ہے، منشیات میں گھرا ہوا ہے، یہ رشوت کھاتا ہے اور یہ غیبت کرتا ہے۔ اب اس کی بیماریوں کو دیکھ کر اس کا علاج تجویز کرتے ہیں کہ اس کا علاج ذکر سے ہوگا، اس کا علاج تہجد سے ہوگا، اس کا علاج اکل حلال سے ہوگا، اس کا علاج اپنے نفس کو کنٹرول میں رکھ کر دوسرے آدمی سے ملنے نہ دینے سے ہوگا۔ تو پھر اس کی اصلاح کرتے ہیں۔ جب اصلاح ہو جاتی ہے تو وہی لوگ ہوتے ہیں جو کل...... نعوذ باللہ...... بگڑے ہوئے تھے، صالح بن جاتے ہیں۔

حقیقی انقلاب:

اسی لیے کسی نے لکھا ہے کہ انقلاب تو فرانس کا بھی آیا ہے، رشیا کا بھی آیا ہے، بڑے بڑے انقلاب دنیا میں آئے، لیکن وہ انقلاب معاشی اور اقتصادی طور پر تھے۔ صحیح انقلاب لانے والی ذات سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جن کی وجہ سے عقیدے میں بھی انقلاب آیا کہ جو مشرک تھے وہ موحد بن گئے اور جو بتوں کے پجاری تھے وہ اللہ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ کی توحید کے داعی بن گئے۔ اور اخلاق میں بھی تبدیلی آئی کہ جو اپنی بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے وہ دوسروں کی بچیوں پر بھی رحم کرنے والے بن گئے، جو ظالم تھے وہ رحم دل بن گئے، جو ڈاکو اور لٹیرے تھے وہ زکوٰۃ دینے والے بن گئے، جو تنگ نظر تھے وہ وسیع القلب بن گئے اور جو کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے وہ اپنے آپ کو بھوکا رکھ کر دوسروں کو دینے والے بن گئے۔ یہ انقلاب سر سے لے کر پاؤں تک تھا۔ اس لیے علمائے اسلام کہتے ہیں کہ اخلاق کے اندر تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔

روزہ سے اخلاق کا علاج:

حدیث قدسی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے مدنی! آپ اپنی امت کو بتلا دیں:

((اَلصَّوْمُ لِيْ وَأَنَا أَجْزِيْ بِهٖ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۹۲، باب: ذکر النبي ﷺ وروایته عن ربه]

''روزہ میرے لیے ہے اور اس کا بدلہ میں دوں گا۔''

ہر عمل کا بدلہ اللہ ہی دیں گے، لیکن روزے کو کیوں خاص کیا گیا؟ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ بندوں میں سرائز ہیں

کہ اگر آدمی ایک دن نماز پڑھے اور دو دن نہ پڑھے تو لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ یہ نماز نہیں پڑھتا، لیکن روزہ ایسی عبادت ہے کہ بیوی کو بھی پتا نہیں چلتا کہ اس نے سحری کھائی ہے اس کو روزہ ہے اور اگر گھر والے کہیں چلے جائیں تو کوئی چیز کھالیتا ہے، پھر ہونٹوں پر کپڑا لگایا کہ پتا لگے کہ حضرت روزے کے ساتھ بیٹھے ہیں، شام کو افطاری کے وقت جہاں اچھی چیزیں ہوں وہیں آکر حضرت بیٹھتے ہیں۔

تو وجہ یہ ہے کہ اللہ نے جو ہمارے اندر قوات رکھی تھیں، بعض قوات ملکیہ تھیں اور بعض قوات شہوانیہ تھیں۔ روزہ رکھنے سے ہماری قوات ملکیہ ابھر جائیں اور قوات شہوانیہ کمزور ہو جائیں۔ اس لیے اسلام کہتا ہے کہ کسی چیز کا ازالہ نہ کرو، بلکہ امالہ کرو۔ مثلاً: بڑی بڑی تین قوتیں اللہ نے بندے میں رکھی ہیں: قوتِ شہوانیہ، قوتِ غضبیہ اور قوتِ عقلیہ۔ ان تینوں قوتوں میں تین حالتیں ہیں: ایک افراط، دوسری تفریط اور تیسری اعتدال۔ افراط کا معنی ہے حد سے بڑھ جانا، تفریط کا معنی ہے حد سے گھٹ جانا اور اعتدال کا معنی ان دونوں کے درمیان رہنا۔ اس کی ایک مثال عرض کرتا ہوں، تا کہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور گمراہ لوگ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیرے بارے میں دو جماعتیں ہلاک و برباد ہو جائیں گی: بعض تیری محبت کے اندر اتنے بڑھ جائیں گے کہ وہ بھی پٹڑی سے اتر کر ہلاک ہو جائیں گے اور بعض تیرے بغض میں اتنے بڑھ جائیں گے کہ وہ بھی پٹڑی سے اتر کر ہلاک ہو جائیں گے۔ [کنز العمال، حدیث: ۳۶۵۹۶، فضائل أمیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں غلو:

شیعان علی محبت کے اندر اتنے بڑھ گئے کہ اپنے عقیدے کا جزء بنالیا، حتیٰ کہ اگر وہ طواف بھی کر رہے ہوں گے تو کہہ رہے ہوں گے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَ مُحَمَّدًا نَبِیًّا وَجَعَلَ عَلِیًّا اِمَامًا" (تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی اور علی رضی اللہ عنہ کو امام بنایا)۔ اور کسی کا نام نہیں لیں گے، کیونکہ ان کے نزدیک امامت صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ میں ہے اور کسی میں نہیں، کیونکہ اس چیز کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

یہ لوگ اور زیادہ آگے بڑھ گئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ امام ہیں اور قرآن میں امامت کی دعا سکھلائی گئی ہے:

﴿وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا﴾ [الفرقان:۷۴] (اور ہمیں متقیوں کا امام بنا دے)۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ انبیاء سے بھی اونچے ہو گئے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اصل درجہ تو امامت کا ہے، نبوت کا بھی اپنا مقام ہے، لیکن نبوت امامت سے کم ہے، لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اللہ نے امام بنایا اور وہ منصوص امام ہیں۔

اور یہ الگ بات ہے کہ ان کے پاس نہ اس کی نص ہے، نہ کوئی حدیث متواتر ہے، بلکہ یہ ان کا ایک دعویٰ ہے جو بلا دلیل ہے، اس لیے وہ کبھی کبھی اپنے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے قرآن میں تحریف کرنے پر آ جاتے ہیں اور کہتے ہیں: ﴿وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ [مریم:۵۷] (اور ہم نے ان کو (کمالات میں) بلند رتبہ تک پہنچایا)۔ یہاں "مَكَانًا عَلِيًّا" سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ تو اللہ کے قرآن میں تحریف کر دی۔

اور کہتے ہیں کہ قرآن میں ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً﴾ [المجادلۃ:۱۲] (اے ایمان والو! جب تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تنہائی میں کوئی بات کرنا چاہو تو اپنی اس تنہائی کی بات سے پہلے کچھ صدقہ کر دیا کرو)۔ اس پر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمل کیا ہے اور کسی نے عمل نہیں کیا، لہٰذا مقامِ امامت کے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ حق دار ہیں اور کوئی نہیں ہے۔

شیعہ سنی کا لطیفہ:

مثل مشہور ہے کہ دو مولوی جھگڑ رہے تھے: ایک اہلِ سنت والجماعت سے تھا اور دوسرا اہلِ تشیع تھا۔ اس نے کہا کہ اللہ کے بندے! تم شیعہ پتا نہیں کب سے پیدا ہوئے ہو؟ اس نے کہا کہ شیعہ سب سے پہلے ہیں۔ قرآن میں ہے: ﴿وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ﴾ [الصّٰفّٰت:۸۳] کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی شیعہ تھے...... نعوذ باللہ!...... بھلا! اس سے بڑی قرآن میں کوئی تحریف ہے؟

مولوی صاحب سمجھدار تھے، انہوں نے کہا کہ ہاں! حضرت ابراہیم علیہ السلام شیعہ تھے، جب باپ کے گھر میں تھے۔ ﴿اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ﴾ [الصّٰفّٰت:۸۴] جب بت خانہ چھوڑا تب تو وہ اہلِ سنت بنے۔ اب اس نے بھی اسی طرح کا جواب دیا۔

حالانکہ دونوں اللہ کے قرآن کو بدل رہے ہیں، کیونکہ غلط بات غلط ہے، چاہے شیعہ کرے یا سنی کرے۔ اگر ہم ہر جگہ شیعہ کے لفظ سے شیعہ مراد لیں تو قرآن میں یہ بھی تو ہے، اللہ فرماتے ہیں: ﴿اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا﴾ [الانعام:۶۵] کہ ایک عذاب یہ بھی ہے کہ میں تمہیں شیعہ بنا دوں گا۔ پھر تو...... نعوذ باللہ!...... ہم قرآن میں تحریف کرتے جائیں۔

ایک اور لطیفہ:

یہ تو وہی بات ہوئی کہ ایک طرف شیعہ کا مناظر تھا اور دوسری طرف اہلِ سنت کا مناظر تھا۔ میں نے دونوں کو دیکھا ہوا تھا، اب دونوں مر گئے ہیں۔ شیعہ مناظر نے جوش میں آکر مولوی صاحب سے کہا کہ سنی اور سور میں کیا فرق ہے؟ اس نے کہا کہ اتنا فرق ہے جو تمہارے اور میرے درمیان ہے، کیونکہ میں تو سنی ہوں اور باقی تم ہو۔ میرے سنی ہونے میں تو کوئی شک نہیں ہے۔

تحریف کر کے گیارہویں کا ثبوت:

تو میرے بھائی! یہ الزامی باتیں ہیں، دلائل نہیں اور نہ اس کو علم کہا جا سکتا ہے۔ ایک مولوی صاحب سے کسی نے کہا کہ یہ جو ہم گیارہویں شریف کرتے ہیں اس کا قرآن وحدیث میں کوئی ثبوت ہے؟ اس نے کہا: قرآن میں ہے: ﴿أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا﴾ [یوسف: ۴] (گیارہ ستارے) "أَحَدَ عَشَرَ" کیا ہوتا ہے؟ اس نے کہا گیارہ ہوتا ہے۔ تو بس گیارہویں ثابت ہو گئی۔

اس گیارہویں نے عقیدے کو برباد کر ڈالا اور گیارہویں نے دنیا کو برباد کر ڈالا۔ اور خدا کی قدرت کہ حج میں بھی گیارہویں کا دن آتا ہے۔ اس میں کنکریاں مارتے ہو یا نہیں؟ ان باتوں کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ باتیں دلیل نہیں ہوتیں۔

مولوی سردار لائل پوری سے مناظرہ:

مولوی سردار بریلوی مسلک کے تھے، ان سے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ کا مناظرہ ہو رہا تھا۔ جب یہ لوگ مناظرے کے لیے آئے تو یہ طے تھا کہ دس منٹ یہ بولے گا اور دس منٹ وہ بولے گا۔ سب سے پہلے سردار احمد نے تقریر کی اور آخر میں طنز کیا کہ مجھے افسوس ہے کہ میرا اس آدمی سے مناظرہ ہے جو عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے۔ بس میں مجبور ہو گیا، وگرنہ میں اس سے مناظرہ نہ کرتا۔ تو خیر! اس نے دس منٹ پورے کر لیے۔ اب جب مولانا نعمانی رحمہ اللہ کی باری آئی تو انہوں نے کہا: حضرات! بات یہ ہے کہ میری بھی بدقسمتی ہے کہ میں دنیا کے بہت بڑے بدبخت سے مناظرہ کر رہا ہوں۔ دیکھو! مرزا نے نبوت کا دعویٰ کیا، لیکن وہ غلام احمد ہی رہا، (کیونکہ اس کا نام غلام احمد تھا) لیکن یہ کون ہے جو سردار احمد (احمد کا سردار) بن گیا۔ بس اس پر نعرے لگ گئے اور وہ بھاگ گیا اور شکست کھا گیا۔

الزامی جواب کی حیثیت:

کہنے کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے کی زبان کو بند کرنے کے لیے یہ الزامی جواب ہوتے ہیں، جبکہ حق وہ ہے جس کے ساتھ قرآن سے، حدیث سے، اجماع امت سے، قیاسِ شرعی سے یا اقوالِ فقہاء سے دلیل ہو۔ لیکن ایسی باتیں کہنا اللہ کے قرآن کو بدلنے اور اس میں تحریفات کرنے والی بات ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا فصل قرآن میں نہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا امام ہونا نہ قرآن میں ہے، نہ حدیث میں ہے اور نہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب خلافت کا مسئلہ آیا تو انصار مدینہ نے کہا کہ خلیفہ ہم میں سے ہوگا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث پڑھی:

((اَلْأَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ)) [مسند أبي داود الطيالسي، حديث: ٢٢٣٧]

''امراء (خلفاء) قریش میں سے ہوں گے۔''

کیونکہ قریش کے خون میں حکومت ہے، وہ صدیوں سے سردار چلے آرہے ہیں، مدینہ والے زراعت پیشہ تو ہیں، لیکن انہوں نے کبھی حکومت نہیں کی۔ تو جب یہ حدیث سامنے آئی تو فوراً انصار مدینہ نے کہا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا تو اب ہم خلافت کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے قرآن کی آیت موجود تھی، اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے فرمانِ رسول موجود تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کو کہتے کہ خدا کے بندو! کس بات پر جھگڑ رہے ہو؟ جب اللہ نے مجھے خلیفہ بنایا تو بات ختم ہوگئی۔ تو کون قرآن کا انکار کرتا؟ لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دلیل نہ دی، اہلِ بیت نے دلیل نہ دی تو تم کیسے قرآن کی آیت کو بدل رہے ہو؟ کوئی عقل والا آدمی اس کو نہیں مانتا۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ان کے بارے میں دو جماعتیں ہو جائیں گی: محبت میں پڑنے والے جو حد سے بڑھ جائیں گے اور بغض دشمنی رکھنے والے جو شان گھٹا دیں گے۔ اس لیے بعض نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا بنا لیا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں پیدا ہو گئے تھے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود پکڑا اور ان سے پوچھا: تم میرے بارے میں کیا اعتقاد رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا: تم خدا ہو۔ آپ نے فرمایا: اللہ سے ڈرو، میں اللہ کا بندہ ہوں، ابو طالب کا بیٹا ہوں، داماد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ مجھے خدا بنا رہے ہو؟ انہوں نے کہا: آپ کچھ کہہ لیں، یہ تو ظاہری پردہ ہے،

ورنہ آپ خدا ہیں۔

حلولی فرقہ کا رد:

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا مان رہے تھے، نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا مان رہے تھے، یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا مان رہے تھے اور ہمارے لوگوں نے ترقی کی اور کہا: سارے ہی خدا ہیں۔

جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

میرا ایک دور کا رشتہ دار تھا۔ راستے میں ملا، کہنے لگا: کہاں جا رہے ہو؟ میں نے کہا: جمعہ پڑھانا ہے۔ اس نے کہا: آپ بھی جمعہ پڑھتے ہیں، آپ ہی تو خدا ہیں ناں! آپ کو عبادت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے کہا: تمہارے جیسا کافر تو ابوجہل بھی نہیں تھا۔ ان کا فرقہ ہے۔ شعر میں بھی ہے:

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

خدا کو دل میں بند کر کے بٹھایا ہوا ہے۔ ہمارے ہاں دو علاقے ہیں: ایک کوٹ مٹھن اور ایک چاچڑاں۔ کوٹ مٹھن میں خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ گزرے ہیں، ادھر دریا ہے، اس کے پار چاچڑاں شریف ہے، اس میں بھی بڑے بزرگ تھے۔ مولوی احمد یار وجد میں آ کر کہتا ہے:

چاچڑ وانگ مدینہ ڈسے تے کوٹ مٹھن بیت اللہ
ظاہر دے وچ پیر فریدن باطن دے وچ اللہ

''چاچڑ مدینہ کی طرح نظر آتا ہے اور کوٹ مٹھن بیت اللہ کی طرح نظر آتا ہے۔ ظاہر میں تو پیر فرید ہے، لیکن باطن اور اندر سے یہ خود خدا ہے۔''

اسی طرح ایک پڑھے لکھے آدمی نے لکھا ہے:

کارِ عالم کا مدبر بھی ہے، مختار بھی ہے عبد القادر
مخدوم بھی ہے، مطاع بھی ہے عبد القادر

''سارے عالم کا مدبر عبد القادر ہے اور میرا بھی عبد القادر ہے۔''

اصل تو عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ تو یہ افراط ہے۔ اسی طرح کسی اور نے کہا ہے:

ساڈا	عبد	القادر	قادر	ہے
سانوں	ہور	قادر	دی	لوڑ نہیں
سانوں	بغداد	دیاں	گلیاں	کافی نے
سانوں	ہور	بہشتاں	دی	لوڑ نہیں

تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دوسرا فرقہ میری دشمنی میں بڑھ جائے گا۔ وہ خوارج ہیں جن کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ مسلمان ہی نہیں...... معاذ اللہ!...... تو وہ اس طرح برباد ہو گئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق عادلانہ رائے:

اعتدال میں کون ہیں؟ وہ ہیں اہل السنت والجماعت۔ انہوں نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ داماد رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، "بَطَلٌ مِنْ بَطَلِ الْإِسْلَامِ" ہیں، سب سے زیادہ فیصلے کرنے والے ہیں اور ابی الحسن والحسین ہیں۔ یہ انہوں نے مقام دیا۔ انہوں نے نہ امام بنایا، نہ نبی بنایا اور نہ ہی خدا بنایا، وہی مرتبہ دیا جو اللہ نے دیا تھا۔ تو یہ اعتدال ہے۔

والدین کے حق میں جہالت کی انتہاء:

اب سمجھیں! ایک ہے قوتِ غضبیہ میں افراط کہ ٹالنے کی جگہ ہو، مگر غصہ کر ڈالے، والد کو مارنا شروع کر دے۔ تو یہ قوتِ غضبیہ کا افراط ہے۔

میرے پاس شکایت آئی کہ ایک آدمی نے اپنے باپ کو مارا ہے۔ میں اس وقت پاکستان میں تھا، میں نے آدمی بھیجا کہ اس کو پکڑ کر لے آؤ۔ جب اس کو پکڑ کر لے آئے تو اس کا دوسرا بھائی ساتھ تھا۔ اس کو پتا تھا کہ مکی صاحب نے پکڑ وایا ہے، وہ ٹھیک ٹھاک سزا دیں گے۔ تو اس نے سوچا کہ میں بھی پہنچ جاؤں، تاکہ کچھ سزا سے بچ جائے۔ وہ میرے پاس آیا اور آ کر کہنے لگا: آپ نے واقعی ٹھیک بلایا ہے، میرے بھائی کی غلطی ہے، میں نے اس بدبخت کو سمجھایا تھا کہ اگر بابا کو مارنا ہے تو دو چار جوتے مار دو...... دیکھو! کیسے سمجھدار بیٹے ہیں!!...... میں نے کہا: میں سمجھا کہ ایک آدمی کی غلطی ہے، لیکن چھوٹے میاں چھوٹے میاں اور بڑے میاں سبحان اللہ!۔ میں نے ان دونوں کو

لٹکا دیا اور جو بلوچ کرتے ہیں ان کے ساتھ کیا۔

بہر حال یہ ہے قوتِ غضبیہ کا غلط استعمال کہ اس کا حد سے بڑھ جانا اور بے محل غصہ دکھانا۔ اور اس کی تفریط کیا ہے کہ جہاں غصہ دکھانا ہے وہاں غصہ نہیں دکھا رہا۔ کافر مقابلہ میں کھڑا ہے، وہ قرآن کے خلاف بکواس کر رہا ہے، حضور ﷺ سے دشمنی کر رہا ہے، صحابہ سے دشمنی کر رہا ہے اور یہ ہنس رہا ہے، یہ کہتا ہے کہ بس دعا کریں، ٹھیک ہو جائے گا۔ تو یہ تفریط ہے۔ دعا تو اس کو لگے گی جس کا برتن صاف ہوگا۔ اگر خراب برتن میں دودھ ڈالو گے تو وہ خراب ہی ہوگا۔

اعتدال کی مثال:

اور اعتدال یہ ہے کہ جہاں ضرورت ہو استعمال کرے اور جہاں ضرورت نہ ہو استعمال نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ [الفتح:۲۹] اللہ نے حضور ﷺ کے صحابہ کی صفت بیان کی کہ کافروں کے مقابلہ میں چٹان بن جاتے ہیں اور شجاعت دکھاتے ہیں، لیکن آپس میں مہربان بن جاتے ہیں اور رحم دلی دکھاتے ہیں۔ یہ ہے اعتدال۔

گناہوں پر ناگواری ایمان کا حصہ ہے:

حدیث میں آتا ہے کہ اللہ نے ایک بستی کے بارے میں حکم دیا کہ اس پر عذاب نازل کر دو۔ ملائکہ نے عرض کیا: یا اللہ! آپ تو علام الغیوب ہیں، وہاں آپ کا ایک ایسا بندہ موجود ہے جس نے ایک لحظہ کے لیے بھی آپ کی نافرمانی نہیں کی، اس پر بھی عذاب نازل کر دیں؟ اللہ نے فرمایا: پھر بھی ساری بستی کو تباہ کر دو، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ کبھی اس نے بستی والوں کو گناہوں سے روکا نہیں ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ تو اپنی فکر کر، دوسروں کو چھوڑ۔ تو پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو ختم ہو جائے گا۔ اور یہ بھی افراط اور تفریط کی ایک قسم ہے۔ اگر کوئی آدمی شرابی ہے، گلی کے اندر آ کر دنگا کرتا ہے، اگر کوئی روکے تو کہتے ہیں: فاسق آدمی ہے، چھوڑیں کیوں خواہ مخواہ ایک آدمی کو اپنا دشمن بناتے ہو؟ تو نتیجہ کیا نکلا کہ آج مافیا غالب آ گیا اور شریف مظلوم ہے۔ یہ تفریط ہے، جبن ہے اور بزدلی ہے۔ وگرنہ آپ یقین کریں کہ کتنا بڑا ڈاکو کیوں نہ ہو اگر سارا محلہ اٹھ کھڑا ہو جائے تو کیا کرے گا؟ یہ تو نہیں کر سکتا کہ ایک آدمی ہزاروں کا مقابلہ کر سکے۔ اگر سارا محلہ فیصلہ کر لے کہ اس کو نہیں چھپانا تو کون سی طاقت ہے جو ڈاکو کو چھپائے؟

افراط اور تفریط کی مثال:

قوت شہوانیہ اور اس میں افراط کیا ہے؟ "صَرَفَهَا فِيْ مَا لَا يَنْبَغِيْ" (قوت کو نامناسب جگہ میں استعمال کرنا) کہ اللہ نے جس چیز کو حرام کیا ہے کہ سارا دن گندی عورتوں کے پیچھے پھرتا ہے، چکلوں میں پھرتا ہے اور چوبیس گھنٹے اسی میں ہے۔ یہ افراط کہ اس نے اپنی قوت شہوانیہ کو حد سے نکالا ہوا ہے۔ اور جہاں حق ہے وہاں بھی استعمال نہیں کرتا۔ اللہ نے بیوی کو حلال رکھا، لیکن وہ بیوی کے پاس بھی نہیں جاتا کہ مجھے عبادت سے فراغت نہیں ہے۔ تو یہ بھی تفریط ہے۔ ایک آدمی نے کہا کہ میں جا رہا تھا تو بیوی نے کہا کہ دین کے نام پر مجھے طلاق دے دو۔ میں نے طلاق دے دی۔ میں نے کہا: تم نے دین اچھا سمجھا ہے۔ یہ ہے افراط و تفریط۔ اب اس کا اعتدال کیا ہے کہ حلال میں استعمال کرے اور حرام سے بچے۔ اگر قوت شہوانیہ کو ختم کر دیں تو اس میں کچھ نہیں ہے۔

مصری عورتوں کا حسن:

ایسے ہی تو امام شافعی رحمہ اللہ نے نہیں لکھ دیا کہ جس نے مصر میں شادی نہیں کی اس نے عورت سے شادی ہی نہیں کی۔ اللہ نے ہر مٹی کے اندر خصوصیتیں رکھی ہیں، کسی میں وفا ہے اور کسی میں جفا ہے۔ کسی کے اندر صرف حسن اور کسی کے اندر اللہ نے دین رکھا ہے۔ یہ تو اللہ کی تقسیم ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت:

بہر حال عفت یہ ہے کہ امرأۃ العزیز وقت کے حاکم کی بیوی ہو، مصر کا حسن و جمال ہو، وہ عورت خوبصورت ہو، خود داعی ہو، تمام انتظام بھی ہو، اپنے شکار کو گھیر کر خود اپنے پاس دعوت دے اور پھر پیغمبر علیہ السلام کہیں: معاذ اللہ! تو یہ ہے مقام عفت۔ اللہ نے پیغمبروں کو عام انسانوں سے کئی گنا زیادہ طاقت دی ہوتی ہے۔ تو یہ کمال ہے۔

گناہ کا اثر:

علماء نے لکھا ہے کہ اگر آدمی کی کسی غیر محرم پر نظر پڑے اور وہ اپنی آنکھوں کو کنٹرول کر لیتا ہے تو...... ان شاء اللہ!...... اللہ تعالیٰ اس کے دل میں نور پیدا کر دیں گے۔ ہماری تباہی اس لیے ہوتی ہے کہ قرآن پڑھایا، تفسیر پڑھائی۔ سامنے سے ایک عورت گزری تو ساری نیکی گئی۔ کیونکہ برائی جلدی اثر کرتی ہے، اب لاکھ خوشبوئیں لگائیں، لیکن باہر ایک گٹر لیک ہو جائے تو سارے محلے میں بدبو پھیل جائے گی۔ آپ خدانخواستہ ایک من دودھ کے

اندر چار قطرے پیشاب کے ڈالیں تو وہ ایک من پر غالب آجائیں گے، حالانکہ دودھ زیادہ ہے۔ اسی لیے آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے نوجوان بچے کسی غلط لڑکے کی محبت میں چلے جائیں تو وہ دو دن میں برباد ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کو ٹھیک کرنا ہو تو ان پر بڑی محنت لگے، کم از کم چھ مہینے لگیں گے تب جا کر اصلاح ہوگی۔

علم حاصل کرنے میں افراط وتفریط:

قوتِ شہوانیہ میں اعتدال یہ ہے کہ جن چیزوں میں اللہ نے حلال کیا ہے اس میں استعمال کرنا اور جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے رک جانا، یہ اعتدال ہے۔

اسی طرح قوتِ عقلیہ کے اندر افراط کیا ہے؟ علوم ضارّہ کا حاصل کرنا، وہ علوم جو بندے کو نقصان دینے والے ہیں وہ اسی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ جادو سیکھ رہا ہے، علم نجوم سیکھ رہا ہے کہ مریخ کیا ہوتا ہے؟ سرطان کیا ہوتا ہے؟ جدی کیا ہوتا ہے؟ وغیرہ، وغیرہ۔ ماشاء اللہ! جو پہلے پڑھے ہیں وہ کون سا آسمان پر پہنچ گئے؟

اور بعض آدمی اس بات میں پڑ جاتے ہیں کہ ایسا تعویذ لکھیں کہ ساری دنیا تابع ہو جائے۔ بعض لوگ جن تابع کرتے ہیں۔ بعض ذہین طالب علم جن تابع کرتے کرتے خود جن بن گئے، عقل سے بھی گئے۔ کتنے لوگ ہیں جو عملیات کے چکر میں پڑ کے اپنے گھر والوں کو برباد کر بیٹھے، اپنی اولاد کو برباد کر بیٹھے۔ تو علوم ضارّہ کا حاصل کرنا یہ قوتِ عقلیہ کا افراط ہے۔ اور تفریط یہ ہے کہ علم حاصل ہی نہیں کرتا کہ چھوڑ دو، علم حاصل کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اصل تو انسان کی ترقی اللہ سے ملنے میں ہے۔ اور اللہ سے ملنے کا طریقہ عشق مجازی ہے۔ پہلے کسی لڑکے سے عشق ہوگا، لڑکی سے عشق ہوگا تو میرا مرشد پٹڑی بدلے گا تو ہم عشق حقیقی میں چلے جائیں گے، نہ عبادات، نہ روزہ۔ یہ تفریط ہے۔

قوتِ عقلیہ میں اعتدال یہ ہے کہ علومِ نافعہ کو حاصل کریں اور علوم ضارّہ سے بچیں۔

مغرب کا ایک کمال، ایک زوال:

یورپ کے پاس دو کمال ہیں: ایک ان کے پاس صنعت کاری ہے اور ایک حرام کاری ہے اور دونوں میں وہ انتہاء کو پہنچ گئے ہیں۔ وہاں میرے خیال میں برائی کا آخری اسٹیج ہی نہیں جو انہوں نے نہ دیکھا ہو۔ آپ حیران ہوں گے کہ انہوں نے اپنے ملک میں کتے کو بہت بڑا ایوارڈ دیا ہے، کیونکہ اس نے ایک بچی کی جان بچائی ہے۔ یہ ہمارا

ہیرو ہے۔ باقاعدہ اس کے گلے میں ایوارڈ ڈالا گیا، اس کی فلمیں بنائی گئیں۔

چاند پر سب سے پہلے کتیا کو بھیجنا:

آپ کو یاد ہوگا کہ جب چاند پر خلائی گاڑی بھیجی گئی تو سب سے پہلی سواری اس میں کتیا تھی۔ قاضی احسان مرحوم (میں نے بھی ان کی تقریر سنی ہے) اس زمانہ میں زندہ تھے۔ انہوں نے کہا: اگر چاند پر کوئی مخلوق ہے تو جب ہماری نمائندہ اترے گی تو وہ کہیں گے کہ نیچے سب اسی کی جنس کے لوگ رہتے ہیں۔ یورپ والوں نے بڑی ترقی کی ہے۔ اور اگر کسی کو اوپر بھیجا بھی ہے تو کتیا کو بھیجا ہے۔

اگر یورپ اور کفار کے ملکوں میں اگر ۱۰۰ انسان مرجائیں تو ان کی کوئی خبر نہیں ہوگی اور اگر ایک کتا مرجائے تو پورے چینل چیخ پڑتے ہیں۔ اگر ایک کتا بھی کار سے ٹکرا کر مرجائے تو سمجھو کہ عذاب آ گیا۔ یہ قوتِ عقلیہ میں افراط ہے کہ حیوان کو بھی انسان کے اوپر لے گئے۔ بعض لوگ تو اپنی جائیداد، کروڑوں ڈالر اپنے جانوروں کے لیے وقف کرکے جاتے ہیں، باقاعدہ کتوں کے لیے ڈاکٹر ہیں، لباس ہیں، خوراک ہے، اب تو کتوں کے لیے ہوٹل بھی ہیں۔ اگر میری ان باتوں میں آپ شک میں پڑ رہے ہوں تو کینیڈا کے بارے میں پڑھیں کہ وہ کتوں کے معاملے میں کتنے آگے چلے گئے ہیں۔

یورپ نے صنعت کاری اور حرام کاری میں ترقی کی ہے تو ہمارا کام یہ ہے کہ ہم صنعت کاری کو تو حاصل کریں، لیکن حرام کاری کو حاصل نہ کریں۔ یہ اعتدال ہے۔ یہ نہ ہو کہ ہم صنعت ان سے لے رہے ہوں تو بے حیائی بھی ان سے لے لیں۔ یا یہ کہیں کہ صنعت بھی حاصل نہ کرو، کیونکہ وہ گندے لوگ ہیں۔ یہ بھی اعتدال کے خلاف اور تفریط ہے۔

افراط کی ایک مثال:

ایک آدمی مجھے کہنے لگا کہ میں اتنی احتیاط کرتا ہوں کہ تمبا کو والا پان حدودِ حرم میں نہیں کھاتا۔ میں نے کہا کہ آپ حرم میں حمام، بیت الخلاء استعمال کرتے ہو؟ یہ نئے نئے صوفی ہوتے ہیں جن کا ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے اور کوئی خواب آیا تو انہوں نے سمجھ لیا کہ ہمارا خدا سے فاصلہ تھوڑا سا رہ گیا ہے۔ یہ افراط ہے۔

اچھی بات ہر کسی سے لی جاسکتی ہے:

قوتِ عقلیہ میں اعتدال یہ ہوا کہ حکمت یعنی علوم نافعہ حاصل کرو اور علوم ضارہ سے بچو۔ حکمت مومن کی گمشدہ

چیز ہے، جہاں سے بھی ملے لے لو۔ اس لیے فرمایا:

''لَا تَنْظُرْ اِلٰی مَنْ قَالَ وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلٰی مَا قَالَ'' [مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح: ۱/۳۰۰]

''یہ نہ دیکھو کہ کہنے والا کون ہے، بلکہ یہ دیکھو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔''

اگر بات صحیح ہے تو لے لو ورنہ چھوڑ دو۔

اسلام ہمیں ان تینوں قوتوں میں اعتدال سکھاتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ [البقرۃ: ۱۴۳]

''اور ہم نے تمہیں ایک ایسی جماعت بنا دیا ہے جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے، تا کہ تم (مخالف) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ہو۔''

تو اس ساری بات کو بتلانے کا مقصد یہ ہے کہ علماء نے فرمایا کہ اگر کسی مسئلے کو سو فیصد پھیلایا جائے تو سننے والے کو بچاس فیصد تو یاد رہے گا اور اگر اس کو بتاؤ ہی پانچ فیصد تو اس کو سب کچھ بھول جائے گا۔ تو اتنی لمبی چوڑی تمہید اس لیے باندھی کہ معلوم ہو جائے کہ اخلاق میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔

روزوں سے شہوانی قوت میں تبدیلی:

حضور ﷺ نے فرمایا:

((يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۵۰۶۵، بابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ...]

''اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جو نکاح کی طاقت رکھے وہ شادی کر لے اور جس میں طاقت نہ ہو وہ روزے رکھے، روزہ اس کو خصی کر دیتا ہے (شہوت کم کر دیتا ہے)۔''

تم میں سے جس کو اللہ نے صحت دی، جوانی دی اور پیسہ دیا ہے وہ نکاح کرے اور اگر تمہارے پاس خرچ وغیرہ کی طاقت نہیں ہے تو تم روزہ رکھو، کیونکہ تمہارے لیے روزہ ڈھال بن جائے گا۔

ہمارے ہاں رواج ہے کہ یہ پڑھ لے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے پھر شادی کریں گے۔ یعنی ہماری نظر اس کی اقتصادیات پر ہے، اس کی اخلاقیات پر نظر نہیں ہے۔ چاہے پڑھتے پڑھتے اس کا کچھ بھی نہ رہے۔ جن لوگوں کے مقدر میں علم ہے وہ شادی کے بعد بھی پڑھتے ہیں اور جن لوگوں کے مقدر میں علم نہیں ہے وہ شادی سے پہلے بھی

نہیں پڑھتے، بلکہ بعض لوگوں کے لیے بیویاں معاون بن جاتی ہیں۔ تو خاوند بھی گناہ سے بچ گیا، بیوی بھی گناہ سے بچ گئی اور بیوی ذہن بنا رہی ہے کہ کچھ پڑھو گے تو کچھ پہچان ہوگی۔ تو وہ ترقی کر جاتے ہیں۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمہارے پاس پیسہ نہیں، طاقت نہیں تو روزے رکھو، کیونکہ روزہ سے قواتِ شہوانیہ دب جائیں گی اور قواتِ ملکیہ ابھر آئیں گی۔ کیونکہ کھانا نہ کھانا فرشتوں کی صفت ہے، شادی نہ کرنا فرشتوں کی صفت ہے۔ جب ہم روزہ رکھ رہے ہوں گے تو وہ صفات غالب آ رہی ہوں گی۔ تو اس کا مطلب ہوا کہ اخلاق میں تبدیلی آتی ہے۔

تو اتنی بڑی تمہید باندھی، حالانکہ ہم سورۂ فاتحہ کے بارے میں پڑھ رہے ہیں۔ روایت میں آتا ہے:

((تَخَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللّٰهِ)) [احیاء العلوم: ۳/۳۶ بیان أن المستحق للمحبۃ ھو اللہ...]

''اللہ کی صفات سے سبق حاصل کرو۔''

اب جب ہم پڑھتے ہیں:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ [الفاتحہ: ۱]

''سب تعریفیں اللہ ہی کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے۔''

تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ محمود ہے۔ اس سے ہمیں خلق اول کا سبق ملا کہ میرے اللہ کی ذات کے لیے تمام محامد ہیں، میرے اللہ کی ذات تمام عیبوں سے پاک ہے۔ تو سبق ملا کہ جب تیرا رب محمود ہے تو تو بھی وہ کام کر جس سے تو بھی محمود بنے، مذموم نہ بنے۔

سورۂ فاتحہ کے کچھ نام:

گزشتہ مضامین میں تعوذ، تسمیہ اور سورۂ فاتحہ کے بارے میں کچھ باتیں ہم نے پڑھیں۔ سورۂ فاتحہ کے معروضات میں بیان کیا تھا کہ سورۂ فاتحہ عظیم سورت ہے۔ سورۂ فاتحہ کے انوار و برکات کے بارے میں بہت ساری احادیث میں اس کی فضیلتوں کا ذکر ہے۔ اس لیے اس کے متعدد نام آئے ہیں: شافیہ بھی ہے، وافیہ بھی ہے، کافیہ بھی ہے اور سورۃ المسئلہ بھی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ درسِ سابق میں بیان کیا تھا کہ کیا اخلاقِ انسانی میں تبدیلی ممکن ہے یا نہیں؟

فلسفۂ یونان کا رد:

فلاسفۂ یونان کے نزدیک جس طرح ''خَلق'' میں تبدیلی نہیں ہو سکتی اس طرح ''خُلق'' میں بھی تبدیلی نہیں

ہو سکتی۔ ان کے ہاں ایک مشہور محاورہ ہے کہ اگر آپ نے سنا ہو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو مان لو، لیکن اگر یہ سنو کہ فلاں بندے نے اپنی عادت بدل لی ہے تو نہ مانو۔ اس لیے بعض لوگوں کو گندی عادتیں ہیں، مثلاً: سگریٹ کی عادت ہے، پان کی عادت ہے۔ حالانکہ یہ معمولی سی چیزیں ہیں، قوت ارادی سے ختم ہو سکتی ہیں، لیکن جب عادت ہو جائے تو بندہ مجبور ہو جاتا ہے۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کا تجربہ:

حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا: ہمارے بعض لوگ جو سگریٹ اور نسوار کے عادی تھے یا چائے پینے کے عادی تھے، ان کی وجہ سے ہماری تحریکیں فیل ہو گئیں کہ وہ ایک دو دن بعد حکومت سے معافی مانگنے لگ جاتے تھے۔ جب کارکن جھک جائے تو تحریکیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ کسی چیز کو عادت نہ بنائیں۔ چائے حلال ہے، ٹھیک ہے، اس کو پی لیں، لیکن اس کو اپنے اوپر اتنا مسلط نہ کر دیں کہ نہ ملے تو آدمی پاگلوں کی طرح بھاگ رہا ہو۔

مولانا آزاد رحمہ اللہ کا جملہ:

مولانا آزاد رحمہ اللہ نے ایک جگہ عجیب جملہ لکھا ہے: ''دامن اگر بھیگتا ہے تو بھیگ جانے دیجیے، لیکن ہاتھوں میں استادم رہے کہ جب چاہا نچوڑ دیا۔'' کہ انسان ہے اس سے خطا ہوتی ہے، لیکن جب چاہو اس کو معاف کر دو، نچوڑ دو۔ ان فلاسفہ یونان میں سے متاخرین میں ایک گروہ پیدا ہوا جو کہتا ہے کہ عادات بدل سکتی ہیں، لیکن اس کے لیے بہت محنت کرنے پڑے گی۔ جب بدن کو مشقتوں میں ڈالیں گے تب جا کر عادت بدلے گی۔ اسی بات کو جوگیوں نے، بدھ مت نے اور فلسفیوں نے لیا ہے۔ یہ اسی فلسفے کا اثر ہے کہ سر منڈا لیں گے، گوشت نہیں کھائیں گے، شادیاں نہیں کریں گے، قبرستانوں میں بیٹھیں گے یا چلہ کشی کریں گے۔ یہ اپنے نفس کو مار رہے ہیں۔ پھر کہیں جا کر اصلاح ہو گی۔

اسلام کا نظریہ:

بہر حال اسلام کے اندر یہ باتیں نہیں ہیں، اسلام کے اندر نہ کہانت ہے، نہ ترکِ دنیا ہے، نہ ترکِ معاشرت ہے، بلکہ اسلام کہتا ہے کہ دین کا کام بھی کرو اور دنیا کا کام بھی کرو۔ اور نبی ﷺ نے فرمایا:

((فَإِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا))

[صحیح البخاری، حدیث:١٩٧٥، باب: حَقِّ الْجِسْمِ فِي الصَّوْمِ]

''تمہارے بدن کا تم پر حق ہے، تمہاری آنکھ کا تم پر حق ہے، تمہارے گھر والوں کا تم پر حق ہے اور تمہارے مہمان کا تم پر حق ہے۔''

اور اسلام کیا کہتا ہے؟ اسلام کہتا ہے:

((فَأَعْطِ كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ)) [صحیح بخاری، حدیث:١٩٦٨، باب: مَنْ أَقْسَمَ عَلَى أَخِيهِ...]

''ہر مستحق کا حق ادا کر۔''

((إِنَّ اللهَ يُحِبُّ أَنْ يَرَى أَثَرَ نِعْمَتِهِ عَلَى عَبْدِهِ))

''اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھیں۔''

[سنن الترمذی، حدیث:٢٨١٩، باب: مَا جَاءَ إِنَّ اللهَ تَعَالَى يُحِبُّ أَنْ يَرَى...]

حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ اس کے کپڑے پرانے اور بوسیدہ ہیں تو حضور ﷺ نے پوچھا: کیا تمہارے پاس مال ہے؟ اس نے کہا:

((أَعْطَانِي اللهُ عَزَّ وَجَلَّ مِنْ كُلِّ الْمَالِ مِنَ الْإِبِلِ وَالْغَنَمِ))

''میرے پاس ہر قسم کا مال ہے: اونٹ بکریاں وغیرہ''

حضور ﷺ نے فرمایا:

((فَلْيُرَ أَثَرُ نِعْمَةِ اللهِ عَلَيْكَ)) [سنن أبي داود، حدیث:٤٠٦٣، مسند أحمد، حدیث:١٧٢٣١، واللفظ له]

خدا تعالیٰ نے تجھے اتنی ساری نعمتیں دی ہیں۔ اس کا اثر تو تیرے بدن پر نظر نہیں آ رہا۔ تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے، اچھا کپڑا پہنو، صاف ستھرے رہو۔

یہ ہمیں دین نہیں سکھاتا کہ کوئی دو مہینے تک غسل نہ کرے، اگر نماز پڑھے تو ساتھ والے بھی بدبو سے بھاگ جائیں۔ اور یہ تصوف اور بزرگی نہیں ہے کہ آدمی گندا رہے، تا کہ لوگ سمجھیں کہ بڑا فقیر آدمی ہے، صوفی ہے۔ صوفی اس کو کہتے ہیں کہ جس کا دل شرک، بدعات اور منکرات سے صاف ہو۔ صفائے قلب سے صوفی بنتا ہے۔

اب اسلام کہتا ہے کہ ''خُلق'' کی بھی تبدیلی ہوتی ہے۔ اس کے لیے محبت ہے، تربیت ہے۔ کسی شاعر نے کہا:

صحبت	صالح	تُرا	صالح	کند
صحبت	طالع	تُرا	طالع	کند

''نیکوں کی صحبت تجھے نیک بنادے گی اور بروں کی صحبت تجھے برا بنادے گی۔''

جیسے حدیث میں آتا ہے کہ کوئی آدمی مدینہ میں جا کر اس طرح چالیس نمازیں پڑھے کہ اس کی تکبیر اولی بھی فوت نہ ہو تو اللہ اس کو نفاق سے اور عذاب سے بری فرما دیتے ہیں۔ یہ حدیث ضعیف ہے، لیکن فضائل اعمال میں محدثین اس کو قبول فرما لیتے ہیں۔

چالیس کے عدد میں حکمت:

اور تبلیغی جماعت والے حضرات بھی ہر آدمی کے لیے کوشش کرتے ہیں کہ ہر آدمی چالیس دن لگائے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ تو اس کو علماء نے لکھا ہے کہ اس کے اندر حکمتیں ہیں۔ بزرگ اگر کوئی بات کرتے ہیں تو ان کے پاس اس کی کوئی دلیل ہوتی ہے۔

❁......بزرگ فرماتے ہیں: جب اللہ تعالی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر بلایا تو وہاں چالیس راتیں بٹھایا۔ قرآن مجید میں فرمایا: ﴿فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ﴾ [الاعراف:۱۴۲] (سو ان کے پروردگار کا وقت پوری چالیس شب ہو گیا)۔ پینتیس (۳۵) راتیں کیوں نہیں بٹھایا، اکتالیس (۴۱) راتیں کیوں نہیں بٹھایا؟ تو مطلب یہ ہوا کہ اس کے اندر کوئی حکمت تھی کہ اللہ نے ان کو چالیس راتیں بٹھایا۔

❁......اور اللہ نے ہر نبی کو نبوت چالیس (۴۰) سال کی عمر کے بعد دی ہے، پینتالیس (۴۵) سال کے بعد کیوں نہیں دی؟

❁......اسی طرح انسان کے نشوونما کے رک جانے کا جو مقام ہے اس کے بارے میں فرمایا: ﴿حَتّٰى إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً ﴾ [الاحقاف:۱۵] (یہاں تک کہ جب وہ اپنی جوانی کو پہنچ جاتا ہے اور چالیس برس کو پہنچتا ہے......) یہاں بھی ۴۰ کا عدد ہے۔

❁......اسی طرح انسان پہلے ''نُطْفَة'' ہوتا ہے، پھر ''عَلَقَة''، پھر ''مُضْغَة'' اور پھر ''كَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا'' ہے۔ اس کا فرق چالیس چالیس دن بعد ہے کہ ہر چالیس دن کے بعد تغیر آتا ہے۔

❁......اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ جو آدمی چالیس احادیث یاد کرلے وہ علماء میں لکھا جائے گا۔ تو وہاں

"أَرْبَعِيْنَ" چالیس کا لفظ ہے۔

❁.....اسی طرح بڑے بڑے محدثین نے "أَرْبَعِيْنَ" لکھیں۔ علامہ نووی رحمہ اللہ نے اور بڑے بڑے علماء نے "أَرْبَعِيْنَ" کو لکھا ہے۔

❁.....اسی طرح جماعت والے بھی کہتے ہیں کہ چالیس دن لگاؤ، کیونکہ جب ہم چالیس دن ماحول سے کٹ جائیں گے، اس کو دوسری جگہ لے جا کر نماز اور تہجد پڑھائیں گے تو تغیر آئے گا، تبدیلیاں آئیں گی اور اس کے اخلاق تبدیل ہوں گے۔ اس لیے علماء اسلام فرماتے ہیں کہ اخلاق کی تبدیلی ہوتی ہے۔

حضور ﷺ کی مجلس کا اثر:

مقامِ نبوت اتنا بلند تھا کہ پہلے جو لوگ حضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرتے تو ایک ہی دم ساری منزلیں طے ہو جاتیں اور ایک منٹ میں انقلاب آجاتا تھا۔

ایک آدمی نے حضور ﷺ کے ہاتھ پر کلمہ پڑھا اور کہا: یارسول اللہ! جب تک میں نے کلمہ نہیں پڑھا تھا، سب سے زیادہ مجھے آپ کی ذات سے بغض تھا اور اب مجھے آپ سب سے زیادہ محبوب ہو گئے ہیں، سب سے زیادہ بغض آپ کے شہر سے تھا اور اب مجھے سب سے زیادہ پیارا آپ کا شہر ہو گیا ہے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۴۳۷۲، باب: وَفْدِ بَنِي حَنِيْفَةَ، وَحَدِيْثِ ثُمَامَةَ بْنِ أُثَالٍ]

یہ کیسے انقلاب آگیا؟ کیونکہ وہ مقامِ نبوت تھا کہ اللہ نے آپ کی ذات، بات اور ملاقات میں اتنی برکات رکھی تھیں کہ ایک منٹ میں تبدیلی آجاتی تھی۔ لہٰذا بندے کے اخلاق میں آہستہ آہستہ تبدیلی آتی ہے۔ وہ اخلاق حسنہ بھی ہو سکتے ہیں اور اخلاق سیئہ بھی ہو سکتے ہیں۔

بچہ پر ماں باپ کا اثر:

اس لیے جو پرانے اطباء گزرے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو بچہ دودھ پیتا ہے وہ بات نہیں کر سکتا، چل نہیں سکتا، جھگڑا نہیں کر سکتا، لیکن اس کے سامنے بھی ماں باپ جھگڑا نہ کریں، گناہ نہ کریں، کوئی بری حرکت اور گناہ نہ کریں۔ کیونکہ بچہ نہ سمجھ ہے، لیکن جو اس کا ذہنی کمپیوٹر ہے، اس کے اندر ساری حرکات فیڈ ہو رہی ہیں، وہ بڑا ہو کر ان حرکات کے اثر کو لیتا ہے۔

بچہ کی فطرت:

اس لیے حدیث شریف ہے:

((كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ))

"ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔"

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۳۸۵، باب: ما قيل في أولاد المشركين]

یعنی اگر بچہ پیدا ہو اس کو پہاڑوں پر چھوڑ دیں، جنگل میں چھوڑ دیں، اس کو کوئی بندہ بھی نہ ملے اور کوئی بندہ بھی اس کو نہ سمجھائے تو وہ دین توحید کو سمجھ لے گا، کیونکہ وہ دینِ فطرت پر پیدا ہوا ہے۔

اگر ماں باپ یہودی ہیں تو وہ بچے کو یہودیت کی طرف لے جاتے ہیں، اگر ماں باپ عیسائی ہیں تو بچے کو عیسائیت کی طرف لے جاتے ہیں، ماں باپ مجوسی (آگ پرست) ہیں تو وہ بچے کو مجوسیت کی طرف لے جاتے ہیں اور اگر مسلمان ہیں تو وہ بچے کو مسلمانیت کی طرف لے جاتے ہیں۔ تو مطلب یہ ہوا کہ اخلاق ان میں اثر کرتے ہیں۔

ایک عالم کا عبرتناک قصہ:

ہمارے ملک میں ایک عالم تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ امریکہ چلے گئے تو ان کے ایک دوست بیس پچیس سال کے بعد امریکہ کی اسی اسٹیٹ میں گئے جہاں وہ عالم رہتے تھے۔ ان کے پاس ان کا ایڈریس تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اتفاق سے آ گیا ہوں تو ان سے مل لوں۔ وہاں جب ان کے گھر پہنچے اور ان کے دروازے پر کال بیل دی تو اندر سے ایک لڑکی نکلی جو منی اسکرٹ میں تھی اور بالکل لباس ایسا پہنا ہوا تھا کہ لباس بھی اس سے شرما رہا تھا۔ بے چارے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ فلاں مولانا صاحب سے ملنے آیا ہوں وہ گھر پر ہیں؟ تو اس نے کہا: ہاں ہیں، آپ کون ہیں؟ انہوں نے اپنے بارے میں بتایا اور کہا کہ ان کو اطلاع کر دیں۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے مجھے اندر بلا لیا۔ جب میں اندر گیا تو یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ بڑا عظیم کتب خانہ ہے، مولوی صاحب کلین شیو ہیں اور سوٹ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور بڑے تپاک سے ملے تو میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: جس ماحول میں رہتا ہوں اس کے اثرات تو یہی ہونے تھے۔ جب تک تمہارے ساتھ تھا تو سنت کے مطابق لباس، داڑھی اور پگڑی تھی۔ جب یہاں آ گئے تو اس نے بھی تو اثر کرنا تھا۔ اس نے پوچھا کہ یہ بچی کون تھی؟ انہوں نے کہا کہ یہ میری بیٹی تھی۔ کہا: اس لباس میں؟ اس نے کہا: جب یہاں آئے تو سوچا تھا کہ اس طرح کے کاموں کے اندر تو ایسے ہوتا

ہے۔ اس کے بعد وہ بندہ وہاں سے چلا آیا۔

وہ کہتا ہے کہ جب پانچ سال کے بعد میں دوبارہ گیا اور ٹیلی فون کیا تو انہوں نے بتلایا کہ وہ مولانا تو فوت ہو گئے ہیں۔ میں ان کی بیگم اور بچوں کو ملنے کے لیے گیا اور میں نے کہا کہ مولوی صاحب کہاں دفن ہیں؟ اگر ان کی قبر قریب ہے تو میں جا کر دعا مانگ لوں۔ انہوں نے کہا: یہاں ایک عیسائیوں کا قبرستان ہے اس میں دفن ہیں۔ میں نے کہا کہ عیسائیوں کے قبرستان میں کیوں؟ تو انہوں نے کہا کہ بچیاں بوائے فرینڈ کے ساتھ پکنک منانے گئی ہوئی تھیں اور میں گھر میں اکیلی تھی تو میں نے مردوں کو دفنانے والوں کو ٹیلی فون کر دیا تھا، انہوں نے عیسائیوں کے طریقے پر عیسائیوں کے قبرستان میں دفن کر دیا۔

یہ صحبت کا اثر ہو گیا کہ ایک عالمِ دین ہے، لیکن صحبت کی وجہ سے یک لخت تبدیل ہو گیا۔

یورپ میں دین داروں کی دین داری قابلِ رشک ہے:

میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ یورپ، فرانس اور برطانیہ وغیرہ میں دین پر قائم ہیں ان کا مقام اللہ کے ہاں کتنا بلند ہوگا!! جہاں شیطانیت بے حیائی کی آخری حد کو پہنچ گئی ہو۔ آپ لوگ حرم کے بیٹھے ہوئے ڈش پر فلمیں دیکھیں اور وہ لوگ یورپ کے اندر رہتے ہوئے رات کو تہجد پڑھ رہے ہوں تو کمال تو ان کا ہے۔

یورپ کے اندر میں نے کئی مدارس کو جا کر دیکھا ہے۔ ہمیں شرم آتی ہے کہ وہ بچے کتنے دین پر ہیں اور ہم کتنے دین پر ہیں۔ ہر بچے کی پگڑی سنت کے مطابق ہے۔ اور مجال ہے کہ کوئی بچہ سنت نہ پڑھتا ہو اور کوئی بچی پردے کے ساتھ نہ ہو۔ وہاں میرے ایک دوست بچیوں کو لے کر آئے، تا کہ وہ بچیوں کو کہہ سکیں کہ جن کی تم کیسٹیں سنتی ہو وہ تمہیں ملنے کے لیے آئے ہیں۔ میں جب وہاں گیا تو دیکھا کہ ساری بچیوں نے اسکاف باندھے ہوئے ہیں اور ایسے ایسے دینی سوالات پوچھے کہ جو میرے خیال میں مولوی کو بھی نہیں آتے ہوں گے۔ تو وہاں سات سال کی بچیوں کو دین کے ساتھ اتنا تعلق تھا۔

اور یہاں مکہ اور مدینہ میں ہماری بچی میک اپ کر کے، سنگھار کر کے اور موبائل ہاتھ میں لے کر گانے سن رہی ہے۔ اور ایسے چل رہی ہے جیسے مال روڈ پر سیر کر رہی ہو۔ ان لوگوں کو اللہ کے کعبہ میں لے آنے والا بھی گنہگار ہے اور آنے والا بھی گنہگار ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایسی عورتیں زانیہ کے حکم میں آتی ہیں جو فیشن سنگھار کر کے اور پرفیوم

چھڑکے ہوئے ہو کہ جہاں سے گزرے تو یادگار کے طور پر اپنی خوشبوئیں چھوڑ جائے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ جب حضور ﷺ نے فرمادیا ہے کہ یہ زانیہ کے حکم میں ہے تو اس کو غسل کرنا چاہیے اور توبہ کرنی چاہیے۔

اولیاء اللہ کی صحبت کا اثر:

یہ اخلاق کی تبدیلی، تربیت اور اصلاح سے آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ [التوبۃ:۱۱۹]

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور (عمل میں) سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو۔''

تم صادقین کی صحبت اختیار کرو کہ اللہ نے ان کی آنکھوں میں ایسا اثر رکھا ہے۔

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

ان کی نظرِ کیمیا ایسی ہوتی ہے کہ آدمی بیٹھے بیٹھے تبدیل ہو جاتا ہے۔

میرے ایک دوست کا واقعہ:

میرا ایک بہت اچھا دوست تھا۔ فوت ہو گیا۔ اللہ اس کی مغفرت فرمائے۔ وہ بہت ست تھا، نماز نہیں پڑھتا تھا۔ میں نے زور لگایا تو وہ کبھی پڑھ لیتا اور کبھی غائب ہو جاتا۔ اب اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ یہ مولوی ہے، مجھے معاف نہیں کرے گا۔ جب نماز کا وقت آتا تو وہ غائب ہو جاتا تھا۔

ایک دفعہ اتفاق سے ایسے ہوا کہ میں کراچی آیا اور وہ بھی میرے ساتھ کراچی آ گیا اور وہاں بنوری ٹاؤن جو بڑا مدرسہ ہے (اللہ تمام مدرسوں کو قائم و دائم رکھے۔ آمین) وہیں میں ٹھہرتا تھا، وگرنہ حضرت مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ مہتمم مدرسہ ناراض ہو جاتے تھے کہ آپ میرے پاس نہیں ٹھہرتے۔ ہم وہاں ٹھہرے اور میرے دوست کو علیحدہ کمرہ دیا گیا۔ جب میں صبح کی نماز کے لیے گیا اور سنتیں پڑھ کر سلام پھیرا تو میرا دوست جو نماز نہیں پڑھتا تھا وہ صفِ اوّل میں بیٹھا تھا۔ میں نے کہا کہ آج تو کمال ہو گیا کہ جو آدمی سورج نکلنے سے پہلے بیڈ سے اٹھتا نہیں تھا، ٹانگوں کو گھسیٹ کر اٹھاتے تھے، آج یہ صفِ اوّل میں بیٹھا ہے، یہ تو عجیب بات ہے!!

مجھے! نماز پڑھ کر جب واپس آئے تو ناشتہ آیا ہوا تھا۔ (حضرت کو پتا تھا کہ میں ناشتہ نہیں کرتا، چائے کی پیالی اور

رس وغیرہ کھاتا ہوں اور یہی معمول ساری زندگی رہا) میں نے اس کو بلوالیا اور اس سے پوچھا: آج آپ نماز کے لیے اتنی جلدی کیسے اٹھ گئے؟ اس نے کہا: جی صاحب! جلدی کہاں اٹھا! آپ کی وجہ سے یہاں پھنس گیا ہوں، ایک آدمی تہجد کے وقت آیا اور پوچھا کہ آپ کو تہجد کے لیے پانی چاہیے؟ لوٹا بھر کر رکھ دوں؟ تھوڑی دیر کے بعد دوسرا آدمی آیا اور اس نے کہا: حضرت! میں نے پانی باہر رکھ دیا ہے، پندرہ منٹ کے بعد ایک اور آدمی آیا، اس نے کہا: میں نے تولیہ بھی لٹکا دیا ہے اور چوتھا آدمی آیا اور کہا: میں نے باہر چپل بھی رکھ دیے ہیں، تا کہ آپ کے بوٹ خراب نہ ہوں۔ میں نے سوچا کہ یہ مولوی تو سونے ہی نہیں دیتے تو بہتر ہے کہ اٹھ کر دو رکعت نماز ہی پڑھ لوں اور مسجد میں چلا جاؤں۔ میں نے صرف صفِ اوّل میں نماز ہی نہیں پڑھی، بلکہ تہجد بھی پڑھ لی ہے۔

اصول یہ ہے کہ حالات اور ماحول انسان کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ اسی طرح خاندانی اثرات سے بھی تبدیلی آتی ہے۔ اس لیے اہلِ اسلام اس بات کے قائل ہیں کہ ''خُلق'' میں تبدیلی ممکن ہے۔

سابقہ مضامین کے بیان کا مقصد:

اس ساری تمہید کا مقصد یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ ہمیں کیا سبق دیتی ہے؟ علماء نے فرمایا: اگر سورۂ فاتحہ میں غور کیا جائے تو سب سے بڑا درسِ اخلاق ہے۔

مشورہ کی اہمیت:

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو بھی پابند کیا اور فرمایا: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ﴾ [آل عمران:۱۵۹] (اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجیے۔ پھر جب آپ رائے پختہ کرلیں تو خدا تعالیٰ پر اعتماد کیجیے)۔ میرے مدنی پاک! جب بھی آپ کوئی فیصلہ کرنا چاہیں، جب بھی آپ کو کوئی مسئلہ درپیش ہو تو صحابہ سے مشورہ کریں۔

اسی طرح اللہ نے فرمایا: ﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾ [الشوریٰ:۳۸] (اور ان کا ہر کام (جس میں بالتعیین نص نہ ہو) آپس کے مشورے سے ہوتا ہے)۔

ہر کام اطمینان سے کرو:

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو تعلیم دی:

﴿اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ﴾ [السجدۃ: ۴]

''اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے آسمان اور زمین کو اور اس مخلوق کو جو ان دونوں کے درمیان میں ہے چھ روز میں پیدا کیا۔''

حالانکہ اللہ کو تو چھ دنوں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

﴿اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ [یٰس: ۸۲]

''جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کا معمول تو یہ ہے کہ اس چیز کو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا! پس وہ ہو جاتی ہے۔''

وہاں تو صرف حکم دینے کی ضرورت ہے کہ ہو جا تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ لیکن چھ دن لگائے، تا کہ بندوں کو تعلیم ملے کہ ہر کام آرام آرام سے کیا جائے۔

شفاعتِ کبریٰ میں حضور ﷺ کی حمد و ثنا:

علمائے محققین فرماتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ کے اندر یہ سبق ملا کہ تمام حمد و ثنا کے لائق صرف اللہ ہے۔ اسی لیے دعا سکھائی گئی:

((اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كُلُّهٗ وَلَكَ الْمُلْكُ كُلُّهٗ بِیَدِكَ الْخَیْرُ كُلُّهٗ اِلَیْكَ یَرْجِعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ))

''اے اللہ! تمام تعریفیں تیرے لیے ہیں، تمام حکومتیں تیرے لیے ہیں، ہر طرح کی خیر تیرے ہاتھ میں ہے اور سارے معاملات تیری ہی طرف لوٹتے ہیں۔'' [مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۲۳۳۵۵]

حضور ﷺ نے فرمایا: جب قیامت کا دن ہوگا تو تمام امتیں میرے پاس شفاعت کبریٰ کے لیے آئیں گی۔ اور جب میں شفاعت کے لیے بڑھوں گا تو اللہ مجھے حمد سکھلائیں گے۔ کیونکہ اللہ جب دینے پر آتے ہیں تو حمد بھی خود سکھلا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ﴾ [البقرۃ: ۳۷]

''بعد ازاں حاصل کر لیے آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند الفاظ تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی ان پر (یعنی توبہ قبول کرلی)۔''

دنیا کے اندر بھی اگر کوئی افسر مہربان ہو تو وہ بھی کہتا ہے کہ اس طرح لکھ کر لاؤ، ہم تیرا کام کر دیں گے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں اس حمد و ثنا کے ساتھ عرش کے نیچے سجدہ کروں گا۔ اس کے بعد اللہ سے شفاعت کی

درخواست کروں گا تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:

((یَا مُحَمَّدُ! ارْفَعْ رَأْسَكَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ وَسَلْ تُعْطَهْ))

''اے (ہمارے محبوب) محمد! اپنا سر اٹھائیے اور سفارش کیجئے آپ ﷺ کی سفارش مقبول ہوگی اور مانگیے، آپ کو دیا جائے گا۔'' [صحیح البخاری، حدیث: ۳۳۴۰، باب: قَوْلِ اللّٰہِ تَعَالٰی: إِنَّآ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلٰی قَوْمِہٖ]

اللہ تمام کمالات سے موصوف ہے:

سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا معبود اللہ ہے جو ہر عیب سے پاک ہے، تمام تعریفیں اسی کے لائق ہیں۔ اس لیے علماء نے معبود کی شان کے بارے میں کہا:

''أَنَّهُ مُتَّصِفٌ بِصِفَاتِ الْجَمَالِ وَالْكَمَالِ وَالْجَلَالِ وَأَنَّهُ مُنَزَّهٌ عَنْ سَائِرِ الْعِجْزِ وَالنَّقْصِ وَالْاِخْتِلَالِ''

''اللہ کی شان یہ ہے کہ تمام صفاتِ جمال اور صفاتِ کمال اس کے لائق ہیں اور صفاتِ عجز ونقص اور ہر اس صفت سے جو اس کی شان کو زیبا نہیں اس سے پاک ہے۔''

دیکھو! اللہ اولاد سے کیوں پاک ہے؟ کیونکہ اولاد کا ہونا عجز کی علامت ہے۔ اس لیے حضرت زکریا علیہ السلام نے دعا مانگی:

﴿فَهَبْ لِي مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا ۝ يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝﴾ [مریم: ۶،۵]

''آپ خاص اپنے پاس سے مجھے ایک ایسا وارث عطا کر دیجیے جو میرا بھی وارث ہو اور یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے بھی میراث پائے۔ اور یا رب! اسے ایسا بنائیے جو (خود آپ کا) پسندیدہ ہو۔''

والدین کا نافرمان:

اسی لیے جب اولاد نافرمان ہو جائے تو بندے کے لیے موت ہے۔ یا بیٹا بیوی کے چکر میں آ کر ماں کو بھول جائے تو ان ماؤں سے پوچھو کہ ان پر کیا گزرتی ہے؟ بیٹا بیگم کو لے کر بڑا خوش ہے اور ماں بیٹے کی شکل دیکھنے کے لیے بھی ترس رہی ہے۔ ہاں! ایسے آدمی کو اولاد ایسی ملے گی جو اس سے بھی زیادہ نافرمان ہوگی اور اس کو دنیا میں ہی نافرمانی کی سزا ملے گی۔ جلدی بھگتے یا دیر سے بھگتے وہ یہ سزا ضرور بھگتے گا۔ اس کو تاریخ میں لکھ کر رکھ لیں کہ آپ جو والدین کے ساتھ کر رہے ہیں اس کا ڈبل آپ کو بھگتنا پڑے گا۔ اگر آپ نے والدین کو چھوڑا ہے تو آپ کی اولاد

آپ کو چھوڑے گی بھی سہی اور توڑ کے بھی رکھ دے گی۔ پھر اس دن یاد آئے گا کہ ہم نے والدین کے ساتھ کیا کیا تھا۔ اس پر اللہ معافی نہیں دیں گے، کیونکہ جنہوں نے اس کو تخلیق کے مراحل سے گزرا ہے، جوان کا نافرمان ہے اس کی سزا ضرور دیں گے۔

اللہ کے بعد نبی کا مقام ہے، لیکن اللہ نے کئی جگہوں پر اپنے ذکر کے بعد والدین کا ذکر کر دیا۔ فرمایا:

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ [النساء:٣٦]

''اور تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو۔''

اور ایک جگہ فرمایا:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ [الاسراء:٢٣]

''اور تیرے رب نے حکم کر دیا ہے کہ بجز اس کے کسی کی عبادت مت کرو اور تم (اپنے) ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو۔''

دیکھیں! اللہ کے بعد والدین کا ذکر آیا ہے۔

تو سورۃ فاتحہ سے ہمیں یہ اخلاقی سبق ملا کہ ہم بھی وہ کام کریں جس سے ہم محمود بنیں، مذموم نہ بنیں۔

کسی میت کے متعلق لوگوں کی اچھی یا بری گواہی:

ایک آدمی فوت ہوا تو حضور ﷺ کی خدمت میں ایک آدمی آیا اور اس نے کہا: وہ اچھا آدمی تھا۔ دوسرا آدمی آیا، اس نے کہا: اچھا آدمی تھا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''وَجَبَتْ'' (واجب ہوگئی) صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ''مَا وَجَبَتْ؟'' (کیا واجب ہوگئی؟) حضور ﷺ نے فرمایا: جب اللہ کی مخلوق اس کی اچھائی کی گواہی دے رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے بھی اس کے لیے اچھا فیصلہ کرنا ہے۔ اسی طرح اگر بندے کسی کے بارے میں کہیں کہ بڑا ظالم، جابر اور بڑا ڈاکو تھا تو سمجھ لیں کہ اس کے لیے جہنم کا فیصلہ ہوگیا، کیونکہ یہ بندے اللہ کے گواہ ہیں۔

[صحیح بخاری، حدیث:١٣٦٧، باب: ثناء النَّاسِ عَلَى الْمَيِّتِ]

اس لیے روایت میں آتا ہے کہ جس کے جنازے میں بندے زیادہ ہوں تو یہ دلیل ہے کہ اس کی مغفرت

ہو جائے گی۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۲۲۴۷، باب: مَنْ صَلَّی عَلَیْہِ مِائَۃٌ شُفِّعُوا فِیہِ]

اپنی موت پر تم ہنسو اور لوگ روئیں:

بلکہ بعض بزرگوں نے فرمایا کہ جب تو پیدا ہوا تھا تو تُو رو رہا تھا اور سارے ہنس رہے تھے۔ اب اگر مرنے کا وقت آئے تو تم اگر مرد ہو تو انتقام لو کہ تم مسکرا رہے ہو اور دنیا تمہارے لیے رو رہی ہو۔ تمہارے لب پر مسکراہٹ ہو اور تم ہنس رہے ہو اور دنیا رو رہی ہو کہ کیسا اچھا بندہ چلا گیا۔ کتنے اچھے آدمی سے ہم محروم ہو گئے۔ اس لیے اولیاء اللہ اور صوفیاء نے بڑی عجیب بات کہی کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو نہ بول سکتا ہے، نہ بھاگ سکتا ہے اور نہ مانگ سکتا ہے تو اللہ نے اس کو سب سے پہلے رونا سکھا دیا کہ تم رونا شروع کر دو، پھر دیکھو میں تمہارے لیے سارے گھر کو فکر مند کر دیتا ہوں۔ ماں بھاگ رہی ہے، نانی بھاگ رہی ہے، بھائی بھاگ رہا ہے، باپ چیخ رہا ہے کہ بچہ رو رہا ہے، دیکھتے نہیں ہو؟ تو اللہ نے رونا سکھلا دیا جس سے اس کے سارے مسائل حل ہو گئے۔ تو یہی اللہ سکھانا چاہتے ہیں کہ جب اللہ کے آگے رونا سیکھ جاؤ تو تیرے آخرت کے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔

خدا کے خوف سے رونے والے:

جو آنکھ رات کی تاریکیوں میں اور تنہائیوں میں اللہ کے خوف سے روتی ہے اللہ اس کو جہنم سے پانچ سو سال کے فاصلے پر دور کر دیتے ہیں۔ اس لیے بعض اولیاء اللہ جب روتے تھے تو وہی آنسو اپنے چہرے پر مل لیتے تھے کہ اسی سے اللہ نے جہنم کو دور کرنا ہے۔ جب یہ آنسو میرے منہ پر ہوں گے اللہ اس کو جہنم سے دور کر دیں گے۔

تو پہلا سبق "اَلْخَلْقُ الْاَوَّلُ" یہ ہے کہ ہم اچھے بنیں، برے نہ بنیں، اپنے اندر صفاتِ حمیدہ پیدا کریں اور صفاتِ ذمیمہ سے بچیں۔

سب کو پالنے والا رب:

اور دوسری صفت "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" ہے، سب کو پالنے والا۔ انسان تو انسان چرند، پرند اور درندے سب کو پالنے والا اللہ ہے۔ جب ہم پیٹ میں تھے تو پالنے والا اللہ، "جَنِیْن" تھے تو پالنے والا اللہ، "صَبِی" بنے تو پالنے والا اللہ اور پھر جوانی میں آئے تو پالنے والا اللہ۔

جدید تعلیم یافتہ لوگ اور بوڑھے والدین:

اور جب بڑھاپے میں چلے گئے، پھر اگر اولاد زیادہ پڑھی لکھی ہوئی تو کسی اولڈ ہاؤس میں پھینک آئیں گے۔ اگر جاہل ہوئی تو روٹی وغیرہ دے دیں گے۔ میں یورپ کے اندر جا کر کہتا ہوں کہ اگر تمہیں دنیا کی کوئی پرانی چیز ملے تو تم اس کو دس گنا مہنگا خرید لیتے ہو، لیکن باپ پرانا ہو تو اس کو اولڈ ہاؤس میں پھینک دیتے ہو۔ وہ بھی تو بوڑھا ہو گیا، پرانا ہو رہا ہے اس کی قدر کرو۔ لیکن اس کو اولڈ ہاؤس پھینک آئیں گے کہ سارا وقت کھانستا رہتا ہے، ڈسٹرب کرتا رہتا ہے۔ عید وغیرہ پر جا کر کارڈ دے دیں گے یا کبھی کبھی وہاں جا کر پوچھ لیں گے اور اگر مر گئے تو کمپنی کو ٹیلی فون کریں گے کہ ابا جان کو دفنا دو، پیمنٹ ہم کر دیں گے، ہمارے پاس تو ٹائم نہیں ہے۔

اللہ پاک فرماتے ہیں: میری ربوبیت پر نظر ڈالو! اپنے اندر وہ صفت پیدا کرو، میں تجھے پالنے والا ہوں تو بھی پالنے والا بن، کسی کو مارنے والا نہ بن۔

ایک دیہاتی کی عجیب دعا!

دعا وہ ہوتی ہے جو دل سے نکلتی ہے۔ مسجع، مقفّی کلام کا نام دعا نہیں ہے۔ ایک اعرابی مست بیٹھا دعا کر رہا تھا:

❀..... ''یَا اَللّٰہُ! خَلَقْتَنِیْ مَجَّانًا'' (اے اللہ میاں! آپ نے مجھے مفت ہی پیدا کیا ہے (کیونکہ والدین کے پیسے لگے ہوں تو لگے ہوں، میرے تو نہیں لگے)۔

❀..... ''وَرَزَقْتَنِیْ مَجَّانًا'' (اور مجھے رزق بھی مفت دیا ہے (کیونکہ جب میں چھوٹا تھا تو میں کمانے کے قابل تو نہیں تھا پھر بھی آپ نے رزق دیا تھا)۔

❀..... ''فَاَدْخِلْنِی الْجَنَّةَ مَجَّانًا'' (تو جنت بھی مفت میں عطا فرما دے)۔

یہ دعا دل سے نکل رہی تھی۔ اور جو دعا دل سے نکلتی ہے، اثر کرتی ہے۔

ہمارے ہاں کندیاں شریف ایک علاقہ ہے، وہاں بڑے بڑے بزرگ گزرے ہیں اور اب بھی خواجہ خان محمد صاحب رئیس ختم نبوت ہیں، جو ہمارے بزرگوں کے مقام پر ہیں۔ (بوقتِ تحریر وفات پا چکے ہیں۔ اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین) وہاں سے ایک آدمی آیا۔ اس وقت یہ کاریں اور موٹریں نہیں تھیں۔ یہ اونٹ اور زیادہ سے زیادہ کسی کو گدھا مل گیا۔ اس کے پاس پیسے زیادہ نہیں تھے، اس نے گدھا کرایہ پر لیا اور اس پر

حج کیا۔ جب حج سے فارغ ہو گیا اور طواف زیارت کے لیے ملتزم پر آیا تو پنجابی کے اندر کہا کہ اے اللہ! ہمارے ہاں رواج ہے کہ بڑے سے بڑا مجرم ہو، اس کے سر پر استرا پھروا کر گدھے پر بٹھا دیتے ہیں تو پھر اس کو علاقے والے معاف کر دیتے ہیں۔ اے اللہ! میں نے بھی سر منڈوا دیا ہے اور گدھے پر بھی بیٹھ گیا ہوں۔ اب تو معاف نہ کرے تو تیری مرضی ہے۔

یہ ہے اصل دعا جو دل سے نکلے، دل کی تڑپ اور اخلاص سے ہو۔ اس لیے اللہ نے فرمادیا: تم اپنے اندر وہ صفتیں پیدا کرو جو ہم تمہیں تعلیم فاتحہ میں پڑھا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی اپنے قرآن کے سمجھنے کی اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔

اصلاحِ اخلاق کے تین طریقے:

اسی لیے اللہ نے انبیاء اور رسل بھیجے کہ وہ تلاوتِ کتاب سے اور تزکیہ سے ہماری اصلاح کریں۔ تو اسلام اس بات کا قائل ہوا کہ انسان کے اخلاق کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اس اخلاق کی اصلاح ان تین طریقوں سے ہوگی جو اللہ کے قرآن میں ہیں:

1 ...... تلاوتِ کتاب:

قرآن کو پڑھنے سے اخلاق کی اصلاح ہوتی ہے۔ جب آدمی قرآن پڑھ رہا ہوتا ہے تو گویا کہ وہ اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ جیسے ہم حدیث مبارک پڑھتے ہیں تو ہم حضور ﷺ سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ جس گھر میں ترمذی شریف موجود ہو تو گویا کہ اللہ کے نبی ﷺ اس کے گھر میں موجود ہیں۔

حضرت عکرمہ رحمہ اللہ بہت بڑے مفسر قرآن ہیں۔ جب وہ تلاوت کے لیے قرآن کھولتے تھے تو فرماتے: "هٰذَا كَلَامُ رَبِّيْ" (یہ میرے رب کا کلام ہے) میں اپنے رب سے ہم کلام ہو رہا ہوں تو ان پر غشی طاری ہو جاتی تھی۔ [بحر الفوائد، ص: ۱۷۳]

دیکھیں! قرآن میں کیا ہے؟

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ﴾ [البقرۃ: ۲۱]

"اے لوگو!"

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ [البقرۃ:۱۰۴]

''اے ایمان والو!''

تو اللہ تعالیٰ ہمیں خطاب فرما رہے ہیں۔

انسان کی اصلاح کا ایک بڑا ذریعہ تلاوتِ قرآن ہے۔ اور ہماری زبان میں اس کے لیے دو لفظ زیادہ استعمال ہوتے ہیں: تلاوت اور قرأت۔ دونوں کا معنی ایک ہی ہے، یعنی پڑھنا۔ اس لیے قرآن میں بھی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ [القیامۃ:۱۶]

''(اے پیغمبر! وحی قرآن کے اختتام سے پہلے) آپ اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے، تا کہ آپ اس کو جلدی یاد کرلیں۔''

جب ہم قرآن پڑھیں تو اس کی اتباع کریں۔ یہاں بھی لفظ قرأت ہے۔ اسی لیے قرآن کو قرآن کہتے ہیں۔

اور دوسرا لفظ تلاوت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ﴾ [البقرۃ:۱۲۱]

''جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توریت و انجیل) دی بشرطیکہ وہ اس کی تلاوت (اس طرح) کرتے رہیں جس طرح کہ تلاوت کا حق ہے۔''

اللہ نے حضور ﷺ کا وظیفہ بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ [الجمعۃ:۲]

''وہی ہے جس نے (عرب کے) ان پڑھ لوگوں میں ان ہی (کی قوم) میں سے (یعنی عرب میں سے) ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔''

یعنی نبی ﷺ اللہ کے قرآن پاک کو پڑھیں اور دوسروں کو سنائیں۔ تو دونوں لفظوں کا معنی ایک ہی ہوا۔

تلاوت اور قراءت کا ایک فرق:

بعض علماء فرماتے ہیں کہ ان دونوں لفظوں میں بڑا لطیف فرق ہے۔ مثلاً: آپ کہتے ہیں: ''قَرَأْتُ الْقُرْآنَ''، ''قَرَأْتُ الْحَدِيْثَ'' اور ''قَرَأْتُ الْجَرِيْدَةَ'' (میں نے قرآن پڑھا، میں نے حدیث پڑھی اور میں نے اخبار پڑھا) یہ تو ٹھیک ہے، لیکن آپ کبھی ''تَلَوْتُ الْجَرِيْدَةَ'' (میں نے اخبار کی تلاوت کی، میگزین کی تلاوت کی) نہیں کہہ سکتے۔

کیونکہ تلاوت اس چیز کے پڑھنے کو کہتے ہیں جس کے پڑھنے پر ثواب مرتب ہو۔ اگر آپ غلط میگزین پڑھنے شروع کر دیں تو گناہ ہوگا، منٹو کے افسانے پڑھنے شروع کر دیں تو آپ گنہگار ہوں گے۔ لہٰذا لفظ قراءت عام ہو گیا اور لفظ تلاوت خاص ہے، کیونکہ اللہ کے قرآن کے ایک حرف پڑھنے پر کم از کم دس نیکیاں ملتی ہیں۔

قرآن کی تلاوت کا اثر:

تو اخلاق کی اصلاح تلاوت سے ہوگی۔ اس لیے علماء نے فرمایا کہ انسان چاہے حافظ قرآن بھی ہو چوبیس گھنٹوں میں ایک دفعہ ضرور قرآن کو دیکھ کر پڑھے، چاہے جتنا پڑھے، کیونکہ قرآن کے دیکھنے میں بھی اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔

اس لیے علماء نے فرمایا کہ تین چیزیں ہیں جن کے دیکھنے سے بھی اللہ کی رحمت ہوتی ہے: قرآن کو دیکھنے سے، اللہ کے کعبہ پر نظر ڈالنے سے اور اپنے والدین کے چہرے کو ادب اور احترام کے ساتھ دیکھنے سے بھی اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ [کنز العمال، حدیث ۴۳۳۹۳]

2 ......قرآن وحدیث کی تعلیم:

دوسری چیز جس سے اخلاق درست ہوں گے کہ قرآن پاک کی تعلیم ہے، کیونکہ قرآن پاک ہمیں بتائے گا کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکوٰۃ ادا کرو اور حج کرو۔ قرآن بتائے گا کہ یہ شرک ہے، یہ توحید ہے، یہ حلال ہے، یہ حرام ہے اور یہ حدود اللہ ہیں۔ جب قرآن کی تعلیم آئے گی تو اخلاق بھی درست ہوں گے۔

اور حکمت کا معنی ہوتا ہے دانائی کی باتیں، مراد حضور ﷺ کی سنتیں ہیں۔ جب حدیث پڑھیں گے تو اس سے معلوم ہوگا کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا اور یوں عمل کیا، اس سے منع فرمایا اور اس کا حکم فرمایا۔ اس سے بھی ہمارے اخلاق کی اصلاح ہوگی۔

3 ......تزکیہ کے ذریعہ سے اصلاح:

تیسری چیز جس سے اخلاق کی اصلاح ہوگی وہ تزکیہ ہے کہ ان کے اندر کو مانجھنا، تصفیہ باطن کرنا۔

یہ تزکیہ کیسے ہوگا؟ تو یاد رکھیں! حضور ﷺ کے زمانہ میں حضور ﷺ کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اور کلمہ پڑھتے ہی اتنی فیض نظر ہوتی تھی کہ جو ڈاکو تھے، قاتل تھے وہ ﴿رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ کی تصویر بن گئے، جو اپنی بیٹیوں کو

زندہ دفن کر دینے والے تھے وہ دوسروں کی بیٹیوں کے بھی رکھوالے بن گئے اور جو ڈاکے مارنے پر فخر محسوس کرتے تھے وہ لوگوں کے مال کی حفاظت کرنے لگ گئے۔

علماء اور صلحاء کے ذریعہ سے علاج:

جیسے جیسے ہم حضور ﷺ کے زمانہ سے دور ہوتے گئے اور چودہ سو سال پیچھے آ گئے تو ہمارا تزکیہ کیسے ہوگا؟ اس سلسلہ میں ایک تو علماء ہیں اور دوسرے صوفیاء ہیں۔ شرط یہ ہے کہ وہ قرآن وسنت کے متبع ہوں۔ وہ ہمارا علاج کرتے ہیں، اس سے ہماری اصلاح ہوگی۔

جس طرح ڈاکٹر مریض کے مرض کی کیفیات دیکھنے کے بعد علاج کرتا ہے۔ اچھا ڈاکٹر مریض کو بھی دیکھتا ہے، مرض کو بھی دیکھتا ہے اور اس کے علاج کو بھی دیکھتا ہے۔ اسی لیے ان کی خوراک تقسیم ہوتی ہے۔ چھوٹوں کے لیے ایک گولی اور بڑوں کے لیے دو گولیاں ہوتی ہیں۔ وہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ دیکھتے ہیں کہ اس دوائی کی کیا طاقت ہے؟ اور آگے لینے والے کی عمر کا کیا تقاضا ہے؟ اسی طرح روحانی معالج علماء اور صوفیاء کو بھی ہماری بیماری کا پتا ہوتا ہے کہ یہ آدمی بہت اچھا ہے، لیکن جھوٹ بولنے کی بیماری میں مبتلا ہے، یہ آدمی بہت اچھا ہے، لیکن نماز میں سستی کرتا ہے۔ ان کا اپنا طریقہ ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ اور مولانا ظہیر الحق رحمہ اللہ کا واقعہ:

مجھے ایک ذمہ دار آدمی نے بتایا کہ مولانا ظہیر الحق صاحب دین پوری رحمہ اللہ...... جو حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ کے نواسے تھے اور حضرت مولانا غلام محمد رحمہ اللہ کے خلیفہ تھے انہوں...... نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کو دو یا تین مسواک ہدیہ میں بھیجے۔ اور ایک آدمی جو سہارنپور جارہا تھا اس کو وہ مسواک دیے تو وہ آدمی سوچنے لگ گیا کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ بہت اونچے آدمی ہیں، ان کا بڑا مقام ہے، حضرت نے کوئی ہدیہ بھیجنا تھا تو کوئی قیمتی چیز بھیجتے، کیا یہ مسواک ان کو وہاں سے نہیں ملتے ہوں گے؟ لیکن حضرت کی بات تھی، اس لیے وہ لے کر چلا گیا۔

جب وہاں جا کر اس نے وہ ہدیہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو پیش کیا تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ بہت خوش ہوئے اور بڑی دعائیں دیں۔ پھر اپنے حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا: تمہیں پتا کہ خلیفہ صاحب نے مجھے مسواک کیوں بھیجے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہمیں تو نہیں پتا۔ فرمایا: وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ مستحبات کا خیال رکھو، ان کو نہ چھوڑا کرو۔ کیونکہ

قاعدہ یہ ہے کہ اگر مستحبات چھوڑو گے تو اللہ نوافل سے محروم کر دیں گے، جب نوافل میں کوتاہی کرو گے تو اللہ سنتوں سے محروم کر دیں گے اور جب سنتوں سے کوتاہی کرو گے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ فرضوں سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

سنتوں اور نوافل کی اہمیت:

آج کل ہمارے نوجوان بڑے سوچ سمجھ کر کہتے ہیں کہ چھوڑو کیا نفل پڑھتے ہیں!؟ شیطان آپ کو پہلے سنتوں سے محروم کرے گا، پھر آہستہ آہستہ باقی حصے سے بھی محروم کر دے گا، بالآخر معاملہ یہاں تک پہنچ جائے گا کہ فرائض بھی ختم ہو جائیں گے۔ لیکن دوسرے حضرات سوچیں گے کہ مسجد میں آ گئے ہیں، اذان نہیں ہوئی تو چلو! دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھ لیں۔ اگر ظہر کے فرائض سے پہلے وقت ہے تو سنتیں پڑھ لیں گے، پھر فرائض کے بعد سنت اور نوافل بھی پڑھ لیں گے۔ کیونکہ جو فرائض کے اندر کی کوتاہی ہو گی وہ ان سے پوری ہو جائے گی اور اگر ہم یہ سب کچھ چھوڑ یں گے تو فرائض کو کس چیز سے پورا کریں گے؟

فقہ حنفی کی خصوصیات:

اسی لیے جہاں عبادت اور نوافل کا تعلق ہو گا وہاں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کثرت پر زور دیں گے اور جہاں حلال وحرام کا مسئلہ آئے گا تو وہاں قلت پر زور دیں گے۔ یہ فقیہ کا تفقہ ہے۔

ایک آدمی آٹھ رکعت تراویح پڑھتا ہے ہم اس کو منع نہیں کرتے، لیکن جس حدیث میں گیارہ رکعتیں ہیں یا تیرہ رکعتیں ہیں ان پر تو عمل رہ گیا اور جب بیس پر عمل کیا تو اس سے آٹھ والی پر بھی عمل ہو گیا۔ گیارہ والی پر بھی عمل ہو گیا، تیرہ والی پر بھی عمل ہو گیا اور رمضان کے مہینے میں تو ویسے زیادہ سے زیادہ عبادت کی جائے۔ تو جہاں زیادتی مقصود ہو تو امام صاحب نے اس پر زور دیا۔ اگر اس نے آٹھ والی روایت پر عمل کیا تو باقی احادیث کے بارے میں کیا کرے گا؟ اور اگر قیامت کے دن کہا گیا کہ بیس تراویح وغیرہ میں صحابہ کا اجماع برحق تھا تو کیا جواب دے گا؟ کمی کہاں سے پوری کرے گا؟

جلال الدین بخاری رحمہ اللہ اور محبوب سبحانی رحمہ اللہ کا واقعہ:

حضرت جلال الدین بخاری رحمہ اللہ اوچ شریف میں (جہاں بہت اولیاء اللہ کا اجتماع رہا ہے) موجود تھے اور محبوب سبحانی وہاں بعد میں آئے...... اور ادب یہ ہے کہ اگر کوئی بیٹھا ہو تو اس کے ساتھ بیٹھنے سے پہلے اجازت لی

جائے تو...... حضرت محبوب سبحانی ؒ نے حضرت جلال الدین ؒ کو پیغام بھیجا کہ فقیر چلتے چلتے اس مقام پر آگیا اور یہاں آپ مجھ سے پہلے موجود ہیں تو کیا مجھے اجازت ہے کہ میں اوچ میں رہ جاؤں؟ حضرت جلال الدین ؒ کو جب پیغام ملا تو مسکرائے اور خادم کو کہا کہ ایک پیالے میں دودھ لے آؤ۔ وہ دودھ لے آیا تو فرمایا کہ اس کو کسی ٹرے میں ادب کے ساتھ حضرت محبوب سبحانی کی خدمت میں پیش کر آؤ۔ مرید نے سمجھا کہ وہ مہمان ہیں اور دودھ افضل چیز ہے، اس لیے بھیج رہے ہیں۔ وہ لبالب پیالہ بھرا ہوا حضرت سبحانی ؒ کی خدمت میں لایا۔ حضرت نے جب دیکھا تو وہ بھی مسکرائے۔ اور اس وقت حضرت محبوب سبحانی ؒ کے ہاتھ میں ایک پھول تھا تو اس سے ایک پھول کی پتی نوچی اور اس کو دودھ میں ڈال کر واپس بھیج دیا...... میرے جیسے لوگ کیا سمجھتے؟ یہ کہ دودھ کے بارے میں تو شریعت میں ہے کہ واپس نہیں کرنا چاہیے اور انہوں نے واپس بھیج دیا۔ سنت کی خلاف ورزی کی ہے۔ اور پھر اوپر گلاب کی پتی کیوں رکھ دی......؟

جب وہ خادم حضرت جلال الدین ؒ کی خدمت میں واپس آیا تو آپ نے وہ دودھ بھی اور ساتھ روٹی کے کچھ ٹکڑے بھی بھجوا دیے۔ حضرت محبوب سبحانی ؒ نے فرمایا کہ الحمد للہ! اجازت مل گئی ہے۔ کچھ خشک مولوی جن کا کام ہی اعتراض کرنا ہوتا ہے۔ اللہ ان کو ہدایت دے۔ انہوں نے کہا: کیسے اجازت مل گئی؟ ہمیں تو کچھ سمجھ نہیں آیا۔ انہوں نے فرمایا: میں نے درخواست بھیجی تھی کہ مجھے اوچ میں رہنے کی اجازت عطا فرما دیں، حضرت نے دودھ کا پیالہ بھیج کر اشارہ فرما دیا کہ یہاں پہلے ہی اللہ والوں سے میدان بھرا ہوا ہے، کسی اور کی گنجائش ہی نہیں ہے، آپ کسی اور جگہ تشریف لے جائیں۔ تو میں نے دودھ کے اوپر پھول کی پتی ڈال کر گزارش کی کہ جس طرح اس پتی نے گزارہ کر لیا میں بھی گزارہ کر لوں گا۔ اس کے بعد حضرت نے روٹی کے ٹکڑے بھیجے کہ اب آپ ہمارے مہمان ہو، روٹی کھالو۔ آپ کو یہاں رہنے کی اجازت ہے۔ آپ میں اتنی صلاحیت ہے کہ ان اللہ والوں کے ہوتے ہوئے رہ لیں گے۔ اب آپس میں جو اشارات تھے ان کو کون سمجھے گا؟ جاہل کہے گا کہ دیکھو! یہ بھی کوئی بات ہے؟ کیا یہ قرآن میں لکھا ہوا ہے؟ ان باتوں کا کوئی علاج نہیں ہے، صرف یہ ہے کہ اللہ ہدایت عطا فرمائے۔

قرآن وحدیث کے مخفی اشارات:

اسی طرح آپ آگے جائیں تو اشارات قرآن وحدیث میں بھی آپ کو ملیں گے۔

جیسے حضور ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کو فرمایا کہ میرے بعد سب سے پہلے اس کی وفات ہوگی اور وہ

میرے پاس آئے گی جس کا ہاتھ لمبا ہوگا۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن فرماتی ہیں کہ ہم نے ہاتھوں کی پیمائش کرنی شروع کردی کہ کس کا ہاتھ لمبا ہے؟ تو حضرت سودا رضی اللہ عنہا کا ہاتھ لمبا تھا۔ لیکن جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا فوت ہوئیں تو سمجھ آیا کہ "أطولكنّ يدًا" سے سخاوت مراد ہے۔ وہ ام المساکین تھیں، اس لیے اللہ ان کی وفات کا وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رکھا۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۱۴۲۰، باب: فَضْلِ صَدَقَةِ الشَّحِيحِ الصَّحِيحِ]

روحانی معالج کا طریقۂ اصلاح:

تزکیہ کا معنی ہوتا ہے پاک کرنا۔ روحانی معالج علماء اور صوفیاء لوگوں کا تزکیہ کرتے ہیں۔ مثلاً: وہ کہیں گے کہ آپ روزانہ پانچ پارے پڑھا کریں، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس کی اصلاح تلاوتِ قرآن سے ہوگی۔ پھر جب ان کو لگے گا کہ یہ ٹھیک نہیں ہو رہا تو کہیں گے کہ آپ نے آٹھ رکعت تہجد پڑھنی ہے اور ہر رکعت میں مثلاً چار رکوع پڑھنے ہیں۔ کیونکہ وہ رات کا وقت ہوگا، رحمت کی گھڑی ہوگی، اللہ کی رحمت آئے گی اور اس کی اصلاح ہو جائے گی۔ اور بعض لوگوں کو کہتے ہیں کہ کثرت سے روزے رکھو۔ بہر حال! مقصد یہ ہے کہ یہ وہ طریقے ہیں جن سے اخلاق کی اصلاح ہوسکتی ہے۔

حضرت لاہوری رحمہ اللہ چالیس دن میں اصلاح کر دیتے تھے:

حضرت لاہوری رحمہ اللہ کے بارے میں سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ بھائی! اگر کسی کی اصلاح مقصود ہو اور لوگ کہتے ہوں کہ یہ ٹھیک نہیں ہوگا تو میں کہوں گا کہ میرے پاس آجاؤ اور چالیس دن لنگر میں رہو، مشترکہ کھانا کھاؤ گے، جو کپڑے دوں گا وہ پہنو گے، جو کہوں گا وہ کرو گے اور پھر چالیس دن کے بعد دیکھیں کہ تمہاری اصلاح ہوئی یا نہیں؟ بڑے بڑے ڈاکو، ظالم، قاتل حضرت کی خدمت میں گئے اور جب واپس آئے تو ایسا انقلاب آیا کہ داڑھی بھی رکھ لی، سنت کے مطابق لباس بھی پہن لیا اور نمازی بھی بن گئے۔

سید عطاء اللہ بخاری رحمہ اللہ کا واقعہ:

حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ بڑے ہنس مکھ آدمی تھے۔ ان کی خدمت میں سب لوگ آتے تھے، ڈاکٹر بھی ہوتے، مریض بھی ہوتے، شاعر بھی ہوتے، کمیونسٹ بھی ہوتے، اولیاء اللہ بھی ہوتے، بڑے بڑے صنعتکار بھی ہوتے، بیوروکریسی کے اونچے اونچے ستون بھی ہوتے اور فقیر بھی ہوتے۔ سب لوگ آتے تھے اور سمجھتے تھے کہ شاہ

جی مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔

ایک دفعہ شاہ جی رحمہ اللہ کی خدمت میں کیمونسٹ اور دہریہ قسم کا آفیسر آیا...... چونکہ یہ انگریزی سکول کے پڑھے ہوئے ہوتے ہیں، ان کو اسلام کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہوتا۔ بس یہی سمجھتے ہیں کہ باپ دادا مسلمان تھے تو ہم بھی مسلمان ہیں...... وہ شاہ جی کو کہنے لگا کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں، آپ ساری رات تقریریں کرتے ہیں، مصیبتیں برداشت کرتے ہیں، اس کا فائدہ کیا ہے؟ آپ اتنی محنت کر رہے ہیں، لوگوں میں کون سی تبدیلی آ گئی ہے؟ جرائم، ڈکیتیاں، قتل و غارت گری اسی طرح ہے اور اسی طرح جھوٹ، شراب، فحاشی اور عریانی ہے تو آپ کی تقریروں کا کیا فائدہ ہے؟ آپ آرام کریں میں آپ کو کسی ٹھنڈے علاقے میں بھجواتا ہوں...... اس آدمی کا اصل مقصد اپنی بڑائی بیان کرنا اور لوگوں کو بتانا تھا کہ ان مولویوں کا کیا فائدہ ہے؟ ان کو تو بولنے کی عادت ہے......

حضرت شاہ جی رحمہ اللہ نے فرمایا: ہاں بیٹے! ٹھیک کہتے ہو، میرا جو رات لاہور موچی دروازے پر جلسہ تھا اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال کہ کتنا مجمع ہوگا؟ اس نے کہا: آج کی اخبارات میں ایک لاکھ آدمیوں کا ذکر ہے، گورنمنٹ کا اعداد و شمار دس ہزار ہے اور میری رائے میں بیس پچیس ہزار حقیقی مجمع تھا۔ باقی اخبار والوں کی بات بھی سچی نہیں اور ہمارے رپورٹروں کی بات بھی سچی نہیں ہے۔ شاہ جی نے فرمایا: چلو! تمہاری بات مانتے ہیں کہ پچیس ہزار آدمی تھے۔ یہ بتاؤ کہ جلسہ کب شروع ہوا؟ اس نے کہا: عشاء کے بعد۔ شاہ جی رحمہ اللہ نے فرمایا: ختم کب ہوا؟ اس نے کہا: صبح کی نماز کے وقت ختم ہوا۔ شاہ جی نے فرمایا کہ پچیس ہزار آدمیوں کو آٹھ گھنٹے کے لیے گناہ سے روک لیا، یہ تھوڑا کام ہے؟ سگریٹ والوں کو سگریٹ سے روکا، حقہ والوں کو حقہ سے روکا، جھوٹ بولنے والے کو جھوٹ سے اور غیبت والے کو غیبت سے روکا اور دھوکہ دینے والوں دھوکہ دینے سے روکا، کیا یہ کم فائدہ ہے؟ اگر پورے ملک کے علماء کے جلسوں کو دیکھو تو وہ کروڑوں آدمیوں کو گناہوں سے روک رہے ہیں، وہ کام کر رہے ہیں، لیکن تمہاری فورسز کیا کر رہی ہیں؟ اس بے چارے کو سمجھ آ گئی کہ بات تو ٹھیک ہے۔

اصلاح کے اہل حضرات:

یاد رکھیں! اہل اسلام کے ہاں اخلاق کی اصلاح ہوتی ہے، لیکن اس کے طریقے ہوتے ہیں۔ اور سب سے اہم ترین طریقہ یہی ہوتا ہے کہ نماز پڑھنا، تلاوت قرآن کرنا، حدیث پاک کی تلاوت کرنا، اہل اللہ، علماء حقہ اور وہ

صوفیاء جو قرآن وسنت کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھتے ہوں ان کی صحبت اختیار کرنا۔ یہ ہماری باتیں نہیں، یہ ساری قرآن کی سورۂ فاتحہ کی باتیں ہیں۔

قرآن کہتا ہے:

﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ [الفاتحہ: ۶]

''اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' کون لوگ ہیں؟ کیا وہ ہیں جنہوں نے آئی سی ایس کیا ہو؟ یا پی ایچ ڈی کا امتحان دیا ہو؟ یا ڈاکٹر ہوں؟ نہیں، بلکہ ''اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' وہ لوگ ہیں جن کا تذکرہ تفصیل سے قرآن پاک میں دوسری جگہ کیا ہے۔

ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ [النساء: ۶۹]

''اور جو شخص اللہ اور رسول ﷺ کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صلحاء رحمہم اللہ اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔''

تو ان حضرات سے اخلاق کی اصلاح ہوگی، وگرنہ کیسے اصلاح ہو سکتی ہے؟

خدا کی ربوبیت عامہ:

علماء مفسرین نے فرمایا کہ جب ہم سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرتے ہیں تو ہمیں اخلاق کا سبق دیا جاتا ہے۔ اسی لیے آتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے اخلاق جیسا اپنا خلق بناؤ۔ اب یہ کیسے ہوگا؟ اس کو سمجھیں۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ سے یہ اخلاقی سبق ملا کہ ایسے کام کریں جو محمود ہوں اور مذموم نہ ہوں۔ ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ سے دوسرا اخلاقی سبق ملا کہ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کو پالنے والا ہے۔ یہ نہیں کہ صرف مسلمانوں کو دیا اور کافر کو نہ دیا، مسلمان کے گھر میں بارش ہو اور کافر کے گھر میں بارش نہ ہو، بلکہ ان کے ہاں بارش زیادہ ہوتی ہے۔ ان کے ہاں تین چیزیں مشہور ہیں کہ بیگم، ورک اور موسم کا کوئی پتا نہیں ہوتا۔ جب دفتر سے گھر آتے ہیں تو پتا نہیں ہوتا کہ بیوی بھی گھر میں ہوگی یا نہیں ہوگی؟ اور موسم کا یہ حال ہے کہ کسی بھی وقت بارش ہونے لگ جاتی ہے۔ رہا کام اور کچھ نہیں تو جوتے پالش کرنے لگ جائیں تو روٹی مل ہی جاتی ہے۔

ایک ڈی سی کا لطیفہ:

ایک آدمی مدت بعد پاکستان آیا۔ اس کے گھر والے کسی جگہ رشتہ لینے کے لیے گئے، پینٹ، شرٹ اور عمدہ بیگ ہاتھ میں ہے اور قیمتی گھڑی ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ وہاں کرتے کیا ہو؟ اس نے کہا کہ میں وہاں ڈی سی ہوں۔ ان کو بڑی خوشی ہوئی، کیونکہ ہمارے ہاں تو ڈی سی ضلع کا بڑا افسر ہوتا ہے۔ تو اس نے کہا کہ تصدیق کرلو، یہ میرے پاس پاسپورٹ ہے، کاغذات پاس ہیں، ان پر بھی ڈی سی لکھا ہوا ہے۔ انہوں نے لڑکی کا رشتہ دے دیا۔ جب وہاں گیا تو وہاں پتا چلا کہ یہ تو ہوٹل میں برتن دھوتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ تم نے تو کہا تھا کہ میں ڈی سی ہوں۔ اس نے کہا کہ میں نے کہا تھا: میں ڈی سی (ڈش کلینر) برتن دھونے والا ہوں۔ اگر تم نے ڈپٹی کمشنر سمجھا ہے تو یہ تمہاری بے وقوفی ہے، میں نے تو کوئی جھوٹ نہیں بولا۔

جنگ وجدال میں امن وامان کا حکم:

اس لیے میرے عزیزو! ''رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سب سے ہمدردی رکھیں، چاہے کافر ہے، ہندو ہے، یہودی ہے۔ یہ مخلوق ہیں، ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ان پر ظلم کریں۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک تقابل اور حرب آتا ہے۔ وہاں جو احکام شریعت کے ہوں گے اس کے مطابق چلیں گے۔

اسی لیے جب حضور ﷺ نے مکہ فتح کیا اور دس ہزار کا لشکر حضور ﷺ کے ساتھ ہے تو صحابہ نے کہا ''لَا قُرَیْشَ بَعْدَ الْیَوْمِ'' (آج کے بعد قریش کا بچہ بھی نہیں رہے گا) انہوں نے جو ہمارے اوپر ظلم کیے تھے ہم بھی گن گن کر بدلے لیں گے۔ جب حضور ﷺ مکہ کے قریب آئے اور اپنی فوج کو ترتیب دیا تو فرمایا: میرے صحابہ!

((مَنْ دَخَلَ دَارَ أَبِي سُفْيَانَ فَهُوَ آمِنٌ))

''جو ابوسفیان کی حویلی میں چلا جائے اس کو امان ہے۔''

((وَمَنْ أَلْقَى السِّلَاحَ فَهُوَ آمِنٌ))

''اور جو ہتھیار پھینک دے اس کو بھی امان ہے۔''

((وَمَنْ أَغْلَقَ بَابَهُ فَهُوَ آمِنٌ))

''جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے اس کو بھی امان ہے۔''

((وَمَنْ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَهُوَ آمِنٌ))

"اور جو مسجد حرام میں داخل ہو جائے اس کو بھی امان ہے۔"

[صحیح مسلم، حدیث: ۱۷۸۰، سنن ابی داؤد، حدیث: ۳۰۲۲، باب: مَا جَاءَ فِي خَبَرِ مَكَّةَ]

بوڑھے کو، بچے کو اور عورت کو بھی امان ہے۔ اسی طرح اللہ بھی ہمیں سبق دیتا ہے کہ تم بھی سب کے ساتھ بھلائی کرو، خیر خواہی کرو۔

سب پر رحم کا حکم:

اس لیے اسلام میں ہے کہ اگر تم گوشت زیادہ نہیں پکا سکتے تو شوربہ تو زیادہ بنا سکتے ہو، شوربے کا پیالہ ہمسائے کو بھیج دو کہ وہ بھوکا تو نہ رہے۔ تمہارے اندر بھی ربوبیت والا مادہ ہو۔ اس لیے اسلام کہتا ہے کہ اگر فروٹ کھائے ہیں تو اس کے چھلکے دروازے کے پاس نہ پھینکو، کیونکہ کوئی غریب گزرے گا، اس کو خوشبو آئے گی اور وہ سمجھے گا کہ اس گھر میں آم کھائے جا رہے ہیں اور ہمارے گھر میں تو سوکھی روٹی بھی نہیں ہے۔ تو اس کی جو ٹھنڈی سانس نکلے گی وہ تمہارے لیے نقصان کا باعث نہ بن جائے۔ اگر اس کو فروٹ نہیں کھلا سکتے تو اس کو دکھاؤ تو نہ دو۔

تیسرا خلق ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝﴾ ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑے مہربان نہایت رحیم ہیں۔ اس کو "شَفَقَةٌ عَلَى الْخَلْقِ" کہتے ہیں کہ جب اللہ کی صفت سے لو گے تو یاد رکھو! شریعت کا اصول ہے "مَنْ رَحِمَ رُحِمَ" کہ رحم کرو گے تو تم پر رحم کیا جائے گا۔ اس لیے فرمایا گیا:

((مَنْ لَا يَرْحَمُ مَنْ فِي الْأَرْضِ لَا يَرْحَمُهُ مَنْ فِي السَّمَاءِ)) [المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث: ۲۲۹۷]

"جو زمین والوں پر رحم نہیں کرتا تو آسمان والا اس پر رحم نہیں کرتا۔"

یہ "شَفَقَةٌ عَلَى الْخَلْقِ" ہے کہ غیروں پر رحم کرنا۔ اس کے اندر یہ فرق نہیں ہے کہ کس پر رحم کیا ہے۔

ایک گندی عورت کا قصہ:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک فاحشہ عورت کسی صحراء سے گزر رہی تھی تو اس کے اندر پھنس گئی، اس کو پیاس لگی تو اس نے دیکھا کہ ایک کچا کنواں ہے۔ اس کے اندر پانی تو ہے، لیکن نکالنے کے لیے کوئی چیز نہیں ہے۔ اس نے اپنے پاؤں سے جوتا نکالا اور دوپٹہ کو رسی بنایا کہ اس سے گھونٹ گھونٹ پانی آئے گا تو اس سے جان بچے گی۔

اور اس نے دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے تڑپ رہا ہے تو اس نے پہلے کتے کو پانی پلایا، پھر پانی نکالا اور خود پیا۔ کتے کو ہوش آیا اور وہ وہاں سے چلا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے کتے پر رحم کرنے سے اس کے سارے گناہ معاف کر دیے، حالانکہ اس نے صرف کتے پر رحم کیا تھا۔ اس کو ''شَفَقَةٌ عَلَى الْخَلْقِ'' کہتے ہیں۔ [مسند البزار، حدیث: ۸۷۲۵]

''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کا معنیٰ:

''الرَّحْمٰنِ'' بڑا مہربان اور ''الرَّحِيْمِ'' نہایت رحم والا۔ بعض علماء نے فرمایا کہ یہ دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں۔ بعض نے کہا کہ ''الرَّحْمٰنِ'' کا تعلق دنیا سے ہے کہ کافر اور مسلمان دونوں پر اللہ کا رحم ہے اور ''الرَّحِيْمِ'' کا تعلق آخرت کے ساتھ ہے کہ صرف مسلمانوں پر رحمت ہوگی۔

عدل وانصاف کا حکم:

اس کے بعد فرمایا: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (قیامت کے دن کا مالک ہے) اس سے یہ سبق ملا کہ اپنے اندر عدل وانصاف پیدا کرو، کیونکہ اللہ عدل والے ہیں، ظلم سے پاک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ [النساء: ۴۰]

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہ کریں گے۔''

اللہ تعالیٰ نقصان اور تمام عیبوں سے پاک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَأَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ﴾ [الرحمٰن: ۹]

''اور انصاف (اور حق رسانی) کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور تول کو مت گھٹاؤ۔''

تول ہو تو عدل کے ساتھ، پیمائش ہو تو عدل کے ساتھ، اگر کبھی گواہ بن جاؤ اور گواہی دو تو عدل کے ساتھ، کبھی جج بن جاؤ اور فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ ہو، حاکم بن جاؤ تو عدل ہو، بڑے بن جاؤ تو عدل ہو، اگر اللہ نے دو بیٹے اور چار بیٹیاں دی ہیں تو عدل ہو اور اگر دو بیویاں ہوں تو عدل ہو، کیونکہ ہم نے عادل کے دربار میں جانا ہے۔ تو ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ سے ہمیں عدل وانصاف کا سبق ملا ہے کہ معاملات میں عدل وانصاف قائم کریں۔ یہ نہ ہو کہ لینے کے باٹ اور ہوں اور دینے کے لیے اور ہوں۔ کھانے کے دانت اور ہوں اور دکھانے کے اور ہوں۔ اسلام اس بات کا سبق نہیں دیتا۔

تواضع کا سبق:

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ سے ہمیں تواضع کا سبق ملا کہ اے اللہ! ہم تیرے بندے ہیں، تو خالق ہے، تو مالک ہے اور تو رازق ہے، ہم تیرے مملوک ہیں۔ بھلا غلام کی بھی کوئی حیثیت ہوتی ہے؟ نماز، حج، اور طواف تواضع ہیں کہ اللہ نے حکم دیا ہے ہم کر رہے ہیں، کنکریاں مار رہے ہیں، دوڑ رہے ہیں تو یہ تواضع ہے۔ غلام کا معنی ہی یہ ہوتا ہے کہ جو مالک کا حکم ہو اس پر عمل کرے۔

سلطان محمود اور ایاز کا واقعہ:

بڑا مشہور واقعہ ہے کہ محمود بادشاہ ایاز غلام کو بہت پسند کرتے تھے تو لوگ جلتے تھے کہ وہ اس ملازم کو ہم پر کیوں ترجیح دیتا ہے؟ تو ایک دن بادشاہ نے تمام دوستوں کو بلوایا اور کہا کہ ہر آدمی ایک ایک چیز اٹھالے، لیکن شور نہ کرے۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ بادشاہ کا کمرہ تھا، کسی نے قیمتی جام اٹھالیا، کسی نے قیمتی قالین اٹھالیا، کسی نے قیمتی پینٹنگ اٹھالی۔ سب نے اٹھالیا، لیکن ایاز خاموش کونے میں کھڑا ہے۔ جب سب نے لے لیا تو ایاز سے پوچھا کہ تم چپ کیوں کھڑے ہو؟ تمہیں اس کمرے سے جو چیز چاہیے وہ لے لو۔ اس نے کہا: مجھے صرف آپ کا قرب چاہیے، آپ کی ذات کے ساتھ رہنا چاہیے اور کچھ نہیں چاہیے۔ تو بادشاہ نے کہا: دیکھو! کسی کو جام عزیز تھا اور کسی کو قالین عزیز تھا، ایاز کو تو میں عزیز ہوں۔ اس لیے ایاز مجھے پیارا لگتا ہے۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ تو ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ میں ہمیں تواضع کا سبق ملا۔

قناعت واستغنیٰ کا حکم:

﴿وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ میں ہمیں قناعت کا سبق ملا کہ تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں، تیرے سوا اور کوئی مددگار ہے ہی نہیں۔ "إِيَّاكَ" مقدم ہے تو حصر کا معنی ہو گیا کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

ہمارے ایک بزرگ عالم فرماتے تھے کہ مسئلہ صرف "ہی" اور "بھی" میں ہے کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ کی بیوی کہے کہ میں تیری بھی ہوں۔ اور کبھی کبھی ذائقہ بدلنے کے لیے غیر کے پاس جائے تو پھر بندہ بے غیرت بنے گا۔ اسی لیے بیوی کو یوں کہنا چاہیے کہ میں تیری ہی ہوں۔ اسی لیے ہم یوں کہتے ہیں کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ تو اس کے اندر قناعت آگئی۔ خدا کی قدرت ہے کہ جب قناعت آجائے تو آدمی غنی ہو جاتا ہے

اور اگر طمع آجائے تو آدمی فقیر رہتا ہے۔

اپنے مولیٰ پر انحصار کا واقعہ:

حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہمارے دور میں اتنا قحط پڑا کہ لوگ پرانے چمڑے ابال کر پانی پی لیتے تھے۔ میرا ایک آدمی پر گزر ہوا تو وہ بیٹھا ہنس رہا تھا، مسکرا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ لوگ قحط کی وجہ سے مر رہے ہیں اور تو بیٹھا مسکرا رہا ہے؟ اس نے کہا کہ میرے آقا کے گودام غلے سے بھرے ہوئے ہیں، وہ مجھ پر مہربان ہے اور میری ضروریات کو بخوبی پورا کرتا ہے تو مجھے کیا فکر ہے؟ حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے سوچا کہ اس بندے کو اپنے دنیا کے مالک پر کتنا ناز ہے! تو جس کے پاس ﴿خَزَآىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ہیں۔ اگر اس کے ساتھ تعلق جڑ جائے تو بندے کو کیا پریشانی ہوگی؟

تو ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝﴾ سے ہمیں سبق ملا کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور کسی کے دروازے پر نہیں جاتے۔

علومِ نافعہ اور علومِ ضارّہ:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝﴾ سے ہمیں یہ سبق ملا کہ ہمیں راستہ ملے تو علم وحکمت والا، سیدھا راستہ۔ اگر گمراہ علم ملا تو ہم گمراہ ہو جائیں گے۔ وگرنہ گانا، موسیقی اور ناچنا بھی تو علم ہے، جادو بھی علم ہے، یہ بھی سارے علوم ہیں۔ لیکن ایک علومِ ضارّہ ہیں، ایک علومِ نافعہ ہیں، ایک علومِ ضالّہ ہیں، ایک علوم ہدایت والے ہیں، ایک علوم رحمانیت والے ہیں اور ایک علوم شیطانیت والے ہیں۔ جیسے یورپ ہے، سارے جدید علوم ان کے پاس ہیں۔ اب ہم ان سے علومِ نافعہ حاصل کرنے کے بعد اس کا استعمال کیسے کر رہے ہیں؟ اس سے ہمیں یہی سبق ملا ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝﴾ کہ یا اللہ! ہمیں علم وحکمت عطا فرما، ہمیں صراطِ مستقیم عطا فرما۔

علومِ رحمانیہ کے فائدے:

علماء نے بڑی عجیب بات لکھی ہے کہ اگر علومِ رحمانیہ ہوں تو اس سے انسان کی روح اور بدن دونوں کو فائدہ ہوتا ہے، اللہ اس کے دل میں نور پیدا کر دیتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَیْرًا یُّفَقِّهْهُ فِي الدِّیْنِ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۷۱، باب: من یرد اللہ بہ خیرا...]

"اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے دین میں سمجھ عطا کرتا ہے۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُورٍ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ [الزمر:٢٢]

"سو جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام (کے قبول کرنے) کے لیے کھول دیا تو وہ اپنے پروردگار کے (عطا کیے ہوئے) نور پر ہے۔"

اور اگر علوم شیطانیہ ہوں تو جسم وجان کو تو فائدہ پہنچے گا، لیکن روح و ایمان کو فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اس لیے آپ یورپ کو دیکھیں کہ ان کے جسم وجان کو تو فائدہ ہے، لیکن روح کا یہ عالم ہے کہ ہر بیس منٹ کے بعد ایک عورت کی عصمت کو تار تار کیا جاتا ہے۔

سیدھا راستہ کیا ہے؟

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں کہ اب تو میرا بندہ بن گیا ہے، مانگ جو کچھ مجھ سے مانگتا ہے۔ تو بندہ مانگتا ہے اور کہتا ہے:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝﴾

[الفاتحۃ:٥، ٦، ٧]

"ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما، ان لوگوں کے راستے کی ہدایت عطا فرما جن پر تو نے انعام کیا، نہ کہ ان لوگوں کے راستے کی جن پر غضب نازل ہوا ہے اور نہ ان کے راستے کی جو بھٹکے ہوئے ہیں۔"

اور وہ کون لوگ ہیں؟ ان کا اللہ نے دوسری جگہ بیان فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَأُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولٰٓئِكَ رَفِيقًا﴾ [النساء:٦٩]

"اور جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے تو وہ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین رحمہم اللہ۔ اور وہ کتنے اچھے ساتھی ہیں۔"

ہدایت کا معنی:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ میں تین چیزیں ہیں: ہدایت، صراط اور مستقیم۔ ہدایت کا معنی ہوتا ہے کہ

کمال مہربانی سے کسی کی منزل مقصود کی طرف رہنمائی کر دینا۔ مثلاً: کسی نے پوچھا کہ صفا و مروہ کدھر ہیں؟ تو آپ نے کہا کہ ادھر آئیں، وہاں حجر اسود کے سامنے سبز رنگ کی بتی جل رہی ہے، اس بتی کے سیدھ میں چلے جائیں، وہاں ایک اونچی جگہ آجائے گی وہ صفا ہے۔ اور صفا سے جب سیدھا چلیں گے تو پھر ایک اونچی سی جگہ آجائے گی، وہ مروہ ہے۔ آپ نے صفا سے سعی شروع کرنی ہے اور مروہ پر ختم کرنی ہے۔ یہ ایک چکر بنے گا۔ پھر آپ سر منڈوالیں اور پھر احرام کھول دیں تو آپ کا عمرہ پورا ہو گیا۔ وہ آدمی کہتا ہے کہ آپ کی مہربانی۔ یہ ہدایت ہے۔

استقامت کا معنی:

''صراط'' کا معنی ہے راستہ اور مستقیم کا معنی ہے سیدھا۔ جیسے آپ کہتے ہیں کہ بڑا قد و قامت والا آدمی ہے، سیدھا آدمی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ بڑا استقامت والا بندہ ہے۔ جہاں کھڑا ہو جائے وہاں کھڑا ہو جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ﴾ [فصلت:۳۰]

''جن لوگوں نے (دل سے) اقرار کرلیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر (اس پر) مستقیم رہے تو ان پر فرشتے اتریں گے۔''

اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میری عبادت کرو تو ''فَاسْتَقِمْ'' اسی پر قائم رہو۔ تو اسی سے صراط مستقیم نکلا ہے۔

ہدایت کا مفہوم:

ہدایت کا مفہوم یہ ہے کہ اصلی ہدایت دینے والے اللہ ہیں۔ جس کو ہدایت عامہ کہتے ہیں کہ ہر چیز کو اس کے حالات کے مطابق سمجھا دیا کہ سورج اپنے کام میں ہے، چاند اپنے کام میں ہے، ستارے اپنے کام میں ہیں اور چرند پرند اپنے کام میں ہیں، ہر چیز اپنے کام میں ہے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى ۝﴾ [الاعلیٰ:۱،۲،۳]

''اپنے پروردگار کے نام کی تسبیح کرو جس کی شان سب سے اونچی ہے، جس نے سب کچھ پیدا کیا اور ٹھیک ٹھیک بنایا اور جس نے ایک خاص انداز دیا، پھر راہ بتلائی۔''

اس نے ہر چیز کو ہدایت بخشی ہے۔ کانوں کا اپنا کام ہے، آنکھ کا اپنا کام ہے، ناک کا اپنا کام ہے اور زبان کا اپنا

کام ہے۔ ان سب پر عقل کو حکم بنا دیا ہے۔

جانوروں کی ہدایت کا مفہوم:

اسی طرح پرندے ہیں کہ جب صبح ہوگی تو اڑ کر کھانے کے لیے جا رہے ہوتے ہیں، شام ہوگی تو اپنے اپنے گھونسلے میں لوٹ رہے ہوتے ہیں۔ محال ہے کہ چڑیا اپنے گھونسلے کو چھوڑ کر دوسری چڑیا کے گھونسلے میں چلی جائے۔ اس کو یہ ہدایت اللہ نے دی ہے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا:

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صَافَّاتٍ ۖ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ﴾ [النور: ۴۱]

"(اے میرے مدنی پاک!) کیا تجھ کو معلوم نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں (مخلوقات) ہیں اور (بالخصوص) پرندے جو پر پھیلائے ہوئے (اُڑتے پھرتے) ہیں۔ سب کو اپنی اپنی دعا اور اپنی تسبیح معلوم ہے اور اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے سب افعال کا پورا علم ہے۔"

ہدایت کی اقسام:

اس لیے علماء نے فرمایا کہ جمادات، حیوانات اور نباتات سب کو ہدایت عامہ ہے۔ بعض کا شعور اتنا کمزور درجہ کا ہوتا ہے کہ ہم کہتے ہیں: یہ بے جان ہے۔

ہدایت کی دوسری قسم یہ ہے کہ جو چیزیں عقل اور شعور رکھنے والی ہیں خاص منزل کی طرف ان کی رہنمائی کرنا۔ وہ انسان اور جنات تھے، اس لیے ان کو مکلف بنایا اور ان کو ہدایت دینے کے لیے پیغمبر بھیجے اور کتابیں بھیجیں۔ یہ ہدایت پہلی ہدایت سے خاص ہے۔

تیسری ہدایت اخص الخاص ہے، جس کو توفیق بھی کہتے ہیں کہ انسان ہدایت والے بھی ہیں، لیکن ان کو اس ہدایت کے ذریعہ منزل مقصود تک پہنچا دینا، اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبوں تک پہنچا دینا۔ اس کو اللہ کے نبی بھی مانگتے ہیں اور اللہ کے ولی بھی مانگتے ہیں۔

آپ نے پڑھا ہوگا کہ جب حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مکہ فتح ہونے کی خوشخبری دی تو اللہ نے یوں فرمایا:
﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا﴾ [الفتح: ۱] (اے پیغمبر!) یقین جانو! ہم نے تمہیں کھلی ہوئی فتح عطا کر دی ہے)۔

اور آگے ارشاد فرمایا: ﴿لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا﴾ [الفتح: ۲] (تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف فرمائے اور آپ پر اپنے احسانات کی تکمیل کر دے اور آپ کو سیدھے رستہ پر لے چلے)۔

حالانکہ حضور ﷺ تو ہدایت پر ہیں، سراپائے ہدایت ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ مراتب بہت ہیں جن پر ترقی ہوتی ہے۔

"اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نُوَحِّدُ وَنَخَافُ" ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، تیری ہی توحید کا اعتراف کرتے ہیں، تیرے غضب سے ڈرتے ہیں اور تیری رحمت کی امید کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب! تیرے سوا نہ کسی سے ڈرتے ہیں جو تجھ سے ڈرنے والا مقام ہے اور نہ کسی سے رحمت کی امید کرتے ہیں جو تجھ سے امید کی جاتی ہے۔

"اِيَّاكَ نَعْبُدُ" کا معنیٰ:

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بظاہر تو ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اس کے اندر یہ بھی اعتراف ہے کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں، کیونکہ تیری طرح کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ یعنی ہم تیری توحید کے قائل ہیں۔ تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تجھ ہی سے ڈرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں۔ کیونکہ ایمان کا معنیٰ بھی یہی ہوتا ہے کہ ہر بندہ اللہ کی رحمت پر کامل یقین رکھے اور اللہ کے عذاب سے ڈر بھی پورا رکھے۔ یہ ایمانِ کامل ہے۔ جب ہم نے ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کہا تو گویا ہم نے اسی ایمان کامل کا اعتراف کیا۔ اسی ایک لفظ میں پورے ایمان کی تشریح آ گئی۔ کیونکہ عبادت کا معنیٰ ہوتا ہے کامل تذلل، کامل عاجزی، کامل بندگی، انتہائی پستی اور ذلت کا اعتراف کرنا۔ آدمی جب اللہ کے سامنے کھڑا ہو تو انتہائی عاجزی کے ساتھ کھڑا ہو کہ میں تیرا عاجز اور حقیر بندہ ہوں۔ پھر انسان جھکتا ہے۔ اور اللہ نے اس کا چہرہ سب سے زیادہ عزت والا بنایا ہے، اس کو وہ مٹی کے اندر ملا دیتا ہے۔ اس کا نام عبادت ہے۔ اور اس عبادت کا جذبہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب دل میں اللہ کی کامل عظمت پیدا ہو جائے۔ جب تک خدا کی عظمت دل میں پیدا نہیں ہوگی اس وقت تک اللہ کے سامنے جھکنے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر دل میں اللہ کی عظمت نہیں ہے پھر تو ایک رسمی نماز ہوگی، پتا نہیں ہوگا کہ میں نے کیا پڑھا؟ مسجد میں کیا کہا، "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ" کا کیا ترجمہ ہے اور "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى" کا کیا معنیٰ ہے؟

نماز کا مقصد:

نماز کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ دل میں اللہ کی عظمت پیدا ہو جائے۔ جب نماز شروع کرتے ہیں تو پڑھتے ہیں: ''اَللّٰهُ اَكْبَرُ'' (اللہ سب سے بڑا ہے) دل میں عظمت ہو گی تو اقرار ہو گا۔ حضور ﷺ پر پہلی کے بعد جو وحی نازل ہوئی اور جو حکم آیا وہ یہ تھا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝﴾ [المدثر: ۱،۲،۳]

''اے کپڑے میں لپٹنے والے! اٹھیں اور ڈرائیں اور اپنے رب کو بڑا بنائیں۔''

ایک ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔ اصل معنی پہلا ہے۔ اللہ کی بڑائی کے اعتراف کا معنی یہ ہے کہ انبیاء ﷺ سے بھی بڑا ہے، اولیاء سے بھی بڑا ہے اور دنیا میں جتنی طاقتیں ہیں ان سب سے بڑا ہے۔ آج ہمارا کیا یہ ایمان ہے؟ اگر ایمان ہوتا تو کیا کافروں سے ڈرتے رہتے؟ ہمارے ملک کے اندر عدالت میں انگریز کا قانون چلتا ہے۔ ہم کہتے ہیں: ''اللہ اکبر'' لیکن ہماری پارلیمنٹ کا نظام کافروں کا ہے۔ تو وہاں بھی اللہ بڑا نہ ہوا۔ وہی کافروں کا قانون، نظام اور ایکٹ ہے۔ ہمارے گھروں کے اندر کفر کے تمام کام موجود ہیں تو اللہ بڑا کیسے ہوا؟ ''اللہ اکبر'' کو ہم نے نہیں مانا۔

اگر کوئی کہے کہ ہم استاذ کا بڑا احترام کرتے ہیں، ہمارے استاذ بڑے ہیں۔ اور استاذ فرمائیں کہ کل فلاں وقت آ جانا۔ اور تم کہو کہ اس وقت میں نہیں آ سکتا۔ استاذ کہیں کہ اس کے دو گھنٹے بعد آ جانا تو تم کہو کہ اس وقت بھی میں نہیں آ سکتا، وہ فرمائیں: اس کے دو گھنٹے بعد آ جانا۔ تم کہو: وہ جی! میرے سونے کا وقت ہے۔ شام کو آ جانا، جی! میں شام کو مصروف ہوں۔ کیا یہ استاذ کا احترام ہے؟

اللہ پاک تو ہر زبان جانتے ہیں۔ لغتِ قرآن لغتِ عربی ہے۔ کیا وہ انگریزی بولتے تھے؟ آپ انگریزی ضرور پڑھیں، ہم اس سے منع نہیں کرتے، لیکن انگریزی زبان کو بڑا نہ بناؤ۔ حضور ﷺ خود صحابہ کو بھیجتے تھے کہ یہودیوں کی زبان کو سیکھو۔

دو سفیر صحابہ رضی اللہ عنہم کا واقعہ:

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور کی بات ہے کہ دو صحابی بادشاہ کے دربار میں سفیر بن کر گئے۔ مسلمانوں کے سفیر

پہلی دفعہ آرہے تھے، اس لیے بادشاہ نے حکم دیا کہ راستوں پر قالین بچھائیں، شامیانے لگائیں اور دربار کو سجائیں، تاکہ جب مسلمان آئیں تو ان پر اثر پڑے۔ وہ دونوں سفیر صحابی تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ دونوں کپڑے پہنے ہوئے ہیں، بورے کا قمیص، شلوار اور اسی کی ٹوپی ہے۔ تلوار پر کپڑا لپٹا ہوا ہے۔ اس کے رکھنے کے لیے چیز نہیں ہے، نیزہ ہاتھ میں ہے، لیکن اس کی اوپر کی لکڑی بھی ٹوٹی ہوئی ہے اور کمزور اونٹوں پر بیٹھے ہوئے ہیں جو چلنے سے بھی معذور ہیں۔ جب انہوں نے دیکھا تو کہا کہ یہ سفیر ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ جب دربار میں چلے تو نیزوں اور اونٹوں کے ساتھ قالینوں پر چلے۔ جب دربار میں گئے تو انہوں نے کہا:

''اَلسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى''

''سلامتی اس پر ہو جس نے ہدایت کی اتباع کی۔''

سجدہ نہ کیا، جھکے نہیں۔ کہا کہ ہم نے اللہ کو بڑا مانا ہوا ہے جو عرش پر ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ کیا چاہتے ہو؟ انہوں نے فرمایا: ''اَسْلِمْ تَسْلَمْ'' کلمہ پڑھ لو سلامتی پا جاؤ گے، ہمارے بھائی بن جاؤ گے۔ بادشاہ نے کہا: اگر کلمہ نہ پڑھوں تو......؟ انہوں نے کہا: جزیہ ادا کرو، ہم تمہاری جان، مال، عزت اور آبرو کی حفاظت کریں گے۔ بادشاہ نے کہا: اگر یہ بھی نہ مانوں تو......؟ انہوں نے کہا: پھر ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار میدان میں فیصلہ کرے گی۔ بادشاہ غصہ کے اندر آگیا اور حکم دیا کہ ایک ٹوکرے میں مٹی بھر کر ان کو دے دو۔ یہ لے جائیں اور جا کر اپنے بادشاہ کو دیں۔ یعنی میں تمہارے منہ میں مٹی بھرتا ہوں۔ انہوں نے صحابہ کے سر پر مٹی رکھ دی۔ صحابہ نے فرمایا: الحمد للہ! حکومت ہمیشہ زمین پر کی جاتی ہے، تم نے اپنے ہاتھوں سے اپنے ملک کی مٹی دی ہے، تم انتظار کرو کل ہمارا یہاں پر پرچم لہرائے گا۔ بادشاہ نے کہا: عجیب قوم ہے! یہ تو سمجھ میں بھی نہیں آتے۔ بادشاہ نے کہا: ہمارے درمیان میں دریا ہے اور مسلمانوں کی فوجیں دریا سے اُس طرف ہیں، کوئی پل وغیرہ نہیں ہے۔ یہ تو دریا بھی عبور نہیں کر سکتے، ہم سے کیسے لڑیں گے؟ ابھی صبح کی نماز بھی نہیں ہوئی تھی کہ دریا عبور کر کے فوج نے چڑھائی کر دی۔

جو اللہ کو بڑا مان لیتا ہے تو دریا تو اس کا غلام ہے، جبکہ ہم تو زبانی کلامی ''اللہ اکبر'' کہتے ہیں۔ اگر ''اللہ اکبر'' بھی کہیں اور ''یا علی'' کا نعرہ بھی لگائیں، ''یا دستگیر'' کا نعرہ بھی لگائیں، معین الدین چشتی کو بلائیں تو ''اللہ اکبر'' کا ترجمہ یہ تو نہیں ہے۔

جب اللہ بڑا ہے تو ہر جگہ قانون اور حکم اسی کا چلے گا۔ اس لیے فرمایا:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [المائدۃ: ۴۴]

''اور جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے سو ایسے لوگ بالکل کافر ہیں۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ [المائدۃ: ۴۵]

''اور جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ لوگ ظالم ہیں۔''

وہ ظالم ہیں کہ بندوں کا قانون چلاتے ہیں، بندوں کے خالق کا قانون نہیں چلاتے۔ بڑا ماننے کا مطلب تو یہ ہے کہ ہر جگہ اسی کی بات چلے۔ یہ مطلب نہیں کہ صرف زبان سے ''اللہ اکبر'' کہہ دیا اور نماز پڑھ لی، لیکن فیصلے انگریزوں کے قانون کے مطابق کیے، اپنے اوپر غیروں کو بڑا مان لیا۔ یہ بڑائی نہیں ہے۔

اس لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کا معنی ہے: ''اِيَّاكَ نُوَحِّدُ وَ نَخَافُ وَ نَرْجُوْكَ يَا رَبَّنَا! وَلَا غَيْرَكَ'' کہ ہم تیری وحدانیت کا اقرار کرتے ہیں، تجھ سے ڈرتے ہیں، تجھ سے امید کرتے ہیں، تیرے سوا ہمیں کسی کا بھی ڈر نہیں ہے اور نہ ہم تیرے سوا کسی سے امید رکھتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۶، الفاتحۃ: الآیۃ: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ]

عبادت کو استعانت سے مقدم کیوں کیا؟

﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ اللہ نے حکم دیا ہے کہ عبادت بھی میرے لیے ہے اور ہر کام میں مدد بھی مجھ سے پکڑو۔ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ مقدم ہے اور ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ موخر ہے، کیونکہ استعانت پکڑنے کا اصل وسیلہ عبادت ہے، اس لیے کہ عبادت اور اعمالِ صالحہ ہی اللہ تک پہنچنے کا حیلہ اور وسیلہ بنتے ہیں۔ تو عبادت اہم تھی، اس لیے اس کو مقدم کیا کہ جب تیری ہی عبادت کرتے ہیں تو مدد اور کس سے مانگیں؟ جب ہم نے سب کو ٹھوکر مار کر ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کا اقرار کیا تو اے اللہ! اب مدد بھی تجھ سے ہی مانگتے ہیں، تو ہی ہماری مدد کرنے والا ہے۔ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ زیادہ اہم تھا، اس لیے اس کو مقدم کیا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۶، الفاتحۃ: الآیۃ: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ]

دنیا کے اندر بھی دیکھ لو کہ ایک آدمی دنیا سے کنارہ کر کے ایک وڈیرے کے دروازے پر بیٹھ جائے کہ اب میں کہاں جاؤں؟ اب آپ نے ہی میری مدد کرنی ہے۔ کوئی دیوی دیوتا کے آگے جھکتا ہے، ابوجہل لات وعزیٰ کی پوجا

کرتا ہے۔ جب ہم نے اقرارِ توحید کیا تو ہم نے کہا: لات وعزیٰ کو باہر پھینک دو۔ کوئی سورج کو پوجتا ہے، ہم نے کہا اس وقت نماز ہی نہ پڑھو، تا کہ کسی کو سورج کی پوجا کا شبہ ہی نہ پڑے۔ کسی نے چاند تاروں کی اور کسی نے جنوں کی عبادت کی ہے۔ ہم نے کہا پڑھو:

﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ①﴾ [الناس:١]

''کہو: میں پناہ مانگتا ہوں سب لوگوں کے پروردگار کی۔''

سارے جنات بھاگ جائیں گے۔ جب ہم نے ساری انسانیت سے ناطہ توڑ لیا ہے اور رب سے جوڑ لیا ہے تو اب مدد بھی اللہ سے مانگیں گے۔

اللہ نے قرآن میں خود مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک غلام ہو، لیکن اس کا مالک ایک ہے اور ایسا غلام ہے جس کے دو مالک ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ جو ایک کا نوکر ہے وہ زیادہ بہتر ہے یا وہ جو دو کا نوکر ہے وہ زیادہ بہتر ہے؟ جو دو کا نوکر ہے اسے ایک کہے گا: ادھر آؤ اور دوسرا کہے گا ادھر آؤ۔ ایک آقا نے کام بھیجا اور دیر ہوگئی تو دوسرے نے جوتے مارے۔ جو دو میں تقسیم ہوگا اس کو دونوں طرف سے جوتے پڑیں گے اور جو ایک کا ہوگا اس پر مالک راضی رہے گا۔

اس لیے جو لوگ اللہ کے غیر کے آگے جھکتے ہیں وہ ایسے ہیں کہ انہوں نے دس خدا بنا رکھے ہوں۔ بچہ دینے کے لیے فلاں بزرگ ہے، نفع دینے کے لیے فلاں بزرگ ہے اور تکلیفیں رفع کرنے کے لیے فلاں بزرگ ہے۔ اللہ نے فرمایا: اس پر غور کرلو کہ بندہ ایک کو معبود بنالے تو بہتر ہوتا ہے یا دس کو معبود بنالے وہ بہتر ہوتا ہے؟ ایک دنیوی مثال سے سمجھا دیا۔ فرمایا:

﴿ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا ۚ الْحَمْدُ لِلَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ㉙﴾ [الزمر:٢٩]

''اللہ نے ایک مثال یہ دی ہے کہ ایک (غلام) شخص ہے جس کی ملکیت میں کئی لوگ شریک ہیں، جن کے درمیان آپس میں کھینچا تانی بھی ہے اور دوسرا (غلام) شخص وہ ہے جو پورے کا پورا ایک ہی آدمی کی ملکیت ہے۔ کیا ان دونوں کی حالت ایک جیسی ہوسکتی ہے؟ الحمد للہ (اس مثال سے بات بالکل واضح ہوگئی) لیکن ان میں سے اکثر لوگ

سمجھتے نہیں۔"

مثال دے کر سمجھا دیا۔ دنیا کے اندر بھی یہی ہے کہ آدمی کا جب کسی سے تعلق ہو اور دکھ آ جائے تو کہتا ہے کہ فلاں مدد کر دے گا اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کی فلاں کے ساتھ بھی دوستی ہے اور وہ اس کی مدد کرے گا۔ تو دونوں اس کی مدد نہیں کرتے ہیں اور وہ مصیبت میں پڑ جاتا ہے۔ اس لیے جب آدمی کا ایک اللہ کے ساتھ تعلق نہ جڑے تو مدد کیسے آئے گی؟ ہم کہتے ہیں کہ اللہ بھی مدد کرے اور کافر بھی مدد کریں۔ اے اللہ! ہم تجھ سے بھی ڈرتے ہیں، لیکن تجھ سے زیادہ کافروں سے ڈرتے ہیں۔ اے اللہ! ہم تجھے اللہ اکبر مانتے ہیں، لیکن ان کو بھی سپر پاور مانتے ہیں۔ بھلا! یہ مسلمان ہے؟ اللہ ہمیں ہدایت دے۔ اگر ہم اللہ کی عظمت کو سمجھ لیں تو پوری دنیا ہمارے دروازے پر ہوگی۔

اقبال نے فرمایا تھا:

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج
اور پہچانے تو ہیں تیرے گداہ دارا وجم

یہاں سعودی عرب میں ایک صحرائے اعظم ہے۔ پہاڑ ہیں یا ریت ہے، کوئی دریا اور جنگلات نہیں ہیں۔ لیکن جب انہوں نے "اللہ اکبر" کو مان لیا تو اب تمہیں بھی روٹی یہی بھیجتے ہیں۔ فرمایا: ہم زمین کو حکم دیں گے کہ تمہیں خزانہ دے۔ اس کو حکم دیں گے کہ اگائے، آسمان پانی برسائے۔ اور ہم ظاہر و باطن سے اتنا مالا مال کر دیں گے کہ دنیا تمہارے دروازے کی غلام ہو جائے گی، کیونکہ تم نے مجھے "اللہ اکبر" مان لیا ہے۔ ہمارے ہاں "اللہ اکبر" نہیں ہے، وگرنہ تو کافر کا قانون چل بھی نہیں سکتا ہے۔

"نَعْبُدُ" اور "نَسْتَعِيْنُ" کیوں فرمایا؟

﴿نَعْبُدُ﴾ اور ﴿نَسْتَعِيْنُ﴾ کہا گیا ہے، "أَعْبُدُ" اور "أَسْتَعِيْنُ" کیوں نہیں کہا گیا؟ اس لیے کہ یہ تمام بندوں کی طرف سے اقرار ہے۔ اگر بندہ جماعت میں ہے یا اکیلا نماز پڑھ رہا ہے تو وہ کہہ رہا ہے کہ میں بھی اور میرے سارے ایمان والے بھائی سب تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

یا تو "نون" عظمت کے لیے ہے، لیکن بعض علماء نے فرمایا کہ یہ مقام ایسا نہیں ہے کہ بندہ اپنی عظمت کا اعتراف کرے۔ اللہ نے فرمایا: میرے بندے! جب تو میری عبادت کے لیے کھڑا ہے تو اب تو شان والا بن گیا

ہے، عظمت والا بن گیا ہے۔ "مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ" (جو بندہ اللہ کا بندہ بن جاتا ہے تو اللہ اس کا بن جاتا ہے) اس لیے اگر نون کو تعظیم کے لیے کہیں تو جائز ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۲۶، الفاتحہ: الآیۃ: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ]

"عَبَدْنَا" کیوں نہیں فرمایا؟

﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کہا "عَبَدْنَا" کیوں نہیں کہا؟ بعض علماء نے فرمایا کہ "نَعْبُدُ" میں تعظیم ہے کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں۔ اگر "عَبَدْنَا" (ہم نے تیری عبادت کی) کہتے تو اس میں بڑائی کا اظہار ہوتا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۲۶، الفاتحہ: الآیۃ: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ]

عبادت اتنا عظیم مقام ہے کہ جو اس میں لگتا ہے وہ اللہ کا عبد بن جاتا ہے۔ ایک اور بندہ ہے جو کہے کہ میں فلاح بادشاہ کا ملازم ہوں اور ایک ہے کہ بادشاہ کہے کہ فلاں میرا خاص ملازم ہے۔ تو اس کی شان زیادہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۛ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا﴾ [مریم: ۳۰] (میں اللہ کا خاص بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب (انجیل) دی اور مجھے اپنا نبی بنایا)۔

اور میرے مدنی ﷺ کے بارے میں اللہ نے فرمایا: ﴿وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا﴾ [الجن: ۱۹] (اور جب خدا کا (خاص) بندہ خدا کی عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو یہ (کافر) لوگ اس بندہ پر بھیڑ لگانے کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

اس لیے جب بندہ عبادت میں ہوتا ہے تو اس کو اللہ کے ساتھ بندگی کی نسبت ہو جاتی ہے۔ اس لیے حکم ہے کہ سجدہ میں دعائیں مانگا کرو، کیونکہ جب انسان سجدے میں ہوتا ہے تو اللہ کے قریب ہوتا ہے اور اس کی دعائیں جلدی قبول ہوتی ہیں۔

مانگنے والوں سے بھی زیادہ کب ملتا ہے؟

حدیث میں آتا ہے کہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے ذکر نے بندے کو اتنا مشغول کر دیا ہے کہ وہ میرے ذکر میں لگا ہے اس کو مجھ سے دعا مانگنے کا بھی وقت نہیں ملا۔ تو اللہ فرماتے ہیں کہ میں اس کو مانگنے والوں سے بھی زیادہ بہتر عطا فرما دیتا ہوں۔ [سنن الترمذی، حدیث ۲۹۲۶]

اس لیے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب اکیلے فرض نماز پڑھیں تو "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ" اور "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى" کو بڑھا لیں اور اگر نفل نماز ہو تو تسبیح بھی کہیں اور وہ دعائیں بھی مانگیں جو قرآن وحدیث میں موجود ہیں۔ اگر قرآن کی دعا ہے تو اس کو بطور دعا پڑھیں گے، بطور تلاوت نہیں پڑھیں گے۔ کیونکہ قرآن سجدے میں پڑھنا جائز نہیں ہے، رکوع میں پڑھنا جائز نہیں ہے۔ قرآن امام بن کر آیا ہے، عظمت ومقام رکھتا ہے۔

دعا کے آداب:

جب انسان اپنی عاجزی کا اقرار کرتا ہے کہ اے اللہ! میں اپنی پستی کو پہنچ گیا ہوں اور تیرے دروازے پر گر گیا ہوں تو اللہ پاک کی رحمت جوش میں آتی ہے۔ اب جب بندہ مانگتا ہے تو دعا جلدی منظور ہو جاتی ہے۔ جب دل غافل ہو تو اس وقت دعا نہ مانگا کریں۔ اگر دل لگ نہیں رہا تو چپ کر کے جلدی سے ختم کر دیں۔ دعا مانگنے کا وقت وہ ہوتا ہے کہ جب اللہ سے تیرا دل جڑ جائے، دعا مانگتے ہوئے لطف آ رہا ہو اور زبان پر اور سے اور الفاظ آ رہے ہوں، پھر زبان پر عاجزی ہو، بدن پر کپکپی ہو اور آنسو بہہ رہے ہوں۔ یہ گھڑی مل جائے تو مانگنے کی جلدی کیا کرو، کیونکہ یہ رحمت کی گھڑی ہوتی ہے اور اس وقت دعا قبول ہو رہی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ دعا مانگنے کی توفیق دیتے ہیں۔ اگر وہ مانگنے نہ دے تو ہم کیسے دعا مانگ سکتے ہیں؟

ایک اللہ والے کا واقعہ:

ایک اللہ والے تھے ان پر کوئی مصیبت آ گئی تو لوگ ان کے پاس تعزیت کے لیے گئے، جبکہ حضرت بڑے خوش بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگوں نے کہا: آپ پر مصیبت آئی ہے اور آپ بڑے خوش بیٹھے ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ مصیبت اسی لیے تو بھیجی ہے کہ میں ان کو یاد کرنے میں کوتاہی کر رہا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام عبدیت:

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو لقب عطا فرمایا وہ "عبد" ہے۔ فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝﴾ [الکھف: ۱]

"تمام خوبیاں اس اللہ کے لیے ثابت ہیں جس نے اپنے (خاص) بندے پر یہ کتاب نازل فرمائی اور اس میں ذرا بھی کجی اور خامی نہیں رکھی۔"

یہ کتنی شان والی بات تھی اور یہاں بھی لفظ "عبد" آیا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا﴾ [الجن: ۱۹]

"جب میرا عبد (محمد مصطفیٰ ﷺ) کھڑے ہو کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔"

اور ایک اور جگہ فرمایا:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا﴾ [الاسراء: ۱]

"وہ پاک ذات ہے جو اپنے بندہ (محمد ﷺ) کو شب کے وقت لے گئی۔"

یہاں بھی لفظ عبد ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو حکم دیا کہ جب آپ پر غم آجائیں تو اس کا علاج یہ ہے کہ عبد بنیں، میری عبادت کریں۔ اس لیے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ﴾ [الحجر: ۹۷]

"اور ہمیں معلوم ہے کہ یہ لوگ جو باتیں کر رہے ہیں، اس سے آپ تنگ دل ہوتے ہیں۔"

کبھی آپ کو شاعر کہتے ہیں اور کبھی جادوگر کہتے ہیں۔ ہمیں پتا ہے کہ آپ کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور ایک جگہ فرمایا:

﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ [الحجر: ۹۹]

"اور آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے، یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے۔"

جب میرے عبد بن جاؤ گے تو تم سے ساری مصیبتیں اور پریشانیاں رفع ہو جائیں گی۔

عبادت کا ایک طریق یہ ہے:

علامہ رازی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بعض صوفیاء کہتے ہیں کہ بندہ عبادت اس لیے کرتا ہے کہ مجھے ثواب ہو یا اس لیے عبادت کرتا ہے کہ مجھے عذاب نہ ہو۔ یہ مقام بھی ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ یہ تو ایک غرض ہے۔ اصل عبادت یہ ہے کہ اپنے اللہ کو حاصل کرنے کے لیے اور اللہ تک پہنچنے کے لیے عبادت کرے، جو کمال صفات سے متصف ہے۔ اگر ثواب حاصل کرنے کے لیے نماز پڑھی یا جہنم سے بچنے کے لیے نماز پڑھی تو گویا تیری نماز ہی نہیں ہوئی ہے۔

بہر حال یہ صوفیاء کا قول ہے اور صوفیاء کے جتنے اقوال ہیں وہ شریعت کے مقابلے میں حجت نہیں ہیں، کیونکہ ان

کا اپنا ذوق ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذوق اور استغراق میں ایک بات کہہ دیتے ہیں، لیکن وہ شریعت میں حجت نہیں ہوتی۔ شریعت میں یہ ہے کہ انسان اللہ کی عبادت کرے اور ثواب کی نیت رکھے اور جہنم سے پناہ مانگے۔ اگر جہنم سے بچنا ضروری نہ ہوتا تو ہمیں حضور ﷺ اس سے بچنے کی دعائیں نہ سکھلاتے۔

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کا واقعہ:

اصل بات یہ ہے کہ ان کا مقام بہت بلند ہوتا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کے پاس ایک بچہ آیا۔ وہ نوجوان بچہ تھا۔ میں اس کے سامنے بڑا شرمندہ ہوا۔ اس نے پوچھا کیا حال ہے؟ میں نے کہا: الحمد للہ! اللہ کا شکر ہے، مل جاتا ہے تو شکر کرتے ہیں اور اگر نہیں ملتا تو صبر کرتے ہیں۔ وہ لڑکا ہنس پڑا۔ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ نے فرمایا: کیوں ہنس رہے ہو؟ اس نے کہا: ''نَعُوْذُ بِاللهِ!'' ہمارے علاقے کے کتے بھی اسی طرح کرتے ہیں، ان کو دے دو تو کھا لیتے ہیں، اگر نہ دو تو مالک کے دروازے پر پڑے رہتے ہیں۔ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ تو مجھ سے بھی آگے ہے۔ میں نے کہا: جو تمہارے علاقے کے بزرگ ہیں وہ کیا کرتے ہیں؟ اس نے کہا: اگر مل جائے تو دوسروں کو کھلا دیتے ہیں اور نہ ملے تو خوش بیٹھے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں: اس سے مجھے اس کا مقام معلوم ہوا۔

جنتیوں کے لیے سب سے بڑی نعمت:

بہر حال! نماز اس لیے پڑھو کہ اللہ راضی ہو جائے، جب اللہ راضی ہوں گے تو خود بخود جنت ملے گی اور جہنم سے نجات ہوگی۔ اس لیے حدیث پاک میں آتا ہے کہ جب لوگ جنت میں چلے جائیں گے تو اللہ فرمائیں گے مانگو، مانگو کیا مانگتے ہو؟ تو وہ عرض کریں گے: یا اللہ! اور بھی کوئی چیز رہ گئی ہے جو ہم مانگیں؟ آپ نے تو ہمیں اتنی نعمتیں دی ہیں جن کو ہماری آنکھوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا اور ہمارے دل و دماغ کے اندر بھی کبھی نہیں آئی تھیں۔ اب کون سی نعمت ہے جو ہم مانگیں؟ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میں تمہیں آج ایسی نعمت دیتا ہوں جو تمہیں پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔

جنت والے حیران ہو جائیں گے کہ وہ کون سی نعمت ہے؟ اللہ فرمائیں گے:

((أُحِلُّ عَلَيْكُمْ رِضْوَانِي فَلَا أَسْخَطُ بَعْدَهُ أَبَدًا))

''آج میں تمہیں اپنی رضا دیتا ہوں جس کے بعد تم پر ناراضگی کبھی نہیں آئے گی۔''

[صحیح البخاری، حدیث: ۷۵۱۸، باب: كَلَامِ الرَّبِّ مَعَ أَهْلِ الْجَنَّةِ]

اس لیے رضا والا مقام جنت سے بھی بڑھ گیا۔ اس لیے صوفیاء کے اقوال کا بھی یہ مقصد ہے کہ اصل عبادت صرف اللہ کے لیے ہو۔

سلطان محمود رحمۃ اللہ علیہ کے وزیر ایاز کا واقعہ:

جیسے ایک مثال ہے کہ ایاز غلام کو بادشاہ بڑا محبوب رکھتے تھے۔ لوگوں نے کہا: یہ کالا غلام ہے، بادشاہ کیوں اس پر دیوانہ ہوگیا ہے؟ ایک دن بادشاہ نے حکم دیا کہ ہمارے اس کمرے کے اندر جو جو چیزیں پڑی ہوئی ہیں جس کا جو جی چاہے ہر آدمی ایک ایک چیز اٹھالے۔ کسی نے قیمتی جام اٹھالیا، کسی نے قیمتی قالین اٹھالیا، کسی نے قیمتی موتی اٹھالیا اور کسی نے کرسی اٹھالی، لیکن ایاز کونے میں خاموش کھڑا ہے۔ بادشاہ نے ایاز سے پوچھا: تم چپ کیوں کھڑے ہو؟ سارے لوگوں نے چیزیں لے لی ہیں، تمہیں اس کمرے سے جو چیز چاہیے وہ لے لو۔ اس نے کہا: مجھے صرف آپ پسند ہیں، مجھے صرف آپ کا قرب چاہیے۔ آپ مجھے مل جائیں اور کچھ نہیں چاہیے۔ تو بادشاہ نے باقی وزیروں سے کہا: دیکھو! اب تم نے سمجھ لیا ہے؟ کسی کو جام عزیز تھا اور کسی کو قالین عزیز تھا۔ تمہیں چیزیں پسند ہیں، ایاز کو تو میں عزیز اور پسند ہوں۔ اس لیے ایاز مجھے پیارا لگتا ہے۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اس کی نظر ان چیزوں پر نہیں تھی، بلکہ مجھ پر تھی۔ اس لیے جس کو اللہ کی رضا حاصل ہو جائے اس کو دوسری چیزوں کی کیا پرواہ ہے۔

ایک اعرابی نے کہا تھا: مجھے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا مرتبہ نہیں چاہیے، مجھے جنت چاہیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہی تو جنت ہے جس کے لیے محنت اور کوشش کی جاتی ہے۔ اللہ ہر کلمہ پڑھنے والے مسلمان کو جنت نصیب فرمائے۔

"اَلصِّرَاط" کی قرأت:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ [الفاتحہ:۵]

اکثر قراء نے اس کو صاد کے ساتھ پڑھا ہے، لیکن قنبل رحمۃ اللہ علیہ اور اویس رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو سین کے ساتھ پڑھا ہے۔

جیسے: ﴿اِهْدِنَا السِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ [الفاتحہ:۵]

اور بعض قراء (جیسے: خلف عن حمزۃ) نے سین کو زاء کے ساتھ ملا کر پڑھا ہے: ﴿اِهْدِنَا الزِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ [الفاتحہ:۵]

لیکن جمہور ائمہ کے نزدیک جو مشہور قراءت ہے وہ صاد کے ساتھ ہی ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾
[الفاتحہ:۵]

علامہ فراء رحمۃ اللہ علیہ نے باقی قراءات کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ بنو عذرہ اور بنو کلب کی لغت بھی، وہ اس کو زاء کے ساتھ پڑھتے تھے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۲۶، الفاتحہ، الآیۃ: اِهْدِنَا الزِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ]

علامہ نے فرمایا: قراءات ایسی ہوتی ہیں کہ جن میں الفاظ بھی بدل جاتے ہیں، جیسا کہ قرآن مقدس میں ''نُنْشِزُهَا'' کو ''نُنْشِرُهَا'' بھی پڑھا گیا ہے، کبھی الفاظ نہیں بدلے جاتے ہیں، لیکن پڑھنے والے کے لحن سے ''سین'' سمجھا جاتا ہے، حالانکہ وہ ہوتا ''صاد'' ہے۔

بعض حروف کے مشکل مخارج:

جیسے ''ضاد'' اور ''ظاء'' میں فرق کرنا قاریوں کا کام ہے، عام آدمی فرق نہیں کر سکتا۔ اور بعض لوگ غلطی کرتے ہیں، وہ ''ضاد'' کو ''دال'' پڑھ دیتے ہیں، حالانکہ معنی بدل جاتا ہے اور آدمی کفر تک چلا جاتا ہے۔ ''اَلضَّآلِّيْنَ'' کا معنی ہے گمراہ ہونے والے اور ''اَلدَّآلِّيْنَ'' کا معنی ہے دلالت کرنے والے۔ اس لحاظ سے آسمان اور زمین کا فرق پڑ گیا اور آدمی کفر کے کناروں تک چلا گیا۔

بعض لوگ ایک حرف پڑھتے ہیں، لیکن معلوم دوسرا حرف ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ''وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ'' کو جب پڑھیں گے تو معلوم ہوگا کہ ''وَجَزْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ'' پڑھ رہے ہیں۔ وہ بے چارے ادا نہیں کر سکتے۔ بعض لوگ بالکل لفظ ہی الٹ دیتے ہیں۔ جہاں ''جیم'' آجائے وہاں ''گاف'' لگا دیتے ہیں۔ ''حَاجَةً'' کی بجائے ''حَاقَةً'' پڑھیں گے۔ بہرحال یہ قراءت کے بارے میں آگیا۔

دعا کی قبولیت کی شرائط:

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دعا کے مقبول ہونے کے لیے شرط ہے:

1. ...... پہلے حمد و ثنا بیان کرے، پھر اپنی بندگی، عاجزی اور اپنی ذلت کا اعتراف کرے۔
2. ...... اس کے بعد پروردگار عالم سے دعا کرے۔

اس طریقہ سے اللہ دعا قبول فرماتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بعض دفعہ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری دعائیں قبول ہو جاتی ہیں یا جو مانگتے ہو وہ تو نہیں ملا، لیکن

اللہ کسی مصیبت کو ٹال دیتے ہیں یا قیامت کے دن کے لیے اس کو ذخیرہ بنا دیا کہ جب میرا بندہ آئے گا وہ محتاج ہوگا، اس وقت اس کو نعمتیں عطا کر دوں گا۔ تو دعا کسی حال میں خالی نہیں گئی۔

دنیا میں دعا جلد قبول ہو جائے اس کے لیے یہ شرائط ہیں:

1 ...... آدمی پاک ہو ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی، کفر سے بھی پاک، شرک سے بھی پاک اور بدعات وغیبت سے پاک ہو۔ غسل کرنے میں دیر لگے گی، لیکن دل سے توبہ کرنے سے اللہ اس کے باطن کو فوراً پاک فرما دیتے ہیں۔

2 ...... دوسرا قبلہ کی طرف متوجہ ہو۔

3 ...... تیسری بات جب دعا کے کرے تو پہلے اللہ کی حمد وثنا کرے اور اللہ کے اسمائے حسنیٰ کے ساتھ دعا مانگے اور جو بھی اللہ کے اسماء یاد ہوں ان سے خدا کو پکارے۔

4 ...... چوتھی بات کہ غافل دل کے ساتھ دعا نہ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ دعا اللہ سے مانگ رہا ہے، لیکن دل اور فکر کسی دوسری جگہ اٹکی ہوئی ہے۔

5 ...... پانچویں بات کہ ایسی دعا مانگے جو ہمیں حضور ﷺ نے سکھلائی ہے۔

6 ...... کوئی دعا شریعت کے خلاف نہ مانگے، مثلاً: یوں نہ کہے کہ فلاں شخص کا مال ہلاک کر دے اور مجھے دے دے۔

7 ...... رونے کی کوشش کرے۔ اگر رونا نہ آئے تو رونے کی شکل بنالیں۔

8 ...... اللہ کی تعریف کریں۔

9 ...... پھر حضور ﷺ پر درود شریف پڑھیں۔

10 ...... اور جب دعا ختم کریں تو بھی حضور ﷺ پر درود شریف پڑھیں۔

کیونکہ درود شریف کی برکت سے دعائیں جلد قبول ہوتی ہیں۔ یہ طریقہ سب سے زیادہ اثر کرنے والا ہے۔

کبھی انسان تعریف کرتا رہتا ہے، لیکن مانگتا کچھ بھی نہیں ہے، مگر تعریف وثنا کے اندر بھی سب کچھ آ گیا۔ جب "یا رَحِیۡمُ" کہا تو اس کے اندر رحمت کی دعا آ گئی، جب "یا رَزَّاقُ" کہا تو رزق کی دعا آ گئی کہ جب تو رزاق ہے تو اپنے خزانہ غیب سے رزق عطا فرما۔ جیسے کسی شاعر نے کہا تھا:

أَأَذْكُرُ حَاجَتِي أَمْ قَدْ كَفَانِي حَيَاءُ
كَفَاءُ مِنْ تَعَرُّفِهِ الثَّنَاءُ

''کیا میں آپ کے سامنے اپنی حاجت کو رکھوں؟ مجھے آپ کے سامنے اپنی حاجت پیش کرنے سے حیا آتی ہے۔آپ کے لیے اپنی حاجت پیش کرنے کے بجائے آپ کی ثنا ہی کافی ہے۔''

ہدایت کے متعلق اشکال وجواب:

ہدایت کا معنی کیا ہے؟ یہ سمجھنا ضروری ہے، وگرنہ قرآن میں کئی جگہ تعارض لگتا ہے۔ مثلاً: حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اللہ نے ہدایت کرنے والا بنا کر بھیجا، یعنی آپ ہادی ہیں۔ اسی طرح حضور ﷺ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں دعا فرمائی:

((اللَّهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا)) [سنن الترمذی، حدیث: ۳۸۴۲، باب مناقب معاويۃ بن أبي سفيان...]

''یا اللہ! اس کو ہدایت کرنے والا اور ہدایت یافتہ بنا۔''

دوسری جگہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ﴾ [القصص: ۵۶]

''آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدیت کر دیتا ہے۔''

تو ایک جگہ ہدات کرنے کا حکم ہے اور دوسری جگہ یہ ہے کہ آپ ہدایت نہیں کر سکتے۔ جب ایسے تعارض آتے ہیں تو پریشانی ہوتی ہے۔

ہدایت کا معنی ہے کمال مہربانی سے کسی کی منزل مقصود کی طرف رہنمائی کرنا۔ پھر اس ہدایت کے درجات ہیں: ہدایت عامہ، ہدایت خاصہ اور خاص الخاص ہدایت۔

وسیلہ کی جائز اقسام:

جب ہدایت کے معانی پڑھ لیے تو اب ایک خاص مسئلہ پڑھیں کہ وسیلہ جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگوں نے وسیلہ کا یہ معنی سمجھ لیا ہے کہ وسیلے کے بغیر ہمارا اللہ سے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اس لیے انبیاء علیہم السلام، صلحاء اور شہداء رحمہم اللہ کے وسیلے سے دعا مانگتے ہیں اور آگے بڑھے تو پیروں کے وسیلے سے دعا مانگتے ہیں۔ جب ان لوگوں سے آپ کہیں کہ وسیلے کا حکم

تو کہیں نہیں ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ وسیلے سے ہی تو سب کچھ ملا ہے۔ اگر ہمیں قرآن ملا، ہدایت ملی، نماز ملی اور دین ملا، یہ ہمیں انبیاء علیہم السلام کے وسیلے سے ملا ہے تو ان کے بغیر کام کیسے ہوگا؟ اس کے اندر ایسا غلو آ گیا ہے کہ لوگ کفر و شرک کی حد سے آگے نکل گئے۔ اس لیے اس مسئلے کو ٹھنڈے دل سے سمجھیں۔

یاد رکھیں! ایک ہے ماتحت الاسباب وسیلہ پکڑنا اور ایک ہے مافوق الاسباب وسیلہ پکڑنا۔ آدمی پانی پیتا ہے تو یہ سبب ہے کہ اس سے پیاس بجھ جاتی ہے، کھانا کھانے سے بھوک ختم ہو جاتی ہے، آرام کرنے سے تھکن دور ہو جاتی ہے اور دوا سے بیماری ختم ہو جاتی ہے۔ یہ سارے اسباب ہیں، اس کو ماتحت الاسباب کہتے ہیں۔ ان میں ایک دوسرے کا وسیلہ پکڑنا، اس سے شریعت منع نہیں کرتی۔ مثلاً: میں کہوں کہ مجھے تکلیف ہے، ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ میں نے آپ کو وسیلہ بنایا، آپ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے، ڈاکٹر نے مجھے دوا دی۔ تو یہ ماتحت الاسباب ہیں۔ یہ اسباب ہیں، ان کے اندر وسیلہ جائز ہے۔

مافوق الاسباب یہ ہے کہ ایک ایسا کام آ گیا کہ اسباب کی حد تک ہم اسے نہیں کر سکتے۔ مثلاً: ایک آدمی کے بارے میں ڈاکٹروں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کو کینسر ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اب اسباب ختم ہو گئے اور علاج ختم ہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اسباب تو ختم ہیں، لیکن اللہ تو قادر ہے۔ ہمارا عقیدہ و ایمان ہے کہ اللہ نے کوئی ایسی بیماری پیدا نہیں فرمائی جس کی دوا نہ ہو، ہر بیماری کی دوا موجود ہے۔ فرمایا:

((مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ دَاءً إِلَّا أَنْزَلَ لَهُ دَوَاءً)) [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۳۴۳۸، باب: ما أنزل الله داء إلا...]

''اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری پیدا نہیں کی، مگر اس کی دوا بھی پیدا کی ہے۔''

یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم اس دوا کو نہ ڈھونڈ سکیں۔

جب مافوق الاسباب مسئلہ پیش آ جائے تو اپنے اعمالِ صالحہ کو سامنے رکھ کر اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے کے اندر بھی کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ جیسے صحیح حدیث کے اندر غار والوں کا قصہ ہے۔ انہوں نے اپنے اعمالِ صالحہ سے وسیلہ پکڑا۔ یہ جائز ہے۔

اسی طرح مافوق الاسباب مسئلہ ہے۔ اگر اللہ کے نبی ﷺ زندہ ہیں تو ان کے پاس جائیں یا اللہ والوں کے پاس جائیں اور ان سے کہیں کہ ہماری مدد کریں اور اللہ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں بچا لے۔ تو یہ جائز ہے۔

وسیلہ کی ناجائز اقسام:

اب رہا یہ مسئلہ کہ کہاں پر وسیلہ جائز نہیں ہوتا۔ اللہ کا ولی زندہ ہے یا فوت ہو چکا ہے اور کوئی بندہ یہ سمجھ کر ان کا وسیلہ پکڑ رہا ہے کہ جس بندے کو میں وسیلہ بنا رہا ہوں اس کی اتنی طاقت ہے اور یہ اتنا مختار ہے کہ اس کی بات رد ہی نہیں ہوسکتی۔ تو یہ شرک ہے۔ اور یہی وہ شرک تھا جو ابوجہل اور ابولہب کرتے تھے۔

اللہ معاف فرمائے ہمارے ملک میں ایک بزرگ کی خانقاہ ہے، اس کے ساتھ ایک قبر خالی رکھی ہوئی ہے کہ ایک پیر صاحب زندہ ہیں، ان کی انتظار ہے۔ جن بزرگوں کی خانقاہ ہے ان کا لقب قیوم ہے۔ یہ ایک باقاعدہ فرقہ ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں چار قیوم پیدا ہوئے اور پانچویں میں جھگڑا ہے۔ اور ان کی باقاعدہ کتاب ''اَلرَّوْضَةُ الْقَيُّوْمِيَّةُ'' ہے، جس کے اندر انہوں نے لکھا ہے کہ قیوم کے درجے ہیں۔ مثلاً پیر ہے، دستگیر ہے، پھر قطب ہے، پھر غوث ہے، پھر ابدال ہے اور آخری درجہ قیوم ہے۔ اور اس میں لکھا ہے کہ جو اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو زمین و آسمان، سورج اور چاند کی حرکت بلکہ عرش و کرسی جس پر اللہ کی ذات مستوی ہے، معاذ اللہ! اس قیوم کے سائے میں ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ بارش کا کوئی قطرہ اور درخت کا کوئی پتہ بھی قیوم کی مرضی کے بغیر نہیں گر سکتا۔ اور ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ساری دنیا میں جو دعائیں مانگی جارہی ہیں وہ پہلے اس قیوم کے سامنے پیش ہوتی ہیں۔ اگر قیوم منظور کرے تو دعا اوپر چلی جاتی ہے، وگرنہ قبول نہیں ہوتی۔ میں کسی پر کوئی جھوٹی تہمت نہیں لگا رہا۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو وہ کتاب بھی پڑھا سکتا ہوں۔ اور اس حرم میں اس علاقہ کے لوگ بھی موجود ہیں، ان کی گواہی بھی دلا سکتا ہوں۔

جب انسان کا یہ عقیدہ ہو جائے تو اس سے بڑا کفر و شرک بھی دنیا میں ہوگا؟ یہ وسیلہ پکڑنا اور استعانت کرنا شرک ہے، اس میں کسی کو کوئی شبہ بھی نہیں ہے۔ ایک مطلقی ہدایت کے درمیان واسطہ سمجھنا، مثلاً: آپ کے گھر میں ایک پنکھا لگا ہوا ہے بجلی کی ٹیوب لائٹیں لگی ہوئی ہیں، بلب لگے ہوئے ہیں، پنکھا ہوا دے رہا ہے یا بلب روشنی دے رہا ہے تو یہ خود ہوا اور روشنی نہیں دے رہے، بلکہ ان کے پیچھے تار کے ذریعے بجلی سے تعلق ہے۔ اگر وہ تعلق نہ رہے تو ان کی ہوا اور روشنی ختم ہو جائے گی۔ اب اگر کوئی اس کو یوں کہے کہ پنکھا خود ہی کرنٹ کے بغیر ہوا دیتا ہے تو یہ جہالت ہے۔ اصل میں روشنی اور ہوا اس وقت آئی جب اس میں کرنٹ آیا۔

ہدایت اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں:

اسی طرح کوئی یہ کہے کہ جب سب کچھ کرنٹ کرتا تو میں پنکھا اور لائٹ توڑ دوں تو یہ غلط بات ہے، کیونکہ اگر پنکھا

اور بلب نہیں ہوگا تو لائٹ کس کے اندر آئے گی؟ تمہارے اندر تو کرنٹ نہیں آسکتا۔ اس لیے یہ عقیدہ رکھیں کہ سب چیزوں کا مالک خدا ہے؛ اس نے ہماری ہدایت کے لیے پیغمبر بھیجے ہیں، ہدایت دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اس نے ہدایت دینے کے لیے کتابیں بھیجیں، پیغمبر بھیجے اور علماء بھیجے اور ان کو ہماری ہدایت کا ذریعہ بنا دیا۔

ہدایت جو بمنزلہ توفیق کے ہے، وہ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جیسے پنکھے کا کام ہے پھرنا، لیکن طاقت اس کرنٹ میں ہے۔ اگر آپ ایک اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کا بلب لگاتے ہیں، لیکن وہ فیوز ہوتا ہے اور نہیں چلتا، پھر آپ ماہرین کو بلاتے ہیں تو وہ کہیں گے کہ اس میں کرنٹ کا کوئی قصور نہیں ہے، آپ نے جو بلب لگایا ہے وہ فیوز ہے۔ انبیاء علیہم السلام چاہے کتنے بڑے آئے ہوں، اگر ہمارے دل کا بلب فیوز ہو گیا ہو تو روشنی کہاں سے آئے گی؟ ابوجہل کا بلب فیوز ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ﴾ [البقرۃ:۷]

”اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔“

جب اللہ نے مہر لگا دی تو اس کے اندر نور کیسے جائے گا؟

اب سمجھیں کہ ہدایت کے لیے اللہ نے انبیاء علیہم السلام بھیجے، ہدایت ان کے ذریعے ملی، لیکن ہدایت دینے والا اللہ ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ جب ہدایت دینے والا اللہ ہے تو ہم انبیاء علیہم السلام کا انکار کر دیں، صحابہ کا انکار کر دیں، علماء کا انکار کر دیں یا ائمہ اور فقہاء کا انکار کر دیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ آدمی اپنے گھر سے اے سی بھی نکال دے، پنکھا بھی نکال دے، بجلیاں بھی اکھاڑ دے اور اب کہے کہ پیچھے پاور ہے، روشنی خود بخود آجائے گی یا ٹھنڈک خود بخود آجائے گی۔ تو لوگ کہیں گے کہ یہ پاگل ہے۔

ایک ہدایت یہ ہوئی کہ کمالِ مہربانی سے منزلِ مقصود کی طرف رہنمائی کرنا اور ایک یہ ہے کہ کمالِ مہربانی سے منزلِ مقصود تک پہنچا دینا۔ یاد رکھیں! راستہ دکھانا انبیاء علیہم السلام، علماء، اولیاء، صلحاء، واعظین، مرشدین اور مبلغین رحمہم اللہ کے ذمہ ہے اور اس کو جنت میں پہنچا دینا اللہ کے ذمہ ہے۔ اس لیے اللہ پاک نے فرمایا:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾ [القصص:۵۶]

”آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدیت کر دیتا ہے۔“

جب ابو طالب مسلمان نہ ہوئے اور حضور ﷺ پریشان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے تسلی دی کہ اے میرے مدنی (ﷺ)! ہدایت آپ کے ذمہ نہیں ہے، آپ کے ذمہ ہے کہ آپ ہدایت پہنچا دیں۔

﴿فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ﴾ [الرعد: ۴۰]

"پس آپ کے ذمہ تو صرف (احکام) کا پہنچا دینا ہے اور حساب کرنا تو ہمارا کام ہے۔"

آپ کے ذمہ بات پہنچانا اور راستہ دکھانا تھا، ایمان دینا اور جنت تک پہنچانا میرے ذمہ ہے، آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس لیے جب جنتی جنت میں داخل ہوں گے تو کہیں گے:

﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ أَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾ [الاعراف: ۴۳]

"اللہ کا شکر ہے کہ جس نے ہمیں توفیق دی اور جنت میں داخل کیا۔ اگر اللہ ہمیں یہ توفیق نہ بخشتے تو ہم کبھی جنت میں داخل نہ ہو سکتے۔"

جب ہم ہدایت کو اس مفہوم میں لیں گے تو ہمارے لیے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ اس لیے جہاں حکم ہے کہ ہدایت کریں اس کا معنی ہے کہ راستہ دکھائیں اور جہاں ہے کہ آپ ہدایت نہیں کر سکتے اس کا معنی یہ ہے کہ آپ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتے۔

خاص الخاص ہدایت کا معنی:

ہدایت خاص الخاص کے درجات بلند ہیں۔ اس لیے ہر وقت حکم ہے کہ بندہ چاہے کتنا مومن بن جائے، عابد بن جائے یا نبوت کے درجہ پر ہو، ہر وقت کہے: ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾

اللہ پاک نے فرمایا: جو لوگ مجھ سے ہدایت مانگتے ہیں ہم ان کی ہدایت کو اور بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔

میرے مدنی ﷺ سراپائے ہدایت ہیں، ہادی بن کر آئے، لیکن اس کے باوجود اللہ نے فرمایا:

﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا﴾ [الفتح: ۱، ۲]

"(اے پیغمبر (ﷺ)!) یقین جانو! ہم نے تمہیں کھلی ہوئی فتح عطا کر دی ہے، تاکہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی تمام کوتاہیوں کو معاف کر دے اور تاکہ اپنی نعمت تم پر مکمل کر دے اور تمہیں سیدھے راستے پر لے چلے۔"

ہدایت کی اقسام:

بعض علماء نے فرمایا کہ طلب ہدایت کا معنی ''اِثْبَاتٌ عَلَى الْهِدَايَةِ'' ہوتا ہے، ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' کا معنی ''ثَبِّتْنَا عَلَى الْهِدَايَةِ'' ہوتا ہے کہ یا اللہ! ہمیں اس ہدایت پر ثابت قدم رکھنا، تا کہ ہم موت تک ہدایت پر رہیں۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہدایت کا معنی ارشاد اور توفیق بھی ہے۔

کبھی کبھی ہدایت متعدی بنفسہ ہوتی ہے۔ جیسے یہاں ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' ہے۔ یہاں معنی ارشاد اور دلالت ہے۔ اور کبھی ہدایت متعدی باللام ہوتی ہے، جیسے اہل جنت قیامت میں کہیں گے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۖ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾ [الاعراف: ۴۳] (یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے ہمیں اس کی توفیق بخشی اور اس قابل بنایا کہ ہم تیری جنت میں آ سکیں)۔

ہدایت عامہ، ہدایت خاصہ اور ہدایت خاص الخاص کو علماء نے دوسرے طریقے سے بھی سمجھایا ہے کہ ایک انابت ہوتی ہے، دوسری ہدایت، تیسری استقامت اور چوتھی سیج ربط علی القلب ہوتی ہے۔

❁......﴿وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ﴾ [الزمر: ۵۴] (اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جاؤ)۔ یہ انابت کا مرتبہ ہے۔

❁......دوسرا درجہ ہدایت کا اور تیسرا درجہ استقامت کا ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ [حم السجدۃ: ۳۰] (جنہوں نے اپنے رب کی ربوبیت کا اقرار کیا پھر اس پر ڈٹ گئے)۔

❁......اور اس سے بھی اوپر ایک درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا﴾ [الکہف: ۱۴] (اور ہم نے ان کے دل خوب مضبوط کر دیے تھے اس وقت جب وہ اٹھے)۔ جن پر ہم راضی ہوتے ہیں ان کے دلوں کو اپنی قدرت کے ہاتھ سے تھام لیتے ہیں۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں راز کھول دیتی کہ میرا بیٹا ہے، یا بہن راز کھول دیتی کہ میرا بھائی ہے تو کیا ہوتا؟ لیکن اللہ فرماتے ہیں: ہم نے ان کے دلوں کو تھام لیا۔ اسی طرح اصحاب کہف کے بارے میں آیا ہے۔

یہ مرتبہ اللہ کے اولیاء کا ہوتا ہے کہ ان کو اللہ پاک ایک خصوصی مرتبہ ومقام عطا فرماتے ہیں کہ اگر ایسا کوئی مرحلہ آئے تو قدرت خود تھام لیتی ہے، کیونکہ ان کے قلوب اللہ کی قدرت میں ہیں۔ اس لیے ان کو مشکل میں پھنسنے سے خود بچا لیتے ہیں۔ اس لیے سب سے افضل، اجمع اور اکمل دعا سورۂ فاتحہ ہے۔

"الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کی تفسیر اور معانی:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ میں "الصِّرَاطَ" موصوف ہے اور "الْمُسْتَقِيْمَ" صفت ہے، یعنی سیدھا راستہ۔ "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" سے کیا مراد ہے؟ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس پر مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس کا معنی کھلا راستہ ہے، جس میں ٹیڑھا پن اور کجی نہ ہو۔ لغت کی تمام کتابوں میں دیکھیں اور شعرائے عرب کے کلام میں بھی "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کا یہ معنی ہے کہ ایسا راستہ ہے جس میں ٹیڑھا پن نہ ہو۔

عرب لوگوں نے لفظ "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کو استعارہ کے طور پر قول اور عمل میں استعمال کیا ہے کہ قول سیدھا ہو، عمل سیدھا ہو۔

مفسرین سلف اور خلف کا لفظ "صِرَاطَ" کی عبارت کے بارے میں اختلاف ہے، اگرچہ یہ اختلاف لفظی ہے۔ کیونکہ تمام اقوال کا مرجع یہ ہے کہ "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کا معنی یہ ہوتا ہے کہ آدمی اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر چلے۔ بعض علمائے سلف نے فرمایا: "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" سے مراد کتاب اللہ، قرآن مجید ہے۔ یہ روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہے۔

فضائل قرآن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت موجود ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن اللہ کی مضبوط رسی، اللہ کا ذکر عظیم اور صراط مستقیم ہے۔ جو اللہ کے قرآن کو پکڑ لے گا وہ اللہ تک پہنچ جائے گا۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۲۹۰۶] اور موقوفاً بھی ایک روایت ہے۔

حضرت منصور رحمہ اللہ نے ابو وائل سے اور انہوں نے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" سے مراد اللہ کا قرآن ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اسلام مراد ہے۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آکر عرض کیا: "قُلْ يَا مُحَمَّدُ! اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" پڑھیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ اے اللہ! ہمیں الہام فرما دے، ہمیں ایسا راستہ بتا دے جو ہدایت کرنے والا ہے۔ اور وہ راستہ اللہ کا دین ہے جس میں کوئی کجی اور ٹیڑھا پن نہیں ہے۔

حضرت میمون بن مہران رحمہ اللہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کے بارے میں نقل

فرماتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: اس سے اسلام مراد ہے۔ حضرت عبداللہ بن محمد بن عقیل رحمہ اللہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل فرماتے ہیں کہ "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" سے اسلام مراد ہے۔ اور اسلام میں اتنی وسعت ہے کہ آسمان اور زمین سے بھی زیادہ وسعت رکھنے والا ہے۔ حضرت ابن حنفیہ رحمہ اللہ نے فرمایا: "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" سے دینِ اسلام مراد ہے۔ کیونکہ دینِ اسلام ایسا دین ہے کہ اس کے ماسوا بندوں سے اللہ تعالیٰ اور کوئی طریقہ قبول نہیں کریں گے۔

جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ [آل عمران:۱۹]

"بے شک (معتبر) دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔"

اور فرمایا:

﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾

[آل عمران:۸۵]

"اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ اس سے مقبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔"

"الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" سے اگر اسلام مراد ہے تو وہ بھی سیدھا راستہ ہے اور اگر اس سے قرآن مراد ہے تو وہ بھی سیدھا راستہ ہے۔ یہ سارے تفسیری اقوال ہیں جو ہمیں سمجھانے کے لیے ہیں، تاکہ بات سمجھ میں آجائے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۷، الفاتحۃ، الآیۃ: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ]

اسلام دین بھی ہے اور مذہب بھی:

مذہب عبادات کے مجموعے کا نام ہے، یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خیرات، صدقات، عمرہ کر لینا اور حج کر لینا، یہ مذہب ہے۔ لوگوں نے آج اسلام کو بطورِ مذہب تو قبول کیا ہے، لیکن بطورِ دین قبول نہیں کیا ہے۔ بس یہی سمجھ لیا کہ اسلام ایک مذہب (عبادات کا مجموعہ) ہے اور ہم جتنے مسلمان ہیں مذہب اسلام پر ہیں۔ اسی لیے آج جتنا جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے ان کو یہ مغالطہ ہے، وہ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک اللہ کے ساتھ ذاتی معاملہ ہے۔ کوئی نماز پڑھتا ہے تو ٹھیک، کوئی نہیں پڑھتا تو بھی ٹھیک ہے۔ ہمیں نماز کے لیے کہنے والے لوگ کون ہوتے ہیں؟ کوئی آدمی حج کرتا

ہے تو اچھی بات ہے، اگر حج نہیں کرتا تو ہمیں کہنے والے کون ہیں کہ حج کرو۔ حالانکہ پورے قرآن پاک میں دیکھیں تو کہیں مذہب کا لفظ نہیں آیا، بلکہ دین کا لفظ آیا ہے۔

دین سر سے لے کر پاؤں تک تمام معاملات کو کہتے ہیں۔ چاہے معاشی ہوں، معاشرتی ہوں، سیاسی ہوں، شخصی ہوں، اجتماعی ہوں، بین الاقوامی ہوں یا بین المسلکی ہوں سب پر اللہ کے دین کو حاوی کر کے نافذ کریں تو دین اسلام نافذ ہوتا ہے۔

کہتے ہیں: نماز پڑھیں۔ ہم نماز سے نہیں روکتے، یہ تو کافر ملکوں میں بھی ہے، بلکہ وہ جمعہ اور عیدین بھی پڑھتے ہیں۔ اپنے اسلام کے مطابق عید الفطر، عید الاضحیٰ مناتے ہیں۔ میرے بھائی اس کا معنی دینِ اسلام نہیں ہے، بلکہ دین اس کو کہتے ہیں کہ اوپر سے لے کر نیچے تک صرف اللہ کا حکم چلے۔

جدید مسائل کا حل:

تمام دنیا اللہ کی مخلوق ہے۔ اللہ جسے امیر بناتے ہیں، خلیفہ بناتے ہیں یا بادشاہ بناتے ہیں تو وہ مسلمانوں کا امیر المؤمنین ہوتا ہے، اللہ کے احکامات کو نافذ کرنے والا ہوتا ہے۔ خود کوئی قانون بنانے والا نہیں ہوتا، بلکہ اللہ کے قانون کو چلانے والا ہوتا ہے۔ اگر کوئی جدید مسئلہ پیدا ہو جائے جس کا قرآن وسنت میں، آثارِ صحابہ میں کوئی واضح راستہ نہ ملے تو ان لوگوں کو جو قرآن وسنت کے عالم ہوں گے ان کو بٹھلائے گا کہ اس مسئلہ کا قرآن وسنت اور اقوالِ صحابہ سے کوئی حل نکالو۔

جیسے بے بی ٹیوب ایسا مسئلہ ہے جو حضور ﷺ کے زمانہ میں موجود نہیں تھا، کسی انسان کا دل نکال کر دوسرے انسان میں لگا دینا یہ حضور ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھا۔ اور اسی طرح کسی کے دل کے وال بند ہو جائیں تو یہ وال پلاسٹک کے بھی مل جاتے ہیں یا خنزیر کے بھی مل جاتے ہیں۔ آدمی کی جو رگیں ہیں ان کو عروقِ شعریہ کہتے ہیں جو بال کے برابر ہیں کہ دل کا وال کام نہیں کر رہا کہ اس کے اندر کوئی ہوا آ گئی ہے یا کوئی چربی آ گئی ہے۔ اس کو صاف کر لیں گے یا اس رگ کو بدلنا پڑے گا کہ وہ خراب ہو گئی ہے۔ خنزیر والا وال سستا ہے اور پلاسٹک والا مہنگا ہے۔ اگر ہم انسان کے دل میں خنزیر کا وال لگائیں تو کیا وہ نماز روزہ ادا کر سکے گا؟ یہ نیا مسئلہ پیدا ہو گیا۔

اسی طرح ایک آدمی نے مرنے کے وقت وصیت کی کہ میں جب مرنے لگوں تو میری آنکھیں نکال کر کسی کو دے دیں۔ یہ مسئلہ حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں تھا، یہ نیا مسئلہ ہے کہ جب میں مر جاؤں گا پھر میری آنکھ رہے یا نہ

رہے کیا فرق پڑتا ہے؟ چلو! میری آنکھوں سے کسی کو فائدہ ہو جائے گا۔ اب معلوم کرنا ہے کہ آنکھیں انسان کی ملک ہیں یا اللہ کی امانت ہیں؟ اگر ملک ہیں تو انسان ان میں تصرف کر سکتا ہے یا نہیں کر سکتا؟ اور اگر امانت ہے تو اس کے اندر خیانت کیسے ہوگی؟ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے صرف وہ لوگ کافی نہیں ہیں جنہوں نے قرآن کبھی نہیں پڑھا اور جنہیں ابھی تک غسل کے فرائض کا بھی پتا نہیں ہے۔

مثلاً: آپ کے کسی ڈیم کو خطرہ پیدا ہو جائے اور ٹیکنیکل فالٹ آجائے تو اس کے لیے آپ نے کبھی مولویوں کو نہیں بلایا کہ مثلاً ڈیم کو ہم کیسے ٹھیک کریں؟ کیونکہ یہ مولویوں کا کام نہیں ہے۔ اسی طرح کسی جگہ ایک بیمار آدمی ہے اور اس کی حالت غیر ہے تو آپ کسی مولوی کو نہیں بلاتے، کیونکہ یہ ڈاکٹر کا کام ہے۔ ہاں! البتہ دعا کا کہہ دیتے ہیں۔ جیسے بیمار کے لیے ڈاکٹروں کی ضرورت ہے اور ڈیم کے لیے انجینئر کی ضرورت ہے، اسی طرح اللہ کے دین کے لیے قرآن وحدیث والوں کی ضرورت ہے۔ ورنہ آپ جب بھی مسئلہ حل کریں گے وہ غلط ہوگا اور آپ اس میں ٹھوکر کھائیں گے۔

گھر کو شریعت کے مطابق چلائیں:

اس لیے دین کا معنی یہ ہوتا ہے کہ ہم تمام امور اور تمام معاملات کے اندر دینِ اسلام کے مطابق چلیں، حتیٰ کہ گھر کے معاملات میں بھی دینِ اسلام کو دیکھیں۔

ایک عورت کا واقعہ:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنے زمانۂ خلافت میں ایک رات گشت کر رہے تھے کہ ایک مکان کی چھت سے ایک عورت کے شعر پڑھنے کی آواز آئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رک کر سننے لگے۔ وہ عورت کہہ رہی تھی: آج چاندنی رات ہے اور میں اکیلی سوئی ہوئی ہوں اور میرا دوست اور خاوند قریب نہیں ہے۔ کاش! وہ میرے قریب ہوتا تو ہم بھی کھیل رہے ہوتے۔ آج اگر مجھے اللہ کا خوف نہ ہوتا تو اس چارپائی کی چولیں ہل رہی ہوتیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پتا کرایا کہ یہ کس کا گھر ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ فلاں عورت کا گھر ہے اور اس کا خاوند جہاد کرنے کے لیے گیا ہوا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سیدھے اپنی بیٹی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گھر والی ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے بیٹی! مجھے ایک مسئلہ تو بتاؤ کہ ایک عورت خاوند کے بغیر زیادہ سے زیادہ کتنی مدت صبر کر سکتی ہے؟ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا پہلے تو شرمائیں اور اس کے بعد فرمایا کہ آپ نے قرآن میں نہیں پڑھا ہے؟

انہوں نے فرمایا: قرآن میں تو اس بارے میں کہیں بھی نہیں لکھا ہوا۔ حضرت حفصہ ﷞ نے کہا: جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس عورت کی عدت قرآن نے چار ماہ دس دن مقرر فرمائی ہے۔ اس کے بعد وہ عورت دوسری جگہ شادی کر سکتی ہے۔ آخر اس کے اندر کوئی تو حکمت ہوگی۔ اس لیے عورت کو چار یا چھ ماہ سے زیادہ دور نہیں رہنا چاہیے۔

تو حضرت عمر ﷛ نے حکم جاری فرمایا کہ کوئی سپاہی یا فوجی چھ ماہ سے زیادہ باہر نہ رہے۔ اب ان کی نظر اللہ کے قرآن پر تھی تو بیٹی نے اللہ کے قرآن کے ذریعہ بتایا تو وہ حکم نافذ ہو گیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۶۹، البقرۃ: آیت: وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ]

حضرت ابوبکر ﷛ کی جرأت:

حضرت ابوبکر ﷛ کے زمانہ میں زکوۃ کا انکار ہوا۔ اب حضرت ابوبکر ﷛ بھی کہہ سکتے تھے کہ یہ پرسنل معاملہ ہے۔ کوئی زکوۃ دے یا نہ دے اس کی مرضی ہے، لیکن حضرت ابوبکر ﷛ کھڑے ہو گئے اور فرمایا: جو شخص زکوۃ سے انکار کرے گا میں اس سے قتال کروں گا۔ زکوۃ تو بڑی چیز ہے اگر کوئی زکوۃ میں ایک رسی بھی دیتا تھا، اب اگر اس سے بھی کوئی انکار کرے گا تو میں اس سے بھی جنگ کروں گا۔

حضرت عمر ﷛ جیسے آدمی بھی کہنے لگے: کیا آپ مسلمانوں سے، اہل قبلہ سے لڑیں گے؟ حضرت ابوبکر ﷛ غصہ میں آگئے اور غصہ سے اپنا ہاتھ حضرت عمر ﷛ کے سینہ پر مارا اور فرمایا:

((أَجَبَّارٌ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَخَوَّارٌ فِي الْإِسْلَامِ؟)) [مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۶۰۲۵]

''عمر! تمہیں کیا ہو گیا ہے کفر کے زمانہ میں بڑے بہادر بنتے تھے اور اسلام میں اتنے کمزور ہو گئے ہو؟''

حضرت عمر ﷛ دیوار کے ساتھ بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر کے بعد روتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق ﷛ کے پاس گئے کہ اے ابوبکر! تجھ پر کروڑوں رحمتیں ہوں! مجھے مسئلہ سمجھ آ گیا ہے۔ اگر آج ایک زکوۃ کا انکار کرے گا پھر نماز کا انکار کرے گا۔ اور ایک قربانی کا انکار کرے گا اور کوئی سود کے حرام ہونے کا انکار کرے گا کہ سود کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔ تم نے اچھا کیا ہے اور میں سب سے پہلے آپ کے ساتھ مل کر تلوار لے کر لڑوں گا۔

اسی طرح جس نے ختم نبوت کا انکار کیا حضرت ابوبکر ﷛ نے اس سے بھی جہاد کیا اور جس نے قرآن کا انکار کیا اس سے بھی جہاد کیا۔ ہم پورے کے پورے دین کو تمام معاملات میں حاوی مان لیں، پھر ہم کہیں کہ مسلمان ہیں۔ صرف نماز پڑھ لی اور فیصلے کافر کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق ہوتے ہوں، کیا یہی مسلمانیت ہے......!؟

اسلام کے متعلق جدید لوگوں کا مزاج:

کسی دوسرے ملک کے اندر چلے جائیں اور وہاں جا کر عیسائیوں سے پوچھیں تو وہ بھی کہیں گے کہ ہم عیسائی ہیں۔ اگر ان سے پوچھا جائے کہ تمہیں اپنی کتاب یاد ہے؟ کہیں گے کہ یاد نہیں ہے۔ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی شراب پی تھی؟ کہیں گے کہ نہیں۔ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فحاشی کو اتنا عام کیا تھا؟ تو جواب دیں گے نہیں۔ ہمارا بھی یہی حال ہے کہ شراب، سود کھاتے رہیں اور زکوۃ سے بچنے کے لیے فارم دے دیں کہ ہم شیعہ ہیں، عشر نہ دیں، اپنی بیٹیوں کا رشتہ نہ کریں تب بھی ہم مسلمان ہیں۔ یہ کونسا اسلام ہے؟ جدید طبقہ کہتا ہے: چھوڑو! ہم سب انسان ہیں۔ ٹھیک ہے، ہم مانتے ہیں۔ اسی طرح جانور بھی سب ایک ہیں، لیکن ان میں فرق ہے۔ ہم گدھے اور گھوڑے کو ایک نہیں مانتے، کتا اور بلی ایک چیز نہیں ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ سب چیزیں اللہ نے پیدا کی ہیں، حلال وحرام کے چکر میں نہ پڑو۔ اگر اسی طرح کی دلیل کافی ہے پھر تو پانی بھی اللہ نے پیدا کیا ہے اور پیشاب بھی اللہ نے پیدا کیا ہے۔ ان دونوں کو بھی برابر سمجھ لیں۔

اسلام پر پورا پورا عمل کرنے کا حکم ہے:

اسی وجہ سے سارے مفسرین ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (یا اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھا) کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ اس سے مراد کتاب اللہ (قرآن مجید) ہے یا اس سے مراد اسلام ہے۔ اگر اس کے مطابق چل رہے ہیں تو صراط مستقیم پر ہیں اور اگر اس سے ہٹ رہے ہیں تو پھر صراط مستقیم پر نہیں ہیں، لہٰذا ہم دین اسلام کے سب تقاضے بطور دین کے قبول کریں۔ اس لیے اللہ نے فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً﴾ [البقرۃ:۲۰۸]

"اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔"

اور کہیں ارشاد فرمایا:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ [آل عمران:۱۰۳]

"اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو اس طور پر کہ (باہم سب) متفق (بھی) رہو اور (باہم) نااتفاقی مت کرو۔"

اور کہیں ارشاد فرمایا:

﴿وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ ۚ﴾
[الانعام: ۱۵۳]

''اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے جو کہ مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تمہیں اس (اللہ) کی راہ سے جدا کر دیں گی۔''

اور کہیں ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ هٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ ۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۖ﴾ [یوسف: ۱۰۸]

''آپ فرما دیجیے کہ یہ میرا طریق ہے۔ میں (لوگوں کو) خدا کی طرف اس طور پر بلاتا ہوں کہ میں دلیل پر قائم ہوں، میں بھی اور میرے ساتھ والے بھی۔''

اے میرے مدنی پاک! ان کو بتا دیں کہ جس راستہ پر میں چل رہا ہوں یہی سیدھا راستہ ہے، جس میں کوئی ٹیڑھا پن نہیں ہے۔ اگر اس کو چھوڑ دو گے تو بھٹک جاؤ گے۔

چار اماموں کے مسلک پر اعتراض:

بعض لوگ اس پر گمراہ ہو جاتے ہیں کہ جب راستہ ایک ہے تو چار اماموں کا کیا مطلب ہے؟ یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے یا پیدا کر دیا جاتا ہے۔ شبہ پیدا ہونے کی وجہ جہالت ہوتی ہے یا جان بوجھ کر شرارت مقصود ہوتی ہے کہ کوئی نہ کوئی نئی بات لوگوں کے ذہنوں میں ڈالو، تاکہ یہ لوگ پریشان ہو جائیں۔

جواب:

میرے مدنی پاک ﷺ نے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات فرما دی ہے۔ اگر اسی حدیث کو سمجھ لیں تو سارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ پہلی امتیں بہتر (۷۲) فرقوں میں تقسیم ہوئیں اور میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں تقسیم ہو گی۔ اور تمام کے تمام فرقے جہنم میں جائیں گے، مگر ایک فرقہ ناجی (بچنے والا) اور جنت میں جانے والا ہو گا۔ صحابہ نے پوچھا: وہ ایک فرقہ کون سا ہو گا؟ فرمایا: صرف وہ فرقہ جنتی ہو گا جو میرے اور میرے صحابہ کے راستے پر ہو گا۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۲۶۴۱، باب: ما جاء في افتراق هذه الأمة]

اگر حضور ﷺ فرما دیتے کہ جو میرے راستے پر چلے گا وہ ناجی ہوگا۔ تو یہ بھی کافی تھا، لیکن فرمایا: وہ راستہ جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم تو لاکھوں ہیں۔ اگر لاکھوں صحابہ کی بات مانیں تو ایک راستہ تو نہیں رہے گا۔ آپ لاکھوں میں نہ جائیں اور یوں سمجھیں کہ خلفاء چار ہیں۔ کوئی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے راستے پر آ گیا، کوئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے راستے پر آ گیا، کوئی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے راستے پر آ گیا اور کوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے راستے پر آ گیا۔ تو یہ چار راستے ہو گئے۔ اور آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ چاروں حضور ﷺ کے راستے پر رہے ہیں۔

ائمہ اربعہ اور محدثین کی ضرورت و اہمیت:

اسی طرح سمجھ لیں کہ ان چار اماموں کا بھی وہی طریقہ ہے جو حضور ﷺ کا ہے۔ جس نے ان میں سے کسی کے قول کو لیا وہ محمد رسول اللہ ﷺ کے تابع ہوگا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان ائمہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ حالانکہ ان سے پہلے بھی لوگ اسلام پر چل رہے تھے۔

جب حضور ﷺ موجود تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو کوئی مشکل پیش آتی تھی تو وہ حضور ﷺ سے پوچھ لیتے تھے کہ ہمارا یہ مسئلہ حل نہیں ہو رہا، اس کو حل فرما دیں۔ حضور ﷺ کے زمانہ کے بعد حضور ﷺ کے ساتھ رہنے والی جماعت اور تربیت پانے والی جماعت موجود تھی۔ کوئی مشکل پیش آتی تو لوگ ان کے پاس چلے جاتے تھے۔ جب ہم حضور ﷺ کے زمانہ سے دور ہوتے گئے، تابعین کا دور آ گیا۔ اب علماء کو فکر ہوئی کہ حضور ﷺ کا زمانہ بھی گزر گیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا زمانہ بھی گزر گیا ہے اور ہم حضور ﷺ کے زمانہ سے بھی دور ہوتے جا رہے ہیں۔ کل کو کوئی آنے والا اپنی نئی نئی باتیں نکالے گا، اب ہم محنت کر کے ان مسائل کو جمع کر دیں، تاکہ قیامت تک آنے والی امت کو تکلیف نہ ہو۔ اس وجہ سے یہ امام پیدا ہوئے۔

جب امام پیدا ہوئے تو انہوں نے کوئی نئی حدیث تو بنائی نہیں، بلکہ قرآن و حدیث میں جو احکام تھے کہ یہ فرض، سنت، نفل، مستحب نصِ قطعی سے ثابت ہے، اجتہادِ رسول ﷺ ہے یا رائے مبارک ہے۔ انہوں نے اس حدیث مبارک کے ذخیرہ کو جمع کیا۔ اب حدیث پاک کے لیے ضرورت تھی کہ جتنا حدیث کا سلسلہ جاری ہے اس میں کوئی جھوٹا تو نہیں ہے، کوئی خارجی، ناصبی تو نہیں ہے؟ تو اس طرح اسماء الرجال کے ماہرین پیدا ہوئے، انہوں نے جرح و تعدیل کا کام کیا ہے۔ جیسے یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ انہوں نے اس پر کتابیں لکھیں۔

جن لوگوں کو مسائل سے غرض تھی انہوں نے فقہی طرز پر احادیث کے ذخیرہ کو سامنے رکھا۔ وہ فقہاء کہلائے۔

اب یہ اتنا کام کر چکے ہیں کہ نہ کوئی آیت چھوڑی اور نہ کوئی حدیث چھوڑی، لہٰذا اب ان کے بعد کسی اور امام کی ضرورت نہیں ہے۔

ائمہ کا اصولِ اجتہاد:

ائمہ نے اصول قائم کیا کہ مسئلہ پہلے قرآن سے لیں گے، پھر سنتِ رسول اللہ ﷺ سے، پھر اجماع جس پر صحابہ اکٹھے ہوجائیں اور اس کے بعد قیاس ہوگا جو کتاب وسنت کی روشنی میں ہو۔ جو چیز کتاب وسنت سے ٹکرائے گی وہ خود بخود پاش پاش ہوجائے گی۔ جیسے آئین کے اندر کچھ بنیادی اصول ہیں اور ان کی ترمیمات ہیں۔ جو ترمیم اصول سے ٹکرائے گی وہ خود بخود ختم ہوجائے گی۔ یہی بات پورے اسلام کے فلسفے میں ہے کہ کوئی بات کتاب اللہ سے ٹکرا جائے یا سنت رسول اللہ ﷺ سے ٹکرا جائے وہ قول ختم ہوجائے گا۔ اصل بات اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی رہے گی۔

مکمل دین کی اتباع لازم ہے:

دین اللہ نے اتارا، قرآن اللہ نے اتارا، میرے مدنی ﷺ کے سینے میں قرآن اللہ نے محفوظ کیا، پڑھایا جبرائیل علیہ السلام نے، حضور ﷺ نے عمل کر کے دکھایا اور صحابہ کو نمونہ بنا کر پیش کیا اور پھر اس کو ائمہ محدثین، فقہاء نے منضبط کیا۔ جب تک ہم دین کو اس معنی میں دین نہ سمجھیں گے اس وقت تک گاڑی نہیں چلے گی۔ وگرنہ ہم نام کے مسلمان ہوں گے، کام کے مسلمان نہیں ہوں گے۔ جیسے علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

> یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
>
> پر کچھ یہ بھی تو بتاؤ کہ مسلمان بھی ہو؟

علامہ اقبال نے یہی رونا رویا تھا کہ ویسے تو تم سید بھی ہو، افغانی ہو اور مرزا بھی ہو، ہم نے یہ مان لیا، لیکن یہ تو بتاؤ کہ مسلمان بھی ہو؟ ایک آدمی سر پر ٹوپی رکھ لے اور نماز بھی پڑھے اور سارا دن سود کا کاروبار بھی کرے، سود کو حلال کہے تو یہ اسلام نہیں ہے۔ جس چیز کو اللہ نے حرام قرار دیا اس کو کوئی حلال کہے تو وہ کافر ہے۔ حضور ﷺ نے یہ کوئی حکم اور فتویٰ نہیں دیا تھا کہ شہد حرام ہے، بلکہ حضور ﷺ نے اپنے اوپر حرام قرار دیا کہ میں آئندہ نہیں پیوں گا۔ اللہ کے حلال کو حرام نہیں کہا، لیکن اللہ نے قرآن نازل فرمادیا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ﴾ [التحریم:1]

(اے نبی! جس چیز کو اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے آپ (قسم کھا کر) اس کو (اپنے اوپر) کیوں حرام فرماتے ہیں؟)۔ اگر اللہ کے نبی ﷺ حلال کو حرام نہیں کر سکتے تو تو کون ہے جو چودہ سو سال بعد حرام کو حلال کہے گا؟ یہ علیحدہ بات ہے کہ حلال کو حلال کہو اور حرام کو حرام کہو، اس میں مشکلات ہیں۔ تو ان لوگوں کو بلانا پڑے گا جو قرآن و حدیث کا علم رکھتے ہیں۔ پھر پتا چلے گا کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے؟

ایک پیر کی جہالت:

جیسے ایک واقعہ ہے کہ ایک آدمی کسی پیر کے پاس بیعت ہونے کے لیے آیا۔ ایک دن رہا اور شام کو کہا: اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ، مجھے اجازت دیں۔ پیر صاحب نے پوچھا: کیسے آئے تھے؟ کہا: ارادہ تو یہ تھا کہ آپ کو پیر بناؤں، لیکن اب نہیں بناتا۔ انہوں نے کہا: کیا بات ہے؟ کہا: جب آپ عصر کی نماز کے لیے مسجد کی طرف آرہے تھے تو آپ نے بایاں پاؤں مسجد میں پہلے رکھا اور دایاں پاؤں بعد میں رکھا۔ جو آدمی خدا کے گھر میں داخل ہونا نہیں جانتا تو آگے خدا کی باتیں کیا جانتا ہوگا؟ اس لیے دعا مانگتے ہیں: ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ''۔

حضور ﷺ کی طرف سے ایک بہترین مثال:

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا صِرَاطًا مُسْتَقِيْمًا......))

اللہ نے ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک صراط مستقیم ہے جس کی دونوں جانب دیواریں ہیں، ان دیواروں میں کھلے ہوئے دروازے ہیں، دروازوں پر پردے لٹک رہے ہیں اور راستے کے مرکزی دروازے پر ایک داعی کھڑا کہہ رہا ہے: لوگو! سب کے سب اس میں داخل ہو جاؤ، دائیں بائیں منتشر نہ ہو اور ایک داعی راستے کے بیچ میں پکار رہا ہے۔ جب کوئی شخص ان میں سے کوئی دروازہ کھولنا چاہتا ہے تو وہ اس سے کہتا ہے کہ اسے مت کھولنا، اس لیے کہ اگر تم نے اسے کھول لیا تو اس میں داخل ہو جاؤ گے۔ صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے، دیوار سے مراد حدود اللہ ہیں، کھلے ہوئے دروازے محارم ہیں اور راستے کے مرکزی دروازے پر جو داعی ہے، وہ قرآن کریم ہے اور راستے کے عین بیچ میں جو داعی ہے، وہ ہر مسلمان کے دل میں اللہ کا ایک واعظ ہے۔ (جسے ضمیر کہتے ہیں، جس کو اللہ نے ہر مسلمان کے دل میں ڈرانے والا رکھا ہے کہ یہ گناہ ہے، حرام ہے، یہ ہلاکت وجہنم کا راستہ ہے اس کی طرف نہ جاؤ

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صراط مستقیم سے اسلام مراد ہے)۔

[کنزالعمال، حدیث:۹۲۱، اَلْبَابُ الثَّانِيْ: فِي الْاِعْتِصَامِ بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ]

سیدھے راستہ کے لیے پانچ صفات:

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن وحدیث کو سامنے رکھ کر ارشاد فرمایا کہ اگر کسی راستے میں پانچ صفات ہوں گی تو وہ صراط مستقیم کہلائے گا۔ اگر اس میں پانچ صفات نہ ہوں تو صراط مستقیم نہیں کہلائے گا۔

- ......ان میں سے پہلی صفت یہ ہے کہ سیدھا راستہ ہو۔
- ......دوسری صفت یہ ہے کہ سب سے قریب ترین راستہ ہو۔
- ......تیسری صفت یہ کہ وہ راستہ کشادہ اور کھلا ہو۔
- ......چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ راستہ "مُوْصِلٌ اِلَى الْمَطْلُوْبِ" (منزل تک پہنچانے والا) ہو۔
- ......اور پانچویں صفت کہ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ ہو۔

اور وہ راستہ یہ ہے: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۥ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ (ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام کیا نہ کہ ان لوگوں کے راستے کی جن پر غضب نازل ہوا ہے اور نہ ان کے راستے کی جو بھٹکے ہوئے ہیں)۔

جھگڑا کب ہوتا ہے؟

غور سے سمجھیں کہ چاہے مسلمانوں کے اوپر کتنے ہی بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے الزام لگائے جائیں اور مسلمانوں کے احوال غلط انداز سے پیش کیے جائیں، لیکن جھوٹ جھوٹ ہوتا ہے، حق حق ہوتا ہے۔ جھگڑا ہمیشہ وہی کرتا ہے جو نہ ماننے والا ہو اور جو ماننے والا ہو وہ کبھی جھگڑا نہیں کرتا۔ مثلاً: آپ کسی سے کہیں کہ آپ میرے ساتھ مدینہ منورہ چلیں اور وہ کہہ دے کہ ٹھیک ہے چلتے ہیں تو کوئی جھگڑا نہیں ہوگا۔

ہمارے دین کا نام ایمان اور اسلام ہے کہ جس کے اندر امن وسلامتی ہے۔ ہم موسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں، ہم عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں تو ہم یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ کیسے جھگڑا کریں گے؟ شرارت تو یہودی اور عیسائی کریں گے جو میرے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے۔ اسی طرح ملنگ صحابہ رضی اللہ عنہم کو نہ ماننے والے ہیں، اہل سنت

تو اہلِ بیت کو مانتے ہیں، وہ کیسے جھگڑا کرنے والے ہو سکتے ہیں۔ کوئی ہمارے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لے تو ہم ان کو مانتے ہیں کہ وہ خلیفہ راشد ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ہیں، اہلِ بیت کے سردار ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور کاتب الوحی ہیں۔ ہم انہیں "سَابِقُوْنَ فِی الْاِیْمَانِ" میں سے مانتے ہیں اور "بَطَلٌ مِّنْ اَبْطَالِ الْاِسْلَامِ" مانتے ہیں تو پھر ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام پر کیسے جھگڑا کر سکتے ہیں؟ جھگڑا تو اس وقت ہوگا جس وقت ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام لیں اور وہ انہیں گالی دیں، جب ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نام لیں اور وہ انہیں گالیاں دیں اور ہم قرآن پیش کریں تو وہ کہیں کہ یہ شرابیوں کا جمع کردہ قرآن ہے اور وہ کہیں کہ ہم نہیں مانتے۔ تو جھگڑا وہ کرے گا جو اسلام پر نہیں ہوگا۔ جو اسلام اور صراطِ مستقیم پر ہوگا، اس کو جھگڑالو کہنے والے اپنے ایمان کی خیر منائیں۔ وہ کیسے جھگڑالو ہو سکتے ہیں؟ اس لیے جب ہم صراطِ مستقیم (اسلام) پر ہیں تو اللہ کا شکر ہے۔

ایک یہودی سے مکالمہ:

ایک دفعہ میں یہودیوں کی ایک مارکیٹ میں گیا۔ اس مارکیٹ کا مالک یہودی تھا۔ اور مجھے وہاں سے کچھ سامان لینا تھا۔ اس یہودی کو کسی نے کہا کہ یہ مسلمانوں کا مولوی ہے۔ اس نے مجھے بلایا کہ میرے ساتھ چائے پئیں۔ میں نے کہا کہ میں ان کو جانتا تو نہیں ہوں، لیکن اگر انہوں نے ملنا ہے تو ضرور ملیں گے۔

یہودی کے اعتراضات اور ان کے جوابات:

اس نے بڑی تکریم وعزت کی اور اس کے بعد اس نے یہی مسئلہ چھیڑ دیا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کا جھگڑا ہے اور یہودی بہت قلیل ہیں، جبکہ مسلمان بہت ہیں، پھر ہم سے لڑائیاں اور جھگڑا کرنا اچھی بات تو نہیں ہے۔ آپ اپنے لوگوں کو سمجھائیں۔ میں نے اس سے کہا کہ آپ کے پاس ایک ملازم ایمان دار ہے اور ایک بے ایمان ہے، آپ کو کونسا ملازم اچھا لگے گا؟ کہنے لگا: ایمان دار ہی اچھا لگے گا۔ میں نے کہا کہ مسلمان ایماندار ہیں اور یہودی بے ایمان ہیں۔ اس نے کہا: کیا مطلب ہے؟ میں نے کہا: ہم تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی مانتے ہیں اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مانتے ہیں، اس لے ہم ایمان دار ہیں۔ اور تم مدنی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے، اس لیے تم لوگ بے ایمان ہوئے۔ اور ہمارا ایمان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بغیر فرشتے کے واسطے کے اللہ تعالیٰ سے کلام فرمایا اور تورات اللہ کی کتاب ہے۔

اس نے کہا ٹھیک ہے کہ ہم آپ کے نبی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں مانتے، لیکن اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو مانتے ہیں۔ میں نے کہا: تم تو کہتے ہو حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قتل کیا، تم تو اپنے نبی کو قاتل کہتے ہو، لہٰذا

تم بے ایمان ہو۔ اسی طرح میں نے کہا کہ تمہارے اور مشرکین میں کیا فرق ہے کہ مشرکین بھی اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں اور تم بھی اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہو؟ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہو۔ مشرکین بھی میرے مدنی پاک ﷺ کے دشمن ہیں اور آپ بھی دشمن ہیں، مشرکین نے بھی حضور ﷺ کے خلاف قتل کی سازشیں کیں اور آپ کے قبیلہ بنو نضیر نے بھی حضور ﷺ کو خود بلایا اور اپنے قلعہ کی دیوار کے نیچے ایک جگہ بنائی اور اوپر ایک بندہ چھپا دیا کہ جب حضور ﷺ یہاں بیٹھیں تو اوپر سے پتھر گرا کر شہید کر دو۔ مشرکین مکہ نے بھی حضور ﷺ کے خلاف بڑی بڑی سازشیں کیں اور ان کو مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا اور تم لوگوں نے بھی سازشیں کیں اور عبد اللہ بن ابی تمہارا سب سے بڑا سازشی تھا۔ کعب بن اشرف سب سے بڑا سازشی تھا، لیکن اس کے باوجود ہمارا دین کتنا انصاف والا ہے کہ تمہیں آج بھی اہلِ کتاب کے نام سے یاد کرتا ہے کہ اے اہلِ کتاب! تم تو پڑھے لکھے ہو، تم تو میرے مدنی پاک ﷺ کو مانو۔ اب آپ بتائیں کہ آپ اسلام کے دشمن ہیں یا اسلام آپ کا دشمن ہے......؟

یہودی کا دوسرا اعتراض اور اس کا جواب:

پھر اس نے کہا: یہ تو بڑی زیادتی ہے کہ آپ ہماری لڑکی سے نکاح کریں اور ہم آپ کی لڑکی سے نکاح نہ کریں۔
میں نے کہا: یہ تو پہلے والی بات ہوئی کہ آپ کی لڑکی تو ایمان دار سے شادی کرے گی ہم بے ایمان کو کیسے لڑکی دیں؟
جب اس نے دیکھا کہ اس کے دوسرے ملازم بھی کھڑے ہیں، کہیں وہ متاثر نہ ہو جائیں تو اس نے کہا: اچھا جی! پھر ملاقات کریں گے۔

دینِ اسلام کی حدود:

دنیا کے اندر ٹریفک والے اگر کوئی نشان مقرر کر دیں تو اس کو کوئی نہیں توڑتا، لیکن جو نشان اللہ نے میرے مدنی ﷺ کو بھیج کر لگا دیے ہیں کہ یہ حلال ہے، یہ حرام ہے، اس پر کوئی غور نہیں کرتا۔ حضور ﷺ نے بتلا دیا کہ نکاح حلال ہے اور زنا حرام ہے۔ تجارت حلال ہے اور سود حرام ہے۔ گائے، بکری، بھیڑ وغیرہ حلال ہیں اور خنزیر، کتا اور چیر پھاڑ کر کھانے والے جانور حرام ہیں۔ اب ان نشانات کو جو توڑتا ہے، ان کو کچھ نہیں سمجھتا اور ان کو روزانہ توڑتا ہے پھر وہ عاشقِ رسول بھی رہے، مسلمان اور مومن بھی بنا رہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جبکہ قرآن کہتا ہے کہ جس نے ان حدود کو توڑا وہ فاسق ہے، وہ ظالم ہے اور وہ حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے ہے۔

"الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کے دوسرے معانی:

حضرت مجاہد ﷫ فرماتے ہیں: "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" سے مراد ہے کہ حق کا راستہ دکھا اور اس پر چلا کر ہمیں منزلِ مقصود جنت تک پہنچا۔ علامہ ابنِ کثیر ﷫ نے لکھا کہ "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کا ترجمہ اگر حق سے بھی کریں تو ٹھیک ہے۔ اور اس کے اندر کوئی تعارض و اختلاف بھی نہیں ہے۔

"اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کے اندر ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد محمد مصطفیٰ ﷺ، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر ﷠ ہیں۔ راوی فرماتے ہیں کہ ابو العالیہ نے جب یہ ترجمہ کیا تو ہم نے آکر حضرت حسن سے پوچھا۔ انہوں نے فرمایا کہ ابو العالیہ نے سچی بات کہی ہے، بلکہ انہوں نے یہ قول بیان کر کے مسلمانوں کو ہدایت و نصیحت بھی کی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۷، ۲۸، الفاتحہ، الآیۃ: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ]

خلاصۂ بحث:

علامہ ابنِ کثیر ﷫ فرماتے ہیں: اگر غور کریں تو یہ سارے کے سارے اقوال درست اور ایک دوسرے کو لازم ہیں، کیونکہ جس نے حضرت ابوبکر و عمر ﷠ کی اتباع کی تو اس نے حضور ﷺ کی اتباع کی، جس نے حضور ﷺ کی اتباع کی تو اس نے حق کی اتباع کی، جس نے حق کی اتباع کی تو اس نے اسلام کی اتباع کی، جس نے اسلام کی اتباع کی تو اس نے قرآن کی اتباع کی، جس نے قرآن کی اتباع کی جو اللہ کی کتاب اور اللہ کی مضبوط رسی ہے، جس کے پکڑنے کا حکم ہے اور یہی سیدھا راستہ ہے جس پر چلنے کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: میرے اور میرے خلفاء راشدین کے راستے کو لازم پکڑو۔ اور داڑھوں کے ساتھ اس پر جم کر رہو، کیونکہ اس کے بغیر کوئی نجات کا راستہ نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کے ضمن میں جو اقوال پڑھے ہیں سارے درست ہیں۔ اور ایک دوسرے کی تصدیق کر رہے ہیں۔

حضرت عبد اللہ ﷛ فرماتے ہیں: "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" سے وہ راستہ مراد ہے جس پر ہمیں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے چھوڑا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۸، الفاتحہ، الآیۃ: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ]

امام ابنِ جریر ﷫ کے نزدیک راجح قول:

علامہ ابنِ جریر ﷫ فرماتے ہیں: اس آیت میں زیادہ راجح قول یہ ہے کہ یا اللہ! ہمیں اپنے اس پاک راستے پر

رہنے کی توفیق عطا فرما جو تو نے اپنے پاک بندوں کے لیے پسند فرمایا اور جن کو انعام عطا فرمایا۔ اور انعام والے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ اور جن کو اس راستے پر چلنے کی توفیق ملی گویا اس کو اسلام پر چلنے کی توفیق ملی اور جس کو اسلام پر چلنے کی توفیق ملی اس کو تمام انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کی توفیق ملی۔ اللہ کے قرآن کو مضبوطی سے تھام لینا، جن باتوں کا حکم دیا ہے ان پر چلنا، جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے ان سے رک جانا، حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے خلفاء (ابو بکر وعمر، عثمان وعلی رضی اللہ عنہم) کے راستے پر چلنا ہی صراط مستقیم ہے۔ اس لیے علامہ ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو ترجیح دی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۸، الفاتحۃ، الآیۃ: اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ]

ہدایت پانے کے بعد ہدایت مانگنے کا حکم کیوں ہے؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مؤمن ہدایت پر ہے تو ہر نماز میں اور ہر وقت یہ ہدایت کیوں مانگتا ہے؟ اور جو چیز موجود ہو اس کا مانگنا تحصیلِ حاصل ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے جواب دیا ہے کہ اگر بندوں کو اس کی ضرورت نہ ہوتی تو اللہ صبح شام بندوں کو اس کی ہدایت بھی نہ کرتے اور اس کا حکم بھی نہ دیتے، لیکن چونکہ بندہ اپنے کسی نفع ونقصان کا مالک نہیں ہے اور بندہ ہر گھڑی اس کا محتاج ہے کہ اللہ اس کو ہدایت پر رکھے، تا کہ اس کو صراطِ مستقیم اور زیادہ سے زیادہ روشنی حاصل ہو اور اسی پر ہمیشہ قائم رہے۔ اس لیے اللہ نے حکم دیا کہ تم ہر وقت دعا مانگا کرو کہ اے اللہ! ہمیں ہدایت عطا فرما، اس پر ثابت قدم فرما اور اسی پر موت عطا فرما۔ نیک بخت لوگ وہ ہوتے ہیں جن کو اللہ سے مانگنے کی توفیق مل جائے۔ اور اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ جو بندہ پریشان ہوگا اور مجھ کو پکارے گا تو میں اس کی دعا قبول کروں گا۔ اب بندہ ہر نماز میں مانگتا ہے کہ اے اللہ! میں ہدایت کا محتاج ہوں، مجھے ثابت قدم رکھ، میں کہیں بھٹک نہ جاؤں۔ اور جیسے اللہ نے ایک دوسری آیت میں فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ [النساء: ۱۳۶]

"اے ایمان والو! ایمان لے آؤ اللہ پر اور رسول اللہ پر۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اے ایمان والو! ایمان پر ثابت قدم رہو۔ یہ تحصیلِ حاصل نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ اے اللہ! ہمیں ہمیشہ اسلام پر ثابت قدم رکھ۔ جیسے قرآن پاک میں ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ﴾

[آل عمران: ۸]

''اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کیجیے بعد اس کے کہ آپ ہمیں ہدایت کر چکے ہیں اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت (خاصہ) عطا فرمائیے۔ بلاشبہ آپ بڑے عطا فرمانے والے ہیں۔''

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۸، الفاتحہ، الآیۃ: اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ]

﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾

تفسیر:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ یا اللہ! (ان لوگوں کے راستے پر چلا) جن پر تو نے اپنا انعام کیا کہ ان کو عبادت اور اطاعت کی توفیق دی۔ اور ان لوگوں میں ملائکہ، انبیاء کرام علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین رحمہم اللہ بھی داخل ہیں۔ اس لیے یہی قول راجح ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۸، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾

تفسیر:

یا اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جو عبادت اور اطاعت والے ہیں، جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر کو لینے والے اور اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نواہی کو چھوڑنے والے ہیں، ان لوگوں کے راستہ پر نہ چلا جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور وہ لوگ جن کے ارادے بگڑ گئے۔ انہوں نے حق کو پہچانا، لیکن حق سے ہٹ گئے۔ اور ان لوگوں کے راستہ پر نہ چلا جو گمراہ ہوئے، وہ لوگ جنہوں نے اپنے راستہ کو گم کر دیا، جو گمراہی کے اندر سرگردان ہیں اور جو لوگ حق کی طرف ہدایت نہیں پا رہے ہیں۔ اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔

بعض نے کہا: ''غَيْرِ'' استثناء کے لیے ہے کہ ان کے راستے پر چلا جن پر تیرا انعام ہوا، نہ کہ ان لوگوں کے راستہ پر جو گمراہ ہیں۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علماء کے نزدیک پہلا قول راجح ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا: ﴿وَلَا الضَّالِّينَ﴾ کا ''لَا'' زائدہ ہے۔ اب عبارت یوں ہوگی: ''غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَالضَّالِّينَ'' کہ یا اللہ! ان لوگوں کا راستہ نہ دکھا جن پر تو نے غضب نازل کیا اور جو گمراہ ہوئے۔ راجح قول

پہلا ہے۔

جو آدمی علم رکھے، لیکن عمل کو چھوڑ دے وہ غضب کا مستحق ہوتا ہے اور جس آدمی کے پاس علم نہیں ہے وہ گمراہ ہوتا ہے۔ ان کے لیے ضلال کا لفظ آیا ہے۔ چاہے یہود ہیں، چاہے نصاریٰ ہیں وہ گمراہ بھی ہیں اور ان پر اللہ کا غضب بھی ہے، لیکن یہود پر اللہ کی طرف سے غضب کا اطلاق زیادہ کیا گیا ہے اور نصرانیوں کے بارے میں ضلال کی صفت زیادہ آئی ہے۔ اس کی تائید میں آیات و آثار موجود ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۲۹، الفاتحہ، الآیہ: صراط الذین انعمت علیھم]

حضرت عدی بن حاتم طائی رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کا واقعہ:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک حدیث بیان فرمائی ہے کہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک گھڑ سوار دستہ آیا اور انہوں نے میری پھوپھی کو اور ہمارے لوگوں کو پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ میری پھوپھی نے عرض کیا: یارسول اللہ! آنے والا دور ہو گیا اور میں اولاد سے کٹ گئی اور میں بوڑھی ہوں، مجھے پکڑ کر لے آئے ہیں اور میری خدمت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ جیسے اللہ نے آپ پر احسان کیا ہے، آپ مجھ پر احسان کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ تیری خدمت کرنے والا کون ہے؟ تو اس نے کہا: عدی بن حاتم ہے۔ فرمایا: اچھا! تم اس کا ذکر کر رہی ہو جو اللہ اور اس کے رسول سے بھاگ گیا، یعنی اسلام نہیں لے آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو۔ کہتی ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس لوٹ کر آئے تو دیکھا کہ آپ کے ساتھ ایک آدمی ہیں، پھر معلوم ہوا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ تم کوئی سواری بھی مانگ لو۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سواری کے بارے میں عرض کیا تو آپ نے سواری عطا فرما دی۔

حضرت عدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پھر میری پھوپھی میرے پاس آئی، اس نے کہا کہ تم عجیب آدمی ہو! تم ایسے آدمی ہو کہ ایسا کام کیا جو کبھی تمہارے باپ دادا کا نہیں تھا کہ ہمیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ کہتے ہیں: انہوں نے مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور مہربانی کا ذکر فرمایا، میں نے سوچا یہ قیصر و کسریٰ تو معلوم نہیں ہوتا، یہ تو اللہ کے نبی معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ بادشاہ ہر کسی کے ساتھ مہربانی اور احسان نہیں کرتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے ساتھ احسان فرمادیا ہے۔

فرماتے ہیں: میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں کس چیز نے "لا إله

إِلَّا اللّٰهُ'' سے بھگا دیا ہے؟ اللہ کے سوا بھی کوئی معبود برحق اور اللہ سے بڑا بھی کوئی ہے؟ تو میں اسلام لے آیا۔ میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ کا چہرہ مبارک خوشی سے کھل اٹھا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۹، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

''اَلْمَغْضُوْبِ'' کون اور ''الضَّآلِّيْنَ'' کون؟

ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ وادی قریٰ میں ہیں اور گھوڑے پر سوار ہیں، بنی قین کے ایک آدمی نے سوال کیا کہ یہ ''اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ'' اور ''الضَّآلِّيْنَ'' کون لوگ ہیں؟ تو حضور ﷺ نے یہود کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: یہ ''اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ'' ہیں اور ''الضَّآلِّيْنَ'' سے مراد نصاریٰ ہیں۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے مفسرین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں دیکھا ہے، سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ''اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ'' سے مراد یہود ہیں اور ''الضَّآلِّيْنَ'' سے مراد نصاریٰ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: ﴿فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ﴾ [البقرۃ: ۹۰] (چنانچہ یہ (اپنی اس جلن کی وجہ سے) غضب بالائے غضب لے کر لوٹے ہیں)۔ اس سے مراد بھی یہی یہودی ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۹، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا:

عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں شام کی طرف نکلا اور میرے ساتھ ایک جماعت تھی۔ ہم ڈھونڈ رہے تھے کہ ہمیں صحیح دین مل جائے اور ہم اسے تسلیم کریں۔ جب ہم یہودیوں سے ملے تو انہوں نے کہا: اگر ہمارے دین میں داخل ہونا چاہتے ہو تو پھر کچھ اللہ کا غضب برداشت کرنا پڑے گا۔ یعنی وہ خود بھی جانتے تھے کہ وہ ''اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ'' ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہم تو اللہ کے غضب سے فرار اختیار کر رہے ہیں اور تم کہتے ہو کہ اللہ کے غضب کو لو۔ پھر ہم نصرانیوں کے پاس گئے، انہوں نے کہا: اگر تم ہمارے دین میں داخل ہونا چاہتے ہو تو اللہ کی ناراضگی کا کچھ حصہ تم پر بھی آئے گا۔ ہم نے کہا: ہم تو یہ طاقت نہیں رکھتے کہ اللہ کا غضب اور ناراضگی مول لیں۔ میں دونوں باتیں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں ہٹ گیا اور نہ میں یہودیوں میں ملا، نہ میں نصرانیوں میں ملا اور نہ میں بت پرستوں میں ملا، لیکن میرے ساتھ جو ساتھی تھے وہ نصرانی بن گئے۔ اور انہیں میں سے ورقہ بن نوفل تھا وہ بھی نصرانی ہو گیا اور اس نے نصاریٰ کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ جب میرے آقا ﷺ کو نبوت ملی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کو

لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں تو اس نے پہچان لیا کہ آپ سچے نبی ہیں۔ اس نے حضور ﷺ کا کلمہ پڑھ لیا اور وہ مسلمان ہو گیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۰، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

"ض" اور "ظ" کا مخرج:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وَلَا الضَّالِّينَ" میں "ض" اور "ظ" دونوں قریب ہیں کہ دونوں مجہورہ، مطبقہ اور رخوہ ہیں اور دونوں کے مخارج قریب ہیں۔ "ضاد" کا مخرج زبان کی کروٹ ڈاڑھ کو لگے اور "ظاء" کا مخرج زبان کا کونہ اوپر تالو کو لگے۔ دونوں کا مخرج طرف اللسان ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے صحیح معنی کے اندر "ضاد" کہہ لیا یا "ظاء" کہہ لیا تو اس کے اندر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۰، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

"ض" پر جھگڑے:

اور ہمارے ہاں اسی پر جھگڑے ہیں۔ لاکھوں لوگ مر گئے۔ اگر کوئی بندہ "وَلَا الدَّآلِّيْنَ" پڑھے تو لوگ کہتے ہیں: یہ عاشق رسول ہے۔ اور اگر کوئی "وَلَا الضَّآلِّيْنَ" پڑھے تو کہتے ہیں: دیکھو! یہ وہابی ہے۔ حالانکہ بے چارے نہ قرأت کو جانتے ہیں اور نہ علماء کے اقوال کو جانتے ہیں۔ بس ایسے ہی لوگوں کو ایک راستے پر لگا دیا گیا ہے۔ اللہ پاک فتنوں سے بچائے اور ہدایت عطا فرمائے۔

فاتحہ میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ غور کریں کہ سورۂ فاتحہ کی سات آیات ہیں۔ جن میں اللہ کی حمد، تمجید اور ثناء ہے، اللہ کے اسماء حسنیٰ ہیں، صفات علیا ہیں، ذکر معاد ہے اور بندوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ جب بھی تضرع اور سوال کریں تو اللہ کی طرف کریں، اللہ کے سواسب سے براءت اختیار کریں، اللہ کی خالص عبادت کریں، اللہ کی توحید اور الوہیت کا اقرار کریں اور تنزیہ بیان کریں۔

اور بندوں کو دعا سکھلائی کہ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" مانگتے رہیں، تاکہ قیامت کے دن جو پل صراط پر چلنا ہوگا وہ اللہ آسان فرما دیں گے اور تمہیں اپنی جنتوں میں پہنچا دیں گے اور تمہیں انبیاء علیہم السلام، صدیقین اور

شہداء رحمہم اللہ کی معیت نصیب کریں گے۔

تو اس سورت کے اندر ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی ہے۔ ترغیب اس طرح کہ ایسے اعمال اختیار کرو جو اعمالِ صالحہ ہوں، تاکہ تم قیامت میں ان لوگوں کے ساتھ اٹھو جن کے اعمال صالحہ ہوں اور جن پر اللہ کا انعام ہوتا ہے۔ اور اس کے اندر ترہیب بھی ہے کہ باطل لوگوں سے بچو، تاکہ قیامت کے دن تم گمراہ لوگوں کے ساتھ نہ اٹھو۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۰، الفاتحۃ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

اللہ کی طرف مذموم چیز کی نسبت:

﴿الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ﴾ فرمایا، فاعل کو ذکر نہیں کیا گیا، حالانکہ ﴿أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ میں فاعل کا ذکر ہے۔ یہ اللہ کی کمالِ رحمت کی طرف اشارہ ہے کہ جب رحمت کا ذکر آیا تو اللہ کے نام کو ذکر کیا گیا اور جب غضب کا ذکر آیا تو نام ظاہر نہیں کیا۔

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ﴾ [المجادلۃ: ۱۴]

''کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں فرمائی جو ایسے لوگوں سے دوستی کرتے ہیں جن پر اللہ نے غضب کیا ہے؟''

غضب کرنے والے، عذاب دینے والے اور رحمت کرنے والے بھی اللہ ہیں۔

اسی طرح ضلال کی نسبت گمراہ لوگوں کی طرف ہے، حالانکہ گمراہ کرنے والی بھی اللہ کی ذات ہے، لیکن ادب کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ ظاہراً بری چیزوں کی نسبت اللہ کی طرف نہ کی جائے۔ اسی لیے قرآن میں ہے:

﴿مَن يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۖ وَمَن يُضْلِلْ فَلَن تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُّرْشِدًا﴾ [الکہف: ۱۷]

''جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پاتا ہے اور جس کو وہ بے راہ کر دیں تو آپ اس کے لیے کوئی مددگار، راہ بتانے والا نہ پاویں گے۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿مَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ ۚ وَيَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾ [الاعراف: ۱۸۶]

''جس کو اللہ گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا اور ایسے لوگوں کو اللہ (بے یار و مددگار) چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں۔''

ان آیات سے معلوم ہوا کہ ضلال بھی اللہ کی طرف سے ہے اور ہدایت بھی اللہ کی طرف سے ہے، لیکن عام طور پر ہدایت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور ضلال کی نسبت بندے کی طرف کر دی جاتی ہے، کیونکہ ادب کا تقاضا یہی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۰، الفاتحۃ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

متشابہات کے ساتھ دھوکہ دینے والے فرقے:

فرقہ قدریہ کی طرح نہیں کہ وہ کہتے ہیں: بندے خود مختار ہیں، بندہ اپنے افعال پر خود قادر ہے، اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔ وہ قرآن کے متشابہات کو سامنے رکھ کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اور یہی اہل ضلال کا حال ہے۔

اسی لیے حدیث شریف میں ہے کہ جب دیکھو کہ ایسے لوگ آرہے ہیں جو متشابہات میں پڑ رہے ہیں تو ان سے بچو۔ یہ وہی لوگ ہیں جو لوگوں کو گمراہ کردیں گے۔ وہ متشابہات کے پیچھے اس لیے پڑتے ہیں کہ لوگوں کو گمراہ کریں اور اس کی خود ہی تفسیر کریں۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: الحمد للہ! اللہ کے قرآن کے اندر کسی گمراہ اور بدعت والے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے، کیونکہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور حق باطل کو علیحدہ کرنے والا ہے۔ قرآن گمراہی کو مٹانے والا ہے، اس کے اندر کوئی تناقض اور اختلاف نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۰، الفاتحۃ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

فاتحہ کے بعد آمین:

کوئی مسلمان سورۂ فاتحہ کو پڑھے تو مستحب ہے کہ اس کے آخر میں آمین پڑھے۔ اور اس کا معنی ہے "اَللّٰهُمَّ اسْتَجِبْ" اے اللہ! ہماری دعا قبول فرما۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۱، الفاتحۃ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِينَ...]

فاتحہ کے بعد آمین کہنا مستحب ہے:

حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! اتنا جلدی آمین نہ کہیں کہ ہم آمین نہ کہہ سکیں۔ یعنی آپ ایسا آمین کہیں کہ ہم بھی آپ کے ساتھ مل جائیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا منظور ہوگی تو ہماری دعا بھی منظور ہو جائے گی۔ [سنن أبی داود، حدیث: ۹۳۷، باب: التأمین وراء الإمام]

حضرت حسن رحمہ اللہ اور حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ اس کو "آمّین" پڑھتے تھے کہ میم پر تشدید پڑھتے تھے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۱، الفاتحۃ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

آمین کہنے میں فرشتوں کی موافقت:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے اصحاب کہتے ہیں کہ آمین کہنا اس کے لیے مستحب ہے جو نماز سے خارج ہو۔ اگر خود نماز پڑھے تو اس کے لیے تاکید ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا: جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو، تاکہ اگر اس کی آمین ملائکہ کی آمین کے ساتھ مل گئی تو اللہ تعالیٰ اس کے پہلے گناہ معاف فرما دیتے ہیں۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۷۸۰، باب: التأمین]

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۱، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

جب تم نماز میں آمین کہتے ہو تو آسمان میں ملائکہ بھی کہتے ہیں آمین۔ اگر تمہاری آمین ملائکہ کی آمین کے ساتھ مل گئی تو تمہاری دعا منظور ہو جائے گی۔

آمین مل جانے کا مطلب کیا ہے:

بعض نے کہا: فرشتوں کے ساتھ آمین ملنے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے بھی آمین کہا اور انہوں نے بھی کہا دونوں کی آمین ایک وقت میں مل گئی۔ بعض نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے وہ اخلاص کے ساتھ کہتے ہیں، اگر تم نے بھی اسی طرح اخلاص کے ساتھ کہا تو تمہاری آمین کے ساتھ فرشتوں کی آمین مل گی۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۱، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

آمین کا معنیٰ:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا: یا رسول اللہ! آمین کا معنیٰ کیا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: "رَبِّ افْعَلْ" کہ یا اللہ! جو ہم نے مانگا ہے وہ ہمیں عطا فرما دے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے فرمایا: آمین کا معنیٰ یہ ہے کہ یا اللہ! اسی طرح کر جس طرح ہم دعا کر رہے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا: اس کا معنیٰ یہ ہے کہ یا اللہ! ہماری دعاؤں کو نامراد نہ کرنا، ہمیں خالی نہ لوٹانا۔ اور اکثر علماء نے فرمایا: اس کا معنیٰ ہے "اَللّٰهُمَّ اسْتَجِبْ لَنَا" یا اللہ! ہماری دعا کو منظور فرما۔

بہرحال! اس کے اندر کوئی شبہ نہیں ہے کہ آدمی پر مستحب ہے کہ آمین کہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۱، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھے:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ خود شافعی المسلک ہیں، لیکن انہوں نے بھی "یُسْتَحَبُّ" فرمایا کہ مستحب ہے۔ چونکہ شافعی المسلک ہیں، اس لیے آمین کو زور سے کہنے کی حدیث کو ثابت کر رہے ہیں، لیکن ان کو یہ خیال نہیں ہے کہ اس سے مسئلۂ سورۂ فاتحہ کے بارے میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ثابت ہو رہا ہے۔ صحیح بخاری شریف کے اندر حدیث آگئی۔ فرمایا:

((إِذَا قَالَ الْإِمَامُ: ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ﴾ فَقُوْلُوْا: آمِيْنَ))

"جب امام ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ﴾ کہے تو تمہارا وظیفہ یہ ہے کہ تم آمین کہو۔" [صحیح البخاری، حدیث: ۷۸۲، باب: جَهْرِ الْمَأْمُوْمِ بِالتَّأْمِيْنِ]

تو ہمارے ذمہ آمین کہنا ہے، ہمارے ذمہ فاتحہ پڑھنا نہیں ہے، ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ جب امام سورۂ فاتحہ پڑھے تو تم بھی فاتحہ پڑھو۔

آمین آہستہ کہو:

جیسے حدیث میں ہے کہ جب مؤذن اذان دے تو جیسے وہ کہے ویسے تم بھی کہو۔ آمین کا معنی آپ نے پڑھا کہ اے اللہ! ہماری دعا کو قبول فرما، ہماری دعا کو نامراد نہ کرنا۔

اب ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا اتنا قصور ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ آمین آہستہ آواز سے کہو۔ حالانکہ قرآن کے اندر بھی آہستہ آواز سے دعا مانگنے کا حکم ہے۔ فرمایا:

﴿أُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾ [الاعراف: ۵۵]

"تم اپنے پروردگار کو عاجزی کے ساتھ چپکے چپکے پکارا کرو۔"

کیونکہ تم ایسے خدا سے مانگ رہے ہو جو آہستہ سے بھی سننے والا ہے۔ اس لیے زور لگانے کی ضرورت نہیں۔ ابتداء میں چونکہ شوکتِ اسلام کو ظاہر کرنا مقصود تھا، اس لیے آمین اونچی کہی جاتی تھی۔

حضرت بلال بن یسار رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آمین اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ لیکن یہ حدیث مرفوع نہیں ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام آمین نہ کہے، کیونکہ اس کے ذمہ یہ ہے کہ وہ ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ پڑھے گا اور آمین کہنے کا حکم مقتدی کو ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ بھی یہ حکم حدیث سے لے رہے ہیں۔ ویسے ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ ''إِذَا أَمَّنَ الْإِمَامُ فَأَمِّنُوْا''۞ (جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو)۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جب امام آمین کہنا بھول جائے تو مقتدی زور سے آمین کہیں۔ امام کو یاد دلا دیں کہ آپ بھول رہے ہیں اور اگر امام زور سے آمین کہہ دے تو مناسب یہ ہے کہ مقتدی نہ کہے، کیونکہ امام کا کہنا سب کی طرف سے کافی ہے۔ اور یہی مذہب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے اور یہی روایت امام مالک رحمہ اللہ سے بھی ہے کہ یہ ذکر ہے اور جیسے نماز کے اندر جتنے ذکر ہیں وہ خاموشی سے کیے جاتے ہیں، کوئی زور سے ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ'' اور ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى'' نہیں کہتا۔ تو آمین بھی ذکر ہے اس لیے اس کو آہستہ آواز سے کہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ زور سے کہے اور دوسرا قول امام مالک رحمہ اللہ والا ہے کہ بالکل نہ کہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر مسجد چھوٹی ہو تو زور سے آمین نہ کہیں، کیونکہ جو امام کا قرآن سن رہے ہیں وہ کافی ہے۔ اگر مسجد بڑی ہے تو زور سے کہیں، تاکہ پیچھے والوں کو بھی پتا لگے کہ ہم نماز میں کہاں تک پہنچے ہیں۔ اور یہی بات امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بھی فرماتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۱، الفاتحۃ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

یہودیوں کا مسلمانوں سے بغض:

حضور ﷺ نے فرمایا: یہود ہم سے تین وجہ سے حسد کرتے ہیں:

- ...... ایک جمعہ کی وجہ سے کہ اللہ نے مسلمانوں کو جمعہ کا دن عطا فرمایا اور وہ اس سے محروم ہیں۔
- ...... دوسری وجہ یہ مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ ہے۔
- ...... اور تیسری بات کہ ہمیں امام کے پیچھے آمین کہنا ملا ہے۔ [مسند احمد بن حنبل رحمہ اللہ، حدیث: ۲۵۰۲۹]

ایک حدیث پاک میں ہے کہ یہود تم پر دو وجہ سے بغض رکھتے ہیں: ایک آمین اور دوسرا اسلام کی وجہ سے۔ [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۸۵۶، باب: الجهر بآمين]

۞ ..... [الصحیح البخاری، رقم: ۷۸۰]

آمین اس امت کی خصوصیت ہے:

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ نے مجھے آمین نماز میں بھی عطا فرمائی اور دعا میں بھی عطا فرمائی ہے۔ مجھ سے پہلے یہ کلمہ کسی کو نہیں ملا۔

امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے کے دلائل:

ہاں! جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہتے رہے تو ان کی دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا﴾ [یونس:۸۹]

''تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی ہے۔''

حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا مانگ رہے تھے اور حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہہ رہے تھے۔ لہٰذا جو آمین کہے گا تو وہ بھی دعا میں شریک ہو گیا۔ یعنی ایک نے فاتحہ پڑھی اور دوسرے نے آمین کہی تو دونوں برابر ہو گئے۔ اسی لیے علماء نے فرمایا ہے کہ مقتدی فاتحہ نہ پڑھے کہ جب وہ آمین کہے گا تو گویا اس نے فاتحہ پڑھ لی۔

اور حدیث پاک میں ہے کہ امام کا پڑھنا مقتدی کے پڑھنے کو کافی ہے۔ مقتدی کو پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

[سنن ابن ماجہ، حدیث:۸۵۰]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان ساری احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب امام جہری نمازوں کے اندر ہو تو مقتدی فاتحہ نہ پڑھیں اور چپ چاپ کھڑے رہیں، کیونکہ امام کا پڑھنا کافی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۱، ۳۲، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ]

نماز میں فاتحہ واجب ہے:

کوئی اور سورت آپ کو نہیں ملے گی جس کے بارے میں حکم ہو کہ ہر نماز میں پڑھی جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض ائمہ کے نزدیک مقتدی کو نہیں پڑھنی چاہیے اور بعض ائمہ کے نزدیک مقتدی کو پڑھنی چاہیے۔ جہری نماز میں بھی سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے اور سری نمازوں میں بھی سورت فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ نماز اہم عبادت ہے، نماز مومن کی معراج ہے اور نماز بندے اور رب کے درمیان ربط ہے۔ تو نماز میں فاتحہ پڑھنی ضروری ہے اور دوسری سورت تو

بدل سکتے ہیں، لیکن سورۂ فاتحہ نہیں بدل سکتے۔ یعنی اگر آپ نماز پڑھ رہے ہیں تو پہلی رکعت میں فاتحہ کے بعد کوئی سورت پڑھ لیں، دوسری رکعت میں کوئی دوسری سورت پڑھ لیں، تیسری رکعت میں کوئی اور سورت پڑھ لیں اور چوتھی رکعت میں کوئی اور سورت پڑھ لیں۔ قرآن مجید میں یہی حکم ہے۔ فرمایا:

﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ [المزمل:۲۰]

''تم لوگ جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جا سکے پڑھ لیا کرو۔''

جہاں سے آسانی ہو، لیکن فاتحہ کو نہیں بدل سکتے۔ آخر فاتحہ میں ضرور کوئی حکمت ہے کہ ہر مسلمان کو پابند بنا دیا کہ نماز میں فاتحہ پڑھیں، بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ افضل اور جامع دعا فاتحہ ہے۔

سورۂ فاتحہ کا اخلاق سے تعلق:

وہ علماء جن کا اللہ کے قرآن سے تعلق ہے۔ جن کو موتیوں کی پہچان ہے انہوں نے کہا کہ اللہ نے ہمیں اس میں اخلاق کی تعلیم دی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اس سورت میں اصلاحِ معاشرہ بھی ہے۔

پہلا سبق اور خلق اوّل یہ تھا کہ اللہ محمود ہے، وہ ہر صفتِ کمال و جمال سے متصف ہے اور ہر وہ صفت جو اس کی شان کے لائق نہ ہو، اس سے پاک ہے۔ یعنی ہر حال میں محمود ہے۔ تو اس سے ہمیں یہ سبق ملا تھا کہ ہم وہ کام کریں جس سے ہم اچھے اور محمود بنیں، برے نہ بنیں، کیونکہ ہمارا تعلق رب سے ہے، ہم ربانی ہیں، ہم مسلمان ہیں۔ تو ہمارے اخلاق کا بھی وہی عالم ہونا چاہیے، اگرچہ ہم رب کا مقابلہ اور تشابہ نہیں کر سکتے، لیکن اللہ کی صفات کو سمجھنا اور سمجھنا ہے کہ ہم نے ہر وہ کام کرنا ہے جو باعثِ مدح و تعریف ہو تو محمود بنیں گے۔ صاف ظاہر ہے جب محمود بنیں گے تو معاشرے کی خود بخود اصلاح ہو گی۔ تو اس طرح اس سورت کا اصلاحِ معاشرہ سے تعلق ہے۔

اللہ سب کو دیتا ہے:

دوسرا خلق ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ تھا۔ ''رَبُّ الْمُسْلِمِيْنَ''، ''رَبُّ الْمُتَّقِيْنَ'' یا ''رَبُّ الْمُؤْمِنِيْنَ'' نہیں فرمایا، بلکہ ''رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ'' فرمایا کہ سب مخلوق کا رب ہے۔ یعنی میرے رب کی ربوبیت عامہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ انسانوں کو رزق دیتا ہے، اسی طرح حیوانوں کو بھی رزق دیتا ہے اور پرندوں کو بھی رزق دیتا ہے۔ جیسے مسلمان کو رزق دیتا ہے تو کافر کو بھی رزق دیتا ہے، جیسے متقی کو رزق دیتا ہے تو فاسق اور فاجر کو بھی رزق دیتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ نمازی کو تو رزق ملے اور بے

نمازی کو رزق نہ ملے، کیونکہ وہ رب العلمین ہے اس کے ہاں سب مخلوق ہے۔ ہاں! آخرت میں انعام صرف مومنوں کے لیے ہے، لیکن دنیا میں سب کے لیے ہے۔ اسرائیلی روایات میں ایک واقعہ ہے۔

اسرائیلی روایات کے متعلق حضور ﷺ کا فرمان:

اسرائیلی روایات کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا: ''لَا نُصَدِّقُ وَلَا نُکَذِّبُ'' (نہ ہم تصدیق کریں گے اور نہ ہم تکذیب کریں گے۔) اس لیے اگر قرآن وحدیث کے مطابق ہیں تو لے لیں گے، ورنہ چھوڑ دیں گے۔

ایک اسرائیلی قصہ:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ! آپ رب العالمین ہیں، رزاق ہیں، ساری دنیا کو رزق دینے والے ہیں۔ اگر تھوڑی سی مہربانی فرما کر مجھے ایک بستی کا رزق دینے والا بنا دیں تو آپ کا بڑا احسان ہوگا۔ اللہ نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ اب اللہ نے تمام نعمتیں بھی مہیا فرما دیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ دیکھو! اس میں کتنے مرد، عورتیں، بچے، یتیم اور مسکین ہیں؟ کتنے روزگار اور کتنے بے روزگار ہیں؟ سارے کوائف بن گئے۔ اس کے بعد یہ بھی معلوم کرلیا کہ کون غنی ہے؟ اور کون غریب ہے؟ جو غنی ہے اس کو تو ضرورت نہیں ہے، لیکن جو بیوہ، مسکین، یتیم اور معذور ہے ان سے بھی پوچھ لیا کہ تم اپنا اپنا پسندیدہ لکھوا دو۔ تو ہر آدمی نے اپنی پسند لکھوا دی۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہر آدمی کو راشن بھجوا دیا۔ لوگ بڑے خوش کہ گھر میں بیٹھے بٹھائے راشن مل گیا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام رات کو گشت کے لیے نکلے تو آپ کو پتا چلا کہ ایک آدمی منشیات کا عادی ہے۔ نشہ پینے کے بعد وہ آؤٹ ہوجاتا ہے اور گھر کی چھت پر بیٹھ کر گالیاں دیتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام گزرے تو وہ اسی طرح شور کر رہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو بلایا اور سختی کے ساتھ ڈانٹا کہ خبردار! اگر تم نے پھر منشیات استعمال کیں اور ایسی حرکتیں کیں تو پھر تمہیں سزا ملے گی۔ اس آدمی نے کہا: اچھا جی! آئندہ نہیں کروں گا۔ لیکن ایسے لوگ باز نہیں آتے۔ وہ دوبارہ اسی طرح کرنے لگ گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شکایت ملی تو اس کو بلوایا اور منع کیا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر وہی کام کرنے لگ گیا۔ آخر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا کہ اس کا راشن پانی بند کردو۔

کئی دنوں کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام پھر گشت کے لیے نکلے کہ کسی کو تکلیف تو نہیں ہے؟ جب اس کے گھر کے قریب آئے تو دیکھا کہ وہ بڑا چیخ چیخ کر رو رہا ہے اور فریادیں کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کی آواز اور فریادوں کو سن کر

کھڑے ہو گئے۔ وہ کہہ رہا تھا: اے اللہ! معلوم ہوتا ہے کہ یہ رزق تو نے کسی اور کو دے دیا ہے، یہ نشہ تو میرے باپ دادا بھی کرتے تھے، لیکن ہمارا رزق تو کبھی بند نہیں ہوا تھا، اب رزق بند کر دیا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ تو نے رازق کسی انسان کو بنا دیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام گھبرا گئے۔

آگے آئے تو دیکھا کہ ایک بچہ رو رہا ہے، چیخ رہا ہے، ماں چپ کرانے کی کوشش کرتی ہے، لیکن بچہ چپ نہیں کر رہا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دروازہ کھٹکھٹایا اور پوچھا: بچہ کیوں رو رہا ہے؟ اس نے کہا: اے اللہ کے نبی! میں اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کر چکی ہوں، میرے سینے میں دودھ نہیں ہے اور بچہ دودھ مانگتا ہے اور کسی کا دودھ قبول نہیں کرتا۔ تو موسیٰ علیہ السلام آئے اور دو رکعت پڑھ کر سجدے میں گر گئے اور کہا: اے مولا! یہ صفتِ رزاقیت تیری ہی شان ہے، بندہ کسی کا رازق نہیں بن سکتا ہے۔ میں کھانا تو پہنچا دوں، لیکن سینے میں دودھ کون لائے گا؟ اور اگر میں غصے میں آ کر کسی گنہگار کا راشن بند کر دوں تو گنہگار کہاں جائیں گے؟ یہ صفتِ رزاقیت تجھے ہی زیبا ہے۔ اے اللہ! تو کسی کا رزق بڑھا رہا ہے یا کسی کا رزق گھٹا رہا ہے تو اس کے اندر تیری حکمتیں ہیں۔

اس خلقِ ثانی ”رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ“ سے ہمیں یہ سبق ملا کہ جس طرح تیرے رب کی ربوبیت سب کے لیے ہے، تیری ہمدردی بھی سب کے ساتھ ہو۔ چاہے فاسق فاجر ہے، ہندو ہے، سکھ ہے، تیرا کوئی بھی ہمسایہ ہے محتاج ہے تو اس کی مدد کر۔ ایک ہے محبتِ اسلامی وہ الگ بات ہے، لیکن بحیثیتِ انسان سب کے ساتھ مہربانی کرنی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ایک شرابی سے حسنِ سلوک:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں واقعہ لکھا ہے کہ ان کے گھر کے قریب ایک نشہ باز رہتا تھا۔ وہ رات کو بھنگ اور بوٹی وغیرہ پی کر بڑے بڑے لطیفے اور غزلیں پڑھا کرتا تھا اور جب غصہ میں آجاتا تو گالیاں بھی دیتا تھا۔ وہ ایک شعر عربی میں ہمیشہ پڑھتا تھا کہ اس علاقے کے لوگوں نے میری قدر نہیں کی اور اپنے ایک نوجوان کو ضائع کر دیا۔

ایک دن امام صاحب آئے اور پوچھا کہ ہمارا ایک ہمسایہ تھا، اس کی رات کو آواز نہیں آئی۔ پتا تو کریں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا؟ تو لوگوں نے کہا کہ اس نے نشہ پی کر کسی آدمی کو مارا تو پولیس والے اس کو پکڑ کر لے گئے۔ امام صاحب رحمہ اللہ اپنا درس موخر کر کے بہ نفسِ نفیس تھانہ میں تشریف لے گئے۔ تھانے والوں نے دیکھا کہ امام اعظم رحمہ اللہ اتنا بڑا آدمی ہے!! ان کا تھانے میں کیا کام ہے؟ عملے والے بھی سارے مسلمان تھے، امام صاحب کو جانتے تھے۔

انہوں نے پوچھا کہ حضرت! کیسے تشریف لائے؟ امام صاحب نے فرمایا: تم ہمارا ایک بندہ پکڑ کر لے آئے ہو۔ انہوں نے کہا: ہم آپ کا بندہ کیسے پکڑ سکتے ہیں؟ فرمایا: فلاں آدمی کو پکڑ کر لے آئے ہو۔ انہوں نے کہا کہ وہ تو نشئی آدمی ہے، نشہ پی کر لوگوں کو مارتا ہے، گالیاں دیتا ہے، بلکہ ہم نے سنا ہے کہ وہ آپ کو بھی گالیاں دیتا ہے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ وہ گالیاں دیتا ہے یا نہیں دیتا تم اس بات کو چھوڑو، وہ میرا ہمسایہ ہے۔ عرب کا محاورہ ہے کہ ہمسایہ ہمسایہ ہوتا ہے، چاہے ظالم بھی کیوں نہ ہو۔ تھانے والوں نے اس کو چھوڑا تو امام صاحب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: تم کہتے ہو کہ ہم نے تمہیں ضائع کر دیا، ہم تو تمہیں ضائع نہیں کیا، بلکہ تیرا خیال رکھا ہے۔ اس نے کہا: اگر خیال رکھا ہے تو پکا خیال رکھو اور مجھے ہمیشہ کے لیے مدرسہ میں رکھ لو۔ اگر امام صاحب میرے لیے چل کر آسکتے ہیں اور میں اب بھی گناہ کروں تو مجھ سے زیادہ بھی کوئی بدنصیب ہو سکتا ہے؟

امام احمد رحمہ اللہ کی ایک ڈاکو کے لیے دعا:

جیسے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اکثر اپنی دعاؤں میں فرماتے: "رَحِمَ اللّٰهُ أَبَا الْهَيْثَمِ" (اللہ ابو الہیثم پر رحم فرمائے)۔ یہ ابو الہیثم اس علاقہ کا سب سے بڑا ڈاکو تھا۔ کچھ دنوں تک لوگ چپ رہے، لیکن جب امام صاحب کی دعا متواتر جاری رہی تو لوگوں نے عرض کیا: حضرت! آپ وقت کے امام اور مقتداء ہیں، جب آپ دعا میں ایک ڈاکو کے لیے دعا کرتے ہیں تو لوگ عجیب محسوس کرتے ہیں کہ ایک دو دفعہ دعا کرتے، لیکن کسی کے لیے مستقل دعا کر رہے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی خاص ہمدردی ہے۔ امام صاحب نے فرمایا: ہاں مجھے اس سے ہمدردی ہے۔ کیونکہ جب مسئلہ خلق قرآن پر حکومت نے مجھے کوڑے مارے، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالیں اور جیل کی طرف لے گئے۔ حالانکہ زندگی بھر میں نے جیل نہیں دیکھی تھی اور کبھی تکلیفیں برداشت نہیں کی تھیں۔ تو جب میں جیل کے اندر داخل ہو رہا تھا تو دیکھا کہ ایک بڑا خوبصورت نوجوان ہے، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ہیں۔ پولیس کا ایک دستہ ساتھ ہے، لیکن وہ دبدبے اور غرور سے چلتے ہوئے آرہا ہے اور چہرے پر مسکراہٹ ہے۔ میں چونکہ پہلی دفعہ جیل جا رہا تھا اس لیے میرے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ جب وہ میرے قریب آیا تو اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور کہا:

"أَأَنْتَ أَحْمَدُ ابْنُ حَنْبَلٍ؟"

"کیا احمد بن حنبل تم ہو؟"

میں نے کہا: ہاں۔ تو وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور کہا: امام صاحب! میں ڈاکو ہوں، ڈاکے مارتا ہوں، لیکن پھر بھی کس طرح جیل میں جا رہا ہوں!! اور تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے جا رہے ہو اور کانپ رہے ہو؟ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کہتے تھے کہ مجھے اس کے اس کلام نے پہاڑ بنا دیا۔ پھر مجھے تکلیفیں دی گئیں، لیکن میں نے اُف نہیں کی۔ اس نے مجھے بہادری سکھائی تھی۔ اس لیے میں اس کے لیے رحمت کی دعا کر رہا ہوں۔

اللہ کی رحمت بے حد و بے انتہاء ہے۔ جب اس کی رحمت برستی ہے تو صرف انبیاء علیہم السلام، اولیاء رحمہم اللہ اور مسلمانوں کے گھر میں نہیں برستی، بلکہ سب پر برستی ہے۔ اس لیے ہمیں سبق ملتا ہے کہ ہر کسی سے ہمدردی اور مہربانی کا سلوک کریں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اگر گوشت تھوڑا ہے تو تم شوربہ تو بڑھا سکتے ہو۔ ہمسائے کے گھر میں دے دو گے تو وہ اس سے روٹی کھا لے گا۔[1]

آگے سبق ملا: ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ (مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔) کہ اللہ بھی ہر ایک پر رحمت کرتے ہیں، تم بھی اپنے اندر صفتِ رحمت کا جذبہ پیدا کرو۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا: ''لَا يَنْبَغِي لِلْمُؤْمِنِ أَنْ يَكُوْنَ لَعَّانًا'' (مومن کی یہ صفت ہی نہیں ہے کہ ایک دوسرے پر لعنت کرے)۔

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۰۱۹، باب: ما جاء في اللعن والطعن]

مرزائیوں کا درودِ لعنت:

مرزا غلام احمد قادیانی جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا جب غصہ میں آ کر ہمارے علماء کے خلاف کتاب لکھی۔ ان علماء کے نام لکھے جو اس سے مناظرہ اور تقابل کرتے تھے۔ اس کے بعد اس نے نیچے لعنت لعنت لکھنا شروع کیا۔ ایک ہزار دفعہ یہ لفظ کتاب پر لکھا ہے۔ اسی لیے ہمارے قاضی احسان صاحب مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ قادیانیوں کا جو درود ہزارہ ہے وہ لعنت لعنت ہے۔ مومن تو لعنت کرنے والا، فحش بکنے والا بن ہی نہیں سکتا۔ جس آدمی نے ایک ہزار دفعہ لعنت لکھی ہو وہ نبی کیسے بن گیا؟ وہ تو مسلمان اور مومن ہی نہیں بن سکتا۔

پورے دین کا خلاصہ دو چیزیں:

علمائے عرب نے فرمایا ہے کہ اگر پورے دین کا خلاصہ نکالا جائے تو دو چیزیں ہیں:

[1] [صحیح مسلم، حدیث: ۲۶۲۵، باب: الوصیۃ بالجار]

1 ......عَظَمَةُ الْخَالِقِ.

2 ......شَفَقَةٌ عَلَى الْخَلْقِ.

اللہ کی عظمت دل میں پیدا ہو جائے اور مخلوق پر شفقت دل میں پیدا ہو جائے۔ دیکھیں! خدا کی عظمت کہ آگر آپ کو وزیر اعظم کا یا گورنر کا خط ملے تو آپ کو پوری رات نیند نہیں آئے گی۔ بار بار اس کو کھول کر پڑھے گا کہ یار بادشاہ نے مجھے خط لکھا ہے۔ بادشاہ کی دل میں عظمت ہے۔

میرا اپنے عہدیدار دوستوں سے رویہ:

چند دن پہلے میرے پاس ایک آدمی آیا اور کہا کہ آپ کے پاس فلاں آدمی کا فون آیا ہے۔ میں نے کہا: یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جو ہمارے دوست ہیں، اس وقت یہ کچھ نہیں تھے اور پھر ہمیں نہ اس کے اقتدار سے کچھ لینا ہے اور نہ دینا ہے، بلکہ مجھے تو ایک بری مرض ہے کہ اگر میرا کوئی دوست اقتدار کی کرسی پر چڑھے تو میں اس کو ملنا چھوڑ دیتا ہوں۔ لوگ تو کہتے رہتے ہیں کہ ابھی تو اس سے کچھ لینے کا وقت ہے، اس وقت آپ اس کو ملتے ہی نہیں۔ میں کہتا ہوں: یہ میری کم عقلی سمجھ لیں، کمزوری سمجھ لیں یا نفسیاتی تاثر سمجھ لیں، میری طبیعت ہی نہیں مانتی۔

انگریزوں کے نزدیک پاکستانیوں کی نفسیات:

انگریز بڑا دانا دشمن ہے۔ اس نے کتابوں میں لکھا ہے کہ جب اس نے ہندوستان پر حکومت کی تو اس میں ایک تجزیہ کیا کہ یہ جو سندھ کے لوگ ہیں ان کو ذرا سختی سے دبا کر رکھو۔ اگر کام ہو تو گدھے بن جاتے ہیں اور جب کام نکل جائے تو پھر کسی کے باپ بھی نہیں بنتے۔ ان کی مٹی کے اندر یہ خاصیت ہے۔

اس لیے حضرت شاہ جی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ اللہ نے مجھے وہ سخن دیا ہے کہ اگر قرآن پڑھوں تو ستارے بھی زمین پر آجائیں، دریا کی موجوں کو قرآن سناتا تو ان کی روانی تھم جاتی، لیکن اللہ نے مجھے پنجاب میں پیدا کیا ہے کہ یہ ایسی مخلوق ہے جو ڈنڈے والے کے آگے بھاگتی ہے اور دولت والے کے پیچھے بھاگتی ہے۔ اور انگریز نے کہا: قبائلی پٹھان کو پیسے دو، ورنہ یہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ چونکہ پٹھان کی کمزوری پیسہ ہوتی ہے۔ بڑا تہجد گزار ہوگا، لیکن اسمگلنگ کرے گا، نشہ بیچے گا۔ بڑی داڑھی ہوگی، لیکن پیسے کے معاملہ میں لازمی کمزور ہوگا۔ یہ ایک فطری بات ہے۔

اور بلوچ قوم میں نہ پیسہ کام آئے گا، نہ یہ دبانے سے دبے گی اور نہ ہی جھکے گی۔ ان کو صرف ”خان صاحب“

کہہ دو، یہ اسی پر خوش رہیں گے۔ جب یہ آئیں تو کرسی سے کھڑے ہو جاؤ، ان کی گاڑی کا دروازہ کھولو۔ یہ انسان کے اندر کمزوریاں ہوتی ہیں۔ میرے قریبی دوست مجھے کہتے ہیں کہ جب آپ آتے ہیں تو وہ آفیسر آپ کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے کام نہیں کرتے۔ میں کہتا ہوں کہ میں کیا کروں کہ میری مجبوری ہے۔ کیونکہ جب ایک دوست اقتدار کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے تو میرا اس سے ملنے کو دل نہیں کرتا۔

انسان کی اصلاح کب ہوگی؟

بہرحال! کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اصلاح کب ہوگی؟ جب تم مہربانی اور انتہائی شفقت کرنے والے بن جاؤ گے تو پھر معاشرہ ٹھیک ہو جائے گا۔ سختی سے کبھی معاشرہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ آپ بیوی پر سختی کریں باغی ہو جائے گی، بچوں پر سختی کریں باغی ہو جائیں گے، بھائیوں پر سختی کریں باغی ہو جائیں، لیکن جب آپ ان پر شفقت اور مہربانی کریں گے تو یہ شفقت اور مہربانی ان کو ٹھیک کر دے گی۔ تو "الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" سے سبق ملا کہ اللہ کی عظمت اور مخلوق پر شفقت ہو۔

پانچ دفعہ اللہ کی طرف سے بلاوا آئے "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ"، "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" اور انسان نہ جائے تو اس کا مطلب ہوا کہ اللہ کی عظمت دل میں نہیں ہے۔ اگر وزیر اعظم بلوائے، پرائم منسٹر بلوائے تو رات کو بھی بھاگتے ہوئے جائیں گے، کیونکہ ان کی عظمت دل میں ہے، لیکن جب اللہ کا بلاوا آئے اور انسان نہ آئیں تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ اللہ کی عظمت ان کے دل میں نہیں ہے۔

شفقت علی الخلق:

شفقت علی الخلق کا معنی یہ ہے کہ آپ کسی کو تکلیف میں دیکھ ہی نہیں سکتے۔

ایک فاحشہ عورت کا واقعہ:

صحیح احادیث میں ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک فاحشہ عورت کہیں جا رہی تھی۔ اسے پیاس لگی تو قریب ایک کنواں تھا، لیکن اس کے اندر ڈول نہیں تھا۔ اس کو یہ سوجھا کہ میرے پاس جوتے ہیں، ان کو دوپٹہ کے ساتھ باندھ کر لٹکا دوں، تاکہ کچھ نہ کچھ تو پانی آئے گا اور جان بچ جائے گی۔ اس طرح اس نے پانی نکالا اور دیکھا کہ پاس ایک کتا تڑپ رہا ہے۔ تو اس نے وہ پانی اپنے منہ میں نہ ڈالا، بلکہ کتے کے منہ میں ڈال دیا تو کتا فوراً ہوش میں آ گیا، پھر اور

پانی ڈالا تو کتا اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کی جان بچ گئی۔ اس کے بعد اس فاحشہ عورت نے خود پانی پیا۔ تو اللہ نے فرمایا: تو نے میری مخلوق پر رحم کیا ہے، میں نے تم پر رحم کیا اور تیرے گناہ معاف کر دیے۔ [مسند البزار، حدیث: ۸۷۲۵]

ایک بلی پر ظلم کی وجہ سے جہنم کا فیصلہ:

حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے جہنم کے اندر ایک عورت دکھائی گئی کہ اس نے ایک بلی کو رسی سے باندھ دیا تھا۔ نہ اس کو چھوڑتی تھی کہ وہ چل پھر کر کھالے اور نہ اس کو پانی اور خوراک دیتی تھی۔ وہ تڑپتی تڑپتی مر گئی۔ اللہ نے اس بلی کی وجہ سے اس کو جہنم میں ڈال دیا۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۲۳۶۴، باب: فضل سقی الماء]

اگر آپ کے دل میں یہ بات آ جائے تو پھر معاشرہ کیسے بگڑے گا؟ اس لیے محاورہ ہے:

"اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ."

"انسان احسان کا غلام ہوتا ہے۔"

شریف انسان پر آپ احسان کر دیں وہ کبھی بھی نہیں بھولے گا۔ اس لیے مشہور ہے کہ جو برے ہوتے ہیں وہ بکرے بھی بھول جاتے ہیں اور شریف کو بوٹی بھی یاد رہتی ہے۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملا کہ تم احسان کرنا اور مہربانی کرنا سیکھو اور اپنی خواہشات کو دبا کر دوسرے پر شفقت کرو۔

حضرت بایزید بسطامی ؒ کا واقعہ:

حضرت بایزید بسطامی ؒ فرماتے ہیں: بلخ بخارٰی سے ایک نوجوان میرے پاس آیا۔ مجھے اس کے سامنے اس کی بات سے اتنی شرمندگی ہوئی کہ اتنی شرمندگی اور کسی کے سامنے نہیں ہوئی۔ اس سے میں نے پوچھا: کیسے آئے ہو؟ اس نے کہا: آپ کا نام سنا تو ملاقات کے لیے آیا ہوں۔ میں نے کہا: ٹھیک ہے، بیٹھ جاؤ۔ اس نے کہا: آپ لوگوں کا کیا حال ہے؟ کیسی گزر بسر ہو رہی ہے؟ میں نے کہا: اللہ کا شکر ہے اگر اللہ دیتے ہیں تو شکر کرتے ہیں، نہیں تو صبر کرتے ہیں۔ وہ نوجوان ہنس پڑا۔ میں نے پوچھا: تم ہنستے کیوں ہو؟ اس نے کہا: ہمارے علاقے میں جانوروں کا بھی یہی حال ہے۔ چارہ ڈال دو تو کھا لیتے ہیں، نہیں تو بھاگتے نہیں ہیں۔ حضرت بایزید بسطامی ؒ فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا: تمہارے علاقے کے بزرگوں کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا: اگر مل جائے تو دوسرے کو دے دیتے

ہیں اور اگر نہ ملے تو شکر کرتے ہیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی دعوت کا واقعہ:

صحیح احادیث میں روایت موجود ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ اپنے گھر آ کر پوچھتے ہیں کہ تمہارے پاس کچھ ہے؟ تو بیوی نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے آٹا بھی ہے، گوشت بھی ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کتنے آدمیوں کو کافی ہو جائے گا؟ اس نے کہا: چار یا پانچ آدمیوں کو کافی ہو جائے گا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر بھوک کا اثر دیکھا ہے۔ بیوی نے کہا: جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دے دو کہ تین، چار آدمیوں کا کھانا ہے، آپ تین یا چار آدمیوں کو ساتھ لائیں، لیکن اس سے زیادہ نہ ہوں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر عرض کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا:

((هَلُمُّوا إِلَى دَعْوَةِ جَابِرٍ))

''سب کام چھوڑ کر سب لوگ جابر کی دعوت کی طرف چلو۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حیران اور پریشان تھا کہ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو بلا لیا ہے تو کھانا کیسے پورا ہوگا؟ میں دوڑا دوڑا گھر آیا اور بیوی کو بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب صحابہ کو بلا کر لا رہے ہیں۔ بیوی نے پوچھا: کیا تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا تھا؟ میں نے کہا: ہاں! بتا دیا تھا۔ تو اس نے کہا: پھر اللہ جانے اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جانیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی شدت جوع کے باوجود اکیلا کھانا پسند نہیں فرمایا اور سب کو بلا لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ تھا کہ سب نے پیٹ بھر کر کھانا کھالیا۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۴۱۰۱، باب: غَزْوَةِ الْخَنْدَقِ وَهِيَ الْأَحْزَابُ]

دودھ کا ایک پیالہ ستر صحابہ کو کافی ہو گیا:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شدتِ جوع اور بھوک سے یہ عالم تھا کہ میں بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا اور میرا ضمیر بھی گوارا نہیں کرتا تھا کہ کسی کو کہوں کہ مجھے بھوک ہے اور مجھے کھانا کھلائیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ گزرے تو میں نے ایک بہانہ کیا کہ حضرت! میں نے آپ سے ایک مسئلہ پوچھنا ہے۔ فرمایا: کیا ہے؟ میں نے پوچھا، انہوں نے بتایا اور چلے گئے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا مقصد تو یہ تھا کہ میری حالت کو دیکھ کر سمجھ جائیں گے کہ بھوکا

ہے، کھانا کھلا دیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی گزر گئے، حضور ﷺ گزرے اور میں نے مسئلہ پوچھا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ مسئلے کا مجھے علم ہے، تم میرے ساتھ آجاؤ۔ حضور ﷺ مجھے اپنے گھر لے گئے تو وہاں ایک دودھ کا پیالہ رکھا تھا۔ فرمایا: اے ابوہریرہ! سارے اصحابِ صفہ کو بلا کر لے آؤ۔ اللہ کے نبی ﷺ کا حکم تھا، میں کیسے انکار کرسکتا تھا؟ اصحابِ صفہ کبھی ساٹھ (۶۰) ہوتے اور کبھی ستر (۷۰) ہوتے تھے۔ میں ان سب کو بلا کر لے آیا۔ حضور ﷺ نے وہ پیالہ مجھے پکڑا دیا اور فرمایا کہ دائیں ہاتھ سے پلانا شروع کرو۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی صحابی دودھ کو منہ لگاتا تو میں دیکھتا کہ دودھ تو ابھی گیا، پھر میرا کیا بنے گا؟ پہلے ایک نے دودھ پیا، پھر دوسرے اور پھر تیسرے نے پیا۔ اس طرح سارے اصحابِ صفہ نے پی لیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: "یَا أَبَا هُرَيْرَةَ!" اے ابوہریرہ! اب تم بھی پی لو۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۶۴۵۲، باب: كَيْفَ كَانَ عَيْشُ النَّبِيِّ ﷺ ...]

اس میں بھی حضور ﷺ نے سبق دیا کہ صرف ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو دودھ نہیں دیا، بلکہ فرمایا: سب اصحابِ صفہ کو لے آؤ۔ جب سب سارے آگئے تب بھی فرمایا: پہلے دوسروں کو پلاؤ پھر خود پینا۔ یہ اسلامی تعلیمات ہیں، لیکن افسوس! آج ہم نے اسلام کو بدنام کردیا ہے، آج ہم نے اپنے اعمال اور اخلاق میں وہ بلندی ختم کردی ہے۔

عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کی شفقت سے بھنگی مسلمان ہوگیا:

پرانے دور میں فلش نہیں ہوتے تھے، باہر گلی میں چھوٹی نالیوں کے اندر لوگ گندگی ڈال دیتے تھے۔ صبح کو جمعدار آتے اور ان کے پاس پانی کے مشکیزے ہوتے تھے۔ وہ پانی ڈالتے تھے اور اس گندگی کو بہادیتے تھے۔

حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمہ اللہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے لیے ناشتہ آیا ہوا تھا تو ایک جمعدار..... جس کو لوگ بھنگی بھی کہتے ہیں...... وہ صفائی کررہا تھا۔ شاہ جی رحمہ اللہ نے اس کو بلایا اور فرمایا: جھاڑو پھینک دو اور ہاتھ دھولو۔ اس نے کہا: حضرت! کیا کررہے ہیں؟ میں جمعدار ہوں اور ادھر امیر شریعت ہیں، جن کے بیان میں اللہ نے جادو رکھ دیا تھا۔ اور حضور ﷺ کے فرمان ((إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا))° کا عملی نمونہ تھے، جن کے پاس پانچ پانچ اور دس لاکھ کا مجمع ہوتا تھا، عشاء کے بعد تقریر شروع کرتے اور صبح تک تقریر کرتے رہتے تھے اور مجمع بھی بیٹھا رہتا تھا۔ جب شاہ جی رحمہ اللہ نے اس کو اپنے ساتھ کھانے کے لیے بٹھایا تو وہ بے چارہ پریشان ہو۔ وہ بھی تصور

° [صحیح البخاری، رقم: ۵۱۴۶]

بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اتنا بڑا آدمی اسے اپنے ساتھ بٹھائے گا۔ حضرت شاہ جی ﷫ اس کے آگے کھانا رکھ رہے ہیں اور اس کو بھائی بھائی کہہ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں اور کچھ لوگ ناک بھوں چڑھا رہے ہیں۔ یہ سید ہیں، آلِ رسول ہیں، اتنے بڑے ہیں اور بھنگی کو ساتھ بٹھایا ہوا ہے۔ جب اس نے روٹی کھالی تو فرمایا: اب تم جا کر اپنا کام کرو۔ وہ چلا گیا۔ جب دوسرے دن جلسہ ختم ہوگیا اور شاہ جی تانگے پر بیٹھ کر سڑک پر آئے۔ لوگ الوداع کر رہے ہیں تو وہ بندہ بھی ایک کنارے کے ساتھ کھڑا ہے۔ جب موقع ملا تو آگے آیا اور کہا: شاہ جی! مجھے اسلام سمجھ آ گیا ہے۔ میں اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لایا ہوں، آپ ہمیں کلمہ پڑھا دیں۔ لاکھ تقریریں کرو، لیکن کسی کو اس طرح اسلام سمجھ نہیں آتا۔

اس لیے اللہ ہمیں سورۂ فاتحہ میں یہی سبق دے رہے ہیں کہ ہمارے اندر شفقت علی الخلق پیدا ہو جائے اور اللہ کی مخلوق سے محبت ہو جائے۔ اس لیے علماء فرماتے ہیں: گناہ سے نفرت کرو، لیکن گنہگار سے نفرت نہ کرو۔ وہ تمہاری شفقت اور ہمدردی کا محتاج ہے۔

کسی پر ظلم مت کرو:

آگے فرمایا:

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ [الفاتحہ: ۳]

''جو روزِ جزا کا مالک ہے۔''

''يَوْمِ الدِّيْنِ'' سے مراد ''جزاءُ يَوْمِ الدِّيْنِ'' ہے کہ بدلے کے دن اور قیامت کے دن اتنا عدل وانصاف ہوگا کہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ﴾ [النساء: ۴۰]

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہ کریں گے۔''

اللہ ظلم سے پاک ہے۔ تو ہمیں سبق ملتا ہے کہ اگر تم میرے ماننے والے ہو تو عدل کرو، کسی کے اوپر ظلم نہ کرو۔ اگر ہم نے تمہیں جج بنایا تو صحیح فیصلہ کرو۔ ہم نے تمہیں عالم اور مولوی بنایا ہے تو صحیح فیصلہ کرو، کیونکہ ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' کے دربار میں تم نے جانا ہے۔ اور اس کی صفت عدل ہے، تم بھی انصاف کرو۔

دوسروں کا بھی خیال رکھو:

﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیرے ہی بندے ہیں) اس سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ اپنی بندگی اور عاجزی کا اعتراف کرو، اپنی تواضع کا اعتراف کرو۔ جب تم لوگوں کو سمجھ آجائے گا کہ تم بھی بندے ہو اور وہ بھی بندے ہیں تو معاشرے کی اصلاح خود بخود ہو جائے گی۔ لیکن اگر تیرے کتے بھی کیک کھاتے ہوں اور ہمسائے کے بچے بھوکے سوتے ہوں، تیرے کتوں کو تو دودھ ملتا ہو اور ہمسائے کے بچے کو ٹھنڈا پانی بھی نہ ملتا ہو اور کتوں کو بڑے اعلیٰ صابن سے نہلایا جاتا ہو اور غریب کے پاس نہانے کے لیے صابن بھی نہ ہو تو اصلاح معاشرہ کیسے ہوگا؟ اصلاح معاشرہ تو تب ہوگا جب تمہارے اندر عدل آئے گا، انصاف آئے گا اور شفقت آئے گی۔ جب تمہارے اندر تواضع آئے گی اور اپنے آپ کو بندہ سمجھو گے کہ میں بندہ ہوں، کمزور ہوں، میں عابد ہوں تُو معبود ہے، میں ساجد ہوں تو مسجود ہے، تو میرا خالق ہے میں تیری مخلوق ہوں اور تو میرا مالک ہے میں تیرا مملوک ہوں تو جب یہ تواضع پیدا ہوگی تو اس سے معاشرے کے اندر اصلاح آئے گی اور فساد نہیں ہوگا۔

عادت نہیں جاتی......حکایت:

حکایت ہے کہ راستے میں جو فقیر خیمے لگا کر بیٹھے رہتے ہیں اور پھر مانگتے رہتے ہیں۔ کبھی یہاں ہوتے ہیں اور کبھی وہاں ہوتے ہیں۔ ان کا کام صرف مانگنا ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے، فقیر ہیں، لیکن کچھ بھی ہو جائے آخر غیرت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ ایک فقیر کی بیوی کو کچھ بری عادتیں پڑ گئیں تو ایک دن اس نے اپنے بیوی کو بڑا سمجھایا کہ مجھے تیرے بارے میں شکایت ملی ہے کہ تم پٹڑی سے اتر چکی ہو اور تم فلاں بندے سے ملتی ہو، اس سے بات کرتی ہو اور فلاں سے بھی۔ میں کافی دنوں سے تمہارے کریکٹر پر نظر رکھ رہا ہوں۔ جب اس نے پیار سے بیٹھ کر سمجھایا تو اس کی بیوی بڑی سمجھدار تھی، اس نے کہا: آج ہم فیصلہ کرتے ہیں۔ اس نے کہا: کیا؟ عورت نے کہا: تم بھیک مانگنا چھوڑ دو، میں یہ برائی چھوڑ دیتی ہوں لیکن میں بھی مزدوری کروں گی، تم بھی مزدوری کرنا۔ مجھے سلائی کڑھائی کا کام آتا ہے، ہماری اولاد تو ہے نہیں، بس گزارا ہو جائے گا۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے، میں بھیک نہیں مانگوں گا۔ عورت نے کہا: آج کے بعد میں بھی گناہ نہیں کروں گی۔ جب چار دن گزرے تو اس مرد نے اپنے کندھے پر گٹھڑی اٹھائی، عورت نے پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟ اس نے کہا: میں تو اپنے پرانے دھندے پر جا رہا ہوں، اب تیری مرضی کہ گناہ کر یا نہ کر،

میں بھیک مانگنا نہیں چھوڑ سکتا۔ عورت نے کہا: جب تم یہ عادت نہیں چھوڑ سکتے تو صاف ظاہر ہے میں بھی اپنی عادت کو نہیں چھوڑ سکتی۔

جن لوگوں کو مانگنے کی عادت ہوتی ہے ان کی ساری زندگی مانگتے ہی گزرتی ہے۔ اور جس کو یقین ہو جاتا ہے کہ میرا اللہ ہی مجھے دے گا۔ جتنا دیتا ہے اس پر قناعت کرتا ہے۔ اور دعا مانگتا ہے:

"رَبِّ قَنِّعْنِيْ بِمَا رَزَقْتَنِيْ وَبَارِكْ لِيْ فِيْ مَا أَعْطَيْتَنِيْ"

"اے رب! جو کچھ آپ نے مجھے دیا ہے اس پر مجھے قناعت عطا فرما اور جو کچھ مجھے دیا ہے اس میں برکت عطا فرما۔"

ان کو پھر کسی کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

﴿الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ کی تفسیر:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ سے مراد علم و حکمت ہے۔ اگر صحیح علم نہیں ہوگا تو سیدھا راستہ کیسے ملے گا؟ انسان کی کامیابی تب ہوگی جب حکمت ہوگی۔ اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ علم دو قسم پر ہے: ایک دنیاوی علم ہے اور دوسرا دینی علم۔ دنیاوی علم سے جسم بنتا ہے، جان بنتی ہے اور مال بنتا ہے، لیکن دین کے علم سے روح کو ترقی ہوتی ہے، اللہ راضی ہوتا ہے۔ جب دین مل گیا تو دنیا اس کے تابع ہے، خود بخود اس کے پیچھے آئے گی۔ اس لیے ہمیں سبق ملا کہ علم و حکمت حاصل کریں، لیکن علم و حکمت بھی ان لوگوں کا ہو جو انعام والے اور ہدایت یافتہ تھے، ان لوگوں کی علم و حکمت نہ ہو جو گمراہ تھے۔ اس لیے فرمایا:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾

سورۂ فاتحہ میں سات اخلاق:

اللہ تعالیٰ نے ہمیں سورۂ فاتحہ کے اندر سات اخلاق سکھلائے اور ان سات اخلاق کو ہم اپنے اوپر لاگو کر لیں تو پورے معاشرے کی اصلاح ہو جائے، فساد اور بگاڑ ختم ہو جائیں گے۔ اس لیے قرآن میں ہے:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ

صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۳۵﴾

[حم السجدۃ: ۳۳،۳۴،۳۵]

''اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو (لوگوں کو) خدا کی طرف بلائے اور خود (بھی) نیک عمل کرے اور کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ اور نیکی بدی برابر نہیں ہوتی، (بلکہ ہر ایک کا اثر جدا ہے تو اب) آپ نیک برتاؤ سے (بدی کو) ٹال دیا کریں، پھر یکایک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جاوے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے۔ اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل (مزاج) ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہے۔''

برائی کو اچھائی سے روکنا اور گالی کے بدلے دعائیں دینا یہ ہر کسی کا کام نہیں ہے، نصیب والوں کو یہ بات ملتی ہے۔ جب بھی ہم سورۂ فاتحہ کی تلاوت کریں تو اس کی ساری صفات پر غور کریں۔ اس کے معبود ہونے پر غور کریں، اس کی ربوبیت عامہ پر غور کریں، اس کے عادل ہونے پر غور کریں اور اس کے ہدایت دینے والا، صراط مستقیم پر چلانے والا ہونے پر غور کریں گے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ صرف ہماری اصلاح ہی نہیں، بلکہ پورے عالم کی اصلاح ہوگی۔ کیونکہ حضور ﷺ سارے عالم کے نبی ہیں، صرف کسی عرب کے لیے، کسی قوم کے لیے، صرف کسی بستی کے لیے نہیں بھیجے گئے۔

سورۂ فاتحہ کی عرفانی تفسیر

اب ہم سورۂ فاتحہ کی تفسیر پڑھیں گے جس کو علماء اور اولیاء اللہ کی اصطلاح میں تفسیر عرفانی کہتے ہیں۔ اولیاء اللہ جن کا تعلق تصوف سے ہے۔ (جس پر علامہ ابن قیم رحمہ اللہ اور علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے سیر حاصل بحث کی ہے) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جیسے پہلے لکھا تھا کہ اصل قوت غضبیہ اور عقلیہ میں اعتدال ہے۔ اگر افراط اور تفریط ہوگی تو ہم راستے سے ہٹ جائیں گے۔

اسی طرح تصوف ہے۔ اگر وہ اللہ کے فرمان کے مطابق تزکیہ باطن ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ہو۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے احسان کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ))

''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت (اس خشوع اور خلوص سے) کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر (یہ حالت حاصل) نہ ہو کہ تم اس کو دیکھتے ہو تو (یہ خیال رہے کہ) وہ تمہیں دیکھتا ہے۔''

[صحیح البخاری، رقم: ۵۰، باب سُؤَالِ جِبْرِيلَ النَّبِيَّ ﷺ عَنِ الإِيمَانِ...]

تو وہ تصوف اگر قرآن وسنت کے مطابق ہے تو ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں، اولیاء اللہ کا اکرام کرتے ہیں اور اولیاء کے بارے میں وہی عقیدہ رکھتے ہیں جو اللہ کے قرآن میں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان میں ہے:

﴿أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [یونس: ۶۲]

''یاد رکھو کہ جو اللہ کے دوست ہیں ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

ولی وہ ہوتا ہے:

﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ﴾ [یونس: ۶۳]

"یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیے رہے۔"

یہ جو افراط و تفریط آ گیا ہے کہ بعض لوگوں نے اس کو فرقہ باطنیہ کے تابع کر دیا۔ اور بعض لوگوں نے شریعت کو صرف اتنی اہمیت دی جیسے پھل کے اوپر کا چھلکا ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا: اصل بات تو وہ ہے جو اندر ہے۔ یہ مولوی شریعت کی بات کرتے ہیں، ان کو طریقت کا کیا پتا ہے؟ انہوں نے طریقت اور شریعت کو تقابل میں کھڑا کر دیا، اس لیے یہ تو خلاف قرآن و سنت ہے۔

کتاب اللہ اور رجال اللہ:

اسی سورۂ فاتحہ سے ہمیں ایک سبق ملتا ہے کہ کیسے لوگ بھٹک گئے؟ اور افراط و تفریط میں پڑ گئے۔ بعض لوگوں نے کتاب اللہ کو تو اپنایا کہ ہمارا اللہ پر، اس کے رسول ﷺ پر اور اس کی کتاب پر ایمان ہے، لیکن رجال اللہ کا انکار کر دیا کہ بس کتاب اللہ ہے، ہمیں رجال اللہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور بعض لوگوں نے رجال اللہ کے ساتھ تو تعلق رکھ لیا، لیکن کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔ تو یہ دونوں افراط و تفریط میں پڑ گئے۔

اعتدال یہ ہے کہ ہم رجال اللہ کو بھی پکڑیں، کیونکہ اللہ نے قرآن میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ [التوبہ: ۱۱۹]

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو۔"

اور ہم کتاب اللہ کو بھی لیں گے کہ "حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ"[1] (ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے۔) اور رجال اللہ کو کتاب اللہ کی روشنی میں دیکھیں گے۔

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کی کرامت معنوی:

جیسے ایک واقعہ ہے کہ ایک آدمی حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کی خدمت میں گئے۔ اور پانچ دن رہ کر آئے اور کہا کہ مجھے اجازت دیں۔ انہوں نے پوچھا کہ کیسے آئے تھے؟ اور کیوں جا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ میں نے سنا تھا کہ آپ بڑے شیخ ہیں، دل چاہا کہ آپ کی بیعت ہو جاؤں اور مرید بن جاؤں۔ اب میرا مرید ہونے کو دل نہیں کرتا،

---

[1] [البخاری، حدیث: ۴۴۳۲، باب: مرض النبی ﷺ ووفاتہ]

کیونکہ میں اتنے دن رہا ہوں اور میں نے آپ کی نہ کوئی کرامت دیکھی اور نہ کوئی بزرگی دیکھی۔ فرمایا: ٹھیک ہے بھائی! بس ایک بات بتاؤ اگرچہ بیعت نہ ہو، ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے کہ تم اتنے دن ہمارے لنگر میں رہے ہو، اتنے عرصہ میں تم نے ہمارا کوئی قول یا فعل خلافِ سنت بھی دیکھا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ حضرت نے فرمایا: فقیر کی تو یہی کرامت ہے۔ ہمارے پاس اور کوئی کرامت نہیں ہے۔ [خطبات حکیم الامت: ۲/۱۳۶، ۱۳۷]

تو ہم نے بھی رجال اللہ کو دیکھنا ہے کہ اس کا ہر عمل کتاب وسنت کے مطابق ہے تو وہ ولی اللہ ہے، ضروری نہیں کہ کوئی کرامت ظاہر ہو۔ اور اگر ایک آدمی پانی پر چل رہا ہے، آگ میں چل رہا ہے، ہوا میں اڑ رہا ہے اور حاضرات کے علوم جانتا ہے، لیکن اس کا عمل کتاب وسنت کے مطابق نہیں ہے۔ وہ ہمیں لاکھ خارقِ عادت باتیں دکھائے ہم اس کو دجال تو کہیں گے، لیکن ولی اللہ نہیں کہیں گے۔

نجومیوں وغیرہ کی تصدیق کرنا:

آج کل لوگوں نے علم نجوم، علم جفر اور علم اعداد اور ہاتھوں کی لکیروں سے ایسے چیزیں حاصل کر رکھی ہیں کہ لوگوں کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ حالانکہ حضور ﷺ کی حدیث مبارک ہے:

((مَنْ أَتَى عَرَّافاً أَوْ كَاهِناً فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُوْلُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلَى مُحَمَّدٍ ﷺ))

''جو شخص کسی کاہن یا نجومی کے پاس جائے اور اس کی باتوں کی تصدیق کرے تو گویا اس نے محمد ﷺ پر نازل ہونے والی شریعت سے کفر (انکار) کیا۔'' [المستدرک علی الصحیحین للحاکم، حدیث: ۱۵]

اس لیے یاد رکھیں! اصل چیز اتباعِ سنت ہے، وگرنہ شعبدے تو ہر کوئی دکھا سکتا ہے۔ بعض لوگوں نے ایسے چکر بنائے ہوئے ہیں کہ اللہ بچائے۔

ایک پیر صاحب تھے...... پتا نہیں کہ اب وہ زندہ ہیں یا مر گئے ہیں...... انہوں نے اپنے خلفاء کو سمجھایا ہوا تھا کہ جو لوگ صبح میرے پاس آئیں ان کی لسٹ بناؤ اور دیکھو کتنے ہیں جن کی اولاد نہیں، کتنے ہیں جو خود بیمار ہیں اور کتنے ہیں جن کا بچہ بیمار ہے اور نوکری ڈھونڈنے والے کتنے ہیں؟ اور ان کو سمجھا رکھا تھا کہ اگر اولاد والے ہوں تو ان کو فلاں گیٹ سے بھیجنا۔ اور جو بیماری والے ہوں ان کو دو نمبر گیٹ سے بھیجنا۔ اب جوں ہی آدمی ایک گیٹ سے آتا تو وہ کہتا: اچھا تم بچہ مانگنے آگئے ہو۔ وہ آکر پاؤں پڑ جاتا کہ حضرت کو تو پتا چل گیا ہے کہ میں تو بیٹے کے لیے آیا ہوں۔

تو وہ کہتا ہے کہ اب تو میں آپ کا دروازہ نہیں چھوڑتا۔ حالانکہ سب فراڈ ہے۔

طاہر القادری کا لطیفہ:

آپ حیران ہوں گے کہ ایک آدمی بہت تعلیم یافتہ ہے، میرا ملنے والا ہے، اس نے کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اس نے اپنی تقریر میں خواب بیان کیا کہ میرے پاس حضور ﷺ تشریف لائے تو آپ ان علاقے والوں پر یعنی پاکستان، ہندوستان والوں پر ناراض تھے۔ میں روتا رہا اور منتیں کرتا رہا۔ بڑی مشکل سے حضور ﷺ راضی ہوئے اور فرمایا: اب اگر میں آؤں گا تو صرف تمہارے ادارے میں آؤں گا۔ میرے آنے جانے کی ٹکٹ کا انتظام تم کرو گے۔ لوگ اتنے جاہل ہیں کہ بہت سے لوگوں نے ٹکٹیں پیش کیں کہ حضور ﷺ اس ٹکٹ سے آجائیں۔ اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟

ایک لاکھ ریال مانگنے والے کا فراڈ:

یہاں مکہ مکرمہ کی بات ہے کہ ایک آدمی میرے پاس آیا اور کہا کہ آپ سے ملنا ہے اور بات کرنی ہے۔ میں نے کہا: فرمایئے! اس نے کہا: نہیں! علیحدگی میں بتاؤں گا۔ میں نے کہا: وہاں علیحدہ بیٹھ جاتے ہیں اور کیا علیحدگی ہوگی؟ میں کوئی وی آئی پی لوگوں میں سے ہوں کہ ہمارے کوئی قاعدے اور ضابطے ہوں؟ بہر حال! وہ مجھے ملا اور کہا کہ مجھے خواب میں حضور ﷺ نے حکم دیا ہے کہ میں آپ کے پاس جاؤں اور آپ مجھے ایک لاکھ ریال دے دیں۔ میں نے کہا: ریال تو میں نے دینے ہیں، مجھے کیوں نہیں کہا؟ تمہیں کیوں کہا ہے؟ آپ ایسا کریں کہ پھر حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کریں کہ حضور ﷺ مجھے فرمائیں تو میں کپڑے بیچ کر بھی ایک لاکھ ریال دینے کے لیے تیار ہوں۔ وہ پھر واپس نہیں آیا۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ جھوٹا تھا۔

ایک ڈوبنے والے مولوی کا لطیفہ:

دوسری بات یہ ہے کہ مولوی کسی سے لے سکتا ہے، دے نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ تو قیامت کی علامت ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ایک مولوی ڈوب رہا تھا اور کنارے پر دیہاتی کھڑا تھا، اس نے کہا: مولوی صاحب! ہاتھ دیں، ہاتھ دیں۔ لیکن وہ ہاتھ نہیں دے رہا تھا۔ دوسرا عقل مند بندہ گزرا، اس نے کہا کہ کہو مولوی صاحب! ہاتھ لیں۔ مولوی ڈوب جائے گا، لیکن ہاتھ نہیں دے گا۔ اس نے کہا: مولوی صاحب! ہاتھ لیں۔ تو اس نے ہاتھ دے دیا۔ جس بندہ نے پیدا ہونے کے بعد لینا سیکھا ہو وہ دینے کو کیسے جانے گا؟

قل خوانی کا لطیفہ:

اس لیے میں ہمیشہ اپنے دوستوں کو کہتا ہوں کہ میری باتوں میں نہ آئیں اور دیانتداری سے بتائیں کہ جہاں جہاں آپ کا گھر ہے، کسی مولوی نے اپنے باپ کے مرنے کے بعد اپنے گھر قل خوانی پر بلوایا ہے؟ یا سات جمعراتیں کی ہیں؟ یا چالیسواں کیا ہے؟ کیونکہ اس کو پتا ہے کہ یہ حرام ہے تو وہ اپنے پیسے حرام کیوں کرے؟ تمہیں تو حکم دے گا، لیکن خود کبھی نہیں کرے گا۔

اولیاء کی تعریف قرآن سے:

اس لیے یادرکھیں! اولیاء کی تعریف قرآن نے خود بیان کردی ہے۔ فرمایا:

﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ﴾ [یونس: ۶۳]

"یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیے رہے۔"

جو ایمان والے اور اللہ سے ڈرنے والے ہیں، جن کے دلوں میں اللہ کی عظمت اور ہیبت ہے وہ اولیاء اللہ ہیں۔ جن کا ہر قدم سنت کے مطابق اٹھتا ہے، جن کے ایک ہاتھ میں کتاب اللہ ہوتی ہے اور دوسرے ہاتھ میں سنت رسول اللہ ﷺ ہوتی ہے۔ اس کے خلاف ہم کوئی بات سوچ ہی نہیں سکتے۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے راستے کو چھوڑ کر چلے گا وہ ولی اللہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ شیطان، دجال اور شعبدہ باز تو ہوسکتا ہے، لیکن اللہ کا ولی نہیں ہوسکتا۔

اولیاء کو ماننے میں اعتدال:

سورۂ فاتحہ نے ہمیں سبق دیا تھا:

﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾

"ان لوگوں کے راستے پر چلا جن پر تیرا انعام ہے۔"

اور وہ کون لوگ ہیں؟ وہ انبیاء کرام علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین رحمہم اللہ ہیں۔ جنہوں نے کتاب اللہ پر سختی کی اور رجال اللہ کو چھوڑ دیا وہ بھی پٹڑی سے اتر گئے اور جنہوں نے رجال اللہ کو سب کچھ سمجھ لیا اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا وہ بھی پٹڑی سے اتر گئے۔ اعتدال یہ ہے کہ کتاب اللہ پر بھی ایمان ہو، سنت رسول اللہ ﷺ پر بھی ایمان ہو اور اولیاء

اللہ پر بھی اعتماد ہو۔ لیکن ان کی ولایت کا امتحان کتاب وسنت کی روشنی میں ہوگا۔ اگر وہ کتاب وسنت پر عمل کر رہا ہے تو وہ اللہ کا ولی ہے، چاہے اس کے ہاتھ پر کرامت ظاہر ہو یا نہ ہو۔ کتنے بڑے اولیاء اللہ ہیں! ان کے ہاتھ پر کرامت ظاہر نہیں ہوئی۔

مولانا غلام محمد دین پوری ؒ نے کرامت کیوں نہ دکھائی؟

حضرت مولانا غلام محمد دین پوری ؒ جو بہت بڑے مجاہد اور اللہ والے تھے۔ والد صاحب اکثر ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے۔ انگریزوں نے انہیں قید کر لیا۔ (کیونکہ صاف ظاہر ہے جو مسلمان ہوگا، اللہ والا ہوگا وہ انگریز کا خیر خواہ تو نہیں ہوگا) انگریز انہیں دین پور سے سکھر تک کا سفر پیدل لے گئے جو تقریباً سو میل بنتا ہے۔ مقصد ان کو تکلیف پہنچانا تھا اور جب جیل میں لے گئے تو ان کو سی کلاس میں رکھا۔ والد صاحب فرماتے ہیں کہ ہماری ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کیا: حضرت! آپ بڑے شیخ ہیں، کچھ کریں۔ اگر حضرت تاج محمود امروٹی ؒ ہوتے تو کسی کرامت کا اظہار ہوتا۔ آپ کو پیدل لے گئے اور سی کلاس میں رکھا، آپ نے تو کوئی بزرگی نہیں دکھائی؟

حضرت امروٹی ؒ کی طبیعت میں بڑا جلال تھا۔ جلدی غصہ میں آجاتے اور اللہ سے دعا کرتے تو اللہ ان کی دعاؤں کو سچا بھی کر دیتا۔ اس لیے والد صاحب ؒ نے ان کا ذکر کیا کہ اگر وہ ہوتے تو وہ انگریزوں کے خلاف ضرور میدان میں آجاتے۔ فرمایا: فقیرو! ولی کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ خالی مٹکے کی طرح آوازیں نکالتا رہے، بلکہ اللہ کے فیصلے پر صابر اور راضی رہے۔ بعض لوگ جلدی میں آکر کچھ دکھا دیتے ہیں، وہ برتن خالی ہوتا ہے۔ برتن بھرا ہوا ہو تو آواز نہیں آتی۔ وہ اللہ کے فیصلے پر صابر وشاکر رہتا ہے کہ اگر اللہ کو یہی منظور تھا تو ہم بھی اسی پر راضی ہیں۔ اور کہنے لگے: تم اس بات پر کیوں غور نہیں کرتے کہ اس جیل میں جو عادی مجرم تھے اللہ نے ان کو نمازی بنا دیا اور کتنے لوگوں نے داڑھی رکھی اور کتنے لوگوں نے اسلام کی تعلیمات کو قبول کیا اور کتنے لوگوں کو رہائی ملی۔ اللہ نے شاید مجھے اسی کام کے لیے جیل میں رکھنا ہو۔ تو اللہ نے کام لے لیا۔

مولانا تاج محمود امروٹی ؒ کی کرامت:

حضرت امروٹی ؒ کے بارے میں سنا ہے کہ بہت بڑے موحد اور مجاہد تھے۔ ان کے لنگر میں ایک نوجوان رہتا تھا اور کام کرتا تھا۔ انگریز کا دور تھا۔ ہندو اور انگریز کی بڑی طاقت تھی۔ ایک ہندو بدبخت نے تقریر میں

حضور ﷺ کے خلاف نازیبا الفاظ کہے، گستاخی کی۔ یہ نوجوان وہاں گیا ہوا تھا، جذبات میں آیا اور اس کو مار دیا۔ ہندو پنڈت مر گیا۔ ان کی حکومت تھی۔ اس پر مقدمہ کرایا اور نوجوان کو قید کر دیا۔ خدا کی قدرت کہ وہ ماں باپ کا اکلوتا تھا اور اس کی ماں لنگر کی روٹی پکاتی تھی۔ وہ سندھ کے علاقے کی بوڑھی عورت تھی۔ ہر پانچ دس دن کے بعد جب حضرت نماز پڑھ کر نکلتے تو وہ حضرت کے بارے میں بڑی بے وقوفی کی باتیں نکالتی کہ آپ نے میرے بیٹے کو پھنسوایا ہے، آپ پیر بنے پھرتے ہو، آپ کو ان میں سے کوئی اور نہیں ملا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے: مجھے پتا نہیں کہ تمہارے بیٹے نے کیا کیا ہے؟ پھر میں نے تیرے بیٹے کو کیسے مروا دیا ہے؟ ہم نے وکیل کر رکھے ہیں۔ معاملہ چلتا رہا۔ اللہ کی قدرت اور شان ہے کہ وہ مقدمہ کورٹ سے بھی سزا ہو گیا، سیشن کورٹ سے بھی سزا ہو گیا اور پھر اس کی ہائی کورٹ میں اپیل ہو گئی۔ وہ بوڑھی روزانہ روتی کہ حضرت کچھ تو کریں۔ حضرت فرماتے کہ وکیل کھڑے کیے ہوئے ہیں، اپیلیں کرا رہے ہیں۔ وہ کہتی: نہیں آپ تو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ جا کر کوشش کریں۔

حضرت سکھر ہائی کورٹ تشریف لے گئے۔ اور جو اس کا لان تھا اس میں جا کر بیٹھ گئے۔ حضرت گھٹنوں پر کپڑا ڈال کر تسبیح پڑھتے رہتے تھے۔ ہندوؤں کے بڑے وکیل تھے اور اس نوجوان کی طرف سے عام سا وکیل تھا۔ بہر حال جب بحث ہو گئی تو اس ہائی کورٹ کے جج نے فیصلہ محفوظ کر لیا کہ آرام کے وقفہ کے بعد فیصلہ سنایا جائے گا۔ حضرت اور ان کے ساتھ تین چار اور آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ آدمی کی پگڑی ہو اور داڑھی ہو تو آدمی دور سے پہچانا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے وکلاء آئے کہ سنا ہے آج مسلمانوں کا پیر بھی آیا ہوا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ آج پیر صاحب کیا کرتے ہیں؟ طنز کرنے لگے کہ پیر صاحب اور زور کی تسبیح پڑھیں، تاکہ آج مرید کو جلدی سزائے موت ہو۔ حضرت نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا: میری فریاد عرش پر پہنچ گئی ہے۔ اتنی دیر میں فیصلہ ہوا کہ ملزم باعزت بری ہے۔ سارے وکیل جج کے پاس گئے کہ یہ کیسا فیصلہ کیا؟ جج نے کہا: مجھے پتا نہیں کہ کس طاقت نے یہ کرایا؟ اب میں یہ فیصلہ واپس نہیں لیتا، میں تو سزائے موت لکھ کر آیا تھا۔ اب جو فیصلہ سنایا ہے میں اس پر قائم ہوں۔

انگریز کا افسر اندھا ہو گیا:

حضرت مولانا تاج محمود امروٹی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ان کے علاقہ کی مسجد تھی، انگریز وہاں سے بہت بڑی نہر گزارنا چاہتے تھے۔ حضرت نے فرمایا: یہ مسجد نہیں ٹوٹے گی۔ انگریزوں نے کہا: ہم مسجد کو توڑیں گے، ہمیں

کیا ضرورت ہے کہ نہر کو اوپر سے لائیں؟ ہم آپ کو دوسری مسجد بنا دیں گے۔ حضرت امروٹی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: نہیں اللہ کا گھر نہیں ٹوٹے گا۔ (یہ تاریخی واقعہ ہے ابھی بھی وہ مسجد اس بڑی نہر کے درمیان میں کھڑی ہے) انگریزوں کا دور تھا۔ وہ کیسے برداشت کرتے؟ انہوں نے آرڈر جاری کیے کہ اس مسجد کو شہید کر دو اور جو راستے میں آئے اس کو بھی مار دو۔ تو اس علاقہ کا جو کلکٹر تھا اس نے کہا: پہلے ایک دفعہ بات کرنے دو۔ وہ کلکٹر آیا، حضرت ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے کہا: آپ اہلِ علم سیدھے سادھے لوگ ہیں، آپ کے یہ دو تین ہزار مرید ہیں، آپ ان کو کیوں مروانا چاہتے ہیں؟ ہم آپ کو متبادل کسی جگہ مسجد بنا دیں گے اور آپ اس کو ہماری کمزوری نہ سمجھیں کہ آپ کے پاس چل کے آئے ہیں۔ تو حضرت نے فرمایا: تمہارے پاس تو ایک فائر کرنے والی بندوق ہے، میرے پاس تو دس فائر کرنے والی طاقت ہے، تم میرے ساتھ لڑنے آئے ہو؟ اس نے کہا: آپ لڑیں گے کیسے؟ آپ نے فرمایا: اندھے ہو جاؤ تو اسی وقت اس کی دونوں آنکھیں ختم ہو گئیں۔ وہ پاؤں پڑ گیا کہ آپ مہربانی کریں، میں جانوں اور گورنمنٹ جانے۔ آپ کی مسجد نہیں گرے گی۔ آپ نے فرمایا: اچھا! اللہ سے دعا کروں گا کہ اللہ تیری آنکھیں واپس لوٹا دے۔

چوتھی چیز راستہ بھی ہو۔ اگر راستہ نہ ہو تو کس پر چلے گا؟ پانچویں چیز ہے کہ راستہ سے انحراف بھی نہ کرے۔ اگر راستہ سے انحراف کرے گا تو منزل پر کیسے پہنچے گا؟ اولیاء اللہ نے اس کو مثال سے سمجھا دیا کہ جس طرح انسانی جسم کے لیے ایک سیر ہے اور اس طرح کی ایک روحانی سیر اور سفر ہے کہ اس کا اللہ سے تعلق جڑ جائے۔ اس کو تو کوئی جانتا ہی نہیں، وہ تو امرِ ربی ہے کہ کیسے سفر کرتی ہے؟ اور کیسے منزل پر پہنچتی ہے؟

روحانی سیر کے درمیان چار حجاب:

اس کے بارے میں وہ ایک مثال دیتے ہیں کہ اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ یہ ہے کہ جو درمیان میں حجابات ہیں وہ ہٹ جائیں۔ جیسے ایک خیمہ ہے، آپ نے اس کے پردے گرا دیے تو اندھیرا ہو گیا، حالانکہ باہر سورج چمک رہا ہو۔ اگر آپ نے حجاب اٹھا دیے تو روشنی آنی شروع ہو گئی۔ اگر خیمے کے سارے حجاب اٹھا دیے تو پوری طرح سورج کی روشنی اندر آئے گی۔ اسی طرح انسان کی کیفیت ہے کہ جب تک حجاب نہیں ہٹتے اس وقت تک انسان کو بھی ذات و صفات کی روشنی نہیں ملتی، جیسا کہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ﴾[البقرۃ:۲۵۷]

''اللہ تعالیٰ ساتھی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے ان کو (کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر (یا بچا کر) نور (اسلام) کی طرف لاتا ہے۔''

وہ نورِ ایمان کی روشنی اس وقت ملے گی جب پردے ہٹیں گے۔

﴿اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰي نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ﴾[الزمر:۲۲]

''بھلا کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے، جس کے نتیجے میں وہ اپنے پروردگار کی عطا کی ہوئی روشنی میں آ چکا ہے، (سنگ دلوں کے برابر ہو سکتا ہے؟)''

جب ہمارے اوپر پردے ہیں تو وہ روشنی اندر کیسے آئے گی؟ وہ پردے اور حجابات مشہور چار ہیں۔

پہلا حجاب، غفلت:

ایک غفلت کا حجاب ہے، جو اللہ کی ذات وصفات کو نہیں سمجھتے۔ اسی لیے اللہ نے قرآن میں کافروں کی مثال دیتے ہوئے فرمایا:

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ١٧٩؁﴾[الاعراف:۱۷۹]

''جن کے دل ایسے ہیں جن سے نہیں سمجھتے اور جن کی آنکھیں ایسی ہیں جن سے نہیں دیکھتے اور جن کے کان ایسے ہیں جن سے نہیں سنتے۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ یہ لوگ زیادہ بے راہ ہیں۔ یہ لوگ غافل ہیں۔''

یہ حجاب غفلت ہے۔ جب انسان دنیا کے ناز ونعم میں پڑا ہوا ہے تو وہ دوسری طرف سے غافل ہے تو اس کو منزل کیسے ملے گی؟ نورِ ایمان کی روشنی کیسے ملی گی؟

دوسرا حجاب، جہل:

جہالت بھی بہت بڑا حجاب ہے۔ مثلاً: آپ سڑک پر جا رہے تھے۔ اس پر بہت ہی قیمتی ڈائمنڈ پڑا تھا، لیکن آپ کو اس کی پہچان نہیں تھی۔ تو آپ اس کو چھوڑ کر چلے جائیں گے کہ یہ تو پتھر کا ٹکڑا ہے؟ اگر آپ کو پتا ہوگا تو آپ اس کو حفاظت سے اٹھائیں گے، ڈاکوؤں سے بچائیں گے۔ جب جہالت کا پردہ ہٹے گا پھر آپ اس چیز کو حاصل کرنے کی

کوشش کریں گے۔

تیسرا حجاب، رسم:

جیسے شادی و بیاہ کی رسمیں، بچے کی پیدائش کی رسمیں، برتھ ڈے، بزرگوں کی برسی، شادی سالگرہ، نیو ایئر نائٹ، فلاں فلاں خوشی ہے۔ یہ ساری رسومات بھی پردہ ہیں۔ کیونکہ رسم کہتے ہیں قوانین مروجہ کو اور انسان قوانین الٰہیہ کے تابع ہے۔ جب ہم قوانین مروجہ میں الجھ گئے تو قوانین الٰہیہ سے خود بخود پردہ ہو جائے گا۔ آج بڑے سے بڑا نمازی ہو، صفِ اُولیٰ کے اندر نماز پڑھتا ہو، لیکن جب شادی کا موقع آ جائے تو وہ بھی رسموں میں پڑ جاتا ہے۔ وہ کہے گا: مولوی صاحب! ایک ہی بیٹا ہے، برادری نہیں مانتی۔ اب شریعت ختم ہو جائے گی۔ یہ جو حدیث پر چلنے والے ہیں چار چار لاکھ کا شادی گھر کرایہ پر لیتے ہیں، کیا یہ بھی حدیث میں حکم ہے؟ بلکہ بعض اوقات تو گانے والیاں بھی آتی ہیں۔

فیشن کا زمانہ اور رسم و رواج:

ایک اخبار میں پڑھ رہا تھا کہ دلہن کے میک اپ پر چار لاکھ لگائے گئے، لیکن دلہن پھر بھی مطمئن نہیں ہے، کیا یہ بھی سنت میں شامل ہے؟ تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی نعمتوں کا اظہار ہے۔ پھر جب کوئی دوسرا اظہار کرتا ہے تو کیوں چڑتے ہو؟ کیا قرآن و حدیث پر عمل صرف نماز اور روزے کے لیے ہے؟ کوئی ہے جو بتائے کہ حضور ﷺ نے پردے لٹکائے ہوں؟ ڈرائنگ روم میں کارپٹ بچھایا ہو؟ کیا یہ سنت کے مطابق ہے؟ ہم کہتے ہیں: یہ عمل سنت ہے، لیکن جب ہماری عورتوں کا مسئلہ آتا ہے تو سنتیں رہ جاتی ہیں۔ مثلاً: اگر آپ کا بیٹا یا بیٹی ہے، آپ چاہتے ہیں کہ میرے رشتہ داروں میں شادی ہو اور عورت چاہتی ہے اس کے رشتہ داروں میں ہو۔ شرط لگا لیں شادی وہاں ہوگی جہاں عورت چاہے گی۔ اگر وہاں شادی ہو گئی جہاں آپ چاہتے ہیں تو آپ کو جینے نہیں دے گی، نہ رشتہ داروں کو جینے دے گی اور نہ بہو کو جینے دے گی۔ کبھی سنیں گے کہ چولہا پھٹ گیا اور کبھی برنر کو بند کرنا بھول گئی تو آگ لگ گئی اور کبھی سنیں گے کہ چھت سے پاؤں پھسلا اور گر گئی۔ خود ساس کا پاؤں نہیں پھسلتا، نوے (۹۰) سالہ بوڑھی بیٹھی ہے۔ یہ ساری صرف باتیں ہیں، شریعت پر چلنے والے بہت کم لوگ ہیں۔ فرمایا:

﴿وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ﴾ [سبا: ۱۳]

"اور میرے بندوں میں کم لوگ ہیں جو شکر گزار ہوں۔"

یہ حجاب رسوم ہے، جس کی وجہ سے احکام الٰہیہ سے ہٹ جاتے ہیں تو درمیان میں پردہ آجاتا ہے۔

چوتھا پردہ:

چوتھا پردہ ہے: "حِجَابُ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ" (اللہ کے سوا غیر سے ڈر اور امید ہو) حالانکہ ایمان کا معنی تھا کہ اللہ سے ڈر اور اللہ سے امید ہو۔ لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے غیر سے امید اور ڈر زیادہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سائیں! فکر نہ کریں، یہ کام میرے مرشد کر دیں گے۔ حضرت کا بڑا کرم ہے۔ اگر میں نے پیر کی جھوٹی قسم کھائی تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔ اللہ کی جتنی قسمیں کھالے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

جھوٹی قسم میں قرآن اٹھانے والے کا واقعہ:

واقعہ مشہور ہے کہ ایک تھانیدار کے پاس فیصلہ آگیا تو تھانیدار نے ملزم کو کہا کہ تم قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر، قرآن اٹھا کر قسم اٹھاؤ گے کہ تم بے گناہ ہو۔ اس نے کہا: مجھے پہلے قرآن دکھاؤ، تھانیدار نے قرآن منگوایا۔ ملزم نے کہا: یہ ایک کیا میں تو گیارہ بھی اٹھا سکتا ہوں۔ تھانیدار سمجھدار تھا کہ یہ تو وزن دیکھ رہا ہے۔ تھانیدار نے کہا: قرآن رحل کے ساتھ اٹھانا ہوگا۔ اس ملزم نے کہا: رحل دکھاؤ۔ تھانیدار نے کہا: اس کو لے جاؤ اور جو کنویں پر رہٹ چل رہا ہے وہ دکھاؤ۔ اس نے کہا: یہ تو میں نہیں اٹھا سکتا، میں تو مر جاؤں گا، بہتر ہے کہ میں چوری کا اعتراف کر لیتا ہوں۔ تو جب یہ عالم ہو تو ان لوگوں کو کیسے بات سمجھائی جائے؟

کچھ دوسری قسموں کا خوف:

سندھیوں کو کہا کہ خدا کی قسم اٹھاؤ تو قسم اٹھالیں گے اور جب کہا جائے کہ آنکھوں پر ہاتھ رکھو تو آنکھوں پر ہاتھ نہیں رکھیں گے۔ بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم اٹھاؤ تو یوں قسم نہیں اٹھائیں گے۔ اس دکان پر قسم اٹھالو۔ نہیں یہ روزی کا اڈا ہے، میں کیوں قسم اٹھالوں؟ چلو! تم اپنے مرشد کی قسم کھالو۔ نہیں اگر میں نے جھوٹی قسم کھالی تو میرا خاندان تباہ ہو جائے گا۔ غیر اللہ سے ڈر رہے ہیں اور امید بھی غیر سے ہے۔ اس لیے فرمایا: جب تک یہ حجابات ہیں انسان ایمان کی روشنی کو حاصل ہی نہیں کر سکتا۔

سورۂ فاتحہ سے غفلت کا پردہ کیسے دور ہوتا ہے؟

یہ بات سمجھیں کہ یہ ساری باتیں سورۂ فاتحہ سے کیسے سمجھ آتی ہیں؟ جب ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' پڑھتے ہیں تو اس سے حجاب غفلت ختم ہو گیا کہ ساری تعریفیں اور محامد اللہ کے لیے ہیں۔ اللہ کی ذات محمود ہے، بندہ حامد ہے۔ وہ مسجود ہے، بندہ ساجد ہے۔ وہ معبود ہے، بندہ عابد ہے۔ اس کو پتا چل گیا کہ ساری مدح وثنا اللہ کے لیے ہے، اب غفلت سے جاگ گیا۔

جہالت کا پردہ کیسے دور ہوتا ہے؟

دوسرا پردہ جہالت کا ہے۔ وہ اس طرح ہٹے گا کہ اللہ کی ذات وصفات کا علم ہو اور احکام وافعال کا علم ہو۔ جب ''رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' پڑھا تو اس کے اندر ربوبیت عامہ ہے کہ وہ تمام جہانوں کا رب ہے، سب کو پالنے والا ہے۔ پھر ''اَلرَّحْمٰنِ'' کہا تو اس سے رحمت عامہ کا پتا لگا کہ اللہ کی رحمت دنیا میں اپنوں کے لیے بھی ہے، بےگانوں کے لیے بھی ہے، ماننے والوں کے لیے بھی ہے اور شرک کرنے والوں کے لیے بھی ہے۔ ''اَلرَّحِیْمِ'' سے رحمتِ خاصہ کا پتا چلا کہ آخرت میں اس کی رحمت صرف ایمان والوں کے لیے ہے۔ ''اَلرَّحْمٰنُ فِی الدُّنْیَا وَالرَّحِیْمُ فِی الْاٰخِرَۃِ'' (رحمٰن دنیا میں اور رحیم آخرت میں)۔ اس کی رحمت عامہ اور خاصہ کا علم ہوا۔

''مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' سے اس کی صفتِ عدل کا علم ہوا۔ فیصلہ کرنے والا اللہ ہے، سزا وجزا کا مالک اللہ ہے۔ تو اس سے ہماری جہالت کے پردے ہٹ گئے۔

رسم ورواج کا پردہ کیسے دور ہوتا ہے؟

جب ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ'' پڑھا تو اس سے رسم ورواج کا پردہ بھی ہٹ گیا کہ ہم تو وہی کریں گے جو تیری رضا ہوگی، تیری ہی عبادت ہوگی اور تجھ ہی سے مانگنا ہوگا۔ اس سے رسم ورواج والا پردہ ختم ہو گیا۔

غیر سے خوف کا پردہ کیسے دور ہوتا ہے؟

باقی اللہ کے سوا غیر سے ڈرنا اور امید رکھنے کا پردہ ''وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ'' سے ختم ہو گیا۔ تجھ سے مدد مانگتے ہیں، تو ہی ہماری امیدوں کا مرکز ومحور ہے۔ ہمارے خوف کا مرکز بھی اللہ ہے۔ اس سے ہم اللہ سے جڑ گئے۔ اب سارے پردے ہٹ گئے، روشنی آنی شروع ہو گئی تو اللہ نے ہمیں سکھایا کہ مانگو:

﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝﴾ [الفاتحۃ: ۵]

''یا اللہ! ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت فرمادے۔''

پردے ہٹنے کے بعد کا عمل:

اب ہمیں صراطِ مستقیم مل گئی، اب اس پر ہمیشہ رہنے کے لیے سکھایا: ﴿صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ﴾ صحبتِ صالحین اختیار کرلو۔ ﴿غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ۝﴾ [الفاتحۃ: ۷] یعنی مردودین کا راستہ چھوڑ دو۔ اب حصولِ منزل آسان ہوجائے گا کہ: ''أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ''[1] (تم نماز میں ایسی عبادت کرو کہ تم اللہ دیکھ رہے ہو۔ اگر اس مرتبہ پر نہ پہنچو تو کم از کم اس مرتبہ پر پہنچو کہ اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے)۔

سورۂ فاتحہ کا تعلق بھی نماز سے ہے۔

((وَجُعِلَ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ)) [سنن النسائی، حدیث: ۳۹۴۹، باب: حب النساء]

''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔''

اس سے ہمیں یہ سبق ملا کہ جب سارے حجاب ہٹ جائیں گے تو ہم ''عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ'' (اللہ کے نور پر) ہوں گے۔ اور وہ نور اللہ کا قرآن ہے۔ جب نور میں آگئے تو اندھیروں سے بھی بچ گئے، ٹھوکروں سے بھی بچ گئے، نماز میں گرنے سے بچ گئے اور جہنم کے گڑھے میں گرنے سے بھی بچ گئے۔

علماء نے سورۂ فاتحہ کی کئی طرح سے تفسیریں لکھی ہیں، تا کہ آپ کے دماغ میں اللہ کی عظمت بیٹھ جائے۔ جب آپ کے دماغ میں سورۂ فاتحہ کی ساری باتیں ہوں گی تو آپ کے پڑھنے میں لذت ہوگی۔

اللہ کی مخلوقات میں اللہ کی حکمتیں:

علماء نے فرمایا ہے کہ اللہ نے آسمان بھی سات بنائے ہیں۔ یاد رکھیں! ہمیں اعداد سے عقیدت نہیں۔ بعض لوگ ۷ (سات) کے عدد کو اچھا سمجھتے ہیں اور ۱۳ (تیرہ) کے عدد کو منحوس سمجھتے ہیں۔ یا بعض ایام کو منحوس سمجھتے ہیں یا بعض مہینوں کو منحوس سمجھتے ہیں۔ الحمد للہ! مسلمان ان عقیدوں سے بری اور دور ہیں۔ لیکن حکمتیں ضرور ہوتی ہے۔ دیکھیں! مچھلی کے گوشت کے اپنے منافع ہیں اور بکری کے گوشت کے اپنے منافع ہیں۔ ہر ایک میں اللہ نے اپنی

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۵۰، باب: سُؤَالِ جِبْرِيلَ النَّبِيَّ ﷺ عَنِ الإِيمَانِ وَالإِسْلَامِ وَالإِحْسَانِ]

نعمتیں رکھی ہیں۔

سات کے عدد میں حکمتیں:

اسی طرح بعض علماء نے فرمایا کہ یہ عجیب اللہ کی حکمتیں ہیں کہ اللہ نے آسمان بھی سات بنائے ہیں، زمینیں بھی سات بنائی ہیں، اپنے گھر کے طواف کے چکر بھی سات بنائے ہیں، صفا و مروہ کے درمیان دوڑانے کے چکر بھی سات بنائے ہیں اور سورۂ فاتحہ کی آیات بھی سات ہیں۔ یہ اللہ کی عظیم حکمت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس میں اسرار ربانیہ ہیں۔ جس طرح سورۂ فاتحہ کی آیات سات ہیں اسی طرح انسان سجدہ بھی سات اعضاء سے کرتا ہے: دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے، دونوں پاؤں زمین پر اور چہرہ زمین پر ہوگا تو سجدہ مکمل ہوگا۔ حدیث پاک میں بھی آتا ہے:

((أُمِرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَسْجُدَ عَلَى سَبْعَةِ أَعْضَاءٍ))

[صحیح البخاری، حدیث: ۸۰۹، باب: السُّجُودِ عَلَى سَبْعَةِ أَعْظُمٍ]

اسی طرح جہنم کے سات دروازے ہیں۔ فرمایا: ﴿لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ﴾[1]۔ اسی لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر سجدے میں دونوں پاؤں اٹھائے رکھیں اور سجدے میں بالکل پاؤں زمین پر نہ لگیں تو اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، کیونکہ سجدہ فرض ہے۔ اگر فرض رہ جائے تو نماز رہ جائے گی۔ اور کچھ دیر کے لیے پاؤں اٹھالیا، مکروہ ہے۔ یہ عام مسئلہ ہے، کوئی اس کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا۔ اچھے خاصے نمازی کو بھی اس کا احساس نہیں ہے۔ اللہ کی کوئی حکمتیں ہیں کہ سات کو ترجیح دی ہے۔

سورۂ فاتحہ پر شبہات:

شبہات دو قسم کے ہیں: شبہات متقدمین جو شروع دور کے لوگوں کے شبہات ہیں اور دوسرے شبہات متاخرین جو اس دور میں پیدا کیے گئے ہیں۔ شبہات کا مقصد لوگوں کو گمراہ کرنا ہوتا ہے۔

شبہات کی مثال:

جیسے میاں بیوی کی اچھی زندگی گزر رہی تھی۔ اتفاق سے بیوی فلیٹ کی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی اور سامنے فلیٹ میں سے کوئی عورت آ گئی، اس سے باتیں کیں۔ اور خاوند کے دل میں شبہ آ گیا کہ کسی مرد سے باتیں کر رہی تھی۔

[1] [الحجر: ۴۴]

آپ کو جب شبہ ہوگا تو اس کے ایک ایک قدم پر آپ کو اعتراض ہوگا۔ یہ قاعدہ اور ضابطہ ہے۔ جیسے کسی نے کہا تھا:

؎ تعصب کی نگاہوں میں نہ یوسف بھی حسیں ٹھہرے
محبت کی نگاہوں میں تو زنگی ماہ جبیں ٹھہرے

جب عداوت کی نظروں سے کسی کو دیکھیں گے تو اس کے ایک ایک قدم پر شبہ کریں گے۔ جیسے آپ کو شبہ پڑ جائے کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے تو اگر کوئی گاڑی آ رہی ہو تو کہیں گے: ہاں یہ بھی تعاقب کر رہا ہے، حالانکہ اس کے فرشتوں کو بھی یہ بات معلوم نہیں ہوگی۔ دو آدمی ہٹ کر بات کریں گے تو آپ شک کریں گے: ضرور میرے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔

دشمنوں کا کام ہی یہی ہوتا ہے کہ شبہ ڈال دو۔ اور قرآن میں شبہات پرانے دور کے بھی ہیں اور نئے دور کے بھی ہیں۔ حضور ﷺ کے زمانے میں جب قرآن نازل ہوا تو کفار نے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ کسی جادوگر کا کلام ہے۔ اس کی یہ دلیل دیتے کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ یہ بھی اللہ کی شان ہے کہ جو علوم ضارہ وشیطانیہ ہیں ان کا اثر بڑا جلدی ہوتا ہے۔ ویسے بھی دیکھ لیں کہ کتنا اچھے سے اچھا عطر لگائیں اس کی خوشبو کہاں تک ہوگی؟ لیکن اگر خدا نخواستہ کسی گٹر کا پائپ لیک ہو جائے تو میلوں تک بدبو ہوتی ہے۔ بدبو خوشبو کی نسبت زیادہ پھیلتی ہے۔

آپ ایک من دودھ کا مٹکا رکھ لیں، لیکن ایک چھٹانک پیشاب ڈال دیں۔ تو ایک چھٹانک سارے دودھ کو لے ڈوبے گا۔ تو اسی لیے جب شیطان شبہ ڈالتا ہے تو انسان بھٹکنا شروع ہو جاتا ہے۔

پرانے شبہات:

تو شروع میں کافروں نے کہا کہ یہ کلام ساحر ہے، کیونکہ اس سے اثر ہوتا ہے، لہٰذا یہ سحر ہے۔ اور ایک شبہ یہ ڈالا گیا کہ اللہ کے نبی ﷺ کاہن ہیں، قرآن کہانت ہے۔ کاہن وہ ہوتے تھے جو غاروں میں رہتے تھے اور قبل از وقت غیب کی خبریں دیتے تھے۔ ایک آدھ خبر سچی ہوتی تھی اور نوے جھوٹی خبریں ہوتی تھیں۔ جنات فرشتوں سے خبریں چرا کر ان کاہنوں کو آ کر بتاتے تھے۔ اور وہ ریاضت کرتے کرتے اس مقام پر ہو جاتے تھے کہ جنات ان کے تابع ہو جاتے تھے۔ اور جو شیاطین الجن والانس ہیں ان کا مقصد بھی حضور ﷺ کی امت کو گمراہ کرنا ہے۔ اس لیے وہ بھی ان کے ساتھ دوستی رکھتے ہیں۔ اس لیے جو لوگ جنات کا کام کرتے ہیں یا ساحر ہیں ان سب کا پلیدی تعلق ہوتا ہے۔ کیونکہ جتنا ناپاک رہے گا اتنا اس کا جادو اثر کرے گا، کیونکہ شیطان ناپاک لوگوں کے ساتھ رہتا ہے،

پاک لوگوں کے ساتھ نہیں رہتا۔ آپ جب "اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ" کہتے ہیں تو شیطان آپ کے پاس کیسے آئے گا؟

بعض لوگوں نے کہا کہ ایک آدمی سے حضور ﷺ سیکھتے ہیں۔ اس کے بعد ہمیں سنا دیتے ہیں کہ خدا نے اتارا ہے۔

اور ایک شبہ ان کا یہ تھا کہ حضور ﷺ خود قرآن بناتے ہیں۔ اور یہ بھی شبہ ڈالا کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے، اگر ہم چاہیں تو ایسا کلام کر سکتے ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ﴾

[الانفال: ۳۱]

"اور جب ان کے سامنے ہماری آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ (بس) ہم نے سن لیا، اگر ہم چاہیں تو اس جیسی باتیں ہم بھی کہہ لائیں۔ یہ (قرآن) اور کچھ نہیں، صرف پچھلے لوگوں کے افسانے ہیں۔"

جیسے الف لیلیٰ کی کہانی ہے۔ بہت ساری کہانیاں ہیں، جن کو لوگ شوق سے پڑھتے ہیں کہ پڑھتے ہوئے سو جائیں گے۔

جوابات:

یہ پرانے دور کے شبہات ہیں جن کے شبہ کا اللہ نے جواب دیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِیْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ﴾ [الحاقۃ: ۴۱]

"اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں (بلکہ اللہ کا کلام ہے،) مگر تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔"

﴿وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۭ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ﴾ [الحاقۃ: ۴۲]

"اور نہ یہ کسی کاہن کا کلام ہے تم بہت کم سمجھتے ہو۔"

﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ﴾ [یٰس: ۶۹]

"اور ہم نے آپ کو شاعری کا علم نہیں دیا اور وہ آپ کے شایان ہی نہیں وہ تو محض (ہمیں جگانے کے لیے) نصیحت اور ایک آسمانی کتاب ہے جو احکام کو ظاہر کرنے والی ہے۔"

﴿تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَكِیْمٍ حَمِیْدٍ﴾ [حم السجدۃ: ۴۲]

''علم وحکمت والی اور حمد وثنا کی مستحق ذات کا کلام ہے جو اس نے اتارا ہے۔''

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ﴾ [الشعراء: ۱۹۳]

''اس کو امانت دار فرشتہ (جبرائیل) لے کر آیا ہے۔''

﴿عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ﴾ [الشعراء: ۱۹۴]

''آپ کے دل پر اتارا ہے، تا کہ آپ لوگوں کو ڈرسنائیں۔''

﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ﴾ [الشعراء: ۱۹۵]

''ایسی عربی زبان میں اترا ہے جو پیغام کو واضح کر دینے والی ہے۔''

﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ [یوسف: ۲]

''ہم نے اس کو ایسا قرآن بنا کر اتارا ہے جو عربی زبان میں ہے، تا کہ تم سمجھ سکو۔''

اور کہیں فرمایا:

﴿إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ﴾ [الطارق: ۱۳، ۱۴]

''یہ قرآن (حق وباطل میں) ایک فیصلہ کر دینے والا کلام ہے اور یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔''

اللہ نے فرمایا: یہ قرآن کھلی ہوئی بات ہے، اس کا کھلا فیصلہ ہے، یہ...... نعوذ باللہ...... بے قیمت اور بے وزن بات نہیں ہے۔ پھر فرمایا:

﴿وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ﴾ [الزخرف: ۴۴]

''اور حقیقت یہ ہے کہ یہ وحی تمہارے لیے اور تمہاری قوم کے لیے ایک نیک نامی کا ذریعہ ہے۔''

اس میں آپ کی بھی شان ہے اور آپ کی قوم کی بھی شان ہے کہ ہم نے ان کی زبان میں قرآن اتارا ہے۔ اللہ نے ان کی ایک ایک بات کا جواب دیا ہے۔

اس جواب پر شبہ:

ایک شبہ ہوتا تھا کہ ہم تو مان لیں، لیکن کافر جن کا قرآن پر ایمان ہی نہ ہو، جبرائیل پر ایمان ہی نہ ہو، جنت، آخرت پر ایمان نہ ہو وہ ان جوابات کو کیسے مانے گا؟

جوابِ شبہ:

اللہ نے فرمایا: ہم نے اپنے نبی ﷺ کو فرما دیا تھا کہ ان کو چیلنج کریں:

﴿فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ ۖ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴾ [البقرۃ: ۲۳]

''تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا لاؤ۔ اور اگر سچے ہو تو اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو۔''

جب تم ایک سورت بھی نہیں بنا سکتے۔ ساری دنیا کا عاجز ہو جانا اور اللہ کے قرآن کا مقابلہ نہ کر سکنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضور ﷺ سچے ہیں اور قرآن اللہ کی کتاب ہے۔

مسیلمہ کذاب کی جھوٹی وحی:

مسیلمہ کذاب نے حضور ﷺ کے زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ جب اس نے یہ دعویٰ کیا تو اس کو اس کے ساتھیوں اور دوستوں نے کہا کہ تم نے نبوت کا دعویٰ تو کر دیا ہے۔ اللہ کے نبی پر وحی آتی ہے تو کیا تمہارے اوپر بھی کوئی وحی آتی ہے؟ تاکہ ہم بھی لوگوں کو بتا سکیں۔ اس نے ایک دن اپنے سارے ساتھیوں کو جمع کیا کہ آج تازہ تازہ وحی آئی ہے، پھر تم میری نبوت پر اعتراض نہ کرنا۔ اللہ نے مجھ پر بھی قرآن اتارا ہے: ''اَلْفِيلُ مَا الْفِيلُ؟ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْفِيلُ؟ لَهُ ذَنَبٌ وَبِيلٌ'' ساتھیوں نے کہا کسی اور کو نہ سنانا، جوتے مار مار کر گنجا کر دیں گے۔

مرزا قادیانی کا فرشتہ ٹیچی ٹیچی:

مرزا غلام احمد قادیانی نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو اس سے بھی لوگوں نے کہا کہ آپ پر بھی وحی آتی ہے؟ اس نے کہا: ہاں! مجھ پر بھی وحی آتی ہے، لیکن وہ وحی تشریعی تو نہیں وہ صرف حضور ﷺ پر آتی تھی۔ میں ظلّی نبی ہوں، سایہ والا نبی ہوں۔ لوگوں نے کہا: چلو تشریعی وحی تو نہ آتی ہو، لیکن غیر تشریعی وحی تو لاتے ہوں گے۔ اس نے کہا: میرے پاس جو فرشتہ وحی لاتا ہے اس کا نام ٹیچی ٹیچی ہے۔ مرزا کی بات تو ٹھیک ہے، کیونکہ وہ خود نبی بھی انگریزی تھا تو فرشتہ بھی انگریزی آئے گا۔ بہر حال اس طرح کے دعوے کرتے رہے، لیکن قرآن کے مقابلے میں کسی کا دعویٰ نہ چل سکا۔

روافض کی تحریفِ قرآن:

روافض نے قرآن بدلا ہے۔ ترجمہ مقبول اردو میں شیعوں کا مشہور ترجمہ ہے۔ ان کو پڑھنے سے پہلے مہربانی کیا کریں کہ ساتھ صحیح ترجمہ بھی رکھا کریں۔ ورنہ جس کو پتا ہی نہ ہو وہ تو گمراہ ہو جائے گا۔ کسی بات کا سلیس ہونا الگ

بات ہے اور اللہ کے قرآن کا لفظ بہ لفظ ترجمہ الگ بات ہے۔ بڑے بڑے شاعر اور بڑی بڑی ادیبہ عورتیں جن کے آپ مرثیے پڑھ کر حیران ہو جائیں، جن کے مدحیہ اور ہجویہ کلام پڑھ کر حیران ہو جائیں۔ آج بھی عربی ادب کا سرمایہ زمانہ جاہلیت کے اشعار ہیں۔ کسی لفظ پر بحث ہو جائے اور اس کو ڈھونڈنا ہو تو جاہلیت کے شعراء کے کلام میں اس لفظ کو ڈھونڈا جائے گا کہ اس لفظ کو کیسے استعمال کیا ہے؟

بہر حال ان کے شبہات پر زور لگانے کے باوجود اللہ نے ان شبہات کو ختم فرما دیا۔

یہ پہلے لوگوں کے شبہات تھے جو لوگوں کے دلوں میں ڈالے جاتے تھے کہ نبی ﷺ کے پاس نہ جانا، کیونکہ وہ جادوگر ہے کہ جو بھی اس کے قریب جاتا ہے اور قرآن سنتا ہے فوراً اس کا ہو جاتا ہے۔

لوگوں کے دل اب قرآن کا اثر کیوں نہیں لیتے؟

قرآن میں وہی تاثیر آج بھی ہے، لیکن ہم پڑھ کر ٹھیک نہیں ہوتے، کیونکہ ہمارے دل، زبانیں اور افکار گندے ہیں، ہمارے نوجوان ایسے ہیں کہ پڑھ قرآن رہے ہوں گے، لیکن ان کے تصور میں فلمیں ہوں گی۔ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھ رہا ہے، لیکن رات بیٹھ کر جو فلم دیکھی تھی اس کا منظر سامنے آ رہا ہے کہ کتنی خوبصورت تھی!! اس لیے اثر نہیں ہے۔

متاخرین اعدائے اسلام:

متاخرین اعدائے اسلام جن میں سب سے بڑے تو یہودی ہیں، اس کے بعد نصاریٰ ہیں، اس کے بعد شیعہ ہیں، اس کے بعد ہندو، بدھ مت ہیں اور آتش پرست ہیں۔ یہ اسلام دشمنی میں ایک ہیں۔ حالانکہ آپ قرآن پڑھ کر دیکھیں، ان کی تاریخیں دیکھیں، یہ دو ضدیں ہیں۔ جیسے رات اور دن اکٹھے نہیں ہو سکتے اسی طرح یہود و نصاریٰ کا کبھی بھی عقیدہ مشترک نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عیسائیوں کے نزدیک بی بی مریم مقدس ہیں اور یہودیوں کے نزدیک (نعوذ باللہ!) فاسقہ اور گنہگار ہیں اور ان کے بیٹے بھی حلال نہیں ہیں:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ ﴾

[البقرۃ: ۱۱۳]

"اور یہود کہتے ہیں: تمہارے پاس کوئی حجت نہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں: تمہارے پاس کوئی حجت نہیں۔"

لیکن تاریخ میں دیکھ لیں کہ اسلام اور مسلمانوں کو مارنے کے لیے یہ دونوں اکٹھے ہیں۔ انہوں نے قرآن پر اور

خاص طور پر سورۂ فاتحہ پر شبہات کیے ہیں۔ سمجھنے کی کوشش کریں گے، تا کہ اللہ اسے ہماری ہدایت کا بھی ذریعہ بنائے اور ہم دشمنوں کے حملے سے بھی محفوظ رہیں اور باخبر ہوں۔ کیونکہ جب آدمی کو پتا ہو کہ میرے دشمن کے پاس فلاں اسلحہ ہے تو آدمی چاہے کمزور ہو، لیکن اپنے بچنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرے گا۔ اور اگر پتا ہی نہ ہو اور دشمن حملہ کر دے تو پھر آپ کیا کریں گے؟ آپ کو حرم کے اندر کوئی شیعہ اور رافضی مل جائے اور وہ آپ سے ایک سوال کرے تو آپ اس کا جواب بھی نہیں دے سکیں گے، کیونکہ آپ کو وقت ہی نہیں۔ آدمی فرصت کے وقت اخبار پڑھتا ہے، ڈائجسٹ پڑھتا ہے، میگزین پڑھتا ہے یا جو زیادہ مہذب آدمی ہیں وہ گھر میں فلم دیکھ لیتے ہیں۔

اہلِ سنت کی اپنے اکابر سے غفلت:

شیعوں کے نزدیک بارہ امام ہیں۔ ان کو اپنے اماموں کے نام یاد ہیں، ان کا شجرہ بھی یاد ہے۔ جبکہ ہمارے اہلِ سنت والجماعت کو چار خلفاء میں سے نہ کسی کا شجرہ آتا ہے اور نہ کسی کا نام آتا ہے۔ اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہوگی کہ ہمیں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام ہی نہیں آتا اور یہ بھی پتا نہیں ہے کہ صدیق لقب ہے یا نام ہے؟ اور یہ صدیق لقب قبل الاسلام ہے یا بعد الاسلام ہے؟ اور صدیق لقب علی السموات ہے یا علی الارض ہے؟ کچھ پتا نہیں ہے۔ اگر نام صدیق ہے تو قرآن کہتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ ۖ وَالشُّهَدَاءُ عِندَ رَبِّهِمْ﴾ [الحدید:۱۹]

''اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں ایسے ہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔''

اہلِ سنت کا ان باتوں پر غور ہے ہی نہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کو کون پڑھے گا اور یاد کرے گا؟

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کا واقعہ:

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی جی! ہم کہتے کہتے مرجائیں گے یا سنتے سنتے مرجائیں گے، ہمارا ثواب تو کہیں نہیں گیا، لیکن بات جہاں تھی وہیں کی وہیں رہ گئی۔

پنجاب کے علاقے میں میری تقریر تھی کافی رش تھا۔ تقریر کے بعد جہاں میری جائے رہائش تھی پیدل جا رہا تھا۔ راستے میں چند پنجابی تبصرہ کر رہے تھے کہ مولوی قرآن تو اچھا پڑھتا ہے، تقریر بھی اچھی کرتا ہے، لیکن ہے وہابی۔ اب اس کا کیا علاج ہے؟

میری تقاریر کا ایک نوجوان پر اثر:

حج کے دنوں کا واقعہ ہے کہ مجھے ایک نوجوان ملا جو خوبصورت تھا اور داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ مجھے بڑی عقیدت اور محبت سے آ کر ملا اور کہا کہ مجھے پتا تھا کہ آپ فلاں کیمپ میں ہوتے ہیں، اس لیے میں یہاں آیا ہوں، تا کہ بطور خاص آپ کے ساتھ حج کروں۔ میں نے آپ کی کیسٹ سے زندگی بدلی ہے۔ میں انگریزوں کے ملک میں رہنے والا آدمی ہوں۔ ساری زندگی انگریزی پڑھی۔ وہ وکیل تھا۔ اور وہاں کے سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ میں مقدمات لڑنے والا آدمی تھا۔

ہم پر قرآن کا اثر کیوں نہیں ہوتا؟

یورپ والوں پر تو اثر ہو گیا، لیکن مکہ والوں پر اثر نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہی ہے کہ برتن صاف ہو گا تو دودھ صحیح رہے گا۔ دودھ کا کوئی قصور نہیں ہے، وہ تو تھنوں سے فلٹر ہو کر نکلا ہے۔ اور ایسے لطیف ذرائع ہیں کہ وہاں انسانی عقل بھی نہیں پہنچ سکتی۔ بہر حال! مقصد یہ ہے کہ آپ کو اثر تب ہو گا جب آپ کو یہ بات سمجھ آئے گی یا سمجھنے کے لیے تھوڑی سی محنت اور غور کریں گے۔

الٹا برتن کبھی نہیں بھر سکتا:

اس کی مثال جیسے مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ ختم نبوت کے لیڈروں میں گزرے ہیں۔ متقی، پرہیزگار تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ اگر ایک آدمی پانی کی ٹونٹی بڑے زور سے کھولے، لیکن گلاس اوندھا کر کے رکھ دے تو گلاس کتنی دیر میں بھر جائے گا؟ صاف بات ہے کہ الٹا گلاس کبھی بھی نہیں بھرے گا۔ اگر برتن کو سیدھا کر کے رکھو گے تو دو سیکنڈ میں بھر جائے گا۔ وجہ یہی ہے کہ ہمارے برتن سیدھے نہیں ہیں۔ جب تک ہم اپنے دل کا رخ قرآن کی طرف موڑیں گے نہیں، تب تک اللہ کا قرآن سمجھ نہیں آئے گا۔ قرآن بادشاہوں کے بادشاہ کا کلام ہے، نہ اس بادشاہ کو ہماری ضرورت ہے اور نہ اس کے کلام کو ہماری ضرورت ہے۔

کٹورے میں تیل لینے والے بچہ کا واقعہ:

اسی طرح ایک اور مثال دیتے تھے کہ ہندوستان، بنگلہ دیش میں پیتل کے بنے ہوئے برتن ہوتے تھے جس کو کٹورا کہا جاتا تھا۔ اس کے نیچے بھی تھوڑی سی جگہ بنی ہوتی تھی، تا کہ نیچے رکھا جائے۔ بڑے خوبصورت برتن ہوتے

ہیں۔ اس زمانے میں ایک ماں نے بچے کو پیسے دیے کہ بیٹا! جا کر تیل لے آؤ۔ وہ دوکاندار کے پاس گیا کہ چار پیسے کا تیل کٹورے میں ڈال دو۔ اس زمانہ میں چار پیسوں کی بھی بڑی اہمیت ہوتی تھی اور دوکاندار بھی اچھے لوگ تھے۔ دھوکہ دینا تو ان کے دماغوں میں بھی نہیں تھا۔

میرے ایک شاگرد کا قصہ:

اتفاق سے ایک دفعہ میں گزر رہا تھا، مجھے کپڑا لینے کا شوق ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ دوکاندار میرا شاگرد ہے، میں بڑا خوش ہو گیا اور دوکان میں چلا گیا۔ میں نے دوکان پر بیٹھ کر اس سے پہلی بات یہی کی کہ میں مفت نہیں لوں گا، کیونکہ اس وقت تو دے دیتے ہیں اور پیٹھ پیچھے کہتے ہیں: چلو ایک بلا تو ٹلی۔ یہ ہماری بیماری کا صدقہ ہو گیا۔

ایک دفعہ ایک مولوی کے پاس کوئی بچہ مکھن کا بھرا ہوا پیالہ لایا۔ تو مولوی صاحب نے کہا: خیر تو ہے؟ اس بچے نے کہا کہ اس کے اندر کتا منہ مار گیا تھا تو اماں نے کہا: مولوی صاحب کو دے آؤ۔

میرے اس شاگرد نے کہا: ٹھیک ہے۔ میں نے اسے کہا: مجھے صحیح ریٹ پر اور صحیح کپڑا دو، تاکہ تمہارا نقصان نہ ہو اور مجھے یہ فائدہ ہو گا کہ مجھے چیز صحیح مل گئی اور صحیح ریٹ پر مل گئی۔ میں نے کپڑا پسند کیا۔ اس نے کہا کہ یہ میری قیمتِ خرید ہے۔ میں نے کہا: ٹھیک ہے، آپ مجھے اس کی رسید نہ دکھائیں، آپ تو ماشاء اللہ حرم میں تفسیر پڑھنے آتے ہیں، مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ اس نے کپڑا دے دیا۔ اتفاق سے مجھے خیال آ گیا کہ کوئی گڑ بڑ ضرور ہے۔ میں نے راستہ میں ایک دوکاندار کو کپڑا دکھایا کہ یہ کتنے کا ہو گا؟ اس نے رعایت سے دس ریال لگائے اور شاگرد نے پندرہ ریال لگائے اور نفع بھی نہیں لیا۔

بہر حال! اس زمانہ میں یہ دوکاندار نہیں ہوتے تھے۔ اس دوکاندار نے اس کو تیل دیا اور کہا کہ بچے تیرا تیل کچھ بچ گیا ہے تو بچے نے اس برتن کو الٹا کر کے کہا کہ ادھر ڈال دو۔ جب بچہ تیل گھر لایا تو ماں نے کہا کہ چار پیسے کا اتنا کم تیل ہے؟ اس نے کہا: نہیں کچھ تیل ادھر بھی ہے۔ تو اس کو بھی الٹا دیا۔ تو اگر ہمارا حال بھی یہی ہو تو درس کا اثر خدا جانے کیا ہو گا؟

میرا درس دینے کا مقصد:

میں ابھی مدینہ سے سفر کر کے مکہ پہنچا ہوں۔ لیکن آپ کا درس نہیں چھوڑا کہ آپ لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔ تم دیکھو لو

کتنے ڈاکٹر ہو، اگر اپنے ساتھ ایک ایک آدمی اور لاؤ گے تو کتنے ہو جاؤ گے؟ لیکن بیٹے، بیٹی کی شادی میں پکڑ کر لے جائیں گے، اللہ کے قرآن کے لیے نہیں لے جائیں گے۔ اس نیت سے آپ کو درس دیتا ہوں کہ اللہ نے یہ پورے عالم میں تبلیغ کا ایک ذریعہ بنا دیا ہے۔ ساؤتھ افریقہ کا مسلم ریڈیو ایک سال سے ان کیسٹوں کو نشر کر رہا ہے۔ اسی طرح کوئی ڈیڑھ سال سے اور کوئی دو سال سے۔ اسی لیے میں نے کہا کہ یورپ والوں کو ہدایت ہو رہی ہے، لیکن مکہ والے محروم ہیں۔ وہ لڑکا اب بہت گہرائی میں جا رہا ہے۔ میں اس کے ذمہ کام لگایا ہے کہ اسلام پر جو یورپ والوں کے اعتراضات ہیں وہ تم مجھے اکٹھے کر کے دو۔ آج کل تو انٹرنیٹ کا دور ہے۔ ایک منٹ میں اکٹھے ہو جائیں گے۔ مقصد ہے کہ ان اعتراضات کے جوابات پر غور کریں۔

اعتراض: کیا اللہ کسی اور اللہ کے نام سے قرآن شروع کرتا ہے؟

جیسے جدید اعتراضات میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن میں ہے: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١﴾﴾ اگر یہ اللہ کا کلام ہے تو اللہ کہہ رہا ہے کہ شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جب یہ اللہ کلام ہے تو اللہ کسی اور اللہ کے نام سے شروع کر رہا ہے۔ دیکھیں! ان ظالموں نے کیسے ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں شبہ ڈال دیا ہے؟

پہلا جواب:

اس کے دو جواب ہیں: ایک تو علمی جواب ہے کہ کبھی کلام متکلم کی طرف سے ہوتا ہے اور کبھی کلام متکلم کا ہوتا ہے، لیکن مقصود دوسرے کی ترجمانی کرنی ہوتی ہے۔ یعنی کلام اللہ کر رہے ہیں، لیکن بندے کو سکھا رہے ہیں کہ تم یوں کہو۔ جیسے آپ اردو محاورے میں کہتے ہیں کہ کمال ہے، آپ نے میرے منہ کی بات لے لی، آپ نے میرے منہ سے لفظ لے لیے۔ یہ بات تو میں آپ کو کہنے ہی والا تھا۔ تو علماء نے کہا: عرب کے اندر اور تمام دنیا کے ادیبوں میں یہ اسلوب ہے کہ جو کچھ اس نے کہا، میں نے سمجھا کہ یہ بھی میرے دل میں ہے۔ یہ کلام اللہ کا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو تعلیم و ہدایت کے لیے فرما رہے ہیں کہ تم ایسے پڑھو: "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"۔

دوسرا جواب:

دوسرا جواب یہ دیا کہ ایک ہے ترتیب نزولی اور ایک ہے ترتیب قرأت کہ سب سے پہلے جو آپ پر وحی اتری وہ ہے:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝﴾ [العلق:۱]

''پڑھو اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے سب کچھ پیدا کیا۔''

تو پہلا حکم ''اِقْرَاْ'' ہے کہ پڑھو۔ اب ہر مرتبہ اور ہر لفظ کے ساتھ تو استاذ نہیں کہتا کہ پڑھو۔ اسی ''اِقْرَاْ'' کے تابع سارا قرآن ہے کہ پڑھو۔ تو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ اور ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ اسی ''اِقْرَاْ'' کے تابع ہے۔ تو اب کوئی شبہ نہ رہا۔ اس لیے حکم دیا گیا تھا، تا کہ آئندہ زمانہ میں کوئی دشمن اس کو لے کر اعتراض نہ کر سکے۔ اب الحمد للہ! اس پر کوئی شبہ اور اعتراض نہ رہا۔

دنیا کے اندر جتنے بھی باطل فرقے پیدا ہوئے ان کے پاس دلائل نہیں ہوتے، کیونکہ وہ حق پر نہیں ہوتے۔ مثلاً ایک آدمی رات کے وقت کہے: یہ دن ہے تو اس کے پاس کیا دلائل ہوں گے؟ حق بات تو اتنی پکی ہوتی ہے کہ جب حق بات آتی ہے تو باطل خود مٹ جاتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝﴾ [الاسراء:۸۱]

''اور کہو: حق آن پہنچا، اور باطل مٹ گیا، اور یقیناً باطل مٹنے ہی والا ہے۔''

باطل فرقوں کے پاس دلائل تو ہوتے نہیں تو وہ اپنی طرف سے لوگوں کے ذہنوں میں شکوک، شبہات، ظنیات اور وہم ڈالتے ہیں کہ اگرچہ حق ختم نہ ہو، لیکن ہل تو جائے۔

عیسائی این جی اوز اور مشنریز:

عیسائی اور یہودی مشنیریوں کے جو داعی ہیں وہ اپنی دعوت وتبلیغ کے لیے مختلف ملکوں میں آتے ہیں، کیونکہ ان کے اقتدار کا دور ہے۔ اس لیے ان کا ایک بجٹ ہوتا ہے۔ پھر وہ آ کر اس بجٹ سے ویلفیئر کے کام کرتے ہیں۔ مثلاً: ہسپتال بنا دیے، سرائے بنا دیں، کوئی لنگر لگوا دیا یا کوئی حادثہ ہو گیا تو وہاں مدد کے لیے پہنچ گئے اور اپنے مشنری سکول بنوا دیے۔ ان کی ایک سالانہ رپورٹ ہوتی ہے۔ تو ان کے ایک بڑے پوپ نے کہا کہ ہم نے آپ پر کروڑوں کا بجٹ خرچ کیا ہے، آپ بتائیں کہ کتنے لوگوں نے مذہب عیسائیت کو قبول کیا ہے؟ تو ایک پادری نے رپورٹ دی کہ میں نے فلاں ملک میں فلاں مقام پر کام کیا ہے۔ اس نے کہا کہ عیسائی تو ایک بھی نہیں بنا، لیکن مسلمان بھی کوئی نہیں رہا۔ ان کی سیرت، تمدن، لباس، ثقافت، کلچر اور ان کا ماحول اپنا بنا دیا ہے۔ اتنی محنت کو اگر آپ کہتے کہ میں نے کچھ نہیں کیا تو پھر میں کیا کرتا؟

آپ مشنری سکولوں میں دیکھیں! مسلمانوں کے بچے وہاں پڑھتے ہیں۔ عیسائیت کا ترانہ ہوگا، تثلیث کا نشان ہوگا۔ بچے کو بھی نہیں کہیں گے کہ تو عیسائی ہو جا، بچہ ان سے متاثر ہوتا ہے۔ کیونکہ پرائمری سے کالج تک ان کے پاس پڑھتا آ رہا ہے۔ تو ان اعدائے اسلام کا کام یہی ہے کہ وہ مسلمان کو شبہات میں ڈالتے ہیں تو وہ مسلمان ہل جاتا ہے اور اللہ رحمت فرمائے آخر میں بھٹکنا شروع ہو جاتا ہے۔

قدیم کفار کے اعتراضات کا محور:

جب شروع میں قرآن اترا تو اس وقت حضور ﷺ کے مقابلہ میں مشرکین مکہ تھے جو جاہل لوگ تھے، اُمی تھے، ان کے پاس آپ ﷺ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں آیا تھا، کوئی کتاب بھی نہیں اتری تھی۔ کیونکہ حضور ﷺ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان تقریباً چھ سو سال کا عرصہ ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ امی تھے تو ان کے شبہات بھی تو ان کی عقلی سطح کے مطابق اور اسی قسم کے ہوں گے۔ اس لیے وہ کبھی یہودیوں کے پاس جاتے تھے کہ تم ہمیں سوال بتاؤ کہ ہم حضور ﷺ سے کیا پوچھیں اور وہ نہ بتا سکیں۔ پھر ہم مسلمانوں کو کہہ سکیں گے کہ یہ لاجواب ہو گئے ہیں اور کبھی کبھی عقل کے مطابق کہہ دیتے تھے کہ یہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے، یہ تو کسی شاعر کا تخیلاتی کلام ہے۔

حضور ﷺ پر شاعر ہونے کا الزام:

لیکن یاد رکھیں! شاعر سے مراد موجودہ دور کا شاعر نہیں ہے۔ عرب ان پڑھ ضرور تھے، لیکن زبردست ادیب تھے اور ان کا زبردست حافظہ تھا۔ کھڑے کھڑے سینکڑوں اشعار پڑھ لیتے تھے۔ ایک بدوی بھی کھڑے کھڑے کئی اشعار پڑھ دیتا تھا۔ حضور ﷺ کے سامنے شعرائے عرب کا کلام پیش کیا۔ حضور ﷺ خود شعر نہیں کہتے تھے۔ شعر کہنا کوئی شان والی بات نہیں ہوتی۔ حضور ﷺ نے کبھی خود شعر کہا ہی نہیں ہے۔ ہاں! حضور ﷺ کا کلام نہایت فصیح و بلیغ تھا، آپ کو جوامع الکلم دیے گئے تھے۔ اس لیے کبھی کبھی حضور ﷺ مرصع، مسجع کلام فرماتے تھے۔ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا:

أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ
أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

[صحیح البخاری، حدیث: ۲۹۳۰، باب: مَنْ صَفَّ أَصْحَابَهُ عِنْدَ الْهَزِيمَةِ]

یہ شعر نہیں ہے۔ اس میں قوافی ہوتے ہیں، اس کے اوزان ہوتے ہیں۔ اس کے اشعار کے وزن کو آپس میں ملایا جاتا ہے۔ تکلفاً اشعار بنائے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ حضور ﷺ کی انگلی مبارک میں چوٹ لگی تو حضور ﷺ نے فرمایا:

هَلْ أَنْتِ إِلَّا اِصْبَعٌ دَمِيْتِ

وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا لَقِيْتِ

''تم ایک انگلی ہی تو ہو اور یہ چوٹ بھی تمہیں اللہ کے راستے میں لگی ہے۔''

[صحیح البخاری، حدیث:۶۱۴۶ جابُ، مَا یَجُوزُ مِنَ الشِّعْرِ وَالرَّجَزِ]

یہ شعر نہیں ہوتا، لیکن ان مشرکین نے حضور ﷺ کو شاعر اس لیے کہا کہ جیسے شعراء اپنے خیالات میں ایسی ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اسی طرح ان کے نزدیک...... نعوذ باللہ!...... گویا کہ حضور ﷺ نے بھی حقیقت سے ہٹ کر کوئی بات کہہ دی ہے۔

شاعرانہ تخیلات کا واقعہ نمبر ۱:

جیسے متنبی نے اپنے ممدوح بادشاہ کی بہادری کی اور اس کے گھوڑوں کی جو تعریفیں کی ہیں کہ میرا بادشاہ جب گھوڑے پر بیٹھ کر دشمنوں پر حملہ کرتا ہے تو گھوڑے کے پاؤں سے مٹی اُڑتی ہے۔ وہ ایسے بن جاتی ہے جیسے سڑک بن جائے کہ اتنی اس میں طاقت ہے۔ اگر وہ چاہے تو اس میں بھی گھوڑا دوڑا سکتا ہے۔ یہ مبالغہ ہے۔

واقعہ نمبر ۲:

جیسے حافظ شیرازی کو بادشاہ نے بلایا اور کہا: میں نے تو اپنے خزانے بخارا اور سمرقند کو آباد کرنے کے لیے لگا دیے اور تم کیسے آدمی ہو کہ تم نے اپنے محبوب کے ایک تل پر بخارا و سمرقند کو صدقہ کر دیا ہے؟ اس نے کہا: بادشاہ! ناراض کیوں ہوتے ہیں؟ اسی سخاوت ہی کی وجہ سے آج میں بھیک مانگ رہا ہوں۔ بادشاہ ہنس پڑا اور ناراضگی کا قصہ ختم ہو گیا۔ مقصد یہ ہے کہ یہ شاعرانہ تخیل تھا۔

واقعہ نمبر ۳:

ایک شاعر کو بادشاہ نے گھوڑا دے دیا اور دو دن کے بعد گھوڑا بھوکا مر گیا۔ اب اس نے سوچا کہ بادشاہ کو پتا لگے

گا تو بادشاہ تو سزا دے گا کہ اس گھوڑے کا خیال نہیں رکھا اور وہ مر گیا۔ بادشاہ نازک مزاج ہوتے ہیں۔ وہ شاعر کچھ دن کے بعد بادشاہ کی مجلس میں خود آ گیا کہ بجائے اس کے کہ دشمن خبر پہنچائے میں خود ہی بتا دوں۔ بادشاہ کو بھی یاد آ گیا تو اس نے پوچھا کہ گھوڑے کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا: جناب! آپ نے ایسا تیز گھوڑا دیا اور وہ اتنا تیز تھا کہ اس دنیا سے ہی نکل گیا۔ اتنے تیز گھوڑے کو کیسے سنبھالتا؟ بادشاہ سمجھ گیا کہ وہ مر گیا ہے۔ یہ شاعرانہ تخیل ہے۔

کفار کا حضور ﷺ کو شاعر کہنے کی ایک وجہ:

مشرکین بھی حضور ﷺ کو شاعر کہتے تھے، کیونکہ آپ فرماتے تھے کہ پوری دنیا پر میرا دین غالب ہوگا، قیصر وکسریٰ کو مٹا ڈالیں گے، تمام جزائر عرب پر اسلام کا غلبہ ہوگا اور اسلام ہی سلامتی وامن کا ذریعہ ہوگا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ کوئی عورت سونے کے زیورات سے لدی ہوئی مکہ سے صنعاء تک جائے گی تو کوئی اس کو چھیڑ نہیں سکے گا۔ اس لیے وہ کہتے تھے کہ شاعرانہ تخیل ہے، ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قیصر وکسریٰ ان لوگوں کے ہاتھوں فتح ہو جائیں جن کے پاس کھانے کو کچھ نہیں اور نہ فوج ہے، نہ قوت ہے اور نہ طاقت ہے؟ یہ مکہ میں نہیں رہ سکتے اور یہ روم کو فتح کر لیں گے؟ اس لیے وہ شاعر کہتے تھے، ورنہ حضور ﷺ نے شعر کبھی نہیں کہے تھے۔ اور کبھی وہ حضور ﷺ کو ساحر (جادوگر) کہہ دیتے۔ حالانکہ جادوگر کہاں اور محمد رسول اللہ ﷺ کہاں......!!؟

جادوگروں کی گندگیاں:

جادوگر تو غلیظ جگہوں پر ہوگا، ناپاک اور گندا ہوگا۔ اس کے کمرے میں جائیں تو بدبو آ رہی ہوگی اور اس کے بدن سے بھی بدبو اٹھے گی۔ کیونکہ جادو اس وقت چلتا ہے جب غلیظ جگہ ہو۔ وہ مسجد میں تھوڑا آئے گا، کیونکہ جادوگروں کا تعلق شیاطین کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب حمام میں جائیں تو پہلے پناہ مانگیں:

((اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۱۴۲]

"اے اللہ! میں ناپاک چیزوں اور ناپاکیوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔"

کیونکہ یہاں آ کر شیاطین شرارت کرتے ہیں۔ اس لیے جو جادوگر ہوگا ایک تو اس کے چہرے پر لعنت برس رہی ہوگی اور دوسرا وہ کبھی پاک نہیں ہوگا۔ (انڈیا اور پاکستان میں یہ لوگ ہوتے ہیں۔ اور بنگال کا جادو ویسے بھی مشہور ہے) حتیٰ کہ اپنے جادو کو زور دینے کے لیے بعض لوگ خنزیر کی ہڈی لے کر انگوٹھیوں میں چڑھوا لیتے ہیں، تا کہ نجس

الغین چیز ہر وقت میرے ساتھ رہے۔

حالانکہ حضور ﷺ صاف ستھری جگہ پر رہنے والے تھے۔ خوشبو پسند تھی اور خود آپ ﷺ کے پسینے میں بھی خوشبو تھی۔ حالانکہ پسینہ میں بدبو ہوتی ہے۔ جیسے آپ اپنے پسینے کو سونگھیں کہ کتنی بدبو ہوتی ہے؟ اسی سے آپ اپنے قیمتی ہونے کا اندازہ لگالیں۔

قبر میں عام مردوں کی حالت:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"مَا بَالُ مَنْ أَوَّلُهُ نُطْفَةٌ مَذِرَةٌ وَ آخِرُهُ جِيفَةٌ" [شعب الایمان،حدیث:۸۲۱۱]

"یہ کیسا انسان ہے جس کی ابتدا ایک بدبودار پانی سے ہے اور جس نے مرنے کے بعد بھی ایک بدبودار لاش بن جاتا ہے۔"

آپ کبھی قبرستانوں سے گزریں۔ اتنی ہوا ہوتی ہے کہ آدمی برداشت بھی نہیں کرسکتا۔ اس لیے ڈاکٹر لوگ جو قبر کشائی کر کے پوسٹ مارٹم کرتے ہیں ان سے پوچھیں کہ کیا حال ہوتا ہے؟ ہاں! بعض لوگوں کی لاشوں کو اللہ نے محفوظ رکھا ہوتا ہے۔ اب بھی شہید ہونے والوں کی لاش سے اور اہل اللہ کی لاش سے خوشبوئیں آتی ہیں۔

حضور ﷺ کو جادوگر کہنے کی وجہ:

وہ حضور ﷺ کو ساحر اس لیے کہتے تھے کہ جس طرح جادو فوراً اثر کرتا ہے اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی نظر بھی فوراً اثر کرتی ہے کہ جو آپ کی زبان سے قرآن سنتا ہے اس پر اثر ہو جاتا ہے اور وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ اس لیے وہ کہتے تھے کہ حضور ﷺ جادوگر ہیں۔ اللہ نے قرآن میں ان لوگوں کی تردید کی ہے۔ فرمایا:

﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ ﴿٤١﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ﴿٤٢﴾﴾
[الحاقۃ:۴۱،۴۲]

"اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے، (مگر) تم تھوڑا ہی ایمان لاتے ہو۔ اور نہ یہ کسی کاہن کا کلام ہے، (مگر) تم تھوڑا ہی سبق لیتے ہو۔"

حضور ﷺ کو کاہن کہنے کی وجہ:

حضور ﷺ کو کاہن اس لیے کہتے تھے کہ جس طرح کاہن غیب کی خبریں دیتے تھے حضور ﷺ بھی غیب کی

خبریں دیتے ہیں کہ کبھی حضرت نوح علیہ السلام کی، کبھی حضرت صالح علیہ السلام کی، کبھی جنت کی اور کبھی مصر کے فرعون کی بات بتاتے ہیں۔ یہ تو غیب کی خبریں ہیں۔ اس لیے وہ حضور ﷺ کو کاہن کہتے تھے۔

مشرکین کے دوسرے شبہات:

شبہات مشرکین بھی ڈالتے تھے جتنی ان کی عقل تھی۔ کبھی کہتے:

﴿لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ [الانفال:۳۱]

''اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس جیسی کلام پڑھ سکتے ہیں۔ یہ تو پرانے زمانے کے قصہ کہانیاں ہیں، اللہ کا کلام نہیں ہے۔''

اور کبھی شبہ ڈالتے کہ محمد (ﷺ) ''مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ'' (سکھائے ہوئے اور دیوانے) ہیں۔ اور کبھی کہہ دیتے کہ یہ اللہ کا کلام نہیں، بلکہ حضور ﷺ نے خود بنایا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی شبہات نہیں تھے۔ اللہ نے ان کے ایک ایک شبہ کا جواب دیا ہے۔

آج کا دور:

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں علم اتنی ترقی کر چکا ہے کہ کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو باقی ہو۔ سائنسی علوم، صناعات، اختراعات ہیں اور آج کل آپ کمپیوٹر کو دیکھ رہے ہیں۔ اب لگتا ہے کہ فصل پک چکی ہے یا پک رہی ہے، اب کٹنے کی دیر ہے۔ چھوٹا سا موبائل ہے، اس میں کیمرہ بھی ہے، اس میں آپ سارے جہان کی معلومات ڈال لیں۔ کوئی تار بھی نہیں ہے۔ اور جو نمبر ڈائل کرتے ہیں بات اسی سے کرواتا ہے اور کسی سے نہیں کرواتا۔ چھوٹی سی مائیکرو فلم کے اندر تیس تیس جلد کی کتابیں آگئیں۔ دس دس کمروں کی جو لائبریریاں بنی ہوئی تھیں ان کو دو چار سی ڈیز میں فیڈ کر دیا گیا ہے۔

مجھے ایک دوست نے امریکہ سے پام ہدیہ بھیجا۔ میرا تو اس سے کوئی کام نہیں تھا، لیکن اتفاق کہ میری ڈسٹرک کا ایک دوست آیا ہوا تھا۔ میں نے کہا: چلو کسی بہانے اس کو ہدیہ بھیج دوں۔ تو بعد میں اس نے ٹیلی فون کیا اور کہا کہ جی صاحب! آپ نے تو میری جان چھڑوا دی ہے۔ میں نے کہا: کیسے؟ اس نے کہا: میرے جتنے مقدمات تھے میں نے سارے فیڈ کر دیے ہیں۔ اب مجھے فائلیں اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، بس یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کونسا مقدمہ ہے؟ اس کا عنوان کیا تھا؟ اور اعتراض کیا تھا؟ میں نے ان سب کو اس میں فیڈ کر دیا ہے۔ تھوڑی دیر میں مقدمہ تیار

ہوجاتا ہے۔ آپ نے میرے اوپر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اب تو اس سے بھی آگے کی چیزیں آگئی ہیں۔ اس لیے شبہات واعتراضات بھی اسی قسم کے آئیں گے۔ اصولی بات ہے کہ جب آدمی کے پاس جدید علوم ہوں گے تو اس کی روشنی میں بیٹھ کر اعتراض کرے گا۔ اور یہ اعتراضات اس وقت سے شروع ہو گئے تھے جب سے یہ علم شروع ہوا۔

ترتیب قرآنی پر اعتراض:

سب سے پہلے یہ شبہ ڈالا کہ اگر یہ اللہ کا کلام ہے تو اس میں ترتیب کیوں نہیں ہے؟ حالانکہ مسلمان کہتے ہیں کہ ان کا رب بھولتا بھی نہیں ہے۔ تو یہ کیا ہے؟ کلام ہو رہا تھا قیامت کا اور درمیان میں بات رسالت کی آگئی، بات ہو رہی ہے توحید کی اور درمیان میں رسالت کا ذکر آگیا۔ پورے قرآن میں ترتیب ہی نہیں ہے۔

فرمایا: ﴿لَآ أُقۡسِمُ بِيَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ ۝ وَلَآ أُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ ۝﴾ [القیامۃ:۱،۲] (میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے)۔ پڑھتے جائیں۔ آگے آتا ہے: ﴿لَا تُحَرِّكۡ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعۡجَلَ بِهٖ ۝﴾ [القیامۃ:۱۶] (اے پیغمبر!) آپ اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے، تاکہ آپ اس کو جلدی لیں)۔ میرے مدنی! آپ خاموش رہیں، جب جبرائیل قرآن پڑھے تو آپ زبان کو حرکت نہ دیں، آپ غم نہ کریں کہ آپ کو بھول جائے گا۔ ہم یہ قرآن جمع کر کے آپ کے سینے میں محفوظ کر دیں گے، ہم سمجھا دیں گے۔ پھر دوبارہ قیامت کا ذکر شروع ہو گیا۔ فرمایا: ﴿كَلَّا بَلۡ تُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُوۡنَ الۡاٰخِرَةَ ۝﴾ [القیامۃ:۲۰،۲۱] (اے منکرو!) ہرگز ایسا نہیں، بلکہ تم دنیا سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ بیٹھتے ہو)۔

انہوں نے کہا کہ یہ کیسے اللہ کا کلام ہے کہ پہلے بھی قیامت کا ذکر ہے اور بعد میں بھی قیامت کا ذکر ہے اور درمیان میں ہے کہ: ﴿لَا تُحَرِّكۡ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعۡجَلَ بِهٖ ۝﴾ (اپنی زبان مبارک کو حرکت نہ دیں)۔

اسی طرح قرآن میں ہے: ﴿سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّكَ الۡاَعۡلَى ۝ الَّذِيۡ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِيۡ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝ وَالَّذِيۡۤ اَخۡرَجَ الۡمَرۡعٰى ۝ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحۡوٰى ۝﴾ [الاعلیٰ:۱تا۵] (اے پیغمبر!) آپ (اور جو مومن آپ کے ساتھ ہیں) اپنے پروردگار عالیشان کے نام کی تسبیح کیجئے جس نے (ہر شے) کو بنایا، پھر (اس کو) ٹھیک بنایا۔ اور جس نے تجویز کیا، پھر راہ بتلائی۔ اور جس نے (زمین سے) چارہ نکالا، پھر اس کو سیاہ کوڑا کر دیا)۔ یہ اللہ کی صنعتوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ لیکن آگے اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں: ﴿سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰۤى ۝ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعۡلَمُ الۡجَهۡرَ وَمَا يَخۡفٰى ۝﴾

[الاعلیٰ:۶،۷] (ہم آپ کو ایسا یاد کرائیں گے کہ آپ نہیں بھولیں گے، مگر ہم چاہیں تو بھلوا سکتے ہیں)۔ یعنی اس کی تلاوت بھی منسوخ کر سکتے ہیں اور اس کا حکم بھی منسوخ کر سکتے ہیں۔ ہم چاہیں تو حکم منسوخ کر دیں اور تلاوت باقی رکھ دیں۔ ہم چاہیں تو تلاوت منسوخ کرے حکم باقی رکھ دیں۔ ہماری تو قدرت ہے۔

اللہ کی صفات کا ذکر ہو رہا تھا اور درمیان میں یہ بات آگئی۔ تو شبہ ڈالتے ہیں کہ جب قرآن میں ترتیب ہی نہیں تو یہ اللہ کا کلام نہیں ہے۔

مدنی سورتیں پہلے مکی بعد میں کیوں؟

دوسرا انہوں نے کہا کہ ایک ترتیب نزولی ہے اور دوسری ترتیب قرأت ہے جس کو بعض علماء کی اصطلاح میں کہتے ہیں کہ ایک ترتیب نزولی ہے اور ایک ترتیب رسولی ہے۔ تو شبہ ڈالتے ہیں کہ جب اللہ کا قرآن اترتا ہے تو وہ: ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ①﴾ [العلق:۱] (پڑھو اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے سب کچھ پیدا کیا) سے شروع ہوتا ہے، لیکن جب ہم قرآن پڑھتے ہیں تو جو سورتیں مکی ہیں وہ آخری پاروں میں اور جو بعد میں مدنی سورتیں اتری ہیں وہ پہلے ہیں۔ سورۂ بقرہ، انعام، مائدہ اور انفال یہ سب مدنی سورتیں ہیں اور پہلے ہیں، جبکہ: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ①﴾ [الاعلیٰ:۱] (اپنے پروردگار کے نام کی تسبیح کرو جس کی شان سب سے اونچی ہے)۔ ﴿عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ①﴾ [النبا:۱] (یہ (کافر) لوگ کس چیز کے بارے میں سوالات کر رہے ہیں؟) یہ مکی سورتیں ہیں اور بعد میں ہیں۔

تو نعوذ باللہ! دشمنوں نے یہ بھی اعتراض کیا، تا کہ مسلمانوں کے دلوں میں، دماغ میں یہ بیٹھ جائے کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے۔

آج کل کے مسلمان کا حال:

آج کل اپنے پڑھے لکھے لوگوں کو بات کرو تو وہ بھی ایسے شبہات ڈالتے ہیں کہ مولوی کی بات بس سن لیا کرو، یہ کوئی قرآن تھوڑا ہے، قرآن میں کس جگہ لکھا ہے کہ داڑھی رکھو؟ بس یہ مولوی کہتے رہتے ہیں۔ قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ عورت اس قسم کا پردہ کر کے باہر نکلے؟ قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ خوشی نہ مناؤ، بسنت نہ مناؤ، ویلنٹائن ڈے مناؤ، یا نیو ائیر نہ مناؤ؟ یہ قرآن کی کس آیت میں لکھا ہے؟ ان مولویوں کو چھوڑو۔ یہ تو خوشی بھی نہیں کرنے دیتے،

انجوائے بھی نہیں کرنے دیتے۔ یہ تو حقوقِ انسانی ہیں۔ یہ مولوی ہماری آزادی پر ڈاکہ ڈالتے ہیں، ان کی کوئی بات نہیں ماننا۔ انہوں نے اپنا ایک حلقہ بنایا ہوا ہے کہ وہ لوگوں کو کہیں۔ اور اگر آپ کا عرس کا دل کرتا ہے تو ٹھیک ہے، نیو ایئر منائیں ٹھیک ہے، اگر ہماری بیٹیوں نے ڈانس کیا تو ٹھیک ہے، لوگ خوش ہوتے ہیں، ان کو جدید حسن ملا۔ تھرکتے ہوئے اعضا ملے، شاعری کرتا ہوا انگ انگ نظر آیا۔ لوگ خوش ہو گئے۔ اللہ نے حسن چھپا کر رکھنے کے لیے تھوڑی دیا ہے، اگر کوئی لڑکی خوبصورت ہے تو اس کو پلیٹ فارم پر لے آئیں۔ یہ شبہات مسلمانوں کے اندر آج بھی ہیں۔ وہ آدمی اپنے آپ کو بہت بڑا مسلمان سمجھتا ہے جو اپنے گھر میں قرآن پڑھوا لے یا آیتِ کریمہ ایک لاکھ دفعہ پڑھوا دے یا سال میں ایک دفعہ مولوی کو کچھ پیسے دے کر میلاد کی جھنڈیاں لگوا دے۔ وہ کہتا ہے کہ تم میرے اسلام کے بارے میں سوال کرتے ہو، میں تو ہر سال میلاد مناتا ہوں اور دیگیں پکواتا ہوں اور راستے مسکینوں کو کھانا دیتا ہوں۔ اگر میں نماز نہیں پڑھتا تو کیا ہو گیا؟

یہ اللہ کے ساتھ میرا ذاتی معاملہ ہے، اس میں مولوی کہاں کا ٹھیکیدار ہے؟ اگر ہم نمازیں پڑھیں گے تو اس میں اللہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے تو ہم نمازیں پڑھ کر کیا کریں گے؟ اگر ہم نمازیں نہ پڑھیں تو کونسا اللہ کا نقصان ہو جائے گا؟ ویسے ہم مسلمان ہیں، میلاد مناتے ہیں، بائیس رجب کو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے کونڈے پکاتے ہیں اور ستائیس رجب کو معراج شریف کا حلوہ پکواتے ہیں، اگر بندہ مر جائے تو قل شریف اور ساتے جمعراتیں اور چہلم کراتے ہیں۔ اس سے بڑی اسلام کی اور کیا دلیل ہو گی؟

یہ شبہات بھی لوگوں کے دماغوں میں ڈالے گئے ہیں اور ان کی وجہ سے مسلمان اسلام سے دور ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اسلام کو رسومات کا مجموعہ بنا دیا کہ اگر یہ رسومات ہیں تو مسلمان ہے۔ جیسے شیعہ کہتے ہیں کہ بس حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور اہلِ بیت کی محبت دل میں ہو، اسی سے نجات ملنی ہے۔ اگر زیادہ پکا مومن بننا ہے تو یکم محرم سے دس محرم تک گھر میں چارپائیاں الٹی کر دو، کپڑے سیاہ پہنو، ماتم کرو، جلوسوں میں شرکت کرو، سبیلیں لگا دو، بس جنت کے دروازے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوں گے، جتنے لوگوں کے گلے میں زنجیریں ہوں گی ان سب کو جنت میں بھیج دیں گے اور جتنے نمازی داڑھی والے ہوں گے ان کو نکال دیں گے، کیونکہ اکٹھے تو نہیں ہو سکتے۔ یہ دشمن مسلمانوں کے دلوں میں شبہات ڈال رہے ہیں۔

ترتیبِ قرآنی پر بہترین تفسیر:

الحمد للہ! علماء حقہ پر اللہ تعالیٰ کروڑوں رحمتیں فرمائے اور جو زندہ ہیں اللہ ان سے دین کا کام لے۔ انہوں نے حالات کے پیش نظر ہر چیلنج اور حالات کا مقابلہ کیا۔ علامہ بقاعی نے پوری تفسیر قرآن لکھی "نَظْمُ الدُّرَرِ فِیْ رَبْطِ الآیَاتِ وَالسُّوَرِ" نظامیہ میں اسلامیہ یونیورسٹی نے یہ شائع کرائی تھی، کتاب نایاب ہوگئی اور پوری دنیا میں ختم ہوگئی۔ (اب بیروت سے بار بار چھپ رہی ہے) میں حیدرآباد دکن ایک لائبریری میں گیا تو لائبریرین اچھا نکلا اور اس نے کہا: آپ غم نہ کریں، اس کی طباعت دوبارہ ہو رہی ہے اور میں آپ کو ایک قدیم نسخہ دے دیتا ہوں۔ اس تفسیر میں آیات کا آیات کے ساتھ تعلق اور سورت کا سورت کے ساتھ تعلق، اول آیت کا آخر سورت کے ساتھ تعلق بیان کر کے اعتراضات کرنے والوں کا منہ بند کر دیا کہ سارے قرآن کا آپس میں ربط ہے۔

شبہات کا جواب دینے کی اہمیت:

ہو سکتا ہے بعض لوگوں کے ذہن میں ہو کہ اس سب کی ضرورت ہے، حضور ﷺ کے زمانہ میں تو یہ نہیں تھا۔ بھائی! اس وقت تو یہ مسئلہ نہیں تھا۔ قادیانیت کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کو تو ان سے واسطہ پڑا ہی نہیں۔ خدا نہ کرے اگر آپ کے سامنے کوئی رافضی، کوئی قادیانی آ کر اعتراض کرے تو کیا جواب دیں گے؟ یہاں کے نوجوان نے تو ایسے ملک میں آنکھ کھولی ہے جو دین اسلام پر چلنے والا ملک ہے، جس میں شریعت کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ہے ان کا تو کسی باطل فرقے سے واسطہ ہی نہیں پڑا ہے۔ اسی طرح ہندوؤں کے جو اپنے حق میں دلائل ہیں اور اسلام پر اعتراضات ہیں، جس آدمی کو ان سے واسطہ ہی نہیں پڑا اس کو اس بارے میں کوئی علم ہی نہیں ہے تو وہ ان کے شبہات کا کیا جواب دے گا؟

قرآن کو اللہ کے نام سے شروع کرنے پر شبہ:

اس میں پہلا اعتراض یہ ہے کہ "بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" (شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے) یہ اللہ کا کلام ہے یا بندے کا کلام ہے؟ اگر اللہ کا کلام ہے تو اللہ کسی اور اللہ کے نام سے شروع کر رہا ہے۔ اگر بندے کا کلام ہے تو قرآن ہی نہ رہا، خدا کا کلام ہی نہ رہا۔

حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے مفسر قرآن تھے۔ جب آپ قلات میں تھے تو خان آف قلات کو قلات میں اسلام کا قانون نافذ کرنا پڑا۔ انہوں نے علوم قرآن پر جو لکھا ہے کاش! اس کو کوئی پڑھنے والا اور سمجھنے والا ہوتا۔ ہم تو طالب علم ہیں، ان کی دس فیصد بات سمجھ لیں تو غنیمت ہے۔ انہوں نے لکھا ہے: دنیا میں جتنی بڑی کلامیں گزری ہیں، اس میں کلام کی نسبت کبھی متکلم کی طرف ہوتی ہے اور کبھی کلام کی نسبت غیر متکلم کی طرف ہوتی ہے۔ یہ بھی بلاغت کا ایک انداز ہے تو قرآن بھی کمالِ بلاغت ہے کہ کلام اللہ کا ہے اور مضمون بندے کا ہے کہ میرے بندے تمہارے لیے میں نے یہ کلام کیا ہے، لیکن مضمون تیرا ہے۔

آسان لفظوں میں یوں سمجھیں کہ آپ نے اپنے بیٹے کو کسی یونیورسٹی میں داخلہ دلانا ہے۔ آپ اپلی کیشنز لگاتے ہیں، شہادت لگاتے ہیں، امتحان کے نتائج لگاتے ہیں اور کریکٹر سرٹیفکیٹ لگا کر پرنسپل صاحب کے پاس تشریف لے جاتے ہیں۔ پرنسپل آپ کا دوست ہو تو وہ فائل دیکھ کر کہتا ہے کہ یہ درخواست میں آپ نے کیا لکھا ہے؟ آپ کا بچہ تو داخل ہی نہیں ہوگا، آپ کو تو درخواست لکھنی ہی نہیں آتی؟ پھر وہ خود درخواست لکھوا دیتا ہے۔ جب وہ درخواست خود لکھوا رہا ہے تو پھر درخواست قبول کیوں نہیں ہوگی؟ جب کسی مقدمے میں جج نے رعایت دینی ہو تو وہ وکیل کی جرح خود سکھلا دیتا ہے کہ فلاں کتاب کا فلاں صفحہ اسٹڈی کر کے آنا۔

یہی اللہ پاک کی رحمت ہے کہ اللہ انسانوں کو آخرت کی کامیابی سکھلا رہے ہیں۔ اس کی مثال جیسے اللہ نے فرمایا کہ ہم آدم سے ناراض ہوئے اور جب راضی ہوئے تو: ﴿فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ [البقرۃ: ۳۷] (بعد ازاں حاصل کر لیے آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب سے چند الفاظ تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ ان پر توجہ فرمائی (یعنی توبہ قبول کر لی)۔ تو ان کے دل میں دعائیہ کلمات ڈال دیے کہ ان کلمات سے معافی مانگو، ہم معاف کر دیں گے۔

اور جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب قیامت والے دن سارے لوگ میدانِ حشر میں اکٹھے ہو کر انبیاء علیہم السلام کے پاس جائیں گے۔ وہ جواب دے دیں گے تو سارے میرے پاس آئیں گے تو میں کہوں گا: ((أَنَا لَهَا)) (شفاعت کے تو اللہ نے مجھے چن رکھا ہے) پھر میں عرش کے پاس آؤں گا، اللہ پاک مجھے اپنی ایسی تعریفیں سکھلائیں

گے جو میں اب نہیں جانتا۔ تو پھر اس دعا کے قبول ہونے میں کیا دیر لگے گی؟ اس لیے فرمایا: ((ثُمَّ أَخِرُّ لَهُ سَاجِدًا)) (میں سجدے میں گر جاؤں گا) اور ان محامد کو بیان کروں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: "يَا مُحَمَّدُ! ارْفَعْ رَأْسَكَ" (اے محمد! تم اپنا سر اٹھالو)۔ آپ کی درخواست قبول ہو گئی۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۷۵۱۰، باب: كَلَامِ الرَّبِّ عَزَّ وَجَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ...]

اسی طرح یہاں بھی کوئی اعتراض نہیں، کیونکہ مضمون بندے کا ہے اور پڑھانے اور سکھانے والا خدا ہے۔ جب مضمون بندے کا ہے تو بندہ کہتا ہے: "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" (شروع اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں)۔

دوسرا جواب:

بعض علماء نے اس کا دوسرا جواب دیا ہے کہ سب سے پہلے جو حضور ﷺ پر قرآن اترا وہ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ﴾ تھا کہ میرا مدنی! اس رب کا نام لے کر پڑھیں جس نے پیدا کیا۔ جب اللہ ایک مرتبہ "اِقْرَاْ" کا حکم دے چکے ہیں تو وہ حکم یہاں بھی ہے۔ "اِقْرَاْ" "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" اب یہ ضروری تو نہیں کہ اللہ ہر آیت کے شروع میں "اِقْرَاْ" فرمائیں۔ تو یہ بندے کو حکم ہے۔ (یہ جواب پچھلے صفحات میں گذر چکا ہے۔ انور)

حضور ﷺ نے اسم اعظم کے بارے میں بتایا کہ قرآن پاک میں ایک آیت ہے جو بندہ اس کو پڑھ کر دعا مانگتا ہے تو اس کی دعا کو قبول فرماتے ہیں۔ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [الانبیاء: ۸۷] (آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، آپ (سب نقائص) سے پاک ہیں۔ میں بے شک قصوروار ہوں)۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۳۵۰۵]

اب بتائیں کہ حضرت یونس علیہ السلام کی زبان کون سی تھی؟ وہ عربی تو نہیں تھے۔ پہلے انبیاء علیہم السلام کی زبان عبرانی تھی یا سریانی وغیرہ تھی۔ جیسا کہ ایک روایت میں آتا ہے:

"أَوَّلُ مَنْ تَكَلَّمَ بِالْعَرَبِيَّةِ مِنْ وُلْدِ إِبْرَاهِيْمَ عليه السلام إِسْمَاعِيْلُ عليه السلام."

"حضرت اسماعیل علیہ السلام پہلے نبی ہیں جنھوں نے عربی زبان بولی۔" [الجامع لاحکام القرآن، ج: ۱]

تو حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی زبان میں جو فریاد کی تھی اس کو اللہ نے اپنی کلام میں نقل فرمادیا، اس کے اندر اسم

اعظم بھی رکھ دیا اور ساتھ یہ بھی فرمادیا:

﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ﴾[الانبیاء:۸۸]

''سو ہم نے ان کی دعا قبول کی اور ان کو اس گھٹن سے نجات دی اور ہم اسی طرح (اور) ایمان والوں کو (بھی کرب وبلا سے) نجات دیا کرتے ہیں۔''

اسی طرح جب ایمان والے میری طرف توجہ کریں گے تو میں ان کو بھی غم سے نکالوں گا۔ اس لیے یہ ساری باتیں میرے اللہ کی طرف سے ہیں۔ تعوذ، تسمیہ یا سورۂ فاتحہ جو بھی ہو اب اس پر اعتراض کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ تو کمالِ رحمت ہے کہ خود سکھلا رہے ہیں اور اس پر خود ثواب دے رہے ہیں۔

شبہ، اللہ کی اپنی زبان سے اپنی تعریف:

انہوں نے ایک شبہ یہ ڈالا ہے کہ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' (شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے) اگر یہ اللہ کا کلام ہے تو...... معاذ اللہ!...... اللہ کسی اور اللہ کے نام سے شروع کر رہے ہیں۔ اور پھر یہ شبہ بھی ڈالتے ہیں کہ اگر یہ اللہ کا کلام ہے پھر تو یہ اپنی تعریف ہے۔

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ کلام بلیغ میں کبھی تو کلام متکلم کی اپنی طرف سے ہوتا ہے اور کبھی کلام دوسرے کی طرف سے ہوتا ہے اور مضمون متکلم کا ہوتا ہے۔ جیسے مثال دی تھی کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے دعا سکھلا دی۔ اور دنیاوی بھی ایک مثال دی تھی کہ آپ کسی آفیسر کے پاس کوئی کام ہو وہ آفیسر اگر مہربان ہو تو کہہ دیتا ہے کہ آپ نے درخواست صحیح نہیں لکھی۔ آپ نیا کاغذ لیں، میں لکھوا دیتا ہوں۔ ایک جواب تو یہ ہو گیا کہ اللہ اپنی طرف سے بندوں کو یہ مضمون سکھلا رہے ہیں۔

دوسرا جواب تھا کہ سب سے پہلی وحی ''اِقْرَاْ'' اتری۔ تو وہ ''اِقْرَاْ'' ہر جگہ لگے گا۔ اس سے اعتراض ختم ہو گیا۔

''رَحْمٰن وَرَحِيْم'' کا تکرار:

دوسرا شبہ یہ ہے کہ ایک لفظ کا تکرار بلاغت کے خلاف ہوتا ہے۔ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' میں بھی ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' ہے۔ اگر یہ اللہ کا کلام ہے تو اس میں تکرار کیوں ہے؟ یہ تو فصاحت وبلاغت کے خلاف ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک لفظ کو ایک ہی مقصد کے لیے دوبارہ لایا جائے تو وہ بلاغت کے خلاف ہے۔ سورۂ

رحمٰن میں ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ اکیس (۲۱) دفعہ آیا ہے۔ تو یہ تکرار بلاغت کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ یہ ہر نعمت کے بعد علیحدہ آیا ہے۔ جب اس سے پہلے نعمت الگ ہے تو تکرار نہیں ہے۔ اسی طرح کلام عرب میں دیکھیں:

؎ کَمْ مِنْ نِعْمَةٍ مُنْتَنٰی عَلَيَّ

کَمْ کَمْ کَمْ

''تم نے مجھ پر کتنے احسانات کیے ہیں!! کن کن احسانات کو میں گنوں!!!''

اس کو بلاغت کے خلاف نہیں، بلکہ حسن سمجھا جارہا ہے کہ تیری کتنی نعمتیں ہیں، میں ان کو شمار ہی نہیں کرسکتا۔ یہ ''کَمْ'' کا تکرار نہیں ہے۔

''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' میں ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' طلب فیوض کے لیے ہے کہ اے اللہ! میں تیرے نام سے شروع کر رہا ہوں، مہربانی فرما کر اپنا فیض عطا فرما، رحمتیں نازل فرما۔ اور جب سورۂ فاتحہ میں ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' ہے وہ دلیل محمودیت ہے کہ تمام حمد اللہ کے لیے ہے جو رب العالمین ہے، بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔ جب دونوں جگہ میں ان کا مقصد الگ ہے تو قرآن میں تکرار کیسے ہوا؟

بعض کلام میں تکرار کا حسن:

یہ تو کلام میں بلاغت ہے کہ ایک لفظ کو ایک جگہ لگاؤ تو وہ حسن بن جائے۔ جیسے اُمی لفظ ہے۔ کسی آدمی کو امی کہو، یہ تو شکایت ہے، لیکن اپنے نبی ﷺ کے بارے میں فرمایا: ﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ﴾ [الاعراف:۱۵۷] (جو لوگ کہ ایسے رسول (ﷺ) یعنی نبی امی کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس توریت وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں)۔ اللہ نے فرمایا میرا نبی امی۔ اگر دوسروں کو امی کہیں تو مذمت ہے، لیکن میرے مدنی پاک ﷺ کے ساتھ لگے تو حسن ہے، مدح ہے کہ وہ نبی جو کسی سے نہیں پڑھے، ساری دنیا کو پڑھانے آگئے ہیں۔

اس لیے کسی نے کہا تھا:

تو نے کانٹوں کو چھوا گلستاں کر دیا

کہ وہ لفظ جو ساری دنیا کے ساتھ لگاؤ تو وہ ذم اور شکایت بنتا ہے، لیکن میرے نبی ﷺ کے ساتھ لگتا ہے تو وہ مدح اور تعریف بن جاتی ہے۔

ہندوستان میں ایک شاعر گزرے ہیں، غالباً وہ جگر مراد آبادی مرحوم ہیں۔ وہ ایک جگہ سے گزر رہے تھے۔ ایک عورت دوسرے بالاخانہ میں کھڑی تھی اور لمبے قد کی تھی۔ اب ایک عورت لمبی ہو اور دوسری منزل پر کھڑی ہو اور جگہ بھی گندی ہو تو کہتے ہیں:

طول شب فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے

جدائی کی رات تو بڑی اور لمبی ہوتی ہے۔ وصال کی رات چاہے کتنی بڑی ہو، لیکن چھوٹی ہوتی ہے۔ کسی کا لمبا ہونا شکایت تھی۔ تو وہ بھی اس بازار کی عورت تھی۔ اس نے سلام کیا اور پوچھا: آپ کیا فرما رہے ہیں؟ تو انہوں نے کہا:

وہ زلف جو تیرے رخسار پر پڑی ہے

اب اس کی تعریف ہوگئی۔ ایک ہی کلام کو مذمت سے مدح کی طرف لے آئے۔ یہ ایک شاعرانہ فصاحت وبلاغت ہوتی ہے۔ اور قرآن تو وہ کلام ہے جس کے مقابلے میں ادیب اور شعراء جواب دے گئے۔

ایک بہت بڑے شاعر مسلمان ہوگئے۔ ایک دن صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ ہمیں اپنے شعر سناؤ۔ اس نے کہا: جب سے قرآن پڑھا ہے شعر کہنا ہی چھوڑ دیے ہیں۔ ہم اس کے آگے بول ہی نہیں سکتے۔

اس لیے یاد رکھیں! لفظ ایک ہے، لیکن الگ الگ مقصد کے لیے استعمال ہو رہا ہے، لہٰذا یہ بلاغت کے خلاف نہیں ہے۔

کیا سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں؟

تیسرا شبہ ان کا یہ ہے کہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ میں سے ''اَلْحَمْدُ'' کے اندر الف لام کا استعمال ہوا ہے۔ اور الف لام کا استعمال چار چیزوں کے لیے ہوتا ہے: جنس کے لیے، استغراق کے لیے، عہد ذہنی کے لیے یا عہد خارجی کے لیے۔ اور یہاں الف لام کا استعمال جنس کے لیے ہوگا یا استغراق کے لیے ہوگا۔ یعنی جنس حمد اللہ کے لیے ہے یا حمد کی تمام جزئیات اور اقسام اللہ کے لیے ہیں کہ تمام محامد اس کے لیے ہیں اور ساری کائنات اس کی تعریف کر رہی ہے۔ تو قرآن کا دعویٰ ہے کہ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اور یہ پہلا دعویٰ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ہے۔

اب وہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں تو اسی قرآن میں حضور ﷺ کی تعریفیں بھی ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ''بَشِیْر'' ہیں، ''نَذِیْر'' ہیں، ''مُنِیْر'' ہیں اور ''عَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ'' ہیں۔ اور اسی طرح

قرآن پاک میں کتنے پیغمبروں کی تعریفیں ہیں؟ کہیں ان کے صبر کی تعریف ہے اور کہیں ان کے "صَادِقُ الْوَعْدِ" ہونے کی تعریف ہے۔ اور ادھر آپ کہتے ہیں: تمام محامد اور حمد کی تمام جزئیات اللہ کے لیے ہیں اور یہاں آپ غیر کی تعریف کر رہے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کی تعریف ہے۔ اور تو اور دنیا میں عمارتوں کی بھی تعریف ہے کہ کیا تاج محل بنایا ہے!! کس طرح دریا کے کنارے پر بنایا ہے! باذوق آدمی چاندنی رات میں جا کر اس کے منظر کو دیکھے تو حیران ہو جاتا ہے۔ ذوق نہ ہو تو پھر کیا سمجھ آئے گی؟ ساری تعمیر سرخ پتھروں سے ہے اور انداز ایسے ہے جیسے سرخ گلاب کا پھول ہو۔

ایک عمارت دبئی کے اندر ہے، اس کو برج عرب کہتے ہیں۔ یہ ایک ہوٹل ہے، لیکن چونکہ ہمارے مسلمان ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں کرتے ابھی تک ہم اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں۔ اس ہوٹل کا یہ عالم ہے کہ اس کے ایک کمرے کا کرایہ چوبیس گھنٹے کا پندرہ ہزار ڈالر ہے اور ایک سو در ہم تو اس کے دیکھنے کی ٹکٹ ہے۔ بنانے والا (عیسائی) اتنا شاطر تھا کہ آپ ہوائی جہاز پر بیٹھے ہوں تو آپ کو اس میں تثلیث نظر آئے گی۔ اس نے جو کرنا تھا کر گیا، لیکن ہمارے لوگوں کی سوچ ہی نہیں پہنچی۔ سنا ہے کہ اب کچھ لوگوں نے بات اٹھائی ہے۔ واللہ اعلم!

اسی طرح ہندو آرکیٹیکچر ہوگا اس کو اگر اور کہیں موقع نہ ملے تو میناروں پر جیسے چاند تارا لگایا جاسکتا ہے۔ جب وہ چاند تارا لگائے گا تو ایک ڈنڈی کھڑی کر دے گا، تاکہ ترشول کا نشان بنے۔ وہ اپنی مار جاتا ہے، لیکن مسلمان نہیں سمجھتا۔ مندر کا پجاری جاگتا ہے اور مسجد کا نمازی سوتا ہے۔ انہوں نے ہمارے ہر مقام پر ایسا اثر ڈالا ہے کہ اب مسلمانوں کا کلچر تبدیل کر دیا ہے۔ مسلمان عورتیں تلک لگاتی ہیں، مسلمان عورتیں ساڑھی باندھتی ہیں اور جیولری پہنتی ہیں۔ اسی طرح کے نام رکھتی ہیں۔

مجھے ایک اچھے خاصے مسلمان گھرانے کے آدمی نے کہا کہ میرا والد فوت ہوا تو میرے بیٹے نے کہا کہ جب گرینڈ پاپا کو آگ دیں گے تو آگ میں لگاؤں گا۔ کیونکہ وہ فلمیں دیکھ رہا ہے کہ مُردوں کو جلایا جاتا ہے۔ وہ جو دیکھے گا اس کے پردہ اسکرین پر وہی نقش ہوگا۔

بہر حال وہ اعتراض کرتے ہیں کہ تم مسلمان کہتے ہو کہ ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ اس کی بھی تعریف ہے اور اس کی بھی تعریف ہے۔

جواب:

یادرکھیں! اس کا علماء نے جواب دیا کہ ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، لیکن جہاں مصنوعات کی تعریفیں ہوتی ہیں دراصل صانع کی تعریف ہوتی ہے۔ مثلاً: کسی خطاط کا قطعہ یا آیت کا ٹکڑا لکھا ہوا ہو، جیسے صادقین گزرے ہیں اور حضرت نفیس الحسینی رحمۃ اللہ علیہ گزرے ہیں، جب ان کی نقش کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں سبحان اللہ! یہ دراصل نقش کی تعریف نہیں ہے، بلکہ نقاش کی تعریف ہو رہی ہے۔ جب آپ زمین پر نظر ڈالیں گے اور آسمانوں پر نظر ڈالیں گے تو ان میں نشانیاں نظر آئیں گی۔ فرمایا:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ﴾

[آل عمران:۱۹۰]

''بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کے بارے بارے آنے جانے میں ان عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔''

﴿الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ [آل عمران:۱۹۱]

''وہ لوگ اللہ کی یاد کرتے ہیں کھڑے بھی، بیٹھے بھی اور لیٹے بھی اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں:) اے ہمارے پروردگار! آپ نے اس کو بے فائدہ پیدا نہیں کیا، ہم آپ کو منزہ سمجھتے ہیں۔ سو ہمیں عذابِ دوزخ سے بچا لیجیے۔''

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کریں گے کہ وہ سید الاولین والآخرین ہیں، عظمتوں والے ہیں، امام الانبیاء والمرسلین ہیں، رحمۃ للعالمین ہیں۔ اور جب ان کو پیدا کرنے والا اللہ ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اصل میں اللہ کی تعریف ہے۔ تمام محامد تو اللہ ہی کے لیے ہیں۔ اللہ کے علاوہ کسی مخلوق کی تعریف کریں تو وہ بھی دراصل بنانے والے خالق کی تعریف ہے۔ جیسے ایک عربی شاعر نے کہا:

وَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَهُ آيَةٌ
تَدُلُّ عَلٰى أَنَّهُ وَاحِدٌ

[المحاضرات فی اللغۃ والادب، ص:۳۹]

"ہر ایک چیز میں اس کی نشانیاں ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ واقعی ایک ہے۔"

اور جیسے اردو شاعر نے کہا:

ہر مرغباں تیری تسبیح پڑھ رہا ہے
ہر غنچۂ سحر سے سنتا ہوں نام تیرا

ہر چیز تیری حمد اور تسبیح کر رہی ہے۔ پرندے چہچہا رہے ہیں، کلیاں چٹک رہی ہیں، پھول کھل رہے ہیں اور سمندر کی لہریں ہیں۔ اگر غور کرو تو ہر چیز میں تیری تسبیح اور تحمید ہے، ہر چیز میں تیرا نام ہے۔ اس لیے کہا:

ہر غنچۂ سحر سے سنتا ہوں نام تیرا

میں تو ہر جگہ سے تیرا ہی نام سنتا ہوں۔ تو کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اس اعتراض کی کوئی حیثیت نہیں رہی، کیونکہ واقعی! تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔

رحمٰن و رحیم کی تقدیم و تاخیر کا سوال:

ان کا ایک اور شبہ یہ ہے کہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" اور سورۂ فاتحہ میں "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" آیا ہے۔ "الرَّحْمٰنِ" کا وزن "فَعْلَانٌ" ہے اور "الرَّحِيْمِ" کا وزن "فَعِيْلٌ" ہے۔ "رَحْمٰن" میں پانچ حروف ہیں اور "رَحِيْم" میں چار حروف ہیں۔ قاعدہ یہ تھا کہ پہلے ادنیٰ کو ذکر کیا جاتا ہے، تاکہ "تَرَقِّي مِنَ الْاَدْنٰى اِلَى الْاَعْلٰى" ہو۔ تو "الرَّحِيْمِ" کا ذکر پہلے ہوتا اور "الرَّحْمٰنِ" کا ذکر بعد میں ہوتا، لیکن دونوں جگہ "الرَّحْمٰنِ" کا ذکر پہلے اور "الرَّحِيْمِ" کا ذکر بعد میں ہے۔ تو یہ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف تنزل ہے۔ آدمی نیچے سے اوپر تو جاتا ہے اوپر سے نیچے تو نہیں آتا۔

پہلا جواب:

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اس کو محسوسات میں آپ نہ لے جائیں، کیونکہ اس کو محسوسات کے ساتھ تشبیہ دینا کوئی عقل کی بات نہیں ہے۔

دوسرا جواب:

دوسرا جواب یہ ہے کہ کلام میں جیسے "تَرَقِّي مِنَ الْاَدْنٰى اِلَى الْاَعْلٰى" ہوتی ہے اسی طرح "نُزُوْل مِنَ الْاَعْلٰى اِلَى

الأدنٰی" بھی ہوتی ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿فَأَمَّآ إِن كَانَ مِنَ ٱلْمُقَرَّبِينَ ۝ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ وَجَنَّتُ نَعِيمٍ ۝ وَأَمَّآ إِن كَانَ مِنْ أَصْحَٰبِ ٱلْيَمِينِ ۝ فَسَلَٰمٌ لَّكَ مِنْ أَصْحَٰبِ ٱلْيَمِينِ ۝﴾[الواقعۃ: ۸۸تا۹۱]

"پھر (جب قیامت واقع ہوگی تو) جو شخص مقربین میں سے ہوگا اس کے لئے تو راحت ہے اور (فراغت کی) غذائیں ہیں اور آرام کی جنت ہے۔ اور جو شخص داہنے والوں میں سے ہوگا تو اس سے کہا جائے گا کہ تیرے لیے امن وامان ہے کہ تو داہنے ہاتھ والوں میں سے ہے۔"

دیکھیں! پہلے مقربین کا بیان ہے، حالانکہ وہ سب سے اعلیٰ ہیں، پھر اصحابِ یمین اور پھر اصحابِ شمال ہیں۔ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف آ رہے ہیں۔

تیسرا جواب:

بعض علماء نے اس کا جواب دیا کہ "الرَّحْمٰنِ" میں واقعی امبالغہ ہے، لیکن المبالغۃ "مِنْ حَيْثُ الْكَمِّ" بھی ہوتی ہے اور "مِنْ حَيْثُ الْكَيْفِ" بھی ہوتی ہے۔ مثلاً: ایک جگہ دس موتی رکھے ہیں اور دوسری جگہ ایک موتی رکھا ہے۔ کمیت کے اعتبار سے دس زیادہ ہیں۔ اور کیفیت یہ ہے کہ دس موتی ایک لاکھ کے ہیں اور یہ ایک موتی دو لاکھ کا ہے۔ تو کیفیت میں ایک موتی بڑھ گیا۔ اللہ کرے بات سمجھ آ جائے۔

جیسے ایک فلسفی نے اپنے شاگردوں کو بٹھا کر شیشہ کا ایک مرتبان رکھا اور ربڑ کی چھوٹی گیندیں اس میں ڈالتا گیا، جب وہ بالکل بھر گیا تو شاگردوں سے پوچھا: کیا یہ مرتبان بھر گیا ہے؟ شاگردوں نے کہا: جی ہاں! بھر گیا ہے، اس کے اندر تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اب اس فلسفی نے گندم کے دانے اٹھا کر اس میں ڈال دیے۔ خالی جگہوں میں دانے چلے گئے تو اس نے کہا: اب بتاؤ کہ بھر گیا ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا کہ اب تو بالکل بھر گیا ہے، جو خالی جگہ نظر آ رہی تھی آپ نے اس میں گندم کے دانے بھر دیے ہیں۔ اس نے تھوڑی دیر کے بعد ریت کی پڑیا اٹھائی اور ریت بھر دی۔ ریت بھی اندر چلی گئی۔ اس نے کہا: اب بتاؤ؟ انہوں نے کہا کہ اب تو بالکل بھر گیا ہے۔ اس نے کہا: کتنی دفعہ اس کو بھرو گے؟ ہر دفعہ کہتے ہو کہ بھر گیا ہے۔ وہ کافی پی رہا تھا اس نے وہ اس میں انڈیل دی، وہ کافی اس ریت کو پی گئی، شاگردوں سے پوچھا: اب بتاؤ؟ انہوں نے کہا کہ بات تو ٹھیک ہے کہ کافی بھی اندر چلی گئی۔ اس نے کہا: میں نے تمہیں یہی سمجھانا تھا کہ اگر تم نے پہلے سے دماغ کے اندر ریت بھر دی ہے تو باقی چیزیں کیسے آ ئیں

گی؟ اگر تم اس دماغ کے اندر گندی باتیں سٹور کرتے رہو گے تو اس کا کیا فائدہ ہوگا؟ اچھی باتوں کے لیے جگہ ہی نہیں رہے گی۔

اس لیے یاد رکھیں! جب تک آپ تعصب کی عینک کو نہیں اتاریں گے اس وقت تک سمجھ نہیں آئے گا۔ اچھے مسلمان نہیں بنتے، لیکن اچھے انسان بننے کی نیت تو کریں اور پھر دیکھیں کہ تمہیں قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ آپ دنیا میں اللہ کی نعمتیں دیکھیں باعتبار کمیت کے زیادہ ہیں کہ اللہ کی رحمتیں سب پر ہو رہی ہیں، مسلمانوں پر بھی اور کافروں پر بھی۔ بارش سب پر برستی ہے۔ اس لیے "الرَّحْمٰنِ" کو پہلے لایا گیا۔

اور قیامت کے دن اس کی نعمتیں عدد کے اعتبار سے، کمیت کے اعتبار سے کم ہو جائیں گی، کیونکہ دنیا کے اندر سب پر تھیں اور آخرت میں صرف مسلمانوں پر ہوں گی۔ مثلاً: دنیا کے اندر دو لاکھ آدمی تھے، ایک لاکھ کافر اور ایک لاکھ مسلمان۔ دنیا کے اندر ایک لاکھ کافر بھی اللہ کی نعمتیں کھا رہا ہے۔ لیکن جنت میں صرف ایک لاکھ مسلمان ہوں گے، کافر تو جنت میں نہیں ہوگا۔ اس لیے وہاں عدد کے اعتبار سے نعمتیں کم ہو جائیں گی اور کیفیت کے اعتبار سے آخرت میں نعمتیں بڑھ جائیں گی۔ وہ تو ایسی نعمتیں ہیں جن کو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں، کسی کان نے سنا نہیں اور کسی کے دل و دماغ سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہاں بھی عورتیں ہوں گی، لیکن حور عین ہوں گی، وہاں بھی مکان ہوں گے، لیکن سونے چاندی کے مکان ہوں گے اور وہاں بھی شراب ہوگی، لیکن شرابِ طہور ہوگی، وہاں بھی نہریں ہوں گی، لیکن سلسبیل ہوگی، نہر کوثر ہوگی۔ اس لیے اللہ نے "الرَّحِيْمِ" کی صفت کو مؤخر رکھا ہے۔

ایک اور جواب:

دنیا پہلے ہے اور آخرت بعد میں ہے۔ تو جو چیز پہلے تھی اس کو پہلے ذکر کیا اور جو چیز بعد میں تھی اس کو بعد میں ذکر کیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"۔

عبادت پہلے اور مدد بعد میں کیوں؟

سورۂ فاتحہ پر ایک اعتراض یہ کرتے ہیں کہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ (اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں) میں عبادت پہلے ہے اور مدد بعد میں ہے، حالانکہ مدد پہلے ہوتی ہے اور عبادت بعد میں ہوتی ہے۔ جیسے وضو پہلے اور نماز بعد میں ہے۔

جواب نمبر 1:

بعض علماء نے یہ جواب دیا کہ کہیں کہیں بلیغ کلام میں فواصل کی رعایت کی جاتی ہے۔ فواصل کا معنی ہے کہ پہلے تھا۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝﴾

[الفاتحہ:۱تا۴]

تو "یَوْمِ الدِّیْنِ" اور "نَسْتَعِیْنُ" فواصل آپس میں مل رہے ہیں اور حسن و جمال پیدا ہو رہا ہے۔ اگر "اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ وَ اِیَّاكَ نَعْبُدُ" ہوتا تو فاصلہ نہ ملتا۔ اس لیے رعایت فواصل کے طور پر "نَعْبُدُ" مقدم ہے اور "نَسْتَعِیْنُ" موخر ہے۔

جواب نمبر 2:

اصل جواب جو محققین نے دیا ہے وہ زیادہ قوی ہے کہ ایک توحید تشریعی ہے اور ایک توحیدِ تکوینی ہے۔ تشریعی توحید کا معنی یہ ہے کہ تمام عبادت اللہ کے لیے ہے۔ یہی دعوت دینے کے لیے سارے نبی آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

﴿وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ﴾ [ھود:۵۰]

"اور ہم نے (قوم) عاد کی طرف ان کے بھائی (حضرت) ہود علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا: اے میری قوم! تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا معبود ہونے کے قابل نہیں۔"

﴿وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ﴾ [ھود:۶۱]

"اور ہم نے (قوم) ثمود کے پاس ان کے بھائی حضرت صالح علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا: اے میری قوم! تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں۔"

﴿وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ﴾ [ھود:۸۴]

"اور ہم نے مدین (والوں) کی طرف ان کے بھائی شعیب علیہ السلام کو بھیجا، انہوں نے (اہل مدین سے) فرمایا کہ اے میری قوم! تم (صرف) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (بننے کے قابل) نہیں۔"

اب دیکھیں کہ ہر پیغمبر علیہ السلام نے یہ دعوت دی کہ اللہ کی عبادت کرو، جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ یہ توحید

تشریعی ہے۔ اور توحید تکوینی یہ ہے کہ جب ہر چیز کو دیکھتے ہیں تو ہر چیز گواہی دیتی ہے کہ مجھے اللہ نے بنایا ہے کسی اور نے نہیں بنایا۔ مثلاً: بڑے سے بڑے خدا کے منکر سے بھی اگر آپ پوچھیں کہ آسمان کو کس نے بنایا ہے؟ تو اس کے پاس اور کوئی جواب نہیں ہوگا۔

علامہ اقبال مرحوم کا استدلال:

علامہ اقبال مرحوم کسی کمیونسٹ ملک میں گئے۔ فرماتے ہیں: میں ہوٹل کے باہر لان میں ٹہل رہا تھا۔ میرا مترجم کمیونسٹ تھا، میں نے اس سے پوچھا کہ یہ ہوٹل کس نے بنایا؟ اس نے کہا: ہم نے بنایا ہے۔ میں نے کہا: یہ خوبصورت لان؟ اس نے کہا: ہم نے لگایا ہے۔ تم مسلمان ہر بات میں اللہ کو لے آتے ہو۔ میں نے ایک پھول توڑا اور اس سے پوچھا کہ اس میں خوشبو کس نے ڈالی ہے؟ وہ خاموش کھڑا ہو گیا۔ تو علامہ اقبال نے کہا کہ تمہاری ایک ہی زمین میں سینکڑوں قسم کے پھول لگے ہوئے ہیں۔ زمین ایک، پانی ایک، لیکن سب کا رنگ الگ ہے، خوشبو الگ ہے۔ یہ خوشبو کس نے ڈالی ہے؟ اس مترجم نے کہا: ایسے ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے کہا: ایسے کیسے ہوتا ہے؟ اگر زمین کے اثرات اور پانی کے اثرات ہوں تو ایک جیسے ہوں، لیکن یہ الگ الگ ہیں۔ گلاب کی اپنی خوشبو ہے، چنبیلی کی اپنی خوشبو ہے، نرگس کی اپنی خوشبو ہے، رات کی رانی کی اپنی خوشبو ہے اور چمپہ کی اپنی خوشبو ہے۔ اس لیے یہ بھی توحید ہے کہ جب ہر چیز پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بنانے والا خدا ہے۔ لیکن توحید تشریعی توحید تکوینی سے ہمیشہ مقدم ہوتی ہے۔ لہٰذا ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ میں تشریعی توحید ہے اور وہ مقدم ہے۔

جواب نمبر 3:

بعض علماء نے اس کا جواب دیا ہے کہ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) میں ایک قسم کا دعویٰ کر رہا ہے۔ خالق کے سامنے دعویٰ کیا تو فوراً عاجزی کا اظہار کیا کہ ﴿وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ (اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) کہ جو ہم عبادت کرتے ہیں اس میں تیری ہی مدد ہے۔ اگر تیری مدد نہ ہو تو ہم نماز اور عبادت ہی نہیں کر سکتے۔ اس لیے ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کے بعد ﴿وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ آیا ہے۔

کیا اللہ دنیا کا مالک نہیں؟

ان کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (اللہ قیامت کے دن کے مالک ہیں) تو کیا اللہ دنیا کے

مالک نہیں ہیں؟ جبکہ قرآن کہتا ہے:

﴿فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى﴾ [النجم:٢٥]

"سو خدا ہی کے اختیار میں ہے آخرت اور دنیا۔"

علماء نے جواب دیا کہ دنیا کا مالک بھی اللہ ہے، حکم بھی اللہ کا ہے اور ملک بھی اللہ کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [المائدہ:١٢٠]

"اللہ ہی کی ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی اور ان چیزوں کی جو ان میں موجود ہیں۔ اور وہ ہر شے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔"

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا﴾ [النساء:١٢٦]

"اور اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کو احاطہ فرمائے ہوئے ہیں۔"

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ﴾ [الملک:١]

"بڑی شان ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں ساری بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔"

ہر چیز کا مالک اللہ ہے، لیکن دنیا میں اللہ نے انسان کو مجازی طور پر ملک دیا ہوا ہے کہ اس زمین کا، مکان کا مالک میں ہوں۔ باقاعدہ مالک اور کرایہ دار کا نام لکھا ہوا ہوتا ہے۔ مجازاً تو یہاں مالک کہا جاتا ہے، لیکن حقیقۃً تو ہر چیز اللہ کی ملک ہے۔ جبکہ قیامت کا دن ایسا ہوگا کہ جس دن ساری مجازی ملکیتیں بھی ختم ہو جائیں گی۔ اس لیے کون دعویٰ کرے گا؟ قرآن میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائیں گے:

﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۚ﴾

"آج کس کی ملکیت ہے؟"

مفسرین نے لکھا ہے کہ سینکڑوں سال گزر جائیں گے، لیکن کوئی جواب نہیں دے گا تو اللہ تعالیٰ خود جواب دیں

گے۔ ارشاد فرمائیں گے:

﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ [غافر:١٦]

''بس اللہ ہی کی ہوگی جو یکتا (اور) غالب ہے۔''

اس دن سارے بادشاہوں کی بادشاہتیں بھی ختم ہو گئیں، ملک بھی ختم ہو گیا۔ اس لیے فرما دیا:

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ [الفاتحہ:٣]

''جو مالک ہیں روز جزا کے۔''

اس روز جزا کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ کوئی دعویٰ کرنے والا بھی نہیں ہوگا۔ سب عاجزی کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾ [النبا:٣٨]

''جس دن ساری روحیں اور فرشتے قطاریں بنا کر کھڑے ہوں گے، اس دن سوائے اس شخص کے کوئی نہیں بول سکے گا جسے خدائے رحمن نے اجازت دی ہوگی۔ اور وہ بات بھی ٹھیک کہے گا۔''

قیامت کے دن کسی کی کوئی ملکیت نہیں ہوگی صرف اسی کا ملک ہوگا۔ اس لیے اللہ نے ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ فرمایا۔

ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں سے ہمارا مطالبہ:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کی بڑی شان رکھی ہے کہ ایک عجمی بچہ جس کو عربی کی سمجھ ہی نہیں ہوتی وہ قرآن پاک ''اَلْحَمْدُ'' سے ''وَالنَّاسِ'' تک زبانی یاد کر لیتا ہے۔ ہم ہندوؤں سے کہتے ہیں کہ تمہارے اتنے وید ہیں، تم الف سے یا تک ہمیں زبانی سنا دو۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ سنا دیں۔ اور آج موجودہ دور میں انگریز ترقی پر ہے طاقت، قوت کے اعتبار سے، علم کے اعتبار سے، اقتصادی اعتبار سے اور جدید علوم کے اعتبار سے، ہم ان کو کہتے ہیں: جس کو تم اپنی کتاب کہتے ہو ہمیں زبانی سنا دو۔ ایک عیسائی پیدا کرو جس کو اناجیل اربعہ یاد ہوں۔ ایک یہودی پیدا کرو جس کو تورات یاد ہو۔ حالانکہ یہودی بڑے عبادت گزار ہیں۔ اپنے مذہب کے اعتبار سے حلال پر بڑا زور ہے، پاکیزگی پر بڑا زور ہے، لیکن کوئی ایک تورات کا حافظ نہیں ہے۔

قرآن اور اہلِ سنت کی صداقت:

قرآن پاک کی اس سے بڑی صداقت کیا ہو سکتی ہے کہ عربی کا اتنا عظیم کلام ہو اور عجمی لڑکا ہو جس کو ایک لفظ کا ترجمہ نہیں آتا، ''اَلْحَمْدُ'' سے ''وَالنَّاس'' تک تراویح میں کھڑا ہو کر زبانی سنا دیتا ہے۔ اتنے بڑے چیلنج کے بعد دشمن نہ مقابلہ کر سکا اور نہ قرآن حفظ کر سکا۔ خدا کی شان کہ مسلمانوں میں بھی وہ فرقے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، لیکن پھر روافض بن گئے، شیعہ بن گئے، دین کو چھوڑ دیا شیعہ کہلائے یا روافض کہلائے۔ ان کی آگے جتنی بھی قسمیں ہیں۔ ان میں جو لوگ صحیح معنی میں خلفاء راشدین کے منکر ہیں یا خلفاء راشدین پر تبرا کرتے ہیں ان میں آج تک ایک بھی حافظ قرآن پیدا نہیں ہوا۔ انڈو پاک اور بنگلہ دیش غریب ملک ہیں۔ ان کے دیہات میں چلے جائیں، جہاں پرائمری سکول بھی نہ ہو، لیکن وہاں کوئی نہ کوئی حافظ موجود ہوگا۔ قرآن کی سچائی پر اس سے بڑی کون سی دلیل ہو سکتی ہے؟

اتنے بڑے ممالک جنہوں نے مریخ پر کمندیں ڈال لیں اور فضاؤں کو مسخر کر لیا، خلاؤں میں مرکز قائم کر لیے، پوری دنیا کو کنٹرول کرنے کے لیے اپنے سیارات فضاؤں میں چھوڑ دیے۔

کفار کو چیلنج:

آج بھی ہم ان کو چیلنج کرتے ہیں کہ قرآن نے ہمیں آدم علیہ السلام کی خبر دی ہے، وہ لوگ اس کی تردید کر دکھائیں۔ قرآن نے خبر دی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں طوفان آیا، وہ ثابت کریں کہ طوفان نہیں آیا۔ قرآن نے خبر دی کہ قومِ عاد اس طرح تھی اور اللہ نے اس پر عذاب بھیجا تھا، وہ اس کی تردید کریں کہ پوری دنیا میں قوم عاد کہیں بھی نہیں تھی اور اللہ نے اس پر عذاب نہیں بھیجا۔ قرآن نے ہمیں فرعون کے بارے میں بتایا کہ موسیٰ علیہ السلام سے اس کا مقابلہ ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام سمندر سے خیریت سے گزر گئے اور فرعون لشکر سمیت غرق ہو گیا۔ اگر غلط ہے تو تردید کریں۔ اسی طرح قرآن ہمیں خبر دیتا ہے کہ ابرہہ ہاتھی لے کر آیا تھا۔ کسی ایک واقعہ اور خبر کی تردید کرو۔ حالانکہ خبر دینے والا ''اَلنَّبِیُّ الْاُمِّیّ'' ہے۔ نہ ٹیلی فون ہے، نہ مواصلات ہے نہ کالج ہے۔

اللہ کے قرآن نے جو احکام بتلائے ہیں کسی ایک حکم کو جھٹلاؤ کہ یہ درست نہیں ہے۔

شاہ فیصل مرحوم کا مدبرانہ جواب:

شاہ فیصل مرحوم...... اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے...... بڑے مدبر و مفکر تھے۔ ایک کافر ملک میں ان کا دورہ ہوا تو وہاں تمام عالم کے نمائندے اکٹھے تھے۔ انہوں نے شاہ فیصل مرحوم سے کہا: آپ کے ہاں سزائیں بڑی سخت ہیں کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو۔ اس کو زیادہ سے زیادہ سزا یہ ہو کہ اس کو جیل بھیج دو یا اس پر جرمانہ کر دو، یہ نہیں کہ اس کے ہاتھ ہی کاٹ دو۔ یہ تو سخت سزا ہے۔ وہ سنتے رہے، اپنی باری پر کھڑے ہوئے اور کہا: میرے ملک کے دس سال کے اعداد و شمار دیکھ لو اور اپنی ایک سٹیٹ کے ایک سال کے اعداد و شمار دیکھو۔ جرائم آپ کے پاس زیادہ ہیں یا میرے پاس زیادہ ہیں؟ ایک ہاتھ کو نہ دیکھیں، بلکہ پورے ملک کے امن و امان کو دیکھیں۔ آپ ایک شاخ کو کٹتا ہوا دیکھ رہے ہیں، باغ کی حفاظت کو نہیں دیکھ رہے؟ اور اس شاخ کا حسن قائم رہے۔ جب ہاتھ اتنا لمبا ہو جائے کہ دوسرے کی جیب یا گھر میں داخل ہونے لگے تو اس کو چھوٹا کرنا ہوگا۔ ان کے ایک ملک میں چھ گھنٹے کے لیے بجلی بند ہوئی تو ہزاروں کی تعداد میں جرائم ہوئے۔

اپنے آپ کو مہذب اور تعلیم یافتہ ملک کہنے والے اور ہمیں جٹ، بیک ورڈ کہنے والے ان کے ہاں جرائم کی یہ حالت ہے کہ ایک سال میں کم سے کم تین لاکھ کنواری لڑکیاں حاملہ ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض شہروں میں آپ اپنی گاڑی میں بھی محفوظ نہیں ہیں، بلکہ باقاعدہ اس کے دروازوں کو لاک کرنا پڑتا ہے کہ لڑکی زبردستی اندر آ کر بیٹھ جائے گی۔ آپ اس کو کہیں بھی سہی کہ میں اس لائن کا آدمی نہیں ہوں۔ وہ کہے گی: میں یہاں بیٹھی ہوں، میرا ٹائم ویسٹ ہوا ہے، مجھے اس کے پیسے دو۔ یہ مہذب ملک کی حالت ہے۔ جیب کے اندر ہر وقت پیسے ہوں۔ اگر راستے میں غنڈہ آ گیا اور پیسے نہ ہوئے تو وہ مار دے گا کہ جیب کے اندر پیسے بھی نہیں رکھتے؟ اگر ان سے کسی جگہ کا پتا پوچھو تو وہ کہے گا کہ مجھے راستہ بتانے کے پیسے دو۔

ہم پوری دنیائے کفر، یہودیت، عیسائیت، نصرانیت اور ہندومت ہر مذہب کو چیلنج کرتے ہیں کہ آؤ قرآن میں جو احکام دیے گئے ہیں ان کو جھٹلاؤ کہ یہ ٹھیک نہیں ہیں۔ حدیث اٹھا کر دیکھ لیں یا فقہ کی کتاب البیوع اٹھا کر دیکھ لیں۔ آج بھی معاملات میں قانون دان اسی چیز کا محتاج ہے جو حضور ﷺ نے بتائے ہیں۔ آپ کے پاس بھی اپنے ملکوں کے اسٹام موجود ہوں گے ان پر لکھا ہوتا ہے: ''من کہ مقرر مسمی فلاں بن فلاں بہ ہوش و حواس خمسہ بلا

اجبار و اکراہ بقصد معتبر (اقرار کرتا ہوں)...... اور بروئے گواہان اقرار کرتا ہوں، تا کہ بوقت سند کام آئے۔" آج تک ان الفاظ کے بدل نہیں لائے ہیں، دنیا کا بڑے سے بڑا بیرسٹر اس کو مانتا ہے۔

جب ہسپانیہ پر مسلمانوں کی حکومت تھی تو جو آج اپنے آپ کو عقلمند کہتے ہیں ان کی یہ حالت تھی کہ ان کے لوگ مسلمانوں کے پاس پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ مسلمانوں کی لائبریریوں کا یہ عالم تھا کہ ہلاکو خان نے جب بغداد کو تباہ کیا، دریائے دجلہ میں اتنی کتابیں ڈالی گئیں کہ تین دن تک دریائے دجلہ کا پانی سیاہ ہو کر بہتا رہا۔ یہ تاریخ کی بات ہے۔ اس کا کوئی ملک انکار نہیں کر سکتا۔

آج بھی پورے میڈیکل کی بنیاد ابن سینا کے قوانین پر ہے۔ وہ ابن سینا کون تھا؟ ابو حیان، الرازی، ابن رشد، ابن نفیس داؤد انطاکی کون تھے؟

ایک مسلمان وکیل کی عقلمندی:

جس کے پاس طاقت ہو وہ جو کہے وہی بات سچ ہے۔ حالانکہ ان کا عالم یہ تھا کہ برطانیہ کے دور میں ایک آدمی کو سزائے موت ہو گئی۔ اس کا وکیل سر سید احمد کا بیٹا یا کوئی عزیز تھا اور وہ خاموش رہا۔ ہوتا یہ ہے کہ اس ملزم کو کوٹھڑی میں بند کر دیا جاتا ہے۔ پھر وقت مقررہ پر جلاد بھی آتا ہے، مجسٹریٹ بھی آتا ہے، پولیس والے بھی آتے ہیں، اس کو غسل دیا جاتا ہے، سخت نگرانی میں اس کو پھانسی گھاٹ پر لاتے ہیں۔ پھر اس کے گلے میں رسہ ڈالا جاتا ہے۔ اور مجسٹریٹ حکم پڑھ کر سناتا ہے۔ اس کے بعد اشارہ کرتا ہے اور جلاد لیور کو گھماتا ہے۔ جب اس آدمی کے گلے میں رسہ ڈالا گیا اور مجسٹریٹ اس کے جرائم سنا رہا تھا کہ اس نے فلاں فلاں شخص کو قتل کیا وغیرہ۔ اس کے بعد جب وہ اشارہ کرنے لگا تو وکیل نے کہا: ایک منٹ اشارہ مت کرنا، میں تمہارے خلاف قتل کا مقدمہ کر دوں گا، کیونکہ قانون میں لکھا ہوا ہے کہ پھانسی پر لٹکایا جائے، یہ تو نہیں لکھا ہوا کہ لٹکا کر مارا جائے؟ اگر اس کو موت آ گئی تو میں تین سو دو کا مقدمہ تم پر درج کروں گا اور اسی پھندے پر تم کو آنا ہو گا۔ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ ہل گئے۔ قانون کی کتابوں میں دیکھتے ہیں تو اس میں ہائنگ کا لفظ ہے، کال ٹیکس کا لفظ ہی نہیں ہے۔ انہوں نے پھانسی روک دی اور سپریم کورٹ تک بات گئی تو انہوں نے کہا کہ وکیل کی بات ٹھیک ہے۔ کیونکہ ہمارے قانون میں یہ لفظ نہیں لکھے ہوئے کہ اس وقت تک پھانسی پر لٹکایا جائے جب تک کہ موت آ جائے۔ لٹکانا الگ بات ہے اور موت تک لٹکانا الگ بات ہے۔ پھر انہوں نے قانون کے اندر تبدیلی کی اور پھانسی کے وقت ایک ڈاکٹر بھی کھڑا ہوتا ہے جو اس کی موت کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ

عقلمند کا قانون ہے۔

اسلام کا قانونِ قصاص:

قرآن میں ہے:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۷۹]

''اور اے عقل رکھنے والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی (کا سامان ہے) امید ہے کہ تم (اس کی خلاف ورزی سے) بچو گے۔''

اگر قاتل سے بدلہ نہیں لو گے تو ساری دنیا قاتل بن جائے گی، ساری دنیا میں فساد پھیل جائے گا۔ اور بدلہ لینے کا اختیار مقتول کے ورثا کو دیا گیا ہے۔ اگر قتل عمد ہے اور مقتول کے ورثاء قصاص چاہتے ہیں تو قصاص ہو گا اور اگر معاف کرنا چاہتے ہیں تو معافی ہو گی۔ قتل خطا میں اس سے قصاص نہیں لیں گے کہ گاڑی ٹکرا گئی اور بندہ مر گیا۔ اگرچہ مقتول کے ورثا دیت لے لیں یا اس کو معاف کر دیں تب بھی قتل خطا کے ملزم کو اسلام کہتا ہے کہ دو مہینے کے روزے بھی رکھو، تا کہ تمہارے اندر کی بھی پاکی ہو۔ اسلام کا جامع قانون ہے دنیا کی کوئی طاقت ایسا قانون نہیں بنا سکتی۔ قرآن نے بوقت نزول چیلنج کیا اور اس کے بعد بھی چیلنج کیا اور آج بھی وہ چیلنج موجود ہے کہ قرآن کے مقابلہ میں قرآن بنا کر دکھاؤ۔ یہ نہیں کر سکتے ہو تو اس کے کسی حکم کو جھٹلا دو۔ اگر یہ بھی نہیں کر سکتے ہو تو اپنی کتاب بچے کو یاد کرا کر وہ بچہ ہمارے سامنے لے آؤ۔

حرام کا کاروبار بھی حرام ہے:

چودہ سو سال پہلے ''النَّبِيُّ الْأُمِّيُّ'' نے فرمایا کہ میرے اللہ کا حکم ہے شراب حرام ہے۔ اسی دور میں ایک صحابی آ گئے۔ کہنے لگے: مجھے پتا نہیں تھا کہ شراب حرام ہو گئی۔ میں نے اپنے پیسوں اور یتیموں کے پیسوں کے ساتھ فلاں ملک جا کر بیچنے کے لیے شراب لے آیا ہوں۔ اس صحابی نے کہا: یا رسول اللہ! اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کو کسی کافر ملک میں بیچ آتا ہوں۔ آپ نے فرمایا:

((ثَمَنُ الْخَمْرِ حَرَامٌ.)) [مسند احمد بن حنبل، حدیث:۲۲۲۵]

''شراب کا پیسہ بھی حرام ہے۔''

جب یہ چیز بری ہے تو کافر کے لیے بھی بری ہے، لہٰذا اسلام کافر کے لیے کیوں اجازت دے؟

شراب کی مذمت:

ہمارے مسلمان ملک غیر ملکیوں کے لیے، سفارت کاروں کے لیے شراب کی اجازت دیتے ہیں۔ کہتے ہیں: یہ رواداری ہے، مہمان کی مہمان نوازی ہے۔ حالانکہ یہی چیز ان غیر ملکیوں کے لیے بھی تجارت کا باعث بنتی ہے کہ ان کے چوکیدار شراب بیچتے ہیں۔

چین نے اپنے ایک علاقے میں شراب پر پابندی لگا دی۔ وہاں غیر ملکی سفیر آئے تو انہوں نے کہا کہ ہمیں تو اجازت دو، کیونکہ شراب ہماری جزوِ حیات ہے۔ انہوں نے کہا: تم ایسے آدمی بھیجو جو شراب نہ پیتے ہوں، وگرنہ ہمیں تمہارے آدمیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ بالآخر انہوں نے ایسے آدمی تلاش کیے جو ڈرنک نہیں کرتے تھے۔

ہمارے لوگ کہتے ہیں: ہم مانتے ہیں شراب حرام ہے، لیکن اتنی شراب جو عقل کو آؤٹ کردے، وہ ماں اور بیٹی میں تمیز نہ کر سکے، بیوی اور بہن میں تمیز نہ کر سکے۔ لیکن ہم شراب پیتے ہیں، ہماری عقل آؤٹ نہیں ہوتی، بلکہ ہم اور تیز ہو جاتے ہیں۔

حضور ﷺ نے چودہ سو سال پہلے فرما دیا:

((اَلْمُسْكِرُ قَلِيْلُهٗ وَكَثِيْرُهٗ حَرَامٌ.)) [سنن النسائی، حدیث:۵۶۹۸]

"جو مشروب نشہ کرے اس کا ایک قطرہ بھی حرام ہے اور ایک گیلن بھی حرام ہے۔"

اب وہ اعتراض کرتے ہیں کہ عربی کی تمام لغات کی کتابوں میں دیکھیں کہ "خمر" اسے کہتے ہیں جو انگوروں سے نکالا جائے۔ ہمارا ایمان ہے کہ جو خمر انگور سے نکالا جاتا ہے وہ حرام ہے۔ ہم وہ پیتے ہیں جو مالٹا، سیب اور گندم سے نکالا جائے، جو ان کیکر کے درخت کی لکڑیوں سے نکالا جائے۔ جبکہ اس نبی امی ﷺ نے اسی وقت فیصلہ فرما دیا کہ ((كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ))[1] (ہر نشہ والی چیز حرام ہے) وہ چاہے انگور سے نکالو چاہے کسی چیز سے بھی نکالو۔ اور فرمایا: "قَلِيْلُهٗ وَكَثِيْرُهٗ حَرَامٌ" (تھوڑی ہو تب بھی حرام ہے اور زیادہ ہو تب بھی حرام ہے) اور نشہ کا فیصلہ فرما دیا کہ جس نے کبھی زندگی میں پیا ہی نہ ہو وہ پیے تو اس کو نشہ آنے لگے، لیکن مسلمان جب کافر کی نقل کرتا ہے تو کافر اس کی جوتیوں کو بھی نہیں پہنچتا ہے۔

1۔ [الجامع البخاری، رقم:۶۱۲۴]

لطیفہ ہے کہ خان صاحب ایک دعوت میں آئے تو اس نے میزبان سے پوچھا کہ کھانا دانا ہے یا خیرات ہے؟ میزبان نے کہا: خان صاحب! کیا کہہ رہے ہو؟ اس نے کہا: کھانا ہے یا خیرات ہے؟ میزبان نے کہا: قورمہ، کوفتہ ہے، روغنی نان ہیں۔ اس نے کہا: اس کو چھوڑو اور یہ بتاؤ وسکی وسکی بھی ہے یا نہیں؟ اس نے کہا: وسکی تو نہیں ہے۔ تو خان صاحب نے کہا تو یوں بولو خیرات ہے۔ کالی ذریت کھانا اس کو سمجھتی ہے جس میں شراب ہو۔ حالانکہ اللہ معاف کرے جو اصل انگریز ہے وہ بھی وسکی نہیں پیتا اس کو پتا ہے یہ ہاٹ ڈرنک ہے۔ شیطان کو ہمارے علاقوں میں کھلی چھٹی ہے، بلکہ وہ صبح ہاتھ باندھ کر آتا ہے اور کہتا ہے: سرکار! میرے لیے آج کیا حکم ہے؟ بیوی کو ماں بنا دیتے ہیں۔

ایک صاحب کا واقعہ:

ایک صاحب یہاں بغیر پاسپورٹ کے رہ رہے تھے۔ میں نے کسی سے کہا کہ اس کو اپنے ملک بھیج دو۔ تو اس صاحب نے بتایا کہ مجھے بحری جہاز سے بھیج رہے تھے تو میں نے ان سے کہا کہ میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ؟ انہوں نے کہا: مل جائے گا۔ وہ پاسپورٹ اکٹھے کر کے دفتر میں پاس کرانے کے لیے لے گیا۔ اس نے مجھے میرے پاسپورٹ کی علامت بتائی اور پھر مجھے وہ پاسپورٹ پکڑا دیا کہ یہ ٹکٹ اور پاسپورٹ آپ کا ہے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میرا خروج بھی ہو گیا اور جہاز میں بھی سوار ہو گیا۔ دو تین دن کے بعد خیال آیا کہ اس کو کھولوں۔ جب کھولا تو وہ ایک عورت کا پاسپورٹ تھا۔ اور ساتھ ایک پرچی لکھی ہوئی تھی کہ یہ پاسپورٹ عورت کا ہے۔ جب جہاز کراچی ساحل پر جا لگے تو اس کو سمندر میں پھینک دینا، کسی افسر کے ہاتھ نہ لگیں۔ افسروں کو کہہ دینا کہ میرا ہاتھ کانپا اور وہ سمندر میں گر گیا ہے، کسی سے نکلوا دو۔ کون سمندر میں جاتا؟ یہ ہدایت نامہ بھی لکھ دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے نفلوں پر زور دیا کہ اللہ میرا پردہ رکھنا۔ لوگ دیکھیں گے کہ اتنی بڑی داڑھی ہے اور عورت کے پاسپورٹ پر سفر کر رہا ہے۔

تین راتیں جہاز میں اتنی نفلیں پڑھیں کہ اتنی مکہ میں بھی نہیں پڑھیں۔ اللہ نے میری عزت رکھی کہ جب جہاز ساحل پر لگتا ہے تو قلی جہاز پر سامان لینے کے لیے اوپر آ جاتے ہیں۔ میرے علاقے کا ایک قلی تھا میں نے اس کو بتایا تو اس نے کہا: پاسپورٹ ٹکٹ مجھے دو۔ یہاں کے حالات کو میں جانتا ہوں۔ کہہ دینا غلطی سے میں دوسرے کا لے آیا ہوں، مجھے کیا پتا کہ میرا کدھر ہے؟ وہ کہتے ہیں: میں اس وقت تک ڈرتا رہا جب تک اس علاقے سے نکل نہیں گیا۔ بہر حال کہنے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ نقالی اور دھوکہ کے اندر اتنے بڑھے ہوئے ہیں۔

تثلیث کے استدلال کا رد:

بعض لوگ این جی اوز کے بہانے ہماری تربیت کرنے کے لیے آتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ دیکھو! اللہ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ [الحجر:۹]

"ہم نے قرآن نازل کیا ہے اور ہم اس کے محافظ (اور نگہبان) ہیں۔"

یہ "اِنَّا"، "نَحْنُ" اور "نَزَّلْنَا" جمع ہے اور جمع کا اطلاق کم سے کم تین پر ہوتا ہے، لہٰذا ہمارا عقیدہ تثلیث صحیح ہوا۔ ان کو یہ کہنا چاہیے کہ جب تم قرآن کو مانتے ہی نہیں ہو تو اس کے جمع، مفرد سے کیسے دلیل پکڑ رہے ہو؟

ایک سنی عالم کا شیعہ کو جواب:

ایک دفعہ شیعہ اور اہلِ سنت کے آدمی کے درمیان مناظرہ ہو رہا تھا۔ شیعہ مناظر نے بخاری شریف سے روایت پیش کی کہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اپنے باپ کی میراث کا حصہ طلب کیا، یعنی باغ فدک مانگا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نہ دیا تو "غَضِبَتْ فَاطِمَةُ" (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اتنی ناراض ہو گئیں کہ مرنے تک آپ رضی اللہ عنہ سے بات بھی نہیں کی) اس نے کہا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ناراض ہونا اور موت تک بات نہ کرنا اور ایک بیٹی کو باپ کی میراث سے محروم کر دینا یہ صحاح میں ہے اور اہلِ سنت کی کتابوں میں ہے: "فَمَنْ أَغْضَبَهَا أَغْضَبَنِيْ" (لہٰذا جس نے فاطمہ کو ناراض کیا اس نے محمد محمد مصطفیٰ کو ناراض کیا) جس نے محمد مصطفیٰ کو ناراض کیا اس نے خدا کو ناراض کیا اور جس نے خدا کو ناراض کیا اس کا انجام تو ٹھیک نہ رہا۔

اہلِ سنت والجماعت کے آدمی نے جواب دیا: پہلی بات تو یہ ہے کہ کیا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس میراث کی درخواست لے کر گئیں؟ اس نے کہا: ہاں تمہاری کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ عالم نے کہا: کیا تم یہ بات تسلیم کرتے ہو کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئیں اور ان سے باغ فدک کا مطالبہ کیا تھا؟ اس نے کہا: ہم تسلیم کرتے ہیں۔ سنی نے کہا کہ دیکھو! دو لاکھ کا مجمع بیٹھا ہوا ہے، یہ بتاؤ کہ درخواست دینے کے لیے آدمی کس کے پاس جاتا ہے؟ جس کے پاس اتھارٹی ہو، اس کے پاس جاتا ہے۔ پہلے اس کی عدالت کو عدالت تسلیم کرے گا تو درخوست دے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مانتی تھیں تب ہی تو درخواست دی۔ پہلے اس مسئلہ کو حل کرو پھر بعد کا مسئلہ حل کریں گے۔ اگر ان کو خلیفہ تسلیم نہیں کیا تھا تو حضرت

خالد رضی اللہ عنہ کے پاس جاتیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس جاتیں یا کسی اور صحابی کے پاس چلی جاتیں، لیکن ان کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس جانے کا یہ مطلب ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کو تسلیم کیا۔ تو پہلے تم اقرار کرو کہ جیسے بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مانا، کیا تم مانتے ہو؟ اگر تم نہیں مانتے تو تم بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مخالف ہو، ہم تو مخالف نہیں ہیں۔

تثلیث کا جواب:

اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جب تمہارا قرآن پر ایمان ہی نہیں ہے تو تم جمع مفرد کے صیغوں کو دلیل کیسے بنا رہے ہو؟ دلیل تو وہ دی جاتی ہے جس کو بندہ خود بھی مانتا ہو اور اس کا مخالف بھی مانتا ہو۔ اگر تم کہتے ہو کہ بطور استشہاد کے دلیل نکل رہی ہے تو پھر قرآن کی دوسری بات بھی مانو، کیونکہ قرآن تو یہ بھی کہتا ہے:

﴿وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ﴾ [البقرۃ: ۱۶۳]

''اور تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں جو سب پر مہربان، بہت مہربان ہے۔''

اور اسی طرح قرآن نے تو یہ بھی کہا ہے:

﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾

[الاخلاص: ۱تا۴]

''آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے: بات یہ ہے کہ اللہ ہر لحاظ سے ایک ہے۔ اللہ ہی ایسا ہے کہ سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اور اس کے جوڑ کا کوئی نہیں۔''

پھر تو اس کو بھی مانو۔ یہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ جہاں سے تمہیں فائدہ نظر آئے اس کو مان لو اور باقی کو چھوڑ دو۔

ہدایت پانے کے بعد ہدایت کی دعا کیوں؟

ان کا ایک شبہ یہ بھی ہے کہ سورۂ فاتحہ میں ہے:

﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ [الفاتحہ: ۵]

''اے اللہ! ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما۔''

اب مسلمان نماز میں بھی پڑھ رہا ہے۔ اگر یہ مسلمان ہدایت پر نہیں ہے تو پھر نماز کیسے پڑھ رہا ہے؟ اگر ہدایت

یافتہ ہے اور پھر دعا مانگے تو یہ تحصیل حاصل ہے۔ یہ انہوں نے اپنی عقل کے اعتبار سے بہت بڑا اعتراض کیا ہے۔ حالانکہ وہ یہ نہیں کہتے کہ ایک بہت بڑا تاجر ہے، اس نے ایک لاکھ روپیہ کما لیا اور ایک لاکھ روپیہ کمانا چاہتا ہے تو وہ بھی تو تحصیل حاصل ہے۔ تمہیں ہدایت کے اندر کیسے تحصیل حاصل نظر آ گیا؟

قرآن کی صداقت چودہ سو سال سے چیلنج کر رہی ہے:

الحمد للہ! قرآن اللہ کی جامع، مانع اور مکمل کتاب ہے۔ یہ دستورِ اسلام اور دستورِ حیات ہے۔ قیامت تک محفوظ ہے۔ اس میں ایک حرف کی بھی زیادتی اور کمی نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے اٹھا لیا ہے۔ آج دنیا کے اندر پرانی مذہبی کوئی کتاب نہیں بچی، کیونکہ اللہ نے ان کی ذمہ داری کا اعلان نہیں فرمایا۔

دشمنانِ اسلام جب قرآن کی فصاحت و بلاغت کا کوئی توڑ پیش نہ کر سکے اور نہ اس کے اعجاز کا کوئی توڑ پیش کر سکے۔ ہزار چیلنجوں کے باوجود اس کے مقابلے میں ایک چھوٹی سی سورت بھی نہ بنا سکے۔ اس کے بعد بھی جوں جوں علم بڑھتا گیا، کیونکہ ہر چیز نے انتہاء کو پہنچنا ہے۔ اب دنیا کی فصل روز بروز پکتی جا رہی ہے، اس کے کٹنے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ علم بڑھتا گیا، ایسی نئی نئی ایجادات آ گئیں کہ آدمی حیران ہوتا ہے۔ اس سب کے باوجود کوئی بھی قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جیسے چودہ سو سال پہلے مشرکین قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکے اب حالانکہ پورا میڈیا مسلمانوں کو بدنام کر رہا ہے۔ جہاں کوئی حادثہ ہو تو مسلمان کا نام ہوتا ہے۔ ان سے دس مر جائیں تو بڑی بات ہے اور اگر اُن سے دس لاکھ مر جائیں تو کوئی بات نہیں ہے۔ کسی نے کہا تھا:

> ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
> وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

کوئی واقعہ ہو جائے اور اس کا پس منظر ابھی سامنے بھی نہ آیا ہو تو نام مسلمانوں کا ہو جاتا ہے۔ جو قومیں مسلمانوں کے اس قدر خلاف ہیں تو کیا وہ اسلام کا توڑ کرنے کی کوشش نہیں کرتی ہوں گی؟ جو قوم ایک دوائی بنانے پر دو دو ارب ڈالر خرچ کر دیتی ہیں، بیس بیس سال اس میں لگے رہتے ہیں، کیا انہوں نے اس کے توڑ کی کوشش نہیں کی ہو گی؟ ہمارے نامور لوگوں کو اسی لیے تو خریدا ہے۔ مرزا قادیانی ہو گیا، سلمان رشدی ہو گیا، تسلیمہ نسرین ہو گئی کہ یہ لوگ کوئی حل نکالیں گے۔ ان کو بڑے مفسرِ قرآن اور سکالر بنا کر پیش کیا، ان سے رجم کا، قصاص کا انکار کرایا کہ یہ سزائیں وحشی اور جاہلانہ ہیں اور یہ دورِ جاہلیت کی باتیں ہیں۔ اس کے باوجود پوری دنیا قرآن کی کسی بات کو چیلنج

نہیں کر سکی۔

جیسے گزشتہ درس میں میں نے بیان کیا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے پکڑا، کنویں میں ڈالے گئے، مصر کے بازاروں میں بیچے گئے، امرأۃ العزیز اور عزیز نے مل کر خریدا اور کچھ حالات پیش آئے اور جیل میں بھیجے گئے، پھر تخت پر آئے۔ یہ تو مصر کا واقعہ ہے، نینوا کا واقعہ ہے، جہاں آج ان کی مکار قوم آباد ہے۔ اگر یہ واقعہ غلط تھا تو اس واقعہ کو چیلنج کر دیتے۔

قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ فرعون نے قتل کا آرڈر دیا ہوا تھا۔ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں بات ڈالی کہ ان کو صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈال دو، دریا اس کو کنارے پر پہنچائے گا اور کنارہ بھی وہ جو فرعون کے گھر میں تھا۔ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دودھ پینا بند کر دیا کہ کسی کا دودھ نہیں پیتے تھے۔ یہودی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں وہ کہہ دیں کہ یہ غلط واقعہ ہے۔ اس کو چیلنج کر کے دکھا دیں۔

اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ لکڑی کو دریا میں مارو تو راستے بن جائیں گے۔ لکڑی ماری گئی تو پانی جم گیا اور راستے بن گئے۔ وہ گزر گئے اور فرعون غرق ہو گیا۔ اور دریا نے اس کی لاش کو باہر پھینک دیا اور وہ قیامت تک کے لیے عبرت بن گیا ہے۔ اسی بات کو چیلنج کر دیں کہ کوئی فرعون غرق نہیں ہوا یا کوئی راستے نہیں بنے، بلکہ لاس اینجلس میں وہ اس منظر کو خود دکھاتے ہیں۔ وہ شہر جسے گندا شہر کہا جاتا ہے وہاں گناہ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دو سپر طاقتیں تھیں: روم اور فارس۔ روم کا بادشاہ ہرقل تھا، اس کو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک ملا تو اس کو چوما اور صحابہ کو بلا کر باتیں پوچھیں۔ کہا کہ جو کچھ ہے سب سچ ہے، جہاں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں اگر میں وہاں ہوتا تو ان کے قدم مبارک کو دھوتا۔

قرآن کی اخبار غیب:

اس سے بھی عجیب بات دیکھیں کہ مکی زندگی میں قرآن پاک نے مستقبل میں پیش آنے والے ایک واقعہ کی پیشین گوئی کی اور فرمایا:

﴿غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ﴾

[الروم: ۲،۳،۴]

''اہل روم ایک قریب کے موقع میں مغلوب ہو گئے۔ اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب تین سال سے لے

کر نو سال تک کے اندر اندر غالب آ جاویں گے۔''

ان کو شکست ہو گئی ہے اور مستقبل کی بھی خبر دے دی کہ کچھ عرصہ کے بعد رومی پھر غالب آ جائیں گے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا تھا۔

ساری دنیا عاجز آ گئی۔ نہ قرآن کی مثل قرآن بنا سکے اور نہ سورت اور نہ اللہ کے قرآن کے اعجاز کے اعتبار سے، نحو کے اعتبار سے، فصاحت کے اعتبار سے، بلاغت کے اعتبار سے اور معانی کے اعتبار سے اس میں کوئی عیب نکال سے۔ اللہ بے عیب ہے تو اس کا کلام بھی بے عیب ہے۔ اللہ کی ذات نقصان سے پاک ہے تو اس کا کلام بھی نقصان سے پاک ہے۔

قرآن میں جدید علوم کا کمال:

ساری دنیا کے بڑے بڑے علماء نے زور لگا لیا، لیکن انہوں نے کہا: جو کچھ قرآن میں ہے وہ سچ ہے۔ قرآن نے جو دریاؤں کا نقشہ کھینچا ہے، سمندروں کا نقشہ کھینچا ہے نیوی کے جو بڑے بڑے ایڈمرل گزرے ہیں انہوں نے کہا: اتنی اچھی اچھی معلومات تو ہمیں کہیں نہیں ملیں۔

قرآن نے جب زراعت کے بارے میں بتایا ہے تو بڑے بڑے ایگری کلچر کے پی ایچ ڈی ماننے پر تیار ہو گئے کہ قرآن صحیح کہہ رہا ہے۔ قرآن نے ہمیں میزائل اور ایٹم بم کے بارے میں بتایا تو ساری دنیا نے غور کیا کہ کوئی پتھر تھا کہ اسے ہاتھیوں پر پھینکا جائے اور وہ پتھر ان کو ہلاک کر کے رکھ دے۔ اور وہ ''كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ'' (کھائے ہوئے بھس کی طرح) ہو گئے۔ جیسے کوئی جانور جب گھاس کھا لیتا ہے تو باقی گھاس میں پاؤں مار مار کر اس کو رگڑ دیتا ہے۔ اور قرآن ہی نے بتایا کہ جب جنات اوپر قرآن سننے کے لیے جاتے ہیں تو: ''فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ'' (ایک چمکتا ہوا ستارہ جو روشنی کی طرح لگتا ہے، ان کے پیچھے آتا ہے)۔

قرآن میں ہے کہ سب سے پہلے کشتی حضرت نوح علیہ السلام نے بنائی اور سب سے پہلے نجاری کا کام حضرت نوح علیہ السلام نے کیا۔ آج دنیا الٹ جائے، لیکن کشتی کی شکل وہی رہے گی، اگر چہ آپ اس کو جہاز میں تبدیل کر لیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے اللہ نے ہوا کو مسخر کر دیا تھا جو ان کے ایک بہت بڑے تخت کو لے کر اڑتی تھی۔ اسی لیے علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

"مجھے انگریز کی علمی اور مادی ترقی حیران نہیں کر سکی، کیونکہ میری آنکھ میں مدینے کی مٹی کا سرمہ ہے۔"

میں حضور ﷺ کو ماننے والا ہوں۔ یہ میرے لیے کیا چیزیں ہیں؟ یہ انگریز تو ابھی چاند پر پہنچ رہا ہے۔ اور جس نبی ﷺ کو میں مانتا ہوں اس نے انگلی سے چاند کو دو ٹکڑے کر دیا تھا۔ اور یہ اب وہاں کی تصویریں اور مٹی لا رہے ہیں اور تحقیق کر رہے ہیں کہ اگر وہاں رہیں گے تو پانی کا کیسے بندوبست کریں گے؟ جبکہ اللہ کے نبی ﷺ نے بغیر کسی خلائی اسٹیشن کے، بغیر کسی اسباب کے سرزمین مکہ میں چاند سے دور کھڑے ہو کر اشارہ کیا اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا اور سارے مکہ والوں کو حضور ﷺ نے فرمایا: "فَاشْهَدُوْا" (گواہ ہو جاؤ۔) ایک دو آدمیوں نے نہیں دیکھا، ساری دنیا نے دیکھا تھا۔

چاند کے دو ٹکڑے ہونے پر اعتراض:

اس واقعہ پر لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر چاند دو ٹکڑے ہوتا تو دوسرے ملک بھی تو اس کا مشاہدہ کرتے قرآن اور قرآن کے ماننے والوں کے علاوہ تو کسی نے یہ واقعہ ذکر نہیں کیا ہے۔

جواب:

پہلا جواب یہ ہے کہ کیا اس وقت اتنے وسائل تھے کہ سب کو ٹیلی فون ہو جاتے اور وہ موبائل پر بتا دیتے کہ اٹھو اور دیکھ لو، چاند دو ٹکڑے ہو گیا ہے۔ دوسری یہ بات کہ ہر ملک کے اوقات مختلف ہیں، لہٰذا ضروری تو نہیں کہ جس وقت چاند کا واقعہ ہوا ہے ہر جگہ رات ہو۔ سب سے بڑا جواب یہ ہے کہ آپ ہندوستان کی تاریخ فرشتہ اٹھا کر دیکھیں اس میں ہے کہ گوالیار کے راجہ نے بیان کیا ہے کہ میں فلاں تاریخ، فلاں مہینہ اور فلاں سال محل کے اوپر بیٹھا ہوا تھا اور میں نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ ہندو راجہ تھا، مسلمانوں کا دوست نہیں تھا۔ کیونکہ ہندو اور یہودی کے خون میں اسلام کی دشمنی ہے۔ آپ ان کے ساتھ جتنی ہمدردی کر لیں یہ کبھی بھی آپ کے دوست نہیں بنیں گے۔ کہیں گے یہ مو سلا ہے۔

جب غیر مسلم ان چیلنجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو کہتے ہیں: چلو ان میں شکوک و شبہات ڈال دو۔ تو ان شبہات

میں سے کافی شبہات ہم نے بیان کیے اور ان کے جوابات بھی دے دیے۔

ایک نحوی اشکال:

تیسرا شبہ ہے "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" بدل ہے اور مبدل منہ "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" ہے۔ مبدل منہ کو ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ یوں کہہ دیتے "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" یہ قواعد کے اعتبار سے اعتراض ہے۔ اور ان کو سمجھ بھی وہی سکتا ہے جس کو قواعد کے ساتھ دلچسپی ہو۔

جواب کی تمہید:

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ہدایت کے درجات ہیں، جیسے تقویٰ کے درجات ہیں:

- ......تقویٰ کا پہلا درجہ یہ ہے کہ کفر سے بچے، یعنی کلمہ پڑھے اور شرک سے بچے۔
- ......دوسرا درجہ یہ ہے کہ کبیرہ گناہوں سے بچے۔
- ......تیسرا درجہ یہ ہے کہ صغیرہ گناہوں سے بھی بچے۔
- ......اور آخری درجہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا دل کے اندر اور کسی کا خیال نہ آنے دے۔ اب اگر آدمی کو ایک درجہ حاصل ہے تو دوسرا درجہ تو مانگتے ہیں۔

اسی طرح علماء نے فرمایا ہدایت کے مراتب اور درجات ہیں کہ ایک درجے سے دوسرے درجے پر جاتا ہے، اس کے بعد اور درجے پر اور پھر اور درجے پر اور ہدایت کا معنی بھی اللہ کی معرفت اور اس کی صفات کی معرفت ہے۔ مثلاً: اگر ایک تاجر ہے، اس نے لاکھ کما لیا ہے۔ اب وہ دوسرا لاکھ کمانے کے لیے بزنس کرتا ہے۔ اب اس کو تو کوئی بندہ بھی بے وقوف نہیں کہتا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ صراط مستقیم سے مراد دین ہے، مقصد منزل پر پہنچنا ہے۔ ہم کسی سے اپنی منزل کے بارے میں پوچھیں وہ ہمیں راستہ بتا دے۔ ہم صرف اس راستہ کو دیکھتے ہیں تو کیا منزل پر پہنچ جائیں گے؟ اس وقت تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اس پر نہ چلیں۔ اسی طرح جو آدمی نماز پڑھ رہا ہے وہ ابھی منزل تک تو نہیں پہنچا ہے۔

علماء اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ہدایت کا ایک معنی ہوتا ہے: "اِرَاءَةُ الطَّرِيْقِ" اور ایک معنی ہوتا ہے "اِيْصَالٌ اِلَى الْمَطْلُوْبِ"۔

"اِرَاءَةُ الطَّرِيْقِ" کا مطلب یہ ہے کہ آپ سے کوئی پوچھتا ہے کہ فلاں ڈاکٹر کہاں رہتا ہے؟ آپ اس کو بتائیں کہ سیدھی رہداری چلیں، پھر مڑ کر فلاں کمرہ نمبر میں جائیں، وہ ڈاکٹر صاحب آپ کو وہاں ملیں گے۔ راستہ دکھانا اور اشارہ بھی کر دینا اس کو "اِرَاءَةُ الطَّرِيْقِ" کہتے ہیں۔ تو یہ بھی ہدایت ہے۔

اور ایک ہدایت "اِيْصَالٌ إِلَى الْمَطْلُوْبِ" ہے کہ میں نے پوچھا: فلاں ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے۔ تو اس آدمی نے میرا ہاتھ پکڑا اور اس ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گیا کہ "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کے مہمان ہیں۔ تو یہ بھی ہدایت ہے۔

ایک آدمی نے راستہ دکھایا ہے اور دوسرے نے منزل پر پہنچایا ہے۔ اس لیے آدمی نماز میں دعا مانگتا ہے "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" (یا اللہ! ہمیں منزل مقصود پر پہنچا) قرآن پاک میں آتا ہے کہ جب جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے تو کہیں گے:

﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ أَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾ [الاعراف: ۴۳]

"تمام تر شکر اللہ کا ہے، جس نے ہمیں اس منزل تک پہنچایا، اگر اللہ ہمیں نہ پہنچاتا تو ہم کبھی منزل تک نہ پہنچتے۔"

بعض علماء نے فرمایا: "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کا معنی یہ ہوتا ہے "اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْنَا عَلَى الْهِدَايَةِ" (اے اللہ! ہمیں ہدایت پر ثابت قدم رکھ) آج ہم پڑھ رہے ہیں کل بھٹک نہ جائیں اور گمراہ نہ ہو جائیں۔ کتنے نمازی لوگ تھے جو بھٹک گئے، نمازیں چھوڑ گئے اور کتنے فاسق فاجر تھے جو نمازی بن گئے۔ اس لیے آدمی دعا مانگتا رہے: "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ"۔

بدل اور مبدل منہ والے شبہ کا جواب:

اب رہا یہ شبہ کہ بدل اور مبدل منہ دونوں کا ذکر کیوں کیا؟ تاکہ متعین کا پتا چلے کہ جن پر اللہ نے انعام کیا ہے وہ نبیین ﷺ، صدیقین، شہداء، اور صالحین ﷺ ہیں۔ ہمیں راستے کا تو پتا لگ گیا، لیکن ہمیں اس راستہ پر چلانے والا تو کوئی ہوگا۔ اگر اس راستے پر چلانے والا اور سڑک عبور کرانے والا نہ ملتا تو کامیابی کیسے ملتی؟ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ اگر تم نے کامیابی حاصل کرنی ہے تو ان لوگوں کی معیت حاصل کرو۔ نبیین کا زمانہ تو گزر گیا، اب صدیقین، شہداء اور صالحین کی صحبت اختیار کرو۔

اسی کے ضمن میں اس اعتراض کا جواب بھی ہو گیا کہ حضور ﷺ کو اللہ نے ہادی بنا کر بھیجا ہے اور اللہ نے قرآن میں یہ بھی فرمادیا ہے:

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ﴾ [القصص:٥٦]

"آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدیت کر دیتا ہے۔"

ابو طالب کے پاس حضور ﷺ تشریف لائے اور کوشش کی کہ کلمہ پڑھ لیں۔ فرمایا:

((قُلْ كَلِمَةً أُحَاجُّ لَكَ بِهَا عِنْدَ اللَّهِ)) [تفسیر البیضاوی،تحت:سورۃ الانفال]

"ایک مرتبہ کلمہ پڑھ لیں، تا کہ مجھے اللہ کے سامنے کیس پیش کرنے کا موقع تو ملے۔"

چچا کہتے ہیں: میں جانتا ہوں کہ تم سچے ہو، میں چاہتا ہوں کہ تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دوں، لیکن میں عار سے ڈرتا ہوں کہ ساری برادری کہے گی کہ ابو طالب موت اور قبر سے ڈر گیا، اس لیے میں اس عار کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا۔

((أَنَا عَلَى مِلَّةِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ)) [المستدرک علی الصحیحین للحاکم،حدیث:٣٢٩١]

"میں عبدالمطلب کی ملت پر ہوں۔"

حضور ﷺ بہت غمگین تھے کہ یہ میرا چچا میرا محسن ہے۔ ہر دکھ سکھ میں حضور ﷺ کا ساتھ دینے والا بھی جہنم میں جائے گا، کیونکہ کلمہ نہیں پڑھا۔ تو اللہ نے فرمایا:

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ﴾ [القصص:٥٦]

"آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدیت کر دیتا ہے۔"

اے میرے نبی! راستہ دکھانا تو آپ کا کام ہے، لیکن منزلِ مقصود پر پہنچانا اور اس کی توفیق آپ کا کام نہیں ہے۔ اس سے ہمیں ہدایت کا معنی اور مفہوم سمجھ میں آ گیا کہ ایک ہے راستہ دکھانا اور اللہ نے سارے انبیاء ﷺ اسی لیے بھیجے کہ وہ لوگوں کو راستہ دکھائیں، لیکن منزلِ مقصود پر پہنچانا اللہ کا کام ہے۔

کیا فاتحہ میں یہود و نصاریٰ کی دشمنی سکھائی گئی ہے؟

وہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿اهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ۝﴾ [الفاتحہ: ۵، ۶، ۷]

''ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما، ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام کیا، نہ کہ ان لوگوں کے راستے کی جن پر غضب نازل ہوا ہے اور نہ ان کے راستے کی جو بھٹکے ہوئے ہیں۔''

یہ عجیب بات ہوئی کہ جن پر انعام ہو گیا، صاف ظاہر ہے کہ ان پر ناراضگی نہیں ہو گی۔ یہ دونوں چیزیں علیحدہ علیحدہ کیوں ذکر کیں؟ اور وہ کہتے ہیں کہ روایات میں آتا ہے کہ ''غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ'' سے مراد یہود ہیں اور ''وَلَا الضَّآلِّيۡنَ'' سے مراد نصاریٰ ہیں۔ اس لیے یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ تمہارے مسلمانوں کے بچوں کو شروع ہی سے ہمارے خلاف یہ سبق دیا جاتا ہے تو پھر ہماری اور تمہاری صلح کیسے ہو؟

قرآن کی اہلِ کتاب سے رواداری:

یہ بھی اسلام پر بہتان ہے۔ کیا ان کی نظر ان آیتوں پر نہیں ہے جو اہلِ کتاب کی تعریف میں ہیں؟ قرآن میں ہے:

﴿وَمِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ مَنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِقِنۡطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ ۚ﴾ [آلِ عمران: ۷۵]

''اہلِ کتاب میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں کہ اگر تم ان کے پاس دولت کا ایک ڈھیر بھی امانت کے طور پر رکھوا دو تو وہ تمہیں واپس کر دیں گے۔''

وہ امانت پر قائم رہیں گے، خیانت نہیں کریں گے۔ اسی طرح جو صحیح طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے ہیں قرآن نے ان کی تعریف کی ہے:

﴿قَالَ الۡحَوَارِيُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشۡهَدۡ بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ ۝﴾ [آلِ عمران: ۵۲]

''حواریوں نے کہا: ہم اللہ (کے دین) کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لا چکے ہیں، اور آپ گواہ رہیے کہ ہم فرمانبردار ہیں۔''

یہ آیتیں ان کو نظر نہیں آتیں اور ''غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ'' والی آیت نظر آتی ہے۔ اسی طرح قرآن میں ہے کہ مسلمانوں کے دشمن یہود بھی ہیں اور نصاریٰ بھی ہیں، لیکن زیادہ عداوت یہود کو ہے۔ فرمایا:

﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوا الۡيَهُوۡدَ وَالَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقۡرَبَهُمۡ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوا

﴿الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ۝﴾ [المائدۃ:۸۲]

"تمام آدمیوں سے زیادہ مسلمانوں سے عداوت رکھنے والے آپ ان یہود اور مشرکین کو پائیں گے اور ان میں مسلمانوں کے ساتھ دوستی رکھنے میں زیادہ قریب ان لوگوں کو پائیں گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں۔ یہ اس سبب سے ہے کہ ان میں بہت سے علم دوست عالم ہیں اور بہت سے تارک دنیا درویش ہیں اور اس سبب سے بھی ہے کہ یہ لوگ متکبر نہیں ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نصاریٰ مسلمانوں سے محبت کرنے والے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے علماء، قسیسین اور راہب ہیں اور تکبر نہیں کرتے اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑتے ہیں۔ قرآن اہلِ کتاب کی تعریف بھی کر رہا ہے۔ یہ ان کو نظر نہیں آتا۔

کاش! امتِ محمدیہ ﷺ میں کوئی ایک آدمی ایسا ہوتا جو کفار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا، لیکن ہم مجموعی طور پر اتنے کمزور ہو چکے ہیں جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

قرآن تو کہتا ہے کہ اہلِ کتاب کا ذبیحہ بھی حلال ہے، ان سے نکاح بھی جائز ہے، لیکن یہود پر غضب اس لیے ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کہنا نہ مانا۔ اور اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ۝﴾ [الاعراف:۱۶۶]

"یعنی جس کام سے ان کو منع کیا گیا تھا جب وہ اس میں حد سے نکل گئے تو ہم نے ان کو (بطور قہر) کہہ دیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ۔"

ایک اعتراض اور اس کا بہترین جواب:

ایک دفعہ میڈیا والوں نے ٹیلی فون کر کے پوچھا کہ کیا آپ اس حدیث کو مانتے ہیں کہ جس پتھر کے پیچھے کوئی یہودی چھپنے کی کوشش کرے گا وہ پتھر پکارے گا:

((يَا مُسْلِمُ! هٰذَا يَهُوْدِيٌّ وَرَائِي فَاقْتُلْهُ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۲۹۲۶، باب: قتال الیہود]

"اے مسلم! یہ میرے پیچھے یہودی ہے اسے قتل کر ڈال۔"

میں نے کہا: ہاں! یہ حدیث ہے۔ انہوں نے کہا: جب یہ حال ہے تو مسلمانوں کے ساتھ صلح کیسے ہو سکتی ہے؟

میں نے کہا: یہ واقعہ کس وقت ہوگا؟ یہ اس وقت ہوگا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین پر اتریں گے۔ اب تم نصرانیوں پر اعتراض کرو کہ تمہارا نبی ہمیں مروائے گا، لیکن ان کے ساتھ تو تم ملے ہو، ہم نے تو تمہیں مدینہ میں بھی پناہ دی، خیبر میں بھی پناہ دی اور ہمارے نبی ﷺ کا سب سے پہلے جو معاہدہ ہوا جسے میثاق مدینہ کہتے ہیں یہودیوں کے ساتھ ہوا ہے۔ اگر ہمارے نبی ﷺ کے دل میں بغض ہوتا تو وہ اتنی اہمیت کیوں دیتے؟ جب میڈیا والے نے یہ سنا تو وہ چونکا۔ میں نے کہا: یہ چیزیں ہیں، لیکن آپ کو نظر نہیں آئیں گی، کیونکہ آپ کو صرف وہ چیز نظر آتی ہے جس سے مسلمان کو بدنام کرتا ہو، الزام لگاتا ہو اور جہاں مذہبی دہشت گرد ثابت کرتا ہو۔

یہودیوں پر غضب کی ایک وجہ:

اسی طرح ان پر غضب اس لیے ہوا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: چلو! جہاد کے لیے چلتے ہیں تو انہوں نے انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قَالُوا يٰمُوسٰى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ﴾ [المائدۃ:۲۲]

"کہنے لگے: اے موسیٰ! وہاں تو بڑے بڑے زبردست آدمی ہیں اور ہم تو وہاں ہرگز قدم نہ رکھیں گے جب تک کہ وہ وہاں سے نکل نہ جاویں۔ ہاں! اگر وہ وہاں سے کہیں اور چلے جائیں تو ہم بے شک جانے کو تیار ہیں۔"

اسی طرح تم وادی تیہ کے اندر اپنے نبی کے زمانہ میں بھٹکتے رہے۔ تم میں سے جو بھی اسلام لایا، اسلام نے اس کو سینے سے لگایا ہے۔ حضور ﷺ نے یہود سے یہ کہا کہ ایک آدمی قتل ہوگیا ہے، اس کی دیت کے لیے ہم چندہ کررہے ہیں اور تم لوگ بھی ہمارے حلیف ہو چندہ دو۔ یہودیوں نے کہا: ٹھیک ہے، آپ تشریف لے آئیں۔ جتنا آپ فرمائیں گے اتنا ہم چندہ دیں گے۔ ادھر حضور ﷺ کو دعوت دے رہے ہیں اور دوسری طرف اپنے ایک آدمی کو قلعہ پر بٹھا کر بڑے بڑے پتھر دے رہے ہیں کہ ہم حضور ﷺ کو دیوار کے ساتھ بٹھادیں گے۔ تم اوپر سے پتھر پھینک دینا۔ تو حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ یہودیوں کے اس مذموم پروگرام سے آگاہ کردیا اور آپ ان کے شر سے محفوظ ہوگئے۔

بہرحال! پہلی بات تو یہ ہے کہ صرف یہود و نصاریٰ مراد نہیں ہیں، بلکہ ذکر جزء کا ہے اور مراد کل مخالفین اور گمراہ فرقے ہیں۔ دوسری بات اگر مان بھی لیں تب بھی یہ صرف مثال کے طور پر بیان فرمایا ہے۔

آدمی کی چار حالتیں ہوتی ہیں:

1 ...... اعتقاد بھی صحیح ہو اور عمل بھی صحیح ہو۔

2 ...... اعتقاد بھی غلط ہو اور عمل بھی غلط ہو۔

3 ...... اعتقاد صحیح ہو اور عمل غلط ہو۔

4 ...... اعتقاد غلط ہو اور عمل صحیح ہو۔

کوئی بندہ ان چار حالتوں میں سے ایک میں لازمی طور ہوگا، اس کے علاوہ پانچویں صورت نہیں بن سکتی۔

خدا کی شان کہ ''غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ'' دونوں میں فسادِ عقیدہ بھی ہے اور فسادِ عمل بھی ہے، لیکن جن کا فسادِ عقیدہ ہے ان پر اللہ کا غضب آگیا اور جو گمراہ ہیں، عمل میں گڑبڑ ہے وہ نصاریٰ ہوں گے۔ اس لیے دیکھیں! حضور ﷺ کی زندگی میں یہود سے جنگ ہوئی ہے، لیکن نصاریٰ سے کبھی جنگ نہیں ہوئی۔

رومی سپر پاور کے حکمران ہرقل کا حضور ﷺ کے بارے میں نظریہ:

ہرقل عیسائیوں کی سپر پاور تھی۔ ان کے بارے میں سنا کہ وہ حملہ کرنے کے لیے آرہے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہم خود جائیں گے۔ آپ گئے لیکن وہ مقابلے کے لیے نہیں آئے۔ اس ہرقل نے اپنے قریبی لوگوں سے کہا کہ وہ اللہ کا نبی ہے اور اللہ کے نبی سے ہم جنگ جیت ہی نہیں سکتے۔ اس لیے عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم لڑنے کے لیے نہ جائیں۔

نصاریٰ نجران کا وفد عبدالمسیح کی قیادت میں آیا تھا جس میں ساٹھ یا ستر آدمی تھے۔ حضور ﷺ نے ان کو مباہلہ کی دعوت دے دی۔ جب سارے عیسائی مشورہ کے لیے اکٹھے ہوئے تو انہوں نے کہا: یہ اللہ کا سچا نبی ہے، صلح کرلو۔ جو کچھ مانگتے ہیں دے دو، لیکن مباہلہ یعنی ان کے مقابلہ میں ہلاکت کی دعا نہ کرنا۔ اس لیے اللہ نے فسادِ عقیدہ والوں کا بھی ذکر کردیا اور فسادِ عمل والوں کا بھی ذکر کردیا۔

ایک اور جواب:

بعض علماء نے بڑی اچھی بات کی ہے کہ مسلمانوں میں ہندو بننے کا اتنا خطرہ نہیں ہے۔ خطرہ تھا تو صرف یہودیت اور نصرانیت سے تھا۔ آج بھی مسلمانوں کو دیکھو کہ عقیدے میں جو تشکیکات ہیں وہ سب یہودیوں کے عمل کا اثر

ہے۔ اور عمل کے اعتبار سے مسلمان جتنا بگڑا ہوا ہے، شکل وصورت کے اعتبار سے کھانے اور پہننے کے اعتبار سے وہ سارا نصاریٰ کا اثر ہے۔ آج مسلمان میں وہی نفاق ہے جو یہودی میں ہے۔ جیسے یہودی کہتے ہیں کہ ہمیں تو عذاب ہی نہیں ہوگا اور کبھی کہتے ہیں: جتنے دن ہمارے بڑوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی اتنے دن عذاب ہوگا۔ جیسے وہ متذبذب ہیں اسی طرح مسلمان بھی متذبذب ہیں۔ کبھی کہتے ہیں "یا اللہ!" اور کبھی کہتے ہیں "یا داتا!"۔

اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ حضور ﷺ کی امت گمراہ ہوگی اور ان فتنوں میں مبتلا ہوگی۔ اس لیے فرمایا کہ یوں دعا کیا کرو: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ [الفاتحہ: ۵، ۶، ۷]۔ آمین۔

قرآن کی عظیم الشان سورت:

سورۂ فاتحہ ایسی بابرکت سورت ہے کہ جس کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہ تورات میں اتری، نہ انجیل میں اتری اور نہ زبور میں اتری۔ تقریباً سوا چار سو کتابیں اللہ نے قرآن سے پہلے اتاریں۔ ان تمام کتابوں میں سے افضل اللہ کا قرآن ہے، پھر قرآن کی اعظم اور شان والی سورتوں میں سے سورۂ فاتحہ ہے۔ اسی لیے ائمہ کرام کے نزدیک اس سورت کے شانِ نزول کے بارے میں اختلاف ہے۔

سورۂ فاتحہ مکی بھی ہے اور مدنی بھی:

بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ سورت مدنی ہے، ہجرت کے بعد اتری ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک اور راجح قول بھی یہی ہے کہ سورۂ فاتحہ مکی ہے، ہجرت سے پہلے اور ابتدائے زمانۂ بعثت میں اتری ہے کہ جس زمانہ میں سورۂ علق کی پانچ آیتیں اور سورۂ مدثر کی کچھ آیات نازل ہوئی تھیں اسی زمانہ میں سورۂ فاتحہ پوری کی پوری اتری تھی۔ کیونکہ قرآن اپنی تفسیر خود بیان کرتا ہے۔

اور سورۂ فاتحہ کی سات آیات ہیں اور اس کا نام "سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ" بھی ہے۔ اللہ نے قرآن پاک میں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝﴾ [الحجر: ۸۷]

"اور ہم نے تمہیں "سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ" (سات ایسی آیتیں جو بار بار پڑھی جانے والی ہیں) دے رکھی ہیں اور عظمت والا قرآن عطا کیا ہے۔"

یہ آیت مکہ میں اتری ہے۔ اگر سورۂ فاتحہ اس سے پہلے اتری ہو تب جا کر یہ معنی بنے گا۔

پورا قرآن صراطِ مستقیم کا جواب ہے:

علماء نے فرمایا کہ انسان نے سورۂ فاتحہ کے اندر اللہ تعالیٰ کی پہلے حمد و ثنا بیان کی، پھر اللہ کے سامنے دعا کی درخواست کی تو آگے "الٓمٓ" سے "وَالنَّاسِ" تک اس دعا کا نتیجہ ہے کہ تم نے صراطِ مستقیم کی دعا کی ہے۔ تو میں قرآن کو اتار رہا ہوں، قرآن کو مضبوطی سے تھام لو گے تو صراطِ مستقیم کو پہنچ جاؤ گے۔ اسی لیے قرآن نے فرمایا:

﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا﴾ [آل عمران: ۱۰۳]

"اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھامے رکھو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو۔"

اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا:

((وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِينُ)) [سنن الترمذی، حدیث: ۲۹۰۶، باب: ما جاء في فضل القرآن]

"قرآن اللہ کی مضبوط رسی ہے۔"

اور اسی لیے فرمایا: جو لوگ قرآن کی پناہ میں آگئے وہ نجات پا گئے اور جو قرآن سے اعراض کر گئے وہ ہلاک و برباد ہو گئے۔ اسی لیے علماء نے فرمایا کہ سورۂ فاتحہ میں اللہ نے جو ہمیں سوال سکھایا تھا پورا قرآن اسی سوال کا جواب ہے۔

سورۂ فاتحہ کے اہم مضامین:

بعض علماء نے فرمایا: اگر تدبر و تفکر اور غور کریں تو پورے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں ہے، کیونکہ قرآن کے اہم مضامین: توحید، رسالت اور مسئلۂ معاد ہیں، جن کو ایمان بالثلاثیات کہتے ہیں کہ ان تین پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ اگر ایک چیز کے اندر بھی کجی آجائے تو آدمی مومن ہی نہیں رہتا۔ توحید کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ذات اور صفات میں وحدانیت کا قائل ہونا۔ مسئلۂ معاد کا یہ معنی ہے کہ مرنے کے بعد اٹھنا ہے، حشر ہے، نشر ہے، حساب کتاب ہے، جنت ہے اور جہنم ہے۔ پورے قرآن میں یہ تین اہم مسائل ہیں، باقی سارا قرآن اس پر دلیل ہے۔

سورۂ فاتحہ کے اندر بھی غور کریں تو تینوں مسئلے آجاتے ہیں۔ سب سے پہلے اللہ کی حمد و ثنا ہے، اللہ کی ذات و صفات کا اقرار ہے، اس کے بعد اسی کی خالص عبادت اور خالص اسی سے مدد مانگنے کا اعتراف ہے۔ اسی کے اندر مسئلۂ الوہیت و

وحدانیت اپنے تمام اجزاء کے ساتھ آ گیا ہے۔ اس کے بعد ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ میں مسئلۂ معاد کا ذکر ہے۔ پھر ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ میں اللہ کے انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین رحمہم اللہ کا ذکر ہے، گویا نبوت ورسالت کا ذکر ہے۔ اس لیے علماء نے فرمایا: کسی نے پورے قرآن کا خلاصہ دیکھنا ہو تو وہ سورۂ فاتحہ کو دیکھے۔

سورۂ فاتحہ کا خلاصہ ''بِسْمِ اللهِ'' میں:

اور بعض علماء اور آگے بڑھے اور انہوں نے کہا: پورے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں ہے اور پوری سورۂ فاتحہ کا خلاصہ ''بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' میں ہے، کیونکہ اس میں ہے کہ تیرے نام کے ساتھ مدد اور استعانت پکڑتے ہیں۔ اسی کا نام ہمیں سکھایا جا رہا ہے جس نے قرآن اتارا، انبیاء علیہم السلام بھیجے، آخرت کے بارے میں بتایا۔ تو اصل مسئلہ تو خدا کی اعانت، استعانت ومدد ہے۔ اس لیے سورۂ فاتحہ کا خلاصہ ''بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' میں آ گیا۔

''بِسْمِ اللهِ'' کا خلاصہ ''ب'' کے نقطہ میں:

بعض علماء اس سے بھی آگے بڑھے، انہوں نے کہا: پوری ''بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کا خلاصہ ایک نقطہ میں ہے کہ ساری دنیا اسی کے دروازے پر گھومتی پھرے گی، ساری مخلوق اسی کی محتاج ہے جو ''اَحَدٌ'' ہے، ''اَلصَّمَدُ'' ہے، ''لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ'' ہے، جس کا نام ''بِسْمِ اللهِ'' میں موجود ہے، جس کا کوئی تثنیہ اور جمع نہیں آیا۔ اس لیے دیکھا جائے تو ساری ''بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کا خلاصہ ایک نقطہ میں آ گیا۔

حضور ﷺ نے فرمایا: جو مجھے عظیم سورتیں دی گئی ہیں وہ سورۂ فاتحہ اور خواتیم سورۂ بقرۃ ہیں۔ یعنی ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ...﴾ سے آخر تک۔ اس کے آخر میں بھی ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بندے کا کام مانگنا ہے، دینے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔

نماز میں فاتحہ واجب ہے:

سورۂ فاتحہ کی فضیلت کے بارے میں بہت سی احادیث آئی ہیں۔ اسی لیے علماء اس بات پر متفق ہو گئے کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی، کیونکہ حضور ﷺ کی واضح اور صریح حدیث موجود ہے کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اس لیے ائمہ کرام رحمہم اللہ نے فرمایا کہ اگر نماز میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی تو نماز نہیں ہوگی، لیکن بعض ائمہ کرام رحمہم اللہ نے

فرمایا کہ اگر سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی، لیکن کہیں سے بھی قرآن پڑھ لیا نماز تو ہو جائے گی، لیکن ایسے کرنا نہیں چاہیے۔
ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے:

﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۭ﴾ [المزمل:۲۰]

"تم لوگوں سے جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جا سکے پڑھ لیا کرو۔"

امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا مسئلہ:

یہ علیحدہ مسئلہ ہے، اس کا اوپر والے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھنی چاہیے یا نہیں؟ اس مسئلہ کے بارے میں امام شافعی ﷫ فرماتے ہیں کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی، کیونکہ حدیث مبارک ہے:

((لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ)) [البخاری،حدیث:۷۵۶،باب:وُجُوبِ الْقِرَاءَةِ لِلْإِمَامِ...]

"جس نے فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز ہی نہیں ہوئی۔"

چاہے مقتدی ہے یا امام، نماز جہری ہے یا سری ہے، سب کو فاتحہ پڑھنی ہوگی، کیونکہ حدیث کے لفظ عام ہیں، کسی قسم کی کوئی قید نہیں ہے۔

امام احمد بن حنبل ﷫ فرماتے ہیں: اگر نماز جہری ہے (جس میں امام فاتحہ اور سورت زور سے پڑھتا ہے) اس میں مقتدی نہ پڑھے، کیونکہ مقتدی کے ذمہ سننا ہے، پڑھنا نہیں ہے، البتہ سری نمازوں میں (جن میں امام فاتحہ اور سورت آہستہ آواز سے پڑھتا ہے) امام اور مقتدی دونوں سورۂ فاتحہ پڑھیں۔ اگر جہری نمازوں میں مقتدی امام سے اتنا دور ہے کہ امام کی قراءت نہیں سن رہا تو پھر مقتدی فاتحہ پڑھ سکتا ہے۔

امام ابوحنیفہ ﷫ فرماتے ہیں کہ امام بھی فاتحہ پڑھے گا اور تنہا نمازی بھی فاتحہ پڑھے گا، لیکن مقتدی امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھے گا۔ تو اختلاف صرف اقتدا کی صورت میں ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے کھڑا ہے تو فاتحہ پڑھے یا نہ پڑھے؟

امام ابوحنیفہ ﷫ کے دلائل:

امام ابوحنیفہ ﷫ کی دلیل قرآن کی یہ آیت ہے:

﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝﴾ [الاعراف:۲۰۴]

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو (تمہارا کام یہ ہے) اس کو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو، تا کہ تم پر رحمت ہو۔''

تو اللہ کی رحمت دونوں چیزوں (چپ رہنے اور سننے) سے مشروط ہے۔ اور قاعدہ ہے: ''إِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَ الْمَشْرُوطُ'' (جب شرط ختم ہو جائے تو مشروط خود بخود ختم ہو جائے گا۔) مثلاً: آپ کہتے ہو کہ اگر تم میرے پاس آؤ گے تو میں تمہارا احترام کروں گا اور اگر تم نہیں آؤ گے تو تمہارا احترام نہیں ہوگا۔ تو لہٰذا تم اللہ کی رحمت میں تب شامل ہو گے جب تم سنو بھی سہی اور چپ بھی رہو۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جتنی احادیث کی کتابیں ہیں ان میں ''کِتَابُ الصَّلٰوۃِ'' کا باب کھولو، اس میں نماز کی فضیلت ہے اور ایک منفرد کو نماز سکھائی ہے۔ اور ایک باب ہے جس میں امام کو نماز سکھائی ہے اور ایک باب ہے اس میں اس نمازی کی نماز سکھائی ہے جو امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہو۔ مسلم کے اندر حدیث موجود ہے کہ حضور ﷺ نماز سکھلا رہے ہیں۔ یہ کمال بات ہے کہ ''لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ'' کے اندر مقتدی کا لفظ نہیں ہے اور نہ ہی امام کا لفظ ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: ﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ جمعہ کے خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، نماز کے بارے میں نازل نہیں ہوئی۔ یعنی جب خطبہ پڑھا جائے تو چپ رہو اور اس کو سنو۔

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس لیے آپ اس بات پر غور کریں کہ اگر خطبہ کے وقت خطبہ کو سننا اور چپ رہنا ضروری ہے اس میں بھی اللہ کا قرآن اور حدیث کا بیان ہوتا ہے۔ جب اس کو سننا ضروری ہے تو امام کے پیچھے نماز کے اندر قرآن کو سننا اور زیادہ ضروری ہے۔

اور امام صاحب کی دوسری دلیل یہ حدیث ہے:

''مَنْ كَانَ لَهُ إِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الْإِمَامِ لَهُ قِرَاءَةٌ'' [ابن ماجہ حدیث: ۸۵۰، باب إِذَا قَرَأَ الْإِمَامُ فَأَنْصِتُوا]

''جس آدمی کا امام ہو تو امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے۔''

اسی طرح حضور ﷺ نے نماز سکھاتے ہوئے فرمایا:

((فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا...)) [صحیح مسلم حدیث: ۴۰۴]

''جب امام اللہ اکبر کہے تم بھی اللہ اکبر کہو۔''

یہاں امام کا وظیفہ بھی بتا رہے ہیں اور مقتدی کا وظیفہ بھی بتا رہے ہیں۔ مقتدی کو سکھلایا، فرمایا:

((وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوا))

''جب وہ پڑھے تو تم خاموش رہو۔''

اور یہاں پر یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ حضور ﷺ نے سورۂ فاتحہ کے بارے میں تو نہیں فرمایا کہ جب امام پڑھے تو تم خاموش رہو۔ تو واضح فرمادیا:

((وَإِذَا قَالَ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ فَقُولُوا آمِينَ)) [صحیح مسلم، حدیث:۴۰۴]

''جب امام ''وَلَا الضَّالِّينَ'' کہے تو تم آمین کہو۔''

اتنی بڑی وضاحت کے بعد کوئی شبہ نہ رہا کہ فاتحہ امام کے ذمہ ہے، مقتدی فاتحہ نہیں پڑھے گا اور جب امام ''وَلَا الضَّالِّينَ'' کہے گا اس وقت مقتدی آمین کہے گا۔''

حضور ﷺ نے دونوں کے کام بھی تقسیم کر دیے کہ مقتدی کا کام یہ ہے اور امام کا کام یہ ہے۔ اس طرح امام صاحب نے قرآن کی آیت پر بھی عمل کیا کہ جب قرآن پڑھا جائے تو سنو اور چپ رہو اور حدیث پر بھی عمل کیا کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اکیلا ہے تو فاتحہ پڑھے، امام ہے تو فاتحہ پڑھے اور مقتدی فاتحہ نہ پڑھے، کیونکہ امام نے اپنی طرف سے اور مقتدی کی طرف سے فاتحہ پڑھی ہے۔ لہٰذا نماز فاتحہ کے بغیر تو نہ ہوئی۔ ہاں! اگر امام فاتحہ نہ پڑھتا تو پھر نماز بغیر فاتحہ کے ہوتی۔

اور حدیث پر بھی عمل ہو گیا کہ جس کا امام ہو تو امام کی قراءت مقتدی کے لیے کافی ہے۔ اور صحیح مسلم شریف کی حدیث پر بھی عمل ہو گیا کہ جب امام پڑھے تو تم چپ رہو۔ اس لیے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مقتدی کا وظیفہ خاموش رہنا ہے، کیونکہ امام ضامن ہے۔ اگر اس نے ثنا پڑھی ہم نے بھی پڑھی، قراءت اس نے کی ہم نے بھی کی، رکوع اس نے بھی کیا ہم نے بھی کیا، سجدہ اس نے بھی کیا اور ہم نے بھی کیا، التحیات اس نے بھی پڑھی ہم نے بھی پڑھی اور سلام اس نے بھی پھیرا اور ہم نے پھیرا، پھر امام نے ہمارا کون سا بوجھ اٹھایا؟ اور کس چیز کا وہ قائم مقام بنا؟ صرف یہی قراءت ہے۔

امام کے کام مقتدی کے کام کیسے ہوئے؟

عقلی دلیل یہ ہے کہ حرم کے اندر امام کعبہ کے پیچھے بیس لاکھ آدمی نماز پڑھ رہا ہے۔ امام سے کوئی غلطی ہو گئی اور امام کو سجدہ سہو کرنا پڑا تو مقتدی بھی سجدہ کریں گے، حالانکہ غلطی اس کی ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ امام کی غلطی

کو اپنی غلطی بتاتے ہو، لیکن اس کے قرآن کو اپنا قرآن نہیں بناتے، امام کا وضو ٹوٹ گیا تو اس کی نماز ٹوٹ گئی تو ہماری نماز بھی ٹوٹ جاتی ہے۔

سورۂ فاتحہ اللہ کے سامنے سوال کرنا ہے۔ سوال کرنے کا قاعدہ یہ ہے کہ جب سوال اجتماعی ہو تو ایک بولے گا اور باقی سب خاموش کھڑے رہیں گے۔ دنیا کے بادشاہوں کے کچھ آداب ہیں تو اللہ کے دربار میں بھی آداب ہیں کہ ایک آدمی کے رکوع پر رکوع سجود پر سجود کریں گے کہ یا اللہ! جو یہ کر رہا ہے، ہمارا بھی یہ مقصد ہے۔

کتاب وسنت، خلفاء راشدین اور بڑے بڑے صحابہ کے عمل کی روشنی میں دیکھیں تو ان سب کے ہاں بھی یہی ہے کہ اگر امام ہے تو اس کا پڑھنا مقتدی کے لیے کافی ہے۔

اتنے دلائل کے باوجود ہم تمام ائمہ کو برحق کہتے ہیں، کیونکہ ان کا مقصد بھی حضور ﷺ کے فرمان کو سمجھنا تھا۔ اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں کرے۔

شریعت میں ایک مسئلہ کے کئی درست احتمالات

پہلی مثال:

کبھی کبھی ایسے ہوتا ہے کہ ایک فرمان ہوتا ہے اور اس کو سمجھنے والے دو آدمی ہوتے ہیں اور دونوں مختلف سمجھتے ہیں۔ جیسے حضور ﷺ نے حکم فرمایا:

((لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ الْعَصْرَ إِلَّا فِي بَنِي قُرَيْظَةَ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۹۴۶، باب: صلاۃ الطالب...]

''میرے تمام صحابہ عصر کی نماز بنو قریظہ میں پڑھیں۔''

صحابہ کو نماز کا وقت راستے میں ہو گیا تو دو جماعتیں ہو گئیں: ایک نے کہا کہ جلدی سے عصر کی نماز پڑھ لو، لیکن دوسروں نے کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا تھا کہ عصر کی نماز بنو قریظہ میں پڑھنا۔ اس لیے جب تک ہم بنو قریظہ میں نہیں پہنچیں گے نماز نہیں پڑھیں گے۔ پہلے گروہ نے کہ کہ حضور ﷺ کا مقصد اور منشا یہ تھا کہ جلدی کرو، یہ نہیں کہ نماز کا وقت ہو جائے تو نماز نہ پڑھنا۔ اللہ نے قرآن میں نماز کے اوقات متعین کر دیے ہیں۔ اگر بنو قریظہ میں جاتے جاتے ہوئے نماز کا وقت ختم ہو جائے تو ہم کیسے نماز پڑھیں گے؟ تو آدھے صحابہ نے راستہ میں نماز پڑھی اور آدھے صحابہ نے بنو قریظہ میں جا کر نماز پڑھی۔ حضور ﷺ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو حضور ﷺ نے

فرمایا: تم دونوں نے ٹھیک کیا۔

دیکھو! دونوں نے علیحدہ علیحدہ سمجھا، لیکن دونوں کی نیت میں اخلاص تھا اور دونوں کی سمجھ درست تھی تو حضور ﷺ نے دونوں کو سچا فرمایا۔

دوسری مثال:

غزوۂ بدر کے موقع پر حضور ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا۔ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ اگرچہ کافر و مشرک ہیں، لیکن آپ کے رشتہ دار ہیں۔ آپ ان پر احسان کریں، یہ احسان کا بدلہ ضرور دیں گے۔ حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا تو انہوں نے عرض کیا کہ میری رائے یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تلوار دیں کہ وہ اپنے چچا کے بیٹے کی گردن پر تلوار رکھیں اور میں اپنے رشتہ داروں کی گردن پر رکھتا ہوں۔ جب انہوں نے کلمہ نہیں پڑھا، آپ کی رسالت کو نہیں مانا اور توحید کو نہیں مانا تو ان سے کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔ اللہ نے ہمیں دشمن باندھ کر دیا ہوا ہے، آج ہی اس کو جڑ سے اکھیڑ دیں۔

دونوں کی رائے مختلف ہے، حالانکہ دونوں حضور ﷺ کے فرمانبردار ہیں۔

ائمۂ فقہ کی تعظیم:

اسی طرح یہ ہماری جہالت ہے کہ ائمہ کے مسائل کو، اختلاف کو سمجھ نہیں سکتے۔ دو کتابیں پڑھ کر ہم مولوی بن گئے۔ یہ ہماری کم عقلی ہے۔ اللہ نے جنہیں مقامِ امامت، تفقہ فی الدین عطا فرمایا اور ان کا زمانہ بھی حضور ﷺ کے زمانہ کے قریب ہے۔ ان کا تمام مقصود اتباع محمد مصطفیٰ ﷺ تھا۔ اگر ان کا کہیں سمجھنے اور بعض الفاظ کی تحقیق میں اختلاف ہو گیا ہم ان کے اختلاف کو بدنیتی پر محمول نہیں کریں گے، بلکہ یہ کہیں گے:

"اَلْمُجْتَهِدُ قَدْ يُخْطِئُ وَقَدْ يُصِيْبُ"

"ہر مجتہد غلطی بھی کرتا ہے اور صواب کو بھی پہنچتا ہے۔"

کیونکہ میرے نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ اگر مجتہد غلطی بھی کرتا ہے تو اللہ اس کو ایک ثواب دیتے ہیں اور اگر وہ صواب کو پہنچ جائے تو اللہ اس کو دوہرا اجر دیتے ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی کے بارے میں دل میں برا خیال اور گمان نہ ہو۔ اللہ نے اس سے منع فرما دیا ہے۔ قرآن میں فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا﴾

[الاحزاب:۵۸]

''اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ان کے کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچاتے ہیں، انہوں نے بہتان طرازی اور کھلے گناہ کا بوجھ اپنے اوپر لاد لیا ہے۔''

اس لیے وہ عذاب کے لیے تیار رہیں۔ جب اللہ کسی سے ناراض ہوتا ہے تو وہ شخص کسی اللہ والے کی غیبت میں لگ جاتا ہے اور جو اس کے دوستوں کے خلاف ہو جائے اس سے اللہ خود جنگ فرماتے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ تمام ائمہ کی تعظیم کریں۔ اس لیے علماء نے فرمایا کہ اگر کوئی ایک ایسی بات کہہ دے جس میں ننانوے فیصد کفر کا احتمال ہو اور ایک فیصد ایمان ہو سکتا ہو تو اس کو کافر نہ کہو، کیونکہ ہو سکتا ہے اس کی مراد وہی ایک فیصد ہو، ننانوے فیصد اس کے ذہن میں بھی نہ ہو۔ اسلام نے ہمیں بڑی احتیاط کی تاکید کی ہے۔

بہرحال! فاتحہ عظیم سورت ہے۔ قاعدہ ہے کہ جس کے جتنے نام زیادہ ہوں اتنی وہ چیز عظیم ہوتی ہے۔ اور سورۂ فاتحہ کے بھی کئی نام ہیں۔ جیسے صحیح احادیث میں اللہ کے ننانوے نام ہیں اور بعض کتابوں میں ہزار اور بعض میں تین ہزار نام بھی ہیں۔

بعض اسلامی کتابوں کی مقبولیت:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ''اَلْاَسْنٰی فِيْ اَسْمَاءِ اللّٰهِ الْحُسْنٰی'' کتاب لکھی ہے۔ اس میں اللہ کے ناموں کو جمع فرمایا ہے۔ وہ محدث بھی تھے، مفسر بھی تھے، فقیہ بھی تھے اور اللہ نے ان کے اخلاص کو اتنا قبول فرمایا ہے کہ حنبلیوں، حنفیوں اور مالکیوں کے مدارس میں بھی اس کو پڑھایا جا رہا ہے اور شافعیوں کے ہاں تو ویسے بھی پڑھی جاتی ہے، کیونکہ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ شافعی تھے۔

اسی طرح اللہ پاک نے بخاری شریف کو اتنا مقبول فرمایا کہ تمام ممالک میں اس کو پڑھا جاتا ہے۔ عام آدمی بھی جانتا ہے۔ کوئی بات آ جائے تو کہتا ہے کہ اچھا یہ بخاری شریف میں ہے؟ اصل اخلاص کی بات ہے۔

بعض مقبول تراجم قرآن:

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے دو بیٹوں: شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر دونوں حضرات نے قرآن مجید کا ایسا ترجمہ لکھا کہ شاہ عبد القادر نے چالیس سال میں قرآن پاک کا ترجمہ مسجد میں لکھا اور مسجد سے باہر نہیں گئے۔ اتنے

اخلاص اور پاکبازی سے جس آدمی نے ترجمہ لکھا ہو تو کتنا وہ مقبول ہوگا؟ وہ پرانے زمانے کی اردو ہے، جو مشکل ہے۔ اس لیے علماء نے ترجمہ کو کچھ سہل بنانے کی کوشش کی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے خاندان میں ایک سے بڑھ کر ایک پیدا ہوا۔ یہ اللہ کی طرف سے مقبولیت ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ترجمہ ہے، جس میں حضرت شاہ عبد القادر رحمہ اللہ مذکور کے ترجمہ کی تسہیل وتجدید کی گئی ہے، جو مالٹا کے قید خانہ میں بیٹھ کر لکھا تھا۔ حالانکہ ان کے پاس دیگر کوئی مراجع نہیں تھے، لیکن آج بھی بڑے بڑے علماء ترجمہ میں الجھ جائیں تو وہی ترجمہ اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ اسی کے اندر مسئلہ موجود ہوتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ انسان علم اور سمجھ بھی رکھتا ہو۔ اگر وہ فاعل، مفعول، معروف اور مجہول میں بھی فرق نہ کر سکے تو وہ ترجمہ کیا سمجھے گا؟

ایک مراثی کا تفسیر لکھنے کا دعویٰ:

آج یہ دور آ گیا ہے کہ میں اگلے دن اخبار میں پڑھ رہا تھا کہ کوئی گانے والا، غالباً جس کا نام عنایت حسین بھٹی ہے، جو نام سے بھی شیعہ لگتا ہے اور ملنگ قسم کا ہے۔ شیعہ ہی ہوگا۔ اس نے کہا کہ میں بھی قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہا ہوں۔ اللہ معاف کرے! اگر یہ گانے والے اور مراثی تفسیر لکھنے بیٹھ جائیں تو اس سے زیادہ کیا ظلم ہو سکتا ہے؟ اس لیے دعا کریں! اللہ ایسے لوگوں کو ہدایت دے اور صحیح عقیدہ اور علماء کی صحبت نصیب فرمائے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: کوئی اپنی مرضی سے قرآن میں کوئی کلمہ کہہ دے تو وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنالے۔ قرآن پاک کے اندر تو ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما یہ نہیں کہتے کہ ہماری رائے یہ ہے، وہ تو کہتے ہیں: ''سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ، هٰكَذَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم.'' حضور ﷺ نے یوں فرمایا، مجھے پڑھایا، سکھایا۔ قرآن ایسی چیز نہیں جس میں تم اپنی رائے اور فکر چلاتے رہو، کیونکہ جب عقل سے کام لیں گے تو ٹھوکریں کھائیں گے۔

قربانی پر جدید لوگوں کا اعتراض:

جیسے بہت سے لوگوں نے کہہ دیا کہ قربانی کا کیا فائدہ ہے کہ اربوں روپیہ ضائع کر دیا جائے، اتنا پیسہ فقیروں اور مسکینوں کو دے دو۔ پہلے تو ہر آدمی گوشت نہیں کھاتا تھا، اب تو ہر آدمی گوشت کھاتا ہے۔ تو قربانی کا کیا فائدہ؟ اور جن کے ذہنوں میں ہے کہ اللہ نے حکم دیا ہے: ﴿هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ﴾ [المائدۃ:۹۵] (کعبہ پہنچا کر قربان کیا جائے)۔

اگر حاجی متمتع یا قارن ہو تو اس کو قربانی دینی ہوگی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''سُنَّةُ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ

السَّلَامُ" (تمہارے ابا ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے)۔ [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۳۱۲۷]

انسان کے اندر جان اور روح ہے۔ جان کے صدقے تو ساری زندگی کرتے رہتے ہیں، لیکن قربانی یہ روح دار چیز ہے، یہ روح کے لیے قربانی دے رہے ہیں تو اس کا بدل غیر ذی روح چیز نہیں بن سکتی۔ ہاں اگر پیسوں کے اندر تم روح ڈال دو تو پھر ٹھیک ہے۔ لیکن جو دین کی سمجھ رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر خون بہانا مقصود نہ ہوتا تو پھر حضور ﷺ بھی حکم دے دیتے کہ تم اونٹ ذبح نہ کرو، بلکہ پیسے دے دو۔ اس میں ہمارا اعتراف ہوتا ہے کہ اللہ! اگر آپ حکم کرتے تو ہم اپنی گردن بھی کٹا دیتے، لیکن آپ نے جانور کے ذبح کا حکم دیا ہے وہ ہم کر رہے ہیں۔

اسلام پر جدید اعتراضات:

اگر ہر کام عقل سے ہو تو ایک کہے گا کہ قربانی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، دوسرا کہے گا کہ حج کی کیا ضرورت ہے؟ گرمیوں میں دھکا کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور ایک کہے کہ ہوا ایک جگہ سے خارج ہوگئی اور بندہ سارا وضو کرے اس کو عقل نہیں مانتی۔ اور یہ کہے کہ آدمی ساری زندگی بہن پالتا ہے، جب بڑی ہوجائے تو خود نکاح کیوں نہ کرے؟ دوسرے کو کیوں دے دے؟ جب عقل میں آؤ گے تو تم تباہ و برباد ہوجاؤ گے۔ کیونکہ اللہ سے اور اس کے رسول ﷺ سے نہ کوئی عقل میں بڑا ہے، نہ کوئی علم میں بڑا ہے۔ اس لیے ہمیں قرآن اس وقت سمجھ میں آئے گا جب ہم قرآن کو قرآن و سنت کی روشنی میں سمجھیں گے۔

سورۂ فاتحہ کے نام:

سورۂ فاتحہ کے کئی نام ہیں: ایک نام "اُمُّ الْكِتَابِ" ہے۔ "اُمُّ" ماں کو کہتے ہیں۔ جس طرح ماں اولاد کی اصل ہوتی ہے، اسی طرح سورۂ فاتحہ بھی پورے قرآن کا خلاصہ ہے۔ دوسرا نام "فَاتِحَةُ الْكِتَابِ" ہے، کیونکہ اللہ کا قرآن اس سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا نام "اُمُّ الْقُرْاٰنِ" بھی ہے، گویا قرآن کی چھوٹی سورت فاتحہ ہے۔ ایک نام "اَلسَّبْعُ الْمَثَانِيْ" بھی ہے۔ "مَثَانِيْ" کا معنی مکرر اور بار بار ہے اور "سَبْعٌ" کا معنی سات ہے۔ اس کو بھی بار بار پڑھا جاتا ہے۔ خدا کی قدرت کہ اس کی آیتیں بھی سات ہیں، جنت کے دروازے بھی سات ہیں، سجدہ بھی سات اعضا پر ہوتا ہے، ہفتے کے دن بھی سات ہیں، زمینیں بھی سات ہیں، طواف کے چکر بھی سات ہیں، صفا مروہ کے چکر بھی سات ہیں اور سورۂ فاتحہ کی آیتیں بھی سات ہیں۔ اس کی حکمتیں اللہ ہی جانتا ہے۔ اس کا شریعت اور مسئلہ سے

کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر اللہ چاہتے تو اس کو کم اور زیادہ بھی کر سکتے تھے۔ تو معلوم ہوا کہ اس کے اندر حکمتیں ضرور ہیں۔ اس پر ہمارا ایمان ہے۔ "مَثَانِي" کا معنی ہے بار بار، کیونکہ یہ سورت ایک دفعہ مکہ میں نازل ہوئی اور ایک دفعہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ دو دفعہ نازل ہوئی ہے۔ اور اس کو نماز میں بھی بار بار یعنی ہر رکعت میں پڑھا جاتا ہے، اس لیے اس کو "مَثَانِي" بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کا نام "وَافِيَةٌ" بھی ہے، "كَافِيَةٌ" بھی ہے اور "شِفَاءٌ" بھی ہے۔

سورۂ فاتحہ کے مضامین:

سورۂ فاتحہ کی پہلی تین آیات میں حمد و ثنا ہے، آخری تین آیات میں خالص دعا ہے اور درمیانی آیت میں من وجہ حمد و ثنا ہے اور من وجہ دعا ہے کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں، یعنی تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ یہ حمد و ثنا ہے۔ اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ یہ دعا ہے۔

زمانوں کے اعتبار سے سورۂ فاتحہ کی تقسیم:

زمانے تین ہیں: ماضی جو زمانہ گزر گیا ہے، حال جس زمانہ میں ہم موجود ہیں اور مستقبل آنے والے زمانے کو کہتے ہیں۔

جب ہم نے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کہا تو اس سے ہم نے اقرار کیا کہ اے اللہ! ہم آپ ہی کی حمد و ثنا بیان کرتے ہیں، کیونکہ آپ نے ہمیں عدم سے وجود بخشا ہے اور آپ ہی "رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" ہیں۔ یہ زمانہ کے ساتھ متعلق ہے۔ اور ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ (بے حد مہربان نہایت رحم والا) اس کا تعلق زمانہ حال کے ساتھ ہے کہ ہماری ہر ضرورت کو پورا فرمایا، ہر حال میں ہماری مدد فرمائی۔ مستقبل کے اندر ہم اللہ سے مدد مانگ رہے ہیں کہ جس طرح تو نے زمانہ ماضی و حال میں ہماری مدد فرمائی ہے اسی طرح آپ ہم پر مستقبل کے اندر بھی رحم فرمائیں۔

جب آپ اس بات پر غور کریں گے کہ ہمیں عدم سے وجود میں لانے والے اور ہماری تربیت فرمانے والے اللہ ہی ہیں، ہماری ہر حال میں مدد فرمانے والے بھی جب اللہ ہی ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ عبادت کے لائق بھی صرف اللہ ہی ہیں۔

عبادت کا معنی اور اقسام:

عبادت کا معنی یہ ہے کہ کسی کی غایت تعظیم اور کمال محبت میں آ کر اظہار بندگی اور عاجزی کرنا۔ اگر کوئی ڈنڈے سے کرائے تو اس کو عبادت نہیں کہیں گے۔ یعنی اس ذات سے کمال محبت بھی ہو اور انتہائی تعظیم بھی ہو تو اس وقت اس کے آگے جھکنا، عاجزی، تذلل سے اور اس کی تعظیم اور اس کی عظمت کا اعتراف یہ عبادت کی قبولیت ہے۔ عبادت صرف نماز ہی نہیں، بلکہ روزہ ہے، حج ہے، زکوۃ ہے، اللہ کا ذکر ہے، تلاوتِ کلامِ پاک ہے، اللہ کے اوامر پر چلنا اور نواہی سے رکنا ہے۔ یہ تمام چیزیں عبادت ہیں۔

جب نماز عبادت ہے تو اس کے تمام ارکان رکوع، سجود، ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا بھی عبادت ہے۔ حمد وثنا بیان کرنا بھی عبادت ہے، اس کا ذکر کرنا بھی عبادت ہے۔ جیسے کعبۃ اللہ کا طواف کرنا عبادت ہے، کیونکہ اللہ کا حکم ہے، ورنہ کعبۃ اللہ تو پتھروں کا مکان ہے۔ نہ سونا ہے، نہ چاندی ہے، بلکہ بڑے بڑے پتھر ہیں۔ وہ بھی بے ترتیب، کوئی درمیانہ، کوئی بڑا اور کوئی چھوٹا ہے۔ اس کا طواف کر رہے ہیں، کیونکہ اللہ نے اس کو اپنا گھر قرار دیا ہے۔ اس لیے ہم اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔

عبادت صرف خدا کی ہے:

''إِيَّاكَ'' کو ''نَعْبُدُ'' پر مقدم کیا ہے۔ کیونکہ اگر ''نَعْبُدُ إِيَّاكَ'' ہوتا تو معنی ہوتا کہ ہم تیری بھی عبادت کرتے ہیں مطلب ہوتا کہ غیروں کی بھی کرتے ہیں، لیکن جب ''إِيَّاكَ'' کو مقدم کر دیا تو معنی ہوا کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ مثلاً: آپ کی بیوی کہے گی کہ میں تیری ہی بیوی ہوں۔ یوں نہیں کہے گی کہ میں تیری بھی بیوی ہوں۔ اگر وہ تیرے ساتھ کسی اور کو شریک کرے تو شریف بیوی نہیں کہلا سکتی اور مرد بھی باغیرت نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح جب آدمی اللہ کی عبادت میں شریک کرے کہ تیری بھی عبادت کرتے ہیں اور تیرے سوا بھی بھی قبر کو سجدہ کر لیتے، ہمیشہ ہم تیری نذر و نیاز کرتے ہیں، لیکن کبھی کبھی نذر و نیاز حسین بھی کر لیتے ہیں، ہمیشہ تیرے نام کی منت مانتے ہیں، لیکن کبھی کبھی پیروں کے نام پر بھی منت مان لیتے ہیں۔ یہ شرک ہے۔

بندے کی صفت عبدیت کاملہ:

تو اصل یہ ہے کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور کسی کو شریک نہیں کرتے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے:

﴿فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۚ﴾ [ھود:۱۲۳]

''اے محمد (ﷺ)! آپ اسی کی عبادت کیجیے اور اسی پر بھروسہ رکھیے۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا﴾ [النساء:۳۶]

''اور اللہ کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔''

بندے کی سب سے بڑی صفت عبدیت ہے۔ جب بندہ عبدِ کامل بن جائے یہی اس کا اصل مقام ہے۔ اس لیے اللہ نے معراج والی آیت میں فرمایا:

﴿سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى﴾ [الاسراء:۱]

''پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی۔''

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ۝﴾ [النجم:۱۰]

''اس طرح اللہ کو اپنے بندے پر جو وحی نازل فرمانی تھی، وہ نازل فرمائی۔''

اور اور ایک دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَأَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا ۝﴾ [الجن:۱۹]

''اور جب خدا کا (خاص) بندہ خدا کی عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو یہ (کافر) لوگ اس بندہ پر بھیڑ لگانے کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ۝﴾ [مریم:۳۰]

''میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾ [الفرقان:۶۳]

''اور رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔''

اور اسی طرح فرمایا:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾ [الزمر: ۵۳]

''آپ کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو! جنہوں نے (کفر وشرک کر کے) اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو۔''

اصل مقام یہ ہے کہ اس کا عبد بن جائے کہ خالص اللہ کے لیے عبادت ہو۔ فرمایا:

﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ [البینۃ: ۵]

''حالانکہ ان لوگوں کو (کتب سابقہ میں) یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اسی طرح عبادت کریں کہ عبادت اسی کے لیے خالص رکھیں۔''

ذرے کے برابر بھی اس میں کسی کو شریک نہ کریں۔ اور وہ عبادت یہ ہے کہ کمال محبت اور غایت تعظیم دل کے اندر آ جائے۔ جب کسی کی محبت اور عظمت ہو تو آدمی اس کا احترام کرتا ہے۔ استاذ آ جاتا ہے تو اس کا احترام کرتا ہے، والد آ جاتا ہے تو اس کا احترام کرتا ہے، کوئی بزرگ آ جائے تو اس کا احترام کرتا ہے اور اگر کوئی اللہ کا ولی آ جائے تو بندہ اس کا احترام کرتا ہے۔ اور جب اللہ کی ذات کے ساتھ تعلق جڑے تو اللہ کی عظمت دل میں کتنی ہوگی؟ تو اس کی ظاہری صورت یہی ہے کہ ہم ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور اس کی حمد وثنا بیان کر رہے ہوتے ہیں اور پھر شیطان مردود کے شر سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اور پھر اللہ کے نام سے مدد مانگتے ہیں، اس کے بعد حمد کا اعتراف کرتے ہیں پھر اس کی صفات کا اقرار کرتے ہیں۔ پھر اقرار کرتے ہیں کہ مالک تو ہے اور بدلہ دینے والا بھی تو ہے۔ اس کے بعد اقرار کرتے ہیں کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اس لیے یاد رکھیں! عبادت صرف اللہ کی ہوگی۔ دعا بھی عبادت ہے، حمد وثنا بھی عبادت ہے، رکوع بھی عبادت ہے، سجدہ بھی عبادت ہے، کسی کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا بھی عبادت ہے، کسی کے سامنے خشوع وخضوع کے ساتھ گر جانا بھی عبادت ہے، اعتکاف بیٹھنا بھی عبادت ہے، طواف کرنا بھی عبادت، اللہ کے نام پر قربانی کرنا بھی عبادت اور نذر ونیاز بھی عبادت ہے۔ اب یہ ساری چیزیں کس کے نام پر ہوں گی؟ اگر ان میں سے کسی ایک میں بھی کسی کو شامل کرو گے تو شرک ہوگا۔ مثلاً: اگر کسی اور کی نماز پڑھو گے تو شرک ہوگا اور اگر طواف کعبہ کی بجائے قبر کا طواف کرو گے تو شرک ہوگا۔

قبروں کی تعظیم:

بعض ہمارے مولوی بھائی لوگوں کو مغالطہ میں ڈال دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ بات ٹھیک ہے کہ عبادت صرف اللہ کے لیے ہے۔ اگر ہم کسی بزرگ کے مزار پر جاتے ہیں، گلے میں کپڑا ڈالتے ہیں اور دروازے میں داخل ہوتے ہوئے، اپنے آپ کو جھکا لیتے ہیں اور پھر چوکھٹ کو چوم لیتے ہیں، قبر کے تعویذ کو چومتے ہیں، طواف کرتے ہیں یا ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو کر دعا مانگتے ہیں اور الٹے پاؤں واپس آتے ہیں یہ تو تعظیم ہے عبادت نہیں، عبادت تو صرف اللہ کے لیے ہے، تعظیم تو ہم بزرگوں کی بھی کر سکتے ہیں، سجدہ کر سکتے ہیں۔ عبادت والا سجدہ اور ہے اور تعظیم والا سجدہ اور ہے۔ لہٰذا عبادت والے سجدے کو ہم بھی کفر کہتے ہیں۔ جب یہ مغالطہ دیتے ہیں تو لوگ مغالطے میں پڑ جاتے ہیں۔

سجدہ صرف خدا کے لیے:

ایک دفعہ صحابہ ﷺ نے جمع ہو کر حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! جب ہم دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں تو ہم نے دیکھا ہے کہ لوگ جب بادشاہ کے دربار میں جاتے ہیں تو پہلے جھکتے ہیں، سجدہ کرتے ہیں اور پھر ہاتھ باندھ کر بادشاہ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اور اس وقت تک سر نہیں اٹھاتے جب تک بادشاہ ان کو اجازت نہ دے۔ آپ تو ہمارے دین و دنیا کے بادشاہ ہیں، آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم بھی جب آپ کے دربار میں داخل ہوں تو آپ کو سجدہ کریں، تعظیم بجا لائیں اور آپ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں۔ آپ ہمیں اجازت دیں۔ سوال کرنے والے صحابہ ہیں اور پوچھ بھی حضور ﷺ سے رہے ہیں۔ اب آپ بتائیں کہ صحابہ جو پوچھ رہے تھے تعظیم کے لیے پوچھ رہے تھے یا عبادت کے لیے پوچھ رہے تھے؟ کیا وہ حضور ﷺ کی عبادت کرنا چاہتے تھے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: خبردار! اگر میں کسی کو اللہ کے سوا سجدے کی اجازت دیتا یا حکم دیتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔

[سنن أبي داود، حديث: ٢١٤٠، باب: في حق الزوج على المرأة؛ سنن الدارمي، حديث: ١٥١٥]

اگر بیوی کو بھی حکم ہوتا تو تعظیم کے لیے ہوتا نا کہ عبادت کے لیے ہوتا۔ لیکن اللہ نے حکم دیا ہے:

﴿لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾

[حم السجدة: ٣٧]

''نہ سورج کو سجدہ کرو، نہ چاند کو (نہ بلند چیزوں اور چمکنے والی چیزوں کو سجدہ کرو) اور سجدہ اس اللہ کو کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اگر واقعی تمہیں اسی کی عبادت کرنی ہے۔''

دیکھو! حکم ہے کہ سورج نکلے تو نماز نہ پڑھو، سورج سر پر آ جائے تو سجدہ نہ کرو، جب ڈوب رہا ہو تو نماز نہ پڑھو۔ کیونکہ ان اوقات میں سورج کے پجاری سورج کی عبادت کرتے ہیں۔ اگر ہم نماز پڑھیں بھی سہی تو اللہ کے لیے پڑھیں گے، ہمیں سورج سے کیا واسطہ؟ لیکن منع فرما دیا، کیونکہ اگر ہم نماز پڑھ رہے ہوں تو نہ جاننے والا یہ کہے گا کہ سورج کے پجاری ہیں۔ اب جو آدمی کعبہ کے آگے بھی سجدے کرے اور قبر کے آگے بھی سجدے کرے قبر تو بالکل سامنے ہوتی ہے تو وہ کیسے جائز ہے؟

دیکھو! تمام پانچ نمازوں میں رکوع اور سجدہ ہے۔ جب جنازہ پڑھتے ہیں تو رکوع اور سجدہ نہیں ہے۔ کیونکہ سامنے میت رکھی ہے، کوئی یہ نہ سمجھے کہ اسی کو سجدہ کر رہے ہیں۔ اللہ نے فرمایا: بس کھڑے کھڑے دعا کر دو، میں قبول کر لوں گا، تاکہ کسی کو شبہ اور شک بھی نہ پڑے۔ اب اللہ کے ولی کا جنازہ سامنے رکھا ہو تو رکوع اور سجدے کا حکم نہیں ہے، لیکن جب وہی ولی قبر میں چلا جاتا ہے تو قبر کو سجدہ کرنا جائز ہو جائے گا؟ اسی لیے فرمایا:

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝﴾ [الفاتحۃ: ۴]

''(اے اللہ!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔''

بندے کو رب بنانے کی مثال اور چند قابلِ اصلاح امور:

قرآن کی ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ﴾ [التوبۃ: ۳۱]

''انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ (پیروں) کو رب بنا رکھا ہے۔''

''اَحْبَارٌ'' ''حِبْرٌ'' کی جمع ہے، عالم کے معنی میں ہے۔ اور ''رُهْبَانٌ'' ''رَاهِبٌ'' کی جمع ہے بمعنی عبادت گزار، یعنی پیر جو گوشہ نشین ہوتے تھے، پہاڑوں میں چلے جاتے تھے۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ پہلے عیسائی تھے پھر مسلمان ہوئے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! قرآن کہتا ہے کہ لوگوں نے اپنے پیروں اور مولویوں کو رب بنا لیا ہے، جبکہ ہم نے تو ان کو کبھی بھی رب

نہیں بنایا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: اے عدی! ایک بات بتاؤ کہ جن چیزوں کو اللہ نے حلال کر دیا ہے اور تمہارے ان مولویوں نے اور پیروں نے ان کو حرام کر دیا اور جن چیزوں سے منع کیا اور انہوں نے کہا اس چیز کو کرو۔ تو تم نے مولویوں کی بات مانی یا نہیں مانی؟ مثلاً: اللہ فرماتے ہیں کہ ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار نہ کرو۔ انہوں نے اپنے پادریوں سے مسئلہ پوچھا کہ سخت حکم ہے، لیکن اس دن مچھلی بھی بہت ہوتی ہے۔ اب ہم کیا کریں؟ تو پادریوں نے کہا کہ چھوٹے چھوٹے نالے بنا کر حوض بنالو پھر پانی ادھر چھوڑ کر حوض بند کرلو اور اتوار والے دن اس مچھلی کو پکڑ لیا کرو۔ حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ہاں یہ بات تو تھی کہ جب وہ کہتے تھے کہ یہ کرو تو ہم کرتے تھے اور جب کہتے کہ یہ نہ کرو تو ہم نہیں کرتے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ حق تو صرف میرے رب کا ہے۔ جب اس کے مقابلے میں یہ حق کسی بندے کو دے دیا تو گویا تم نے اس کو رب بنالیا۔

[السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث: ۲۰۳۵۰]

سارے قرآن مجید کو ٹھنڈے دماغ سے پڑھ لو، پورے قرآن میں دیکھیں: اللہ نے کسی جگہ گیارہویں کرنے کا حکم دیا ہے؟ عرس کا؟ تیجہ کا حکم دیا ہے؟ ساتے جمعراتیں، قل خوانیاں اور چالیسواں کرنے کا حکم دیا ہے؟ محرم کے دس دن سیاہ کپڑے پہننے کا اور چارپائیاں الٹی کرنے کا حکم دیا ہے؟ نذر و نیاز، جلوس نکالنے کا کوئی حکم دیا ہے؟ تو جن مولویوں کا کہنا مان کر ہم یہ کر رہے ہیں اور خدا کے حکم پر نہیں چل رہے تو مطلب ہوا کہ ہم ان مولویوں کو رب بنا رہے ہیں۔ اسی طرح صحابہ گزرے ہیں، اہلِ بیت گزرے ہیں کوئی بتلا دے کہ ان میں سے کسی نے حضور ﷺ کے روضے کا طواف کیا ہے؟ کیا ان کے دل میں حضور ﷺ کی عظمت نہیں تھی، ہمارے دل میں عظمت ہے؟ ہم اگر جالیاں چومیں تو تعظیم ہے اور اگر انہوں نے جالی نہیں چومی تو انہوں نے تعظیم نہیں کی؟ کیا ان کے دل میں حضور ﷺ کی محبت نہیں تھی؟ ان سب صحابہ کو مسئلہ سمجھ نہیں آیا؟ اور چودہ سو سال بعد والے لوگوں نے جو مسئلہ نکالا وہ صحیح ہے؟

تمام صحابہ نے زکوٰۃ بھی دی ہے، صدقات بھی کیے ہیں، اللہ کے راستے میں جان اور مال سب کچھ لٹا دیا ہے، کیا انہوں نے کسی نبی، کسی فرشتے کی نذر و نیاز مانی تھی؟ اللہ کے گھر میں اعتکاف بیٹھنا عبادت ہے، لوگ قبر پر ۹ راتیں اعتکاف بیٹھتے ہیں اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اپنے بچے کی لٹ اس وقت کٹوائیں گے جب سائیں کے مزار پر جائیں گے۔ قبر پر جا کر بچے کی لٹ کٹانے کا کیا مطلب؟ یہی کہ پیر دیکھ رہا ہے کہ میرا مرید بچے کو لے کر آیا ہے۔

اللہ ہدایت دے۔

﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ (تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔) یعنی دنیاوی امور ہیں یا اخروی امور ہیں، جسمانی امور ہیں یا روحانی امور ہیں مدد اللہ سے مانگتے ہیں۔ یاد رکھیں امداد اس سے مانگی جاتی ہے جو دینے کے قابل ہو اور ہماری بولی بھی سمجھتا ہو۔ آپ عربی کو کہیں کہ پانی دو تو وہ کہے گا کہ کیا بات ہے؟ اس کو تو بات سمجھ ہی نہیں آئے گی۔

مثل مشہور ہے کہ ہمارے علاقے کے کچھ لوگ حج کرنے کے سلسلے آئے۔ اس وقت پانی نہیں ہوتا تھا، پانی بیچنے والے کندھے پر ستہ (مشک) لٹکا کر بیچتے تھے۔ تو ان میں سے ایک نے آ کر کہا: ''حاجی میاہ'' اس قافلے میں عورتیں بھی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ دیکھو ایک حاجی مر گیا ہے۔ دوسرے نے آواز لگائی تو انہوں نے کہا: لو دوسرا حاجی بھی مر گیا، تیسرے نے آواز لگائی تو انہوں نے کہا کہ حاجی مر رہے ہیں۔ یہاں تو بلا پڑ گئی ہے۔ اس لیے جب آدمی زبان نہ سمجھے تو کیا اس سے مدد مانگے گا؟

لیکن اب آپ کعبہ میں ہیں، ذہن بالکل خالی کر دیں۔ سمجھیں کہ عربی والا عربی میں دعا مانگ رہا ہے، سندھی سندھی زبان میں مانگ رہا ہے، انگریزی بولنے والا انگریزی زبان میں مانگ رہا ہے۔ افریقین افریقی زبان میں مانگ رہا ہے۔ مختلف زبانوں میں اس عقیدے کے ساتھ اللہ سے مانگ رہے ہیں کہ اللہ سمجھتا بھی ہے اور مدد کرنے پر قادر بھی ہے۔ اگر تمہارا پیر سندھی ہے اور اس سے پشتو میں جا کر مانگو گے تو وہ کہے گا: پیر سے کیا بکواس کرتا ہے؟ جب وہ دنیا میں پشتو نہیں سمجھتا تو قبر میں کیسے پشتو سمجھنے لگ گیا؟ اور جس کا پیر سرحد والا ہو، زندہ بھی ہو اور کوئی سندھی میں جا کر مانگے تو کیا وہ سمجھ لے گا؟ اور اگر پیر پنجاب کا ہے اور آپ اس سے انگریزی میں مانگیں گے تو کیا وہ سمجھ لے گا؟ جب ایک زندہ پیر دو زبانیں جانتا ہے چار نہیں جانتا یا چار جانتا ہے، آٹھ زبانیں نہیں جانتا تو جب وہ قبر میں چلا جاتا ہے پھر وہ ساری زبانیں کیسے سمجھ لیتا ہے؟ پھر ہماری مدد کے قابل کیسے ہو جاتا ہے؟ مثلاً: اگر ہمارا پیر بزرگ ہے، عالم ہے، لیکن غریب آدمی ہے۔ اب سارے اس کے پاس اکٹھے ہو کر چلے جائیں کہ ہمیں سو سو ریال دو۔ جب اس کے پاس ہے ہی نہیں تو وہ کیسے دے سکتا ہے؟ اس لیے اس سے مانگا جائے جس کے پاس آسمانوں اور زمینوں کے خزانے ہیں، جو کبھی ختم نہیں ہو سکتے، جو ہر زبان سمجھ سکتا ہے اور سب کو دے سکتا ہے۔ ساری کائنات کی مرادیں اور آرزوئیں پوری کر دے تو ایک روپے کے برابر بھی کمی نہ ہو۔

غیر سے مدد مانگنا کب شرک ہے؟

یاد رکھیں! ایک ہے مادی اسباب کے تحت مدد طلب کرنا۔ جیسے کوئی آدمی کہے: یار! مجھے تھوڑا سا راستہ دے دے، میں چلنے میں دشواری محسوس کر رہا ہوں۔ میرے پاس کتاب نہیں ہے، کتاب دے دیں، یا کتاب سمجھ نہیں آرہی آپ سمجھا دیں۔ یہ مادی اسباب ہیں۔ مادی اسباب کے اندر اللہ کے پیغمبر کے پاس یا اللہ کے ولی کے پاس جانا کہ آپ ہمارے لیے دعا کر دیں۔ تو یہ جائز ہے۔

مدد مانگنا دو طریقے سے شرک بنتا ہے:

اللہ کے سوا کسی کو مختار کل اور متصرف مانتے ہوئے اس سے مدد مانگے۔ یا یہ کہے کہ قادر مطلق خدا ہے، رازق بھی خدا ہے، متصرف فی الامور بھی خدا ہے، لیکن اللہ نے ان کو بھی مختار بنا دیا ہے، یعنی اللہ نے ان کو بھی اختیار دے دیا ہے۔ یہ بھی شرک ہے۔ یہی وہ شرک تھا جو مکہ کے مشرک کرتے تھے۔ جب ان سے پوچھا جاتا کہ تم شرک کیوں کرتے ہو؟ تو وہ یوں نہیں کہتے تھے کہ یہ ہمارے خدا ہیں، بلکہ کہتے:

﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ﴾ [یونس:۱۸]

"یہ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔"

یہ سفارش کرتے ہیں اور ہمارا کام ہو جاتا ہے۔

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ﴾ [الزمر:۳]

"ہم تو ان کی پرستش صرف اس لیے کرتے ہیں کہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں۔"

اسی لیے جب وہ تلبیہ پڑھتے تو کہتے تھے:

"لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ"

"اے اللہ! تیرا کوئی شریک نہیں، مگر وہ جس کو تو نے خود شریک بنایا ہے۔ اور اس کا مالک بھی تو ہے وہ تیرے مالک نہیں ہیں۔"

اب اس عقیدے کے ساتھ کسی بزرگ کے مزار پر جانا، کسی اللہ والے کی دربار پر جانا یا آستانے پر جانا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ اصل تو اللہ ہے، لیکن اللہ نے ان کو بھی کچھ نہ کچھ اختیار دے دیا ہے۔ اور یہ اسی اختیار دیے ہوئے

میں سے ہمیں دے دیتے ہیں تو یہ بھی شرک ہے۔

معجزہ اور کرامات کے ذریعہ سے غلط فہمی:

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں معجزات اور کرامات سے دھوکہ لگتا ہے کہ ایک پیغمبر کے ہاتھ نے چاند کے دوٹکڑے کیسے کر دیے؟ دریا بہہ رہا ہے اور ایک اللہ کا ولی فوج لے کر گزر گیا تو کہتے ہیں: اگر اللہ کے ولیوں کے ہاتھ میں اختیار نہ ہوتا تو پانی کے اوپر سے کیسے گزر جاتے؟ معلوم ہوا کہ اللہ نے ان کو اختیار دیا ہوا ہے۔ یہاں جا کر آدمی عقیدے سے بھٹک جاتا ہے۔

یاد رکھو! معجزہ اللہ کے نبی کے ہاتھ سے اور کرامت ولی کے ہاتھ پر اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتی جب تک اللہ نہ چاہیں۔ اللہ چاہتے ہیں تو ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ چاہے تو حضور ﷺ کے ہاتھ سے چاند دوٹکڑے ہو جائے اور اگر اللہ نہ چاہے تو حضور ﷺ کے دو دندان مبارک شہید ہو جاتے ہیں۔ اگر اللہ چاہتے تو جن کی انگلیوں سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا تھا اسی انگلی سے زمین پر کافر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔ ایک دفعہ آپ نے پیالے میں ہاتھ رکھا تو پندرہ سو آدمیوں نے پانی پی لیا۔ اور اگر اللہ نے حضور ﷺ کے ہاتھ پر معجزہ نہ دکھایا تو حضور ﷺ کئی کئی دن فاقے سے رہے۔ بھوک کی تکلیف بھی برداشت کرنی پڑی۔ معجزہ اور کرامت میں لوگوں کو دھوکہ اور مغالطہ لگ جاتا ہے۔ معجزہ اور کرامت تب ظاہر ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ دکھانا چاہتے ہیں۔ نہ معجزہ نبی کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے اور نہ کرامت ولی کے اپنے اختیار میں ہوتی ہے۔ مکہ والے سارے آگئے کہ آپ ہمیں یہ معجزہ دکھائیں اور یہ معجزہ دکھائیں۔ اللہ نے فرمایا ان کو جواب دے دیں:

﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا﴾ [الاسراء:۹۳]

"اے کافرو! اللہ کی ذات پاک ہے، میں تو ایک بشر ہوں اور اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں۔"

تمام پیغمبروں نے کہہ دیا:

﴿وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَّأْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ﴾ [ابراہیم:۱۱]

"اور یہ بات ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ ہم اللہ کے حکم کے بغیر تمہیں کوئی معجزہ لا دکھائیں۔"

اے کافرو! ہمارے اپنے ہاتھ میں معجزات نہیں ہیں کہ تمہیں دکھلا دیں اور تمہارے مطالبے پورے کر دیں۔ اگر

اللہ چاہے گا تو دکھلا دے گا اور اگر نہیں چاہے گا تو نہیں دکھلائے گا۔ اللہ چاہتا ہے تو میدان بدر میں فرشتوں کو اتار کر کافروں کو ٹکڑے ٹکڑے کروا دیتا ہے۔ اللہ نہ چاہے تو احد میں فرشتے بھی نہیں اترے اور میرے مدنی ﷺ کے ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے۔

غیر خدا کو قدرت واختیار:

اس لیے یاد رکھیں! اللہ کے سوا کسی کو قادر مطلق، رازق اور متصرف مان کر مدد مانگے تب بھی شرک ہے اور اگر یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ نے ان کو اختیار دے دیا ہے، جو چاہیں کریں، لہٰذا ہم ان سے مدد مانگیں۔ تو یہ بھی کفر اور شرک ہے۔ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے نام پر ان کے ایک مرید نے شعر لکھا ہے:

؎ ذی تصرف بھی ہے، ماذون بھی ہے، مختار بھی ہے
اور کارِ عالم کا مدبر بھی ہے عبد القادر

اس کو تصرف کا بھی اختیار ہے، اس کو اللہ نے اجازت دی ہوئی ہے اور اس کو اختیار ہے۔ تمام عالم کا نظام وہی چلا رہا ہے۔ اور آگے کہتا ہے:

بندہ قادر کا بھی ہے قادر عبد القادر

(شاعر کا نام بھی عبدالقادر تھا) کہتا ہے کہ بندہ بھی قادر ہے اور خدا بھی قادر ہے۔ یعنی عبدالقادر قادر ہے۔ اسی سے ان مسلمانوں کے عقیدوں کو دیکھ لیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جب گمراہیاں آدمی کے سر پر چڑھ جاتی ہیں تو آدمی حق کا راستہ نہیں دیکھ سکتا۔ حالانکہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا مسلک حنبلی ہے جو یہاں کے رہنے والوں کا مسلک ہے۔ یہاں کے لوگوں کو وہابی اور نجدی کہتے ہیں۔ اور شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کو پیرانِ پیر اور مختار کل کہتے ہیں۔ وہ بڑے موحد اور اہل سنت والجماعت کے اتنے بڑے عالم تھے کہ باطل فرقے آج تک ان کے نام سے چڑتے ہیں۔ جتنا انہوں نے صحابہ کی عظمت کے بارے میں کام کیا ہے کسی اور نے نہیں کیا۔ لیکن شیطان بدلے لیتا ہے۔ کیونکہ جب کوئی حق والا موجود ہو تو لوگوں کو گمراہ کرتا ہے کہ یہ وہابی ہے، نجدی ہے۔ لوگوں کو مروا دیتا ہے اور بھٹکا دیتا ہے اور جب وہ اللہ کا ولی فوت ہو جاتا ہے تو اس کی قبر پر شرک کرواتا ہے۔ زندگی میں بھی بدلہ لیتا ہے اور مرنے کے بعد بھی ان سے بدلہ لیتا ہے۔

نعرۂ حیدری:

تو قرآن نے ہمیں سبق دیا: ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ﴾ (صرف تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں) ﴿وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ (اور صرف تجھ سے ہی ہم مدد مانگتے ہیں۔) لیکن جو "یا علی مشکل کشا" کہتے ہیں اور پہلوان جب کشتی لڑتے ہیں تو "نعرۂ حیدری" لگاتے ہیں تو اس سے ان کا عقیدہ ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سن رہے ہیں۔ لگتا ہے ان کا تعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اتنا ہے، لیکن انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نہیں سنی۔ کیا وہ اپنے بیٹے سے ناراض تھے؟ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نہیں سن رہے تو نعرہ لگانے والا بے وقوف ہے۔ اگر صرف سن رہے ہیں تب بھی کوئی فائدہ نہیں ہے کہ سنیں تو سہی، لیکن مدد نہ کرسکیں تو کیا فائدہ؟ اب پہلوانوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پکارا۔ اب ایک ہار گیا اور دوسرا جیت گیا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک سے راضی تھے اور دوسرے سے ناراض تھے۔ اور ایک دن کے اندر کتنے نعرے لگتے ہیں۔ کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ ان تمام جگہوں پر پہنچ گئے؟ حالانکہ یہ صفت تو اللہ کی ہے۔ اس سے بڑا بھی کوئی شرک ہوگا؟

یا رسول اللہ کا نعرہ:

جب ہم "یا اللہ!" کہتے ہیں تو ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ نے اس کو سنا ہے اور سمجھا ہے اور مدد کرنے پر بھی قادر ہے۔ اور اگر "یا رسول اللہ!" ہر جگہ سے کہتے ہیں تو کیا عقیدہ ہوتا ہے؟ اگر یہ عقیدہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر بات سنتے اور ہر بولی سمجھتے ہیں اور ہماری مدد کو بھی آسکتے ہیں اور مدد دینے پر بھی قادر ہیں۔ تو پہلے عقیدے اور اس میں تو کوئی فرق نہیں ہے۔ ٹھنڈے دل سے پڑھو اور غور کرو۔

عوام کہتے کہ وہابی کو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے بھی چڑ ہے۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے چڑ ہوتی تو پھر اذان وغیرہ میں "أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" نہ کہتے، جمعہ کے خطبہ میں آیت ﴿إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ﴾ [الاحزاب:٥٦] پڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نہ پڑھتے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے چڑ ہوتی تو نماز میں "أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" بھی نہ کہتے، درود بھی نہ پڑھتے۔ لیکن معلوم ہوا کہ نام سے چڑ نہیں، بلکہ شرک سے چڑ ہے کہ "یا" حرفِ ندا تھا، اس سے اللہ کو پکارتا تھا، لیکن جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ لگا لیا تو وہ تجھے شرک سے بچانے کے لیے چیخ رہا ہے۔ اگر کوئی آج کہے کہ میرا یہ عقیدہ نہیں ہے اور تو ڈر رہا ہے، لیکن آئندہ آنے والی نسلیں جب دیواروں پر لکھا ہوا دیکھیں گی: "یَا اَللّٰهُ!"، "یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!" تو وہ سمجھیں گی کہ یہ کوئی برابر کے ہیں، اگر

مسجد میں "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ" ہوتا تو کوئی اعتراض نہ کرسکتا، ایک جگہ "اللّٰهُ جَلَّ جَلَالُهٗ" اور دوسری جگہ "مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ" لکھا ہو تو کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔

تین نعرے اور تثلیث:

پہلے تو "یَا اَللّٰهُ!"، "یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!" تھا اور اب ملنگوں نے ایک تیسرے نعرے "یَا عَلِیُّ!" کا اضافہ کر دیا ہے۔ اور یاد رکھیں! عیسائیوں کے خدا بھی تین ہیں۔ تو یہ عقیدہ تثلیث ہوگا۔ وہ بھی کہتے ہیں کہ ان تین میں ایک خدا ہے، بلکہ ایک گروہ ان سے بھی آگے بڑھ گیا، انہوں نے دیکھا کہ اللہ کے ساتھ بھی "یا"، محمد ﷺ کے ساتھ بھی "یا" اور علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی "یا" لگ گیا تو ہمارے پیر کے ساتھ بھی "یا" لگاؤ۔ یا غوثِ اعظم، یا معین الدین چشتی مدد کن۔ اگر یہ شرک نہیں ہے تو شرک اور کیا بلا ہے؟ اس لیے جب ہم سورۂ فاتحہ میں ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ پڑھ رہے ہیں تو اس سے ہمیں سبق مل رہا ہے کہ (اے اللہ!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ انبیاء، ملائکہ اور اولیاء اللہ کس کی عبادت کرتے ہیں؟ کس کے سامنے رکوع اور سجدہ کرتے ہیں؟

حضور ﷺ نے اپنی امت کے لیے تین لفظوں میں مسئلہ حل کر دیا، فرمایا:

((إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ)) [سنن الترمذی، حدیث: ۲۵۱۶]

"جب سوال کرو اللہ سے کرو، جب مدد طلب کرو تو اللہ سے طلب کرو۔"

لہٰذا ہمیں جو مدنی پاک ﷺ نے فرما دیا ہم اس پر عمل کریں گے۔

مسئلہ الوہیت:

انسان جب ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ پڑھتا ہے تو اس سے اقرار کرتا ہے کہ تمام محامد اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے، ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ سے اس کی صفات کا اقرار کرتا ہے۔ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ قیامت کے دن کے مالک ہیں۔

انہی تین آیات کے اندر مسئلہ الوہیت آ گیا کہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ جب ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کہا تو اقرار کیا کہ تمام جہانوں کا رب اللہ ہے۔ ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ سے اللہ کی صفات کا اقرار اور کافروں سے اعراض ہے جنہوں نے کہا تھا: ہم نہیں جانتے "مَا الرَّحْمٰنُ، مَا الرَّحِيْمُ؟" (رحمٰن اور رحیم کون ہیں؟) کا فر صفاتِ خداوندی کے

منکر تھے۔ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ سے آخرت، معاد کا اقرار کر لیا کہ ایک دن ایسا آئے گا جس میں جزا و سزا ہو گی۔

﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ سے ہم نے اقرار کیا کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں، تیری عبادت کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ عبادت کی جتنی اقسام ہیں وہ صرف اللہ کے لیے ہوں گی اور کسی کے لیے نہیں ہوں گی۔ نماز کے ارکان: تلاوت، رکوع و سجود اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا بھی عبادت ہے، نذر و نیاز، منت عبادت ہے، دعا مانگنا عبادت ہے۔ یہ تمام عبادات صرف اللہ کے لیے ہوں گی، اللہ کے علاوہ کسی غیر کے لیے نہیں ہوں گی۔ ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ سے ہم نے اقرار کیا کہ تیری ہی عبادت کریں گے۔ ساری دنیا سے رشتہ توڑ کر تجھ سے تعلق جوڑ لیا تو مدد بھی تجھ ہی سے مانگیں گے اور کسی سے نہیں مانگیں گے۔

سورۂ فاتحہ جامع دعا ہے:

اس کے بعد آخری تین آیات خالص دعا ہیں۔ حدیث قدسی کا مفہوم ہے کہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ میرے اور میرے بندوں کے درمیان آدھی آدھی ہے۔ جب بندہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری حمد بیان کی۔ اسی طرح چلتے چلتے جب بندہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری حمد و ثنا کے بعد مجھ سے سوال کیا ہے، ''وَ لِعَبْدِيْ مَا سَأَلَ'' (میرے بندے نے مجھ سے جو مانگا ہے، میں دوں گا)۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۳۹۵، باب: وُجُوبِ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ...]

صراطِ مستقیم کی دعا:

ان آخری تین آیات میں ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ جامع دعا ہے۔ ہدایت کہتے ہیں کمال مہربانی سے کسی کو راستہ دکھانا۔ کبھی ہدایت ''اِلٰی'' کے ساتھ متعدی ہوتی ہے تو معنی رہنمائی ہوتا ہے۔ جیسے قرآن میں ہے: ﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ [الشوریٰ: ۵۲] (اے میرے پیارے نبی (ﷺ)! آپ لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتے ہیں)۔

اور اگر ہدایت لام کے ساتھ متعدی ہو تو معنی ہوتا ہے منزلِ مقصود تک پہنچانا۔ جیسے جنت میں جانے کے بعد مومنین کہیں گے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۚ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾ [الاعراف: ۴۳] (اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے جس نے ہم کو اس (مقام) تک پہنچایا اور ہماری کبھی رسائی نہ ہوتی اگر اللہ تعالیٰ ہم کو نہ

پہنچاتے)۔ یہاں ہدایت لام کے ساتھ متعدی ہے۔

اور اگر ہدایت اپنی ذات کے ساتھ متعدی ہو تو معنی ہوتا ہے کہ راستہ دکھلا اور چلا اور منزلِ مقصود پر پہنچا۔ یعنی اس وقت تینوں معنی آجاتے ہیں۔ سورۂ فاتحہ میں بھی ہدایت اپنی ذات کے ساتھ متعدی ہے۔

صراط کا معنی:

ہم نے اللہ سے دعا کی کہ ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرما۔ صراط کا معنی راستہ ہوتا ہے، سبیل اور طریق کا معنی بھی راستہ ہے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صراط کا لفظ وہاں آئے گا جہاں پانچ صفات پائی جائیں گی:

- ......صراط کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ راستہ سیدھا ہو۔
- ......دوسری صفت یہ ہے کہ وہ راستہ ''مُوْصِلْ اِلَی الْمَطْلُوْبِ'' (منزل تک پہنچانے والا ہو)۔
- ......تیسری صفت یہ ہے کہ وہ راستہ وسیع اور کشادہ بھی ہو۔
- ......چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ راستہ سب سے زیادہ قریب بھی ہو۔
- ......اور پانچویں صفت یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی راستہ ہی نہ ہو۔

جب یہ پانچ صفات پائی جائیں گی تو وہاں لفظ صراط آئے گا۔ اس لیے ہم نے بھی دعا مانگی:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ [الفاتحہ:۵]

''یا اللہ! ہمیں سیدھی راہ دکھلا دے۔''

ایسا راستہ جو تیری رضا اور جنت تک پہنچانے والی ہے جو راستہ وسیع اور کشادہ ہے اور جو راستہ جلدی سے جنت تک پہنچانے والا ہے اور ایسا راستہ جس میں کوئی کجی اور ٹیڑھا پن نہیں، بلکہ سیدھا راستہ ہے۔

ہدایت پر ہدایت طلب کرنے کا مطلب:

سوال ہوتا ہے کہ جب بندہ ہدایت پر ہے تو پھر ہدایت مانگنے کا کیا مطلب ہے؟ کیونکہ جب ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے تو وہ ہدایت یافتہ ہے۔ اب دوبارہ وہ ہدایت کیوں مانگ رہا ہے؟

علماء نے فرمایا ہے کہ ایک ہدایت عامہ ہے، ایک ہدایت خاصہ ہے اور ایک ہدایت خاص الخاص ہے۔ ہدایت

عامہ اللہ نے ہر مخلوق کو عطا فرمائی ہے کہ ہر جانور کو بتا دیا کہ تمہارا کھانا کیا ہے؟ تمہارا گھر کس طرف ہے؟ ہر چرند پرند کو ہدایت کر دی ہے، جو سارا دن اڑ کر اپنا رزق تلاش کرتا ہے اور شام کو واپس اپنے گھونسلے میں لوٹ آتا ہے۔ اسی طرح کسی جانور کا بچہ ہوتا ہے تو وہ اپنی ماں کی طرف جاتا ہے اور کسی کی طرف نہیں جاتا۔ یہ ہدایت عامہ ہے۔

ہدایت خاصہ وہ ہے کہ جو مکلفین کے لیے ہے، یعنی جو ذوالعقول ہیں: انسان اور جن ہیں۔ اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے پیغمبر بھیجے اور کتابیں اتاریں۔

ہدایت خاص الخاص یہ ہے کہ بندے سے بھلائی ہی کا کام ہوتا ہے۔ اور اس کی ہر وقت فکر آخرت کی طرف ہو جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کا واقعہ:

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ بہت بڑے اللہ والے گزرے ہیں۔ وہ جا رہے تھے، راستے میں ایک بدو اونٹ پر سوار ملا۔ بدو نے ان سے پوچھا: تم کون ہو؟ انہوں نے فرمایا: میرا نام ابراہیم ہے۔ پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟ فرمایا: "قَاصِدٌ اِلٰی بَیْتِ اللّٰہِ" میں اللہ کے گھر کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ اعرابی ہنس پڑا اور کہا کہ تمہارے پاس نہ کوئی سواری ہے اور نہ کوئی زادِ راہ ہے اور یہ اتنا مشقت والا راستہ ہے۔ تو حضرت ابراہیم رحمہ اللہ نے فوراً جواب دیا: اے اعرابی! میرے پاس جو سواریاں ہیں وہ تمہیں نظر نہیں آتیں؟ بدو نے کہا: کون سی سواری ہے؟ فرمایا: اگر میرے اوپر کوئی بلا اور مشقت آتی ہے تو میں صبر کی سواری پر سوار ہو جاتا ہوں۔ اگر مجھے کوئی مصیبت پہنچ جاتی ہے تو رضا بر قضا کی سواری پر سوار ہو جاتا ہوں۔ اور اگر میری طبیعت کسی گناہ پر آمادہ ہوتی ہے تو میں دیکھتا ہوں کتنی زندگی گزر گئی ہے اور کتنی زندگی باقی ہے؟ جب اتنی سواریاں میرے پاس ہیں تو میرے بھٹکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اعرابی نے جب یہ بات سنی تو اس نے کہا: تم ہی صراطِ مستقیم پر ہو، میں ہی بھولا ہوں۔ اصل سواری تو تیرے پاس ہے۔

صراطِ مستقیم کا ایک اور معنی:

اس لیے علماء نے فرمایا: ہدایت کا ایک خاص مرتبہ ہوتا ہے، جس میں آدمی ہر وقت مانگتا رہتا ہے اور تلاش کرتا رہتا ہے۔ صراطِ مستقیم سے مراد افراط اور تفریط کے درمیان کا راستہ ہے۔ افراط کا معنی ہے کسی چیز کو حد سے بڑھا دینا اور تفریط کسی چیز کو حد سے گھٹا دینا۔ افراط و تفریط عقیدے کے اندر بھی ہے، اعمال کے اندر بھی ہے، قوتِ غضبیہ کے

اندر بھی ہے اور قوتِ شہوانیہ کے اندر بھی ہے۔ عقیدے کے اندر افراط یہ ہے کہ لوگ خدا کو مانتے آئے اور ہر چیز کی نسبت اس کی طرف کر دی، حتیٰ کہ اس کا بیٹا بھی بنا دیا۔ یہ افراط ہے۔ اور بعض لوگ خود خدا کا انکار کر بیٹھے اور خود خدا بن بیٹھے۔ جیسے فرعون نے دعویٰ کر دیا۔ اللہ نے قرآن میں فرمایا:

﴿فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ﴾ [النازعات:۲۴]

"(فرعون نے) کہا: میں تمہارا اعلیٰ درجے کا پروردگار ہوں۔"

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگا:

﴿لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلَٰهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ﴾ [الشعراء:۲۹]

"اگر تم میرے سوا کوئی اور معبود تجویز کرو گے تو تم کو جیل خانہ بھیج دوں گا۔"

جب آدمی صراطِ مستقیم مانگتا ہے تو معنی ہوتا ہے کہ اے اللہ! ہمیں عقیدہ کے اندر بھی عدل والا راستہ عطا فرما۔

اب دیکھیں! بعض لوگوں نے اللہ کے ولیوں کو اتنا بڑھایا کہ خدا کی منزلت پر لے گئے۔ کہنے لگے کہ اللہ نے تمام اختیارات ان کو عطا کر دیتے ہیں۔ اس لیے ان کے لقب بنا دیے کسی کو غوث اعظم بنا دیا، کسی کو قطب صمدانی بنا دیا اور کسی کو لامکانی بنا دیا اور اتنا بڑھا دیا کہ ان کو زبدۃ الانبیاء (انبیاء کا مکھن) بنا دیا۔ یہ میرا پیر ہے۔ انبیاء ان کے مقابلے میں کمتر نہیں بن گئے۔ اس سے بڑی گستاخی اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کو دیکھنا ہو تو اپنے مرشد کے چہرے کو دیکھ لو۔ اور بعض لوگ اس سے بھی آگے بڑھے کہ تم خدا کا دیدار نہیں کر سکتے، لیکن اگر تم خدا کا دیدار کرنا چاہتے ہو تو اپنے مرشد کے اندر خدا کا دیدار کر لو۔ بعض لوگوں نے ان کو اتنا بڑھایا کہ حاجت روا اور مشکل کشا بنا دیا۔ بعض لوگوں نے انہی کو اپنی اولاد اور نفع ونقصان کا مالک بنا دیا۔ بعض لوگ بالکل اولیاء کا انکار کر بیٹھے اور ان کی شان میں بے ادبی کے ایسے الفاظ کہہ بیٹھے کہ حد سے بڑھ گئے۔ تو ہم نے مانگا: ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ [الفاتحہ:۵] (یا اللہ! ہمیں سیدھا راستہ، درمیانہ راستہ عطا فرما)۔ نہ ہم افراط میں پڑ جائیں اور نہ ہم تفریط میں پڑ جائیں۔

اسی لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"يَهْلِكُ فِيَّ رَجُلَانِ مُحِبٌّ مُفْرِطٌ وَمُبْغِضٌ مُفْرِطٌ" [مسند احمد، حدیث:۱۳۷۶]

"میرے بارے میں دو قسم کے آدمی ہلاک و برباد ہو جائیں گے: ایک قسم میری محبت میں بڑھ جائے گی اور ایک قسم میرے بغض میں بڑھ جائے گی۔"

ایک جماعت مجھے حاجت روا اور مشکل کشا بنا ڈالے گی اور ایک جماعت میری صحابیت کا بھی انکار کر دے گی۔ اس لیے مسلمان مانگتا ہے یا اللہ! اعتدال کے راستے پر رکھ۔ مجھے عقیدے کے اندر بھی اعتدال عطا فرما اور عمل کے اندر بھی مجھے اعتدال عطا فرما۔

اللہ نے مومن کی یہی صفت بیان فرمائی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ [الفرقان:٦٧]

"اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں، نہ تنگی کرتے ہیں، بلکہ ان کا طریقہ اس (افراط و تفریط) کے درمیان اعتدال کا طریقہ ہے۔"

جو صحیح ایمان والے ہیں وہ اگر خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور اتنا بخل بھی نہیں کرتے کہ جائز کاموں میں بھی خرچ نہ کریں، بلکہ درمیانی راستہ نکالتے ہیں۔

فرمایا: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ کیونکہ کبھی راستہ سیدھا بھی ہوتا ہے، کشادہ بھی ہوتا ہے، لیکن اکیلا آدمی گھبراتا ہے۔ اس لیے کہا: ہمیں ان لوگوں کا راستہ عطا فرما جن پر تو نے انعام فرمایا ہے۔ اور وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ [النساء:٦٩]

"اور جو شخص اللہ اور رسول ﷺ کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء ﷺ، صدیقین، شہداء اور صلحاء رحمہم اللہ اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک قول ہے کہ "مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ" وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کا انعام ہوا: انبیاء ﷺ، صدیقین، شہداء اور صلحاء رحمہم اللہ ہیں۔ اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق اور دوست ہیں۔

قادیانیوں کا دھوکہ:

اگر بندہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتا ہے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام کیا۔

تو اس آیت سے بعض جاہلوں مثلاً: قادیانیوں نے مسئلہ نکالا کہ جس طرح بندہ مرتبہ شہادت پر پہنچ جاتا ہے، ولی بن جاتا ہے، صدیق بن جاتا ہے اسی طرح وہ نبی بھی بن جاتا ہے۔ اس لیے وہ لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اتنی اطاعت کی ہے کہ وہ مرتبہ نبوت پر پہنچ گیا۔ ''نَعُوْذُ بِاللّٰہِ ثُمَّ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ'' حالانکہ یہ اللہ کے قرآن کی مکمل تحریف ہے۔ کیونکہ قرآن کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ﴾ (جو شخص اللہ کی اطاعت کرے اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے) ﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ [النساء:۶۹] (تو یہ لوگ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا۔) اب ساتھ ہونے کا یہ معنی تو نہیں ہوتا کہ جو نبی کے ساتھ ہو وہ نبی بن جائے۔ جس طرح ہم دعا کرتے ہیں: ﴿وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ﴾ (اے اللہ! ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ وفات عطا فرما) اس کا یہ معنی تو نہیں ہوتا کہ جہاں نیک آدمی مر رہا ہو تو ہمیں بھی مار دے۔ بلکہ معنی یہ ہوتا ہے کہ ہمیں قیامت کے دن ان کی معیت نصیب ہو جائے، ان کی رفاقت نصیب ہو جائے۔ اگر یہی ترجمہ کریں کہ آدمی نبی کی اطاعت کرنے سے نبی بن جاتے ہوں تو معاذ اللہ! خدا کی اطاعت کرنے سے خدا بن جاتا ہے؟ اگر یہی معنی ہو تو ہم اطاعت کرتے کرتے فرشتے بھی بن سکتے ہیں۔ حالانکہ کوئی انسان فرشتہ نہیں بن سکتا۔ لہٰذا یہ ان کی جہالت ہے، ضلال ہے۔

انعام یافتہ حضرات:

تو مسلمان نے دعا مانگی: یا اللہ! ہمیں سیدھا راستہ عطا فرما۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے اپنا انعام کیا۔ وہ کون لوگ ہیں جن پر تو نے اپنا انعام کیا؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کو آپ نے بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا تو ذبح کرنے پر تیار ہو گئے۔ ان کو آرے کے نیچے رکھ کر دو ٹکڑے کر دیا گیا تو انہوں نے زبان سے اُف بھی نہیں کیا۔ میرے اللہ! جب آپ نے ان سے کہا تو انہوں نے اپنا سب کچھ چھوڑ کر اپنی بیوی بچوں کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ دیا۔ یا اللہ! ہمیں بھی ان کے راستے پر چلا اور ان جیسا صبر عطا فرما اور ان جیسی اطاعت عطا فرما۔ ہمیں بھی ان جیسا قربانی کا جذبہ عطا فرما۔ اس لیے مانگا:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ [الفاتحہ:۶،۵]

اس کے اندر انعام کی نسبت سیدھی اللہ کی طرف کی گئی ہے۔

ایک علمی نکتہ:

اور جب غضب کا ذکر آیا تو ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ فرمایا: "أَنْتَ غَضِبْتَ عَلَيْهِمْ" نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مقام نعمت ہوتا ہے تو فاعل کی شان ظاہر کرنا ہوتی ہے اور اس کی تکریم ہوتی ہے، تاکہ جن لوگوں پر انعام ہوا ہے ان کی شان ظاہر ہو جائے۔

اللہ کی طرف اچھی چیز کی نسبت کرو:

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ قاعدہ ادب یہی ہے کہ جب کسی نعمت اور رحمت کی بات ہو تو اس کی نسبت اللہ کی طرف کرے۔ اور جب کوئی ایسی بات ہو جو اللہ کی شان کے لائق نہ ہو تو بندہ اس کی نسبت اپنے نفس کی طرف کرے۔ جیسے قرآن میں آیا ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:

﴿الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ﴾ [الشعراء: ۷۸]

"[وہ ذات] جس نے مجھے پیدا کیا ہے، پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔"

﴿وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ﴾ [الشعراء: ۷۹]

"اور جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔"

اور آگے فرمایا:

﴿وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ﴾ [الشعراء: ۸۰]

"اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے۔"

حالانکہ بیماری دینے والا بھی اللہ ہے اور شفا دینے والا بھی اللہ ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ جب بیمار کرتے ہیں تو شفا دیتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیماری کی نسبت اپنی طرف کر دی۔ سورۂ جن میں آیا ہے:

﴿وَأَنَّا لَا نَدْرِيْ أَشَرٌّ أُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْأَرْضِ﴾

"اور یہ کہ ہمیں یہ پتہ نہیں تھا کہ آیا زمین والوں سے کوئی برا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے....."

یہاں فاعل کا اظہار نہیں کیا گیا، لیکن آگے فرمایا:

﴿أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا﴾ [الجن: ۱۰]

"یا ان کے پروردگار نے ان کو راہ راست دکھانے کا ارادہ فرمایا ہے۔"

جب رحمت کا ذکر آیا تو اللہ کا نام لیا گیا ہے، لیکن شر کے بیان میں اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے قصے میں ہے کہ جب انہوں نے کشتی کو توڑا تو فرمایا:

﴿فَأَرَدْتُّ أَنْ أَعِيبَهَا﴾ [الکھف: ۷۹]

"میں نے چاہا کہ اس میں کوئی عیب پیدا کردوں۔"

اور جب رحمت کا ذکر آیا تو فرمایا:

﴿فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنزَهُمَا﴾ [الکھف: ۸۲]

"اس لیے آپ کے پروردگار نے یہ چاہا کہ یہ دونوں لڑکے اپنی جوانی کی عمر کو پہنچیں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔"

دیکھیں! جب رحمت کی بات ہوتی ہے تو نسبت رب کی طرف کی جاتی ہے اور جب ایسی بات ہوتی ہے جس میں شر ہو تو اس کی نسبت نفس کی طرف ہوتی ہے۔

اسی طرح دیکھیں! قرآن مجید میں ہے:

﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ﴾ [البقرۃ: ۱۸۷]

"تمہارے لیے حلال کر دیا گیا ہے کہ روزوں کی رات میں تم اپنی بیویوں سے بے تکلف صحبت کرو۔"

"أَحَلَّ اللهُ لَكُمْ" نہیں فرمایا، کیونکہ اس بات کی نسبت اللہ کی طرف زیبا نہیں تھا۔ لیکن جہاں تجارت کی بات آئی تو فرمایا:

﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾ [البقرۃ: ۲۷۵]

"حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔"

غضب اور ضلال کا اطلاق:

اس لیے یہاں سورۂ فاتحہ کے اندر "أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" فرمایا۔ انعام کی نسبت اللہ کی طرف ہے۔ قرآن کی بلاغت دیکھیں کہ انعام کی ضد غضب ہے تو آگے غضب کا ذکر ہے۔

غضب سے کیا مراد ہے؟ بعض احادیث کے اندر آیا ہے کہ ﴿الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ﴾ سے مراد یہود ہیں اور

﴿الضَّآلِّيْنَ﴾ سے مراد نصاریٰ ہیں۔ لیکن یاد رکھیں اس کا یہ معنیٰ نہیں ہوتا کہ صرف یہود ﴿الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ ہیں اور صرف عیسائی ﴿الضَّآلِّيْنَ﴾ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ﴿الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ میں کوئی کامل مکمل قوم ہے تو وہ یہود ہے۔ ورنہ یہ لفظ عام ہے قیامت تک یہود و نصاریٰ کو بھی شامل ہے اور ان کی صفات رکھنے والوں کو بھی شامل ہے۔

غضب اور ضلالت کے مستحق:

﴿الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ سے مراد ایسی قوم ہے جس کو علم ہو، لیکن ہوائے نفسانی کا شکار ہو کر راستے سے ہٹ جائے وہ اللہ کے غضب کی مستحق ہوتی ہے۔ اور ﴿الضَّآلِّيْنَ﴾ سے مراد جو علم نہ رکھتے ہوں اور راستے سے بھٹک گئے ہوں۔ اس لیے لکھا ہے کہ امت محمدیہ ﷺ کا جب کوئی مولوی اور عالم بھٹکے گا تو ﴿الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ میں شامل ہوگا اور جب کوئی صوفی، عابد اور زاہد لوگ بھٹکیں گے تو وہ ﴿الضَّآلِّيْنَ﴾ میں جا پڑیں گے کہ بجائے اللہ کی عبادت کے اپنی عبادت شروع کرا دیں گے، بجائے اللہ کی بندگی کے وہ خود مختار بن بیٹھیں گے، حاجت روا بن بیٹھیں گے اور خود مشکل کشائی کا نعرہ لگائیں گے۔

اللہ کا راستہ اور نیک حضرات قابلِ تقلید ہیں:

اللہ پاک نے سورۂ فاتحہ کے اندر ہمیں جامع دعا سکھلائی ہے۔ اور اللہ پاک نے صراط کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ فرمایا:

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ﴾ [الانعام: ۱۵۳]

"یہ میرا سیدھا سیدھا راستہ ہے، لہٰذا اس کے پیچھے چلو۔"

اور صراط کی نسبت ایمان والے لوگوں کی طرف بھی فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ [الفاتحہ: ۶]

"رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے۔"

خلاصہ کے طور پر دو چیزیں یاد رکھ لیں کہ ایک ہے کتاب اللہ اور دوسرے ہیں رجال اللہ۔ ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑ لو تو منزل مقصود پر پہنچ جاؤ گے۔ بعض لوگوں نے کتاب اللہ کو تو پکڑ لیا، لیکن رجال اللہ کو چھوڑ دیا اور بعض لوگوں نے رجال اللہ کا دامن پکڑ لیا، لیکن کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں راستے سے بھٹک گئے۔ کیونکہ اگر صرف کتاب اللہ کافی

ہوتی تو اللہ اپنے انبیاء علیہم السلام کو کیوں بھیجتے؟ صرف کتاب نازل فرماتے۔ اور دوسرے گروہ نے رجال اللہ کو پکڑ لیا کہ میرا پیر کامل ہے، قلندر ہے، وہ درجہ قیوم کو پہنچ گیا ہے، میرے مرشد کی نظر سے لوگ ولی بنتے ہیں، وہ جس کو گالیاں دے تو وہ تباہ ہو جاتا ہے، وہ جدھر اشارہ کر دے اس کا کام ہو جاتا ہے۔ انہوں نے رجال کو پکڑا اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا تو بھٹک گئے۔ راستے پر وہ رہے جنہوں نے کتاب اللہ کو بھی پکڑا اور اللہ کے بندوں سے بھی اپنا تعلق جوڑ لیا۔ انہوں نے رجال اللہ کو کتاب اللہ کی روشنی میں دیکھا کہ یہ خود قرآن وسنت پر عامل ہے یا نہیں؟

کونسا فرقہ کامیاب ہوگا؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے، ایمان ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اصحاب رسول اللہ ہیں۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی صدیقیت کا قائل نہ ہو وہ بھی ایمان پر نہیں ہوگا۔ کیونکہ "مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ" میں صدیقین بھی ہیں۔ اور صدیق کا درجہ پہلا ہے۔ جو صدیق کا منکر ہوگا وہ صدیقین کا منکر ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت تہتر گروہوں میں بٹ جائے گی۔ (یاد رکھیں! تہتر گروہوں سے مراد بڑے بڑے گروہ ہیں۔) فرمایا:

((كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا مِلَّةً وَاحِدَةً))

"تمام کے تمام فرقے جہنم میں جائیں گے، لیکن ایک فرقہ جنت میں جائے گا۔"

صحابہ نے پوچھا کونسا فرقہ جنت میں جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي)) [سنن الترمذی، حدیث: ۲۶۴۱، باب: مَا جَاءَ فِي افْتِرَاقِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ]

"وہ فرقہ جنت میں جائے گا جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقے پر ہوگا۔"

سب کے لیے ہدایت طلب کرو:

علماء نے فرمایا ہے کہ "اِهْدِنَا" جمع کا صیغہ لائے ہیں، مفرد کا نہیں لائے۔ کیونکہ جب کہا کہ تمام محامد تیرے لیے ہیں، ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) جمع کا صیغہ ہے۔ جب عبادت کرنے اور مدد مانگنے میں جمع کا صیغہ ہے تو ہدایت میں بھی جمع کا صیغہ ہے کہ یا اللہ! ہم سب کو

ہدایت عطا فرما۔

اور بعض علماء نے فرمایا: اس کے اندر یہ حکمت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ایسی زبان سے دعا مانگا کرو جس نے گناہ نہ کیا ہو۔ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! دنیا کے اندر کون ایسا بندہ ہو سکتا ہے جس نے غلطی نہ کی ہو؟ اللہ کے نبی تو معصوم ہو سکتے ہیں، لیکن اور تو کوئی معصوم نہیں ہو سکتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم دوسروں کے لیے دعا مانگا کرو اور وہ تمہارے لیے دعا مانگا کرے۔ آپ کا دامن اور زبان تو میرے لیے پاک ہے۔ آپ جب میرے لیے دعا کر رہے ہیں اور زبان میرے لیے پاک ہے۔ اس لیے تم سب کے لیے دعا کیا کرو۔

مقبول دعا کا طریقہ:

فرمایا: جب انسان سب کے لیے دعا کرتا ہے تو اللہ کی رحمت زیادہ شامل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ہمیں دعا کے اندر حکم دیا گیا کہ اوّل و آخر درود پڑھیں اور درمیان میں اپنی دعا رکھیں۔ کیونکہ ہماری دعا ایسی ہے کہ قبول ہو یا نہ ہو، لیکن درود تو ضرور قبول ہوگا۔ جب دعا کا اوّل اور آخر قبول ہوگا تو درمیان کی دعا بھی اللہ کی رحمت سے ضرور قبول ہو جائے گی۔ اس لیے ہمیں ہر جگہ ایسی دعائیں سکھلائی گئیں جو ہم صرف اپنے لیے نہ مانگیں، بلکہ عالمِ اسلام کے لیے مانگیں۔ مثلاً:

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ [البقرۃ: ۲۰۱]

"اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔"

((اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا ، وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا ، وَصَغِيرِنَا وَكَبِيرِنَا ، وَذَكَرِنَا وَأُنْثَانَا ، اللّٰهُمَّ مَنْ أَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَأَحْيِهِ عَلَى الْإِسْلَامِ ، وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا فَتَوَفَّهُ عَلَى الْإِيمَانِ))

[سنن ابی داؤد، حدیث: ۳۲۰۱، باب: الدُّعَاءِ لِلْمَيِّتِ]

"اے اللہ! ہمارے زندوں و مردوں، حاضر و غائب، چھوٹوں و بڑوں اور مردوں اور عورتوں کی بخشش فرما۔ اے اللہ! ہم میں سے جسے زندہ رکھے اسے اسلام پر زندہ رکھ اور جسے موت دے اسے ایمان پر موت دے۔"

اسی طرح یہاں بھی ہمیں جامع دعا سکھلائی گئی:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾

[الفاتحہ:۵تا۷]

''ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما۔ ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام کیا، نہ کہ ان لوگوں کے راستے کی جن پر غضب نازل ہوا ہے اور نہ ان کے راستے کی جو بھٹکے ہوئے ہیں۔''

اور آخر میں آمین آیا ہے۔ اس لیے علماء نے فرمایا ہے کہ آمین سورۂ فاتحہ کا حصہ نہیں ہے۔ لیکن سنت اور مستحب عمل یہی ہے کہ جب آدمی سورۂ فاتحہ پڑھے تو آمین کہے۔ اور اس سے یہ بھی سبق ملا کہ آدمی جب بھی دعا کرے تو پہلے آدمی اللہ کی حمد و ثنا کرے، درود پڑھے، پھر اپنی بندگی کا اعتراف کرے، اپنی عاجزی کا اظہار کرے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے۔

اسی طرح یہ بھی سبق ملا کہ جب ہم دعائیں مانگیں تو ان کے اندر اخلاص پیدا کریں۔ اور سب سے عظیم دعا سورۂ فاتحہ ہے۔

وضاحت

یہاں تک حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی ﷾ کے ان دروس کا اختتام ہو رہا ہے جو آپ ﷾ نے مسجد مستشفی مکہ مکرمہ میں ارشاد فرمائے تھے۔ اب آگے حضرت ﷾ کے ان دروس کا آغاز ہو رہا ہے جو آپ مسجد حرام کعبہ شریف میں درسِ تفسیر ابن کثیر کے طور پر بیان فرماتے ہیں۔

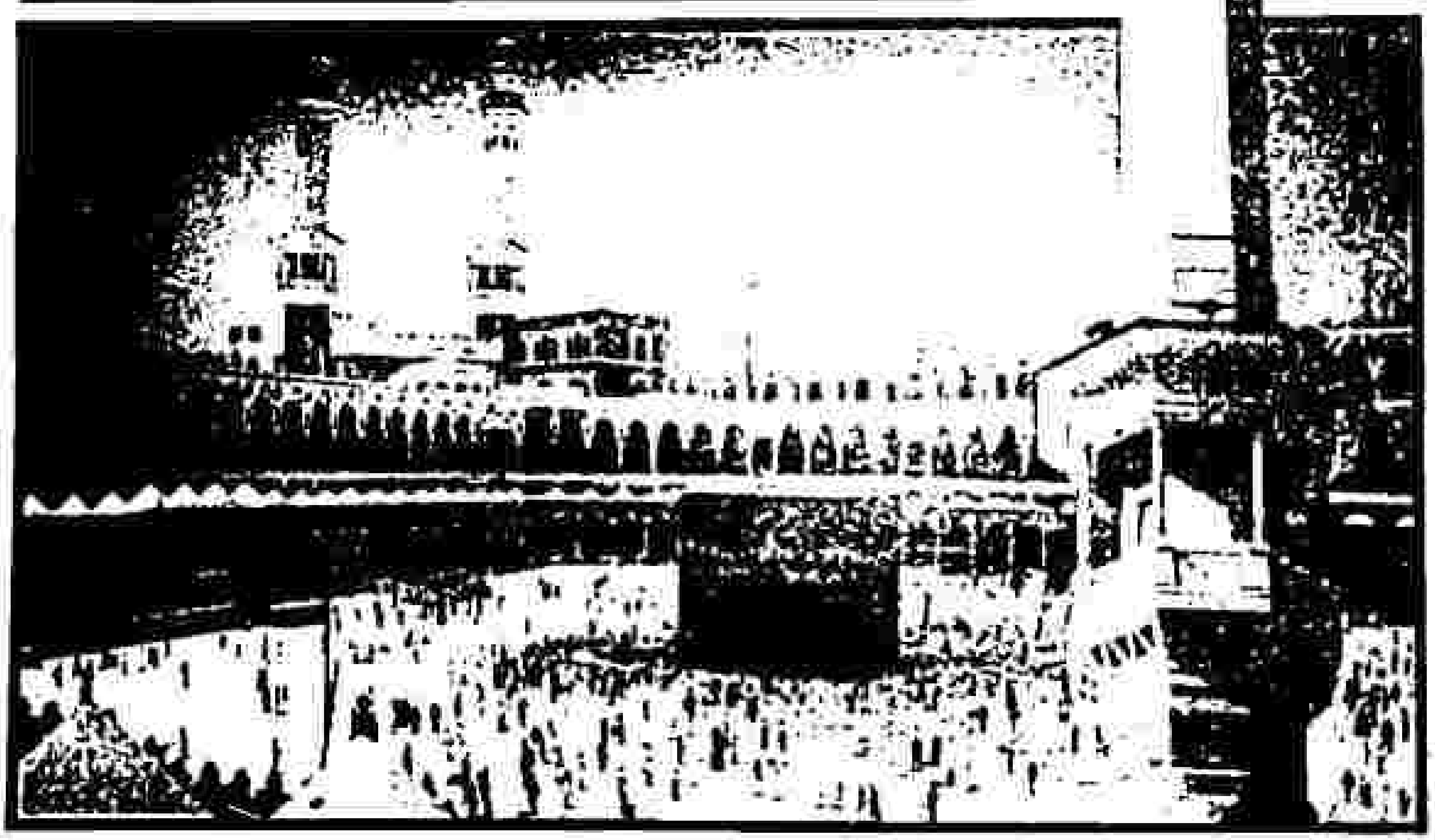
ان دونوں کا تعلق چونکہ سورۂ فاتحہ سے ہے اس لیے ان کو یکجا کیا گیا ہے۔ چونکہ ہر ایک درس میں مستقل طور پر بہترین علمی تفاسیر، نکات، مسائل اور فضائل موجود ہیں اس لیے ان دونوں کو اس ایک جلد میں شامل کر دیا گیا ہے۔

تفسیر کے اس حصے میں زیادہ تر عبارات تفسیر ابن کثیر سے لی گئی ہیں، اس لیے ان کا حوالہ بھی درج نہیں کیا گیا۔ اور باقی کتب کی عبارات کم ہیں، اس لیے بعض دوسری عبارات کے حوالے درج کیے گئے ہیں۔

تفسیرِ انوار الحرم

(حصہ دوم)

دروسِ تفسیرِ ابنِ کثیر



''سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ''

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ﴿۱﴾ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ﴿۲﴾﴾

''تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہان کا پروردگار ہے۔ بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔''

﴿مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ﴿۳﴾ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ﴿۴﴾﴾

''روز جزا کا مالک ہے۔ ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد چاہتے ہیں۔''

﴿اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۙ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬﴾

''ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔ ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام فرمایا۔''

﴿غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ٪﴿۷﴾﴾ [الفاتحہ: ۱ تا ۷]

''جن پر نہ تو تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔''

سورۂ فاتحہ کی وجہ تسمیہ:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فاتحۃ الکتاب کے بارے میں، سورۃ الفاتحہ کے فضائل کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ مکی ہے، یعنی قبل ہجرت نازل ہوئی۔ اس کی سات آیتیں ہیں۔ فاتحہ کو فاتحہ اس لیے کہتے ہیں کہ ابتدائے کتاب کے اندر اوّل شئی فاتحہ ہے اور اسی کے ساتھ نمازوں کی ابتداء بھی ہوتی ہے۔ نمازوں کی ابتداء میں بھی فاتحہ ہے، قرآن کی ابتداء میں بھی فاتحہ ہے۔ اسی لیے اس کا نام فاتحہ ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

فاتحہ کا نام ''اُمُّ الْکِتَابِ'' کیوں؟

اور اسی فاتحہ کا نام ''اُمُّ الْکِتَابِ'' بھی ہے۔ ''اُمُّ الْکِتَابِ'' کا معنی ایسی کتاب جس کے اندر ساری کتابوں کا علم جمع ہو، جیسے ماں اصل ہوتی ہے، یعنی وہ اصل کتاب ''اُمُّ الْکِتَابِ'' ہے۔ اسی لیے اس فاتحہ کا نام بھی ''اُمُّ الْکِتَابِ'' ہے۔ جیسے آپ نے الحمد للہ! خلاصۂ درس میں پڑھا ہے کہ سارے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں ہے، لہٰذا ایک نام اس کا ''اُمُّ الْکِتَابِ'' بھی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

بعض علماء نے ''اُمُّ الْکِتَابِ'' نام پسند نہیں کیا:

اب مفسر ابن سیرین رحمہ اللہ اور حسن بصری رحمہ اللہ کے بارے میں فرماتے ہیں: ''کَرِهَا تَسْمِیَتَهَا بِذٰلِكَ'' (ان دونوں حضرات نے ''اُمُّ الْکِتَابِ'' نام رکھنے کو ناپسند کیا ہے)۔ کیونکہ ابن سیرین رحمہ اللہ اور حسن بصری رحمہ اللہ کی

رائے میں "أُمُّ الْكِتَابِ" "لوحِ محفوظ ہے، جس کے اندر ساری چیزیں ہیں، تمام دنیا کے علوم اللہ نے اس کے اندر محفوظ فرما دیے ہیں۔ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں دراصل "أُمُّ الْكِتَابِ" "آیاتِ محکمات کا لقب ہے۔
[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

کیا "أُمُّ الْقُرْآنِ" "نام صحیح ہے؟

اور اسی طرح ان کے نزدیک "أُمُّ الْقُرْآنِ" "نام رکھنا بھی جائز نہیں، بلکہ مکروہ ہے۔ اب مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سنن الترمذی میں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث نقل کی ہے اور سنداً بھی اس کی توثیق فرمائی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ پوری سورۂ فاتحہ "أُمُّ الْقُرْآنِ" "بھی ہے، "أُمُّ الْكِتَابِ" "بھی ہے اور اس کا لقب "سَبْعُ مَثَانِي" "بھی ہے۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۳۱۲۴، سنن أبي داود، حدیث: ۱۴۵۷، باب: فاتحۃ الکتاب]

اور اسی سورت کا نام "حمد" "بھی ہے، "صلوٰۃ" "بھی ہے۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ ان حضرات (حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ) کو یہ حدیث نہیں پہنچی۔ ان کو وہ احادیث پہنچی ہیں جن میں "أُمُّ الْكِتَابِ" "وغیرہ لوحِ محفوظ اور آیاتِ محکمات کو کہا گیا ہے۔ اگر ان کو وہ حدیث مبارکہ پہنچ جاتی جو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بسندِ صحیح "عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ" "نقل فرمائی ہے تو وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت نہ فرماتے اور یہ نہ کہتے کہ اس سورت کا نام "أُمُّ الْكِتَابِ" "رکھنا مکروہ ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

احرام کھولنے سے پہلے سر منڈانے کا مسئلہ:

تو اصل وجہ یہی ہوتی ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ظاہر حدیث پر نظر ڈال لی کہ ایک حدیث مبارک آئی کہ نماز فاتحہ کے بغیر نہیں ہوتی، باقی چیزیں ان کی نظرِ مبارک سے نہ گزریں۔ اس لیے یہ نہیں ہوا کہ...... نعوذ باللہ!...... انہوں نے نہیں سمجھا یا عمداً انہوں نے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑا۔ اب دیکھیں! جیسے بالوں کے معاملے میں تینوں امام ایک طرف ہیں اور اکیلے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ایک طرف ہیں۔ یعنی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور علماء محدثین اس طرف گئے ہیں کہ اگر آدمی عمرہ کرے یا حج کرے تو پورے سر پر استرا

پھروائے یا اگر بال کتوانا چاہتا ہے تو وہ اتنے بال کتوائے کہ کم از کم یہ معلوم ہو کہ سر کے چوتھے حصے کے بال کٹ گئے ہیں۔ لیکن امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نہیں، اگر کسی نے دو بال کاٹ لیے، تین بال کاٹ لیے تو کافی ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ تین بالوں کو پکڑ کر یوں کھینچ دے تب بھی عمرے سے فارغ ہو گیا۔ ان تین بالوں کے سرے کسی چیز سے کاٹ ڈالے تب بھی وہ کہتے ہیں کہ عمرے سے فارغ ہو گیا۔ اب ائمہ ثلاثہ اس مسئلے میں ان کے خلاف ہیں۔ جہاں تین ائمہ کا فہم اور علم پہنچے گا وہاں ایک کا علم تو نہیں پہنچے گا؟ لیکن اس کے باوجود ہم کہتے ہیں "رَحْمَةُ اللهِ عَلَيْهِ" اللہ ان پر رحمت فرمائے کہ ان کے اجتہادِ مبارک میں یہ بات آگئی کہ قرآن کہتا ہے:

﴿مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ﴾ [الفتح:۲۷]

"سروں کو منڈوانے والے اور سروں کو کتروانے والے۔"

وہ فرماتے ہیں: جب تین بال کاٹے تو کتوانے والوں میں شامل تو ہو گیا۔

بہر حال قرآن کریم کے اس لفظ ﴿مُقَصِّرِيْنَ﴾ میں وہ آ گیا، اگر تین بال بھی نہ کتواتا تو ﴿مُقَصِّرِيْنَ﴾ میں نہ آتا۔ جب تین بال کتوا لیے تو ﴿مُقَصِّرِيْنَ﴾ کی صف میں شامل ہو گیا۔ جب شامل ہو گیا تو احرام سے نکل گیا۔ باقی ائمہ فرماتے ہیں: بھئی! ﴿مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ﴾ (سروں پر استرا پھروانا) حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ تھوڑا استرا یہاں پھیر دو اور باقی نہ پھیر دو، یا ایک طرف پھیر دو اور باقی نہ پھیرو۔ کیونکہ یہ مثلہ ہے۔ جیسے کسی مردے کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا حرام ہے، اسی طرح اپنے سر میں بالوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا کہ ایک طرف سے کاٹ لیے جائیں اور دوسری طرف کے بال چھوڑ دیے جائیں اس طرح کرنا حرام ہے۔ یہ مثلہ ہے۔ ہم یہ دیکھیں گے کہ حضور ﷺ نے کیا کیا؟ تین بال کاٹے یا استرا پھروایا؟ حضور ﷺ نے سارے سر پر استرا پھروایا ہے۔ اور جب سارے سر مبارک پر استرا پھروایا تو ائمہ نے فرمایا کہ پھر قینچی بھی تو سارے سر پر پھرنی چاہیے۔ تین بالوں پر کیوں کھڑی ہو جائے؟ اگر استرا سارے سر پر پھرتا ہے تو پھر قینچی بھی سارے سر پر پھرے۔ اور حضور ﷺ کا اپنا عمل اس آیت کی تفسیر ہے کہ اللہ نے جب حکم دیا کہ عمرے والے سر منڈوائیں تو حضور پاک ﷺ نے اپنے سارے بال سر سے اتروائے اور پھر وہ بال مبارک صحابہ رضی اللہ عنہم میں تقسیم بھی ہوئے اور اسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر بھی حضور پاک ﷺ نے استرا پھروایا، اسی طرح صحابہ نے بھی استرا پھروایا۔ اور جن جن صحابہ سے بال کتوانا ثابت ہے ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں ملتا جس نے تین بال کتوائے ہوں۔ تو اس لیے اب ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک پورے سر

کے بال کاٹے جاتے ہیں۔

اور مشکل یہ ہے کہ لوگوں کو یہ مسئلہ بڑا آسان لگتا ہے کہ بال بھی نہیں کاٹنے پڑتے، فیشن میں بھی فرق نہیں آتا اور آدمی جلدی فارغ بھی ہو جاتا ہے اور عمرہ بھی ہو جاتا ہے۔ ہر آدمی امام شافعی رحمہ اللہ کے قول پر عمل کر رہا ہے۔ دراصل کھڑے کھڑے وہاں پر قینچی لے کر آدمی جاتا ہے، تین بال کٹوا کر گھر آ جاتا ہے، حالانکہ یہ نہیں سمجھتا کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک میرا احرام نہیں کھلا اور ابھی میاں بیوی کا ملنا حرام ہے، کیونکہ جب تک میں اپنے بال نہ کٹوالوں اس وقت تک میں احرام میں ہوں۔ کیونکہ ائمہ ثلاثہ اور جمہور ایک طرف ہیں، جمہور محدثین ایک طرف ہیں کہ یا بالوں پر استرا پھرواؤ یا بال زیادہ بڑے ہوں تو اتنے کٹواؤ کہ بالوں کا چوتھا حصہ کٹ جائے، ورنہ احرام نہیں کھلے گا اور اس پر دم پڑ جائے گا۔

بعض انفرادی اور اجتہادی مسائل:

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! بعض اوقات ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے اجتہاد ہوتے تھے، جیسا کہ بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اجتہاد مبارک تھا۔ بی بی صاحبہ فرماتی تھیں کہ مسئلہ یہ ہے کہ آدمی اگر کسی کا دودھ پی لے تو وہ ماں بیٹا بن جاتے ہیں، اس کی بیٹیاں اور بیٹے اس کے بھائی بہن بن جاتے ہیں۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی، لیکن ان کی بہن بی بی اسماء رضی اللہ عنہا کی اولاد تھی۔ تو بی بی صاحبہ اگر کسی قریبی رشتے دار کے بارے میں چاہتیں کہ وہ میرے گھر میں، میرے سامنے آ جائے اور مجھے پردہ نہ کرنا پڑے تو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا بی بی اسماء رضی اللہ عنہا سے فرماتیں کہ تم ان کو دودھ پلا دو تو وہ اس کو دودھ پلا دیتیں، اس طرح وہ ان کی بہن کا رضاعی بیٹا اور ان کا رضاعی بھانجا ہو جاتا، لہٰذا بی بی صاحبہ پھر ان سے پردہ نہیں فرماتی تھیں۔

اب یہ بی بی صاحبہ کا تفرد ہے۔ اس مسئلہ میں تمام صحابہ، تمام ائمہ مخالف ہیں کہ دودھ کا اثر اس وقت ہوتا ہے جب دودھ پینے کی عمر ہو۔ دودھ پینے کی عمر ﴿حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ (پورے دو سال) ہے۔ یعنی بچہ پیدا ہونے کے بعد دو سال تک دودھ پیتا ہے۔ ایک قول مبارک میں اڑھائی سال تک بھی ہے۔ اگر بچے نے پیدا ہونے کے بعد دو سال کی عمر میں یا اڑھائی سال کی عمر میں کسی عورت کا دودھ پیا ہو اور صرف پستانوں کو منہ نہ لگایا ہو، بلکہ وہ دودھ اس کے پیٹ میں داخل بھی ہوا ہو تو پھر یہ اس کا رضاعی بیٹا کہلائے گا۔ اگر عمر اڑھائی سال سے گزر گئی اور تین سال، چار سال ہو گئی، اب لاکھ دودھ پیتا رہے، لیکن اب بیٹا نہیں بنے گا، کیونکہ اس کے دودھ پینے کی عمر ختم ہو گئی ہے۔ اس لحاظ

سے اب بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اس مسئلہ میں تفرد تھا اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کا اپنا ایک اجتہاد ہے۔ فرماتی تھیں کہ دودھ پینے سے بیٹا بن جاتا ہے، بڑا ہو تب بھی ٹھیک ہے، چھوٹا ہو تب بھی ٹھیک ہے۔ تو قرآن کی دوسری آیت پر بی بی صاحبہ نے نظر نہ ڈالی:

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ [البقرۃ: ۲۳۳]

"اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں، یہ مدت ان کے لیے ہے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہیں۔"

اور ایک قول یہ بھی ہے جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اڑھائی سال۔ وہ اس لیے کہ مدتِ حمل میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات چھ مہینے کا بچہ صحیح پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ حمل کے بعد چھ مہینے کا بچہ بھی صحیح پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ حمل کے چھ مہینے کے بعد بچہ پیدا ہو تو وہ زندہ رہ سکتا ہے، خدا کی قدرت ہے کہ آٹھ مہینے کا زندہ نہیں رہ سکتا اور پانچ کا بھی زندہ نہیں رہتا، چھ ماہ کا بچہ زندہ رہ سکتا ہے۔ ایسے کئی واقعات ہیں کہ چھ ماہ کے بچے ہوئے اور ٹھیک ٹھاک رہے۔

اب اگر حمل کے چھ مہینے ہو جائیں اور اس کے بعد پھر مدتِ رضاعت کو دیکھا جائے تو ﴿وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا﴾ [الاحقاف: ۱۵] (اور اس کو اٹھائے رکھنے اور اس کے دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہوتی ہے) دو سال میں چوبیس مہینے اور چھ مہینے یہ آ گئے، اڑھائی سال بن گئے۔ (اور یہ زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ یہ آیت مذکورہ ان کے ضرور سامنے ہوگی، مگر وہ ﴿حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ کے الفاظ کو کم سے کم کامل مدت دو سال قرار دیتی ہوں اور زیادہ مدتِ رضاعت کی تحدید کی ان کے نزدیک کوئی حد نہ ہو۔ انور) اس لیے علماء نے اس میں دو قول لکھے ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوتا کہ جی فلاں کو یہ مسئلہ سمجھ نہیں آیا، فلاں کو کیوں آیا؟ آج بھی یہ مسئلہ ہے کہ سو طالب علم پڑھتا ہے اور ایک کو سمجھ نہیں آیا۔ یا ایک آدمی کو جلدی سمجھ آ گیا یا آدمی کی فہم دور رس تھی، وہ مسئلے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ یا ایک آدمی نے مسئلہ سمجھا، لیکن اس کی باریکیاں نہیں سمجھ سکا تو کسی کا گلہ نہیں ہوتا اور کسی کا اعتراض نہیں ہوتا۔

اپنے اکابر کا احترام:

لیکن فرق اتنا ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے امام شافعی رحمہ اللہ کی فقہ پڑھی ہے تو لازمی بات ہے کہ وہ امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کو ترجیح دیتے ہیں اور جن لوگوں نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی فقہ پڑھی ہے تو وہ اپنے امام کے قول کو ترجیح

دیتے ہیں۔ اس طریقے سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آدمی نے جس استاذ سے علم حاصل کیا ہو اس استاذ کا احترام زیادہ کرتا ہے، لیکن دوسرے علماء کا انکار نہیں کرتا کہ اور دنیا میں عالم کوئی نہیں۔ دنیا میں لاکھوں عالم ہوتے ہیں، لیکن ہم نے جن سے علم پڑھا ہے ہم پر ان کا احسان زیادہ ہے، ہم پر ان کا فضل اور ان کا کرم زیادہ ہے۔ جن کی کتابوں کو دیکھ کر ہم نے دین سیکھا ہے ان کی بات کو مقدم سمجھیں گے، ان کی تحقیق کو زیادہ افضل جانیں گے اور اولیٰ سمجھیں گے، لیکن دوسروں کو بلا وجہ غلط نہیں کہیں گے۔

سورۂ فاتحہ کے مختلف نام:

- ...... لہٰذا حدیث پاک میں یہ بات واضح ہوگئی کہ سورۂ فاتحہ کا نام "فَاتِحَۃٌ" بھی ہے۔
- ...... "أُمُّ الْكِتَابِ" بھی ہے۔
- ...... "أُمُّ الْقُرْآنِ" بھی ہے۔
- ...... "سَبْعُ الْمَثَانِيْ" بھی ہے، کیونکہ اس سورت کی سات آیات ہیں۔ اور یہ سورت بعض ائمہ کے نزدیک "نُزِّلَتْ مَرَّتَيْنِ مَرَّةً بِمَكَّةَ وَ مَرَّةً بِالْمَدِيْنَةِ الْمُنَوَّرَةِ" (دو مرتبہ نازل ہوئی ہے: ایک مرتبہ مکہ میں اور دوسری مرتبہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے۔) اور بعض علماء نے فرمایا کہ "مَثَانِيْ" کا معنی ہوتا تکرار۔ تکرار کا معنی یہ ہے کہ ہر نماز میں اس کو پڑھا جاتا ہے اور بار بار اس کو پڑھا جاتا ہے، اس لیے اس کا نام "سَبْعُ الْمَثَانِيْ" بھی ہے۔
- ...... اور اس کا نام "حَمْد" بھی ہے، کیونکہ اس میں اللہ کی حمد و ثنا ہے۔
- ...... اور اس کا نام "اَلصَّلٰوۃُ" بھی ہے، کیونکہ ہر نماز کے اندر یہ پڑھی جاتی ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: "لِقَوْلِهٖ ﷺ عَنْ رَبِّهٖ: "حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کا قول نقل فرماتے ہیں:

((قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ، وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ، فَإِذَا قَالَ الْعَبْدُ...الخ))

[صحیح مسلم، حدیث: ۳۹۵، باب: وُجُوبِ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ...]

"فاتحہ میرے اور بندے کے درمیان تقسیم ہے۔ جب بندہ کہتا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہاں میرے بندے نے میری حمد بیان کی، جب بندہ کہتا ہے: ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری صفات کا اقرار و اعتراف کیا ہے، میری تعریف کی ہے۔ جب بندہ کہتا ہے: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "مَجَّدَنِيْ عَبْدِيْ" (میرے بندے نے میری بزرگی اور میری بڑائی کا اقرار کیا

ہے، اس نے اعتراف کیا ہے کہ میں روزِ جزا کا مالک ہوں۔) جب بندہ کہتا ہے: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ (تیری ہی عبادت کریں گے اور تجھ ہی سے مدد مانگیں گے۔) اللہ فرماتے ہیں: یہ میرے بندے کی طرف سے ہے۔ اس کے بعد سوال آگیا: ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ (ہمیں صراطِ مستقیم عطا فرما۔) اس لیے فرمایا: یہ سورت میرے اور بندے کے درمیان آدھی آدھی ہے۔ وہ صرف میری عبادت کرے گا تو قبول کروں گا، مجھ سے مدد مانگے گا تو میں اس کی مدد کروں گا اور مجھ سے سیدھا راستہ مانگے گا تو میں اس کو ہدایت دوں گا۔

یہاں امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے مکمل حدیث نقل نہیں کی، صرف ایک ٹکڑا نقل کیا ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

سورۂ فاتحہ زہر میں بھی شفا ہے:

"فَسُمِّيَتِ الْفَاتِحَةُ صَلَاةً؛ لِأَنَّهَا شَرْطٌ فِيهَا"

"سورۂ فاتحہ کا نام صلوۃ بھی ہے، اس لیے کہ یہ نماز میں شرط ہے۔"

"وَيُقَالُ لَهَا الشِّفَاءُ لِمَا رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ مَرْفُوعًا"

"اس سورت کا نام سورۃ الشفا بھی ہے۔"

دارمی نے فضائل القرآن میں ایک حدیث مبارک لکھی ہے۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فِي فَاتِحَةِ الْكِتَابِ شِفَاءٌ مِنْ كُلِّ دَاءٍ" (سورۂ فاتحہ ہر بیماری کی شفا ہے)۔ کوئی زہر بھی اثر کر رہا ہو، فاتحہ پڑھ کر پلاؤ، ان شاء اللہ! شفا حاصل ہوگی۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

سورۂ فاتحہ دم بھی ہے:

"وَيُقَالُ لَهَا الرُّقْيَةُ لِحَدِيثِ أَبِي سَعِيدٍ فِي الصَّحِيحِ حِينَ رَقَى بِهَا الرَّجُلَ السَّلِيمَ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ: وَمَا يُدْرِيكَ أَنَّهَا رُقْيَةٌ؟" [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

"اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی حدیث کی وجہ سے اس کو "الرُّقْيَةُ" کہا جاتا ہے۔ جب انہوں نے سورت فاتحہ کے ذریعے سے ایک آدمی کو دم کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہ "الرُّقْيَةُ" ہے؟"

"الرُّقْيَةُ" جیسے اردو زبان میں منتر کا لفظ بولتے ہیں۔ جو کسی بیماری کے لیے دعا پڑھی جائے اس کا نام عربی میں

"اَلرُّقْیَۃُ" ہے۔

مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو تفصیلاً نقل نہیں کیا۔ واقعہ یوں ہے کہ صحابہ کی ایک جماعت کہیں جا رہی تھی، راستے میں ایک بستی آئی، وہیں رات پڑ گئی...... قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی مسافر ہے تو وہ بستی والوں سے کھانا لے سکتا ہے۔ یعنی یہ بھیک مانگنا نہیں ہوگا، بلکہ یہ ہر مسلمان کا ایک دوسرے پر حق ہے، ہر مسافر کا گھر والے پر یہ حق ہے...... تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے بستی والوں کے پاس ایک آدمی بھیجا کہ ہم مسافر ہیں، آپ ہمارے کھانے کا انتظام کریں۔ بستی والوں نے کہا: ہمارے پاس کوئی کھانا نہیں ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم خاموش ہو گئے کہ کوئی کھانا نہ دے تو آدمی زبردستی تو نہیں لے سکتا۔

رات کا کچھ وقت گزرا تو بستی والے کچھ لوگ بھاگتے بھاگتے آ گئے اور کہنے لگے: ہمارے سردار کو بچھو نے ڈس لیا ہے، وہ بڑی شدید تکلیف میں مبتلا ہے، تم لوگوں میں سے کوئی ایسا آدمی ہے جس کو کوئی دعا آتی ہو؟ کوئی رقیہ آتا ہو تو وہ پڑھ دے؟ اور اس کو شفا ہو جائے۔ ایک صحابی نے کہا: مجھے آتا تو ہے، میں پڑھ بھی سکتا ہوں، لیکن پڑھتا نہیں ہوں۔ تم لوگوں نے ہماری عزت نہیں کی، ہم تمہاری عزت کیوں کریں؟ ہم مسافر تھے، ہم نے کھانا مانگا، تم لوگوں نے احترام نہیں کیا اور ہمارا حق بھی نہیں دیا، ہم کیوں پڑھیں؟ اس نے کہا: مہربانی کرو، معاف کر دو۔ اب تو آدمی کو غرض پڑ گئی تھی۔ انہوں نے کہا: میں ایک شرط پر پڑھوں گا کہ تم تیس بکریاں مجھے دو۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے، ہم دیں گے۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے، تم مجھے اپنا وہ مریض دکھاؤ۔ مریض کے پاس آئے، صحابی نے کچھ پڑھا اور اللہ کی مہربانی سے شفا ہو گئی۔

اللہ کا قرآن ہو، صحابہ رضی اللہ عنہم کی زبان ہو۔ یعنی زبان بھی پاک اور قرآن بھی پاک ہو تو شفا ہونے میں دیر لگتی ہے؟ آج مشکل مسئلہ یہ ہے کہ قرآن پاک ہے، لیکن ہماری زبانیں ناپاک ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں ایک آدمی آیا، اس نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہلے فاتحہ پڑھتے تھے، آیۃ الکرسی پڑھتے تھے تو شفا ہو جاتی تھی، آپ پڑھتے ہیں تو اتنا فائدہ نہیں ہوتا۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بھئی! قرآن تو وہی ہے، لیکن میں عمر رضی اللہ عنہ والی زبان کہاں سے لے آؤں؟ حالانکہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں اور اپنے وقت کی بات کر رہے ہیں، ہم تو چودہ سو سال اور پیچھے آ گئے ہیں، ہمارے ایمان تو اور بھی کمزور ہو گئے ہیں، ہماری تو عقل اور حرام ہو گئی، لباس ہی حرام کے ہو گئے، ہمارے کھانے مشتبہ ہو گئے، ہماری زبان پر غیبت آ گئی، جھوٹ آ گیا اور مختلف مشاغل آ گئے، اس لیے ہماری زبان سے قرآن کا اثر نہیں ہوتا۔ تو اصل میں ہماری زبان ہی کا قصور ہوتا ہے، ورنہ اللہ کا قرآن تو

قرآن ہے۔

تو صحابی نے پڑھا، پھونک ماری اور وہ ایک منٹ میں ٹھیک ہوگیا۔ انہوں نے کہا: تیس بکریاں دے دو۔ بکریاں لے لیں۔ اب بعض صحابہ نے کہا: اللہ نے کھانا دیا ہے تو دو چار بکرے کاٹو اور کھاتے ہیں۔ بعض صحابہ نے کہا: تم کھاؤ، ہم تو نہیں کھاتے، کیونکہ اس نے قرآن پڑھ کر یہ اجرت لی ہے، بکریاں لی ہیں، زبردستی لے آیا ہے۔ اس نے پہلے طے کیا تھا کہ تیس بکریاں دو گے تو میں پڑھوں گا۔ یہ کوئی ہدیہ بھی نہیں بنتا۔ اس لیے ہم تو نہیں کھاتے جب تک حضور ﷺ کی خدمت میں نہ چلے جائیں۔ بہر حال کچھ صحابہ نے اس میں سے کھایا اور کچھ نے زیادہ احتیاط فرمائی اور نہ کھایا۔

حضور ﷺ کی خدمت میں آئے، آکر عرض کیا کہ حضور! ایسے ایسے واقعہ ہوا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا! یہ بتاؤ تم نے کیا پڑھا تھا؟ صحابی نے عرض کی: حضور! میں نے فاتحہ پڑھی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں پتا تھا کہ اگر زہر والے آدمی پر فاتحہ پڑھی جائے تو ٹھیک ہو جاتا ہے؟ اس نے کہا: میں نے آپ سے سنا تھا کہ یہ سورت رقیہ بھی ہے، سورۃ الشفا بھی ہے۔ تو وہ نام میرے دماغ میں تھا، اس کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے پڑھ دیا اور اللہ نے شفا عطا فرمادی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا! ان بکریوں کا کچھ گوشت تمہارے پاس باقی ہے؟ کہا: جی ہاں! گوشت ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: میرے لیے بھی لے آؤ، مجھے بھی کھلاؤ۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۵۷۳۶، باب: الرقی بفاتحۃ الکتاب]

یعنی حضور ﷺ نے یہ اس لیے فرمایا کہ ان کی تسلی ہو جائے کہ یہ خالص حلال ہے۔ اگر اس میں کروڑواں حصہ بھی شبہ ہوتا تو میرے مدنی پاک ﷺ کبھی نہ کھاتے۔ اس وجہ سے بعض علماء کہتے ہیں کہ اگر ہم کسی کو صلوات پڑھتے ہیں، دعا پڑھتے ہیں تو اس پر پیسے لینا جائز ہے، کیونکہ یہ حدیث مبارکہ میں موجود ہے۔ اگر یہ بات غلط ہوتی تو صحابہ کو حضور ﷺ منع فرمادیتے۔ جب صحابہ کو منع نہیں فرمایا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جائز ہے۔ بہر حال سورۂ فاتحہ شفا ہے۔ بعض علماء نے اس سے بھی استدلال فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الاسراء: ۸۲]

''اور ہم وہ قرآن نازل کر رہے ہیں جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت کا سامان ہے۔''

علماء نے فرمایا: جب اللہ کا قرآن روحانی بیماریوں کے لیے شفا ہے تو جسمانی بیماری تو کوئی چیز ہی نہیں ہوتی۔

اصل تو روحانی بیماری ہے نا! شرک جیسی بیماری، حسد جیسی بیماری، غیبت جیسی بیماری اور بدعت جیسی بیماری۔ جب قرآن ان بیماریوں کو توڑ پھوڑ کر فنا کر دیتا ہے اور بندے کو ٹھیک مسلمان بنا دیتا ہے تو یہ جسمانی بیماریاں تو معمولی چیز ہیں۔ اس لیے انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے اس میں شفا رکھی ہے اور اسی لیے یہ بھی ثابت ہے۔

کیا کیا چیز دم کر سکتے ہیں؟

''مُعَوِّذَتَیْن'' کا پڑھنا بھی ثابت ہے، سورۃ البقرۃ کی آخری تین آیات کا پڑھنا بھی ثابت ہے اور ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ﴾، ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾، ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ کا پڑھنا بھی ثابت ہے۔ بس اب یاد رکھو! احتیاط کیا ہے؟ اس میں علماء کی فہم علیحدہ ہو گئی۔

بعض علماء نے فرمایا: جس جس آیت کی حضور ﷺ نے بیماری کے لیے، سحر کے لیے، جنات کے لیے اور جادو کے لیے پڑھنے کی اجازت فرمائی ہے بس اسی کو پڑھا جائے۔ بس اب وہی سمجھ کی بات آ گئی۔ انہوں نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ﴾، ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾، ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ اور ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾۔ یہ سورتیں پڑھا کرو اور بدن پر دم بھی کیا کرو۔ اسی طرح آیت الکرسی کے بارے میں بھی حضور ﷺ نے فرمایا ہے اور سورت فاتحہ کے بارے میں بھی حضور ﷺ نے فرمایا ہے۔ اب بعض ائمہ، بعض محدثین اور بعض علماء صرف انہی تک محدود ہو گئے ہیں۔

اور بعض علماء نے فرمایا ہے: اگر ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ﴾ بھی قرآن ہے، ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾ بھی قرآن ہے، ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ بھی قرآن ہے، ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ بھی قرآن ہے، آیت الکرسی بھی قرآن ہے اور سورۂ فاتحہ بھی قرآن ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ قرآن جہاں سے بھی پڑھو سارا قرآن پڑھنا جائز ہو گیا۔ جب ایک حصہ پڑھنا جائز ہے تو دوسرا کیوں ناجائز ہے؟ تو مقصد یہ ہوا کہ قرآن کا پڑھنا جائز ہے۔ اس لیے بعض علماء ایسا کرتے تھے کہ کوئی بیمار آ گیا تو جو آیت اس کے مطابق ہوتی تھی وہ پڑھ دیتے یا اس کو بتلا دیتے کہ جاؤ یہ آیت پڑھا کرو، اللہ تعالیٰ تمہارے حال پر رحم فرما دیں گے۔ یعنی کوئی درد والا آدمی آیا اس کی مناسبت سے وظیفہ بتا دیا۔ جیسے اگلے دن کسی نے لکھا کہ اگر کسی کو بخار آ گیا اور اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مناسبت والی آیت پڑھ لی کہ آگ ٹھنڈی ہوئی ہے تو بخار کی آگ بھی ٹھنڈی ہو جائے گی۔ اس لیے بعض علماء فرماتے ہیں کہ جب قرآن پاک کی بعض سورتوں کے پڑھنے کا حکم حدیث میں موجود ہے تو گویا حدیث میں اصل تو آ گئی۔ جب اصل آ گئی تو باقی آیات ہم

مناسبت سے پڑھیں گے تو ٹھیک ہے۔

بعض نے فرمایا کہ نہیں ہم تو احتیاط کریں گے کہ حضور ﷺ نے جو فرمایا اور جتنا فرمایا اتنا تو پڑھیں گے اور جو نہیں فرمایا وہ ہم نہیں پڑھیں گے۔

بس ایک فہم کا اختلاف ہے، ورنہ ان دونوں کے اندر کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے آپ کہہ سکیں کہ انہوں نے بڑی غلطی کی ہے، یا وہ بڑی غلطیوں میں مبتلا ہیں۔

لوگوں کو اسلام کے قریب کرنے کا ایک طریقہ:

اصل میں مشکلات یہ ہوتی ہیں کہ بعض اوقات اہلِ حق لوگوں کو اہلِ باطل سے چھڑانے کے لیے معاملات میں نرمی برتتے ہیں۔ اور بعد میں آنے والے پھر اس کے اندر غلط چیزیں داخل کر دیتے ہیں۔ جیسے آج سے دو سو تین سو سال قبل جو علماء اہل اللہ عرب سے عجم کے اندر تشریف لے گئے اور ان کو عجم میں جا کر ہندوؤں کا مقابلہ، سکھوں کا مقابلہ، بدھ مت کا مقابلہ، سورج پرستوں کا مقابلہ اور آتش پرستوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ وہاں لوگ مختلف مصیبتوں میں گھرے ہوئے تھے اور غلط قسم کے پادریوں اور پنڈتوں کے پاس جاتے تھے تو انہوں نے ان کو وہاں سے نکالنے کے لیے کچھ راستے بنائے کہ کسی طرح لوگ ہمارے قریب تو آئیں۔ جب قریب آئیں گے تو ہم ان کو حق بات بھی سمجھا دیں گے۔ وہ تو الحمدللہ! کامیاب رہے، انہوں نے لاکھوں لوگوں کو کفر سے اسلام میں داخل کیا۔

اس زمانے کے لوگوں کا حال:

لیکن بعد والوں میں یہ چیز نہ رہی، انہوں نے اصل بات دین والی خدمت تو چھوڑ دی اور صرف بدعات میں رہ گئے کہ انہوں نے کہا: بس سب کچھ ٹھیک ہے، یہ قوالی ہو جاتی ہے، یہ گانا بجانا بھی ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا یہ ہے کہ تعویذ تھوک کے حساب سے لکھ کر رکھ لیے اور یہ تعویذ بھی چل رہے ہیں اور کہیں دھاگے چل رہے ہیں اور کہیں جناب انگوٹھیاں ہیں وہ چل رہی ہیں اور کہیں کڑے چل رہے ہیں۔ اصل میں پھر یہ ایک پیٹ پالنے کا مسئلہ بن گیا، کیونکہ وہ علم تو ختم ہو گیا، وہ فضل تو ختم ہو گیا اور اہلِ حق چلے گئے۔ اب جو اہل ہوئے تھے ان کے سامنے تو صرف دولت تھی، ان کے سامنے نہ دین تھا، نہ اللہ کی اطاعت تھی اور نہ سنتِ رسول اللہ ﷺ تھی، لہٰذا وہ لوگ پھر گمراہیوں میں ڈوبتے چلے گئے۔ اب آپ مزارات پر جائیں تو کہیں چھلے بکتے ہیں کہ جی ہاتھ میں ہیں تو بواسیر ختم

ہو جاتی ہے تو پھر خواہ مخواہ ڈاکٹر، آپریشن کا جھگڑا ہی ختم۔ آسان مسئلہ ہے۔

اچھا! اس کے مقابلے میں انگریزوں نے بھی ایک چیز نکال دی۔ انہوں نے کہا: مسلمانوں کے پیر بنا رہے تھے تو ہم بھی بنا دیں۔ انہوں نے بھی ایک چین نکال دی ہے۔ کوئی میگنٹ قسم کی چیز ہے کہ وہ ہاتھ میں پہن لو تمہاری بیماریاں ختم ہو جائیں گی۔ انہوں نے کہا: ان کے پیر کر رہے ہیں تو ہم کوئی کم پیر ہیں؟ یہ تو بڑا بزنس ہے۔

اگر میں ویسے ہی کہوں کہ مجھ سے یہ انگوٹھی لے لو تو مجھ سے کوئی پانچ ریال میں بھی نہیں لے گا۔ اور اگر میں کہوں یہ تو جناب رات داتا دربار سے مجھے ملی ہے تو آپ دو لاکھ میں بھی خرید لیں گے۔ بس دماغ میں ایک بات ڈالنی ہے کہ میں رات کو وہاں گیا تھا، میں نے وہاں جا کر اعتکاف کیا، مراقبہ کیا، میں وہاں بیٹھا رہا اور مجھے حضرت نے حکم دیا کہ فلاں جگہ تمہارے لیے انگوٹھی پڑی ہے وہ اٹھا لو۔ تو میں نے جا کر اٹھالی، یہ وہ انگوٹھی ہے۔ ابھی کئی پاگل خریدنے والے نکل آئیں گے۔ کہیں گے: سبحان اللہ! کیا بات ہے! مہربانی کرو حضرت! یہ انگوٹھی دو لاکھ میں مجھے دے دو۔ حالانکہ ہے بالکل جھوٹ۔

تو اس طرح پھر یہ سارے کاروبار بن گئے۔ کہیں دھاگے بک رہے ہیں، کہیں ٹوپیاں بک رہی ہیں، کہیں گلے میں ڈالنے والے پھندے بک رہے ہیں اور کہیں جناب رسیوں میں گرہیں لگی ہوئی ہیں وہ بک رہی ہیں، وہ گلے میں ڈال رہے ہیں۔ کہیں بڑے، بڑے پتھر بک رہے ہیں، کہیں لوہے کے بید بک رہے ہیں۔ یہ سب پیٹ پالنے کا ذریعہ ہیں، ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ وجہ کیا ہے؟ وہ اللہ والے چلے گئے اور ہم جیسے غلط لوگ رہ گئے اور ہم نے ان کی دین والی خدمت ختم کر دی اور جو روٹی والا مسئلہ تھا وہ ہم نے ان کے نام سے حل کر لیا۔ ہم نے کہا: دین کا کام تم کر گئے، اب قیامت تک تمہارے نام سے روٹیاں ہم کھاتے رہیں گے۔ تم زندہ ہوتے تو ہم تمہیں بھی بیچ دیتے، لیکن خدا کی قدرت ہے کہ ہم تمہارے بعد پیدا ہوئے۔ یہ اتفاق ہے۔ اگر وہ اللہ کے ولی زندہ ہوتے تو یہ ان کا بھی سودا کر دیتے۔ سچی بات ہے، بھئی! خدا کے بندو! ایمان سے کہو! دیکھو حضور ﷺ کی پگڑی مبارک کی زیارت کے پیسے۔ اللہ کے نبی کی پگڑی بیچتے ہو؟ مجھے سمجھاؤ، حضور ﷺ کے بال مبارک ہیں، ان کی زیارت کے پیسے؟ بھئی! اللہ نے تو کعبے کی زیارت کے بھی پیسے نہیں رکھے۔ تم جہاز کا کرایہ بھرتے ہو، کعبے کے تو کوئی پیسے نہیں، یہ تو تم ہوائی جہاز میں بیٹھتے ہو۔ احرام باندھا ہوا ہوتا ہے، مزے سے سواری کرتے ہو۔ مزے سے سفر کرتے ہو، تمہارے آنے جانے اور سفر کے کرائے ہیں۔ کعبہ دیکھنے کے لیے الحمد للہ! تم سے کوئی پیسے نہیں مانگ رہا۔

یاد رکھو! ان اولیاء اللہ کا کوئی قصور نہیں۔ اللہ ان کی قبروں پر کروڑ بار رحمتیں نازل فرمائے، اللہ ان کے درجات بلند فرمائے، اللہ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے اور اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ یہ جو بعد میں نسل آئی ہے انہوں نے بگاڑ پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے۔ چونکہ خدا کی قدرت ہے کہ بعض بزرگوں کی اپنی اولاد کوئی نہیں تھی۔ اولاد تھی تو اولاد اچھی نہ بنی۔ اس طرح جو لوگ قابض ہوتے گئے وہ اپنی مرضی کرتے رہے۔ اب کسی مزار پر کوئی بدعت والا قابض ہے تو پورا مزار بدعت کا گھر بنا ہوا ہے۔ کسی مزار پر یہ ملنگ آگئے ہیں تو وہاں بس بھنگ ہے، چرس ہے یا افیون ہے اور وہاں جناب ننگ دھڑنگ لوگ پڑے ہیں اور سب پہنچے ہوئے مانے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں: اللہ کو پہنچے ہوئے ہیں۔

قوم کی قرآن سے بے وفائی:

میں نے کہا: اچھی بات ہے جو عقل والا ہو اس کو تم یورپ بھیج دیتے ہو اور جو پاگل ہو جائے اسے اللہ کے ساتھ ملا دیتے ہو۔ یعنی اگر تمہارا کوئی اچھا لڑکا پیدا ہو، ذہین ہو، بڑا انٹیلیجنٹ بیٹا ہو تو اس کو تو کورس کرانے کے لیے تم یورپ بھیج دیتے ہو اور جو بالکل پاگل ہو جائے اور کپڑے اتار کر سڑک پر کھڑا ہو جائے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کو مل گیا ہے۔ ......إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ...... دعا کرو اللہ ہمیں عقل دے، اللہ ہمیں ہدایت دے۔ ایمان سے کہو! اکثر آپ نے دیکھا ہوگا کہ اندھے حافظ ہوتے ہیں۔ آنکھوں والے کیوں نہیں ہوتے؟ وجہ یہ ہے کہ جو لڑکا اندھا ہو، چلو جی! مسجدوں میں ڈالو، قرآن شریف پڑھے گا، اور تو کسی کام کا ہے نہیں، بے چارہ اندھا ہے، کیا کریں؟ چلو حافظ بن جائے گا، روٹی شوٹی تو کھاتا رہے گا۔ یعنی جو اندھا ہے، بے کار ہے وہ قرآن کے لیے، جو لنگڑا ہے وہ قرآن کے لیے، جس کا ہاتھ نہیں ہے وہ قرآن کے لیے اور جو سارے خاندان میں نالائق، غبی اور کند ذہن ہے وہ قرآن کے لیے ہے۔

شکر کرو کہ علماء نے تمہارے بے کار پرزوں کو کارآور بنا دیا کہ آج پوری دنیا میں قرآن زندہ ہے، ورنہ تم نے قرآن سے کوئی وفا نہیں کی۔ تم نے تو ہمیں وہ لڑکا دیا ہے جو نالائق ہو، جو ذہین لڑکا ہوگا وہ Kips (کپس) کالج میں پڑھے گا۔ برٹش سکولوں میں پڑھے گا، اس کے بعد پھر باہر جائے گا، پھر آکسفورڈ میں پڑھے گا، وہ یہاں مسجد میں تھوڑا پڑھے گا؟ اس کا مسجد کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ مسجد کے لیے تو تم نے وہ دیا ہے جو بے کار، بالکل نل بٹہ نل ہو، زیرو جمع زیرو نتیجہ زیرو۔ (0=0+0) تم نے وہ بھیجا، لیکن ہم نے اسے بھی حافظ بنا دیا۔ الحمد للہ! اس کے سینے میں

بھی قرآن کی امانت رکھ دی کہ آج جب تراویح کا وقت آتا ہے تو تم آنکھوں والے پیچھے کھڑے ہوتے ہو، وہ اندھا آگے کھڑا ہوتا ہے۔ یہ اللہ تبارک وتعالی کی شان ہے۔ پھر اللہ تعالی جس سے کام لے لے اس کی مرضی۔ اللہ تعالی جس سے چاہیں، جو چاہیں اور جب چاہیں کام لے لیں۔

سورۃ ''أَسَاس''، ''وَافِيَة''، ''كَافِيَة'':

اس کے بعد مصنف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

❁...... ''وَرَوَى الشَّعْبِيُّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ سَمَّاهَا أَسَاسَ الْقُرْآنِ'' (امام شعبی رحمہ اللہ نے روایت کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس سورت کا نام اساس القرآن رکھا ہے)۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ قرآن کی اساس اور بنیاد ہے: ''وَأَسَاسُهَا بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' (اور پھر سورۂ فاتحہ کی بنیاد ﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ہے)۔

❁...... ''وَسَمَّاهَا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ بِالْوَاقِيَةِ'' (حضرت سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے سورۂ فاتحہ کا نام واقیہ رکھا ہے)۔ اور واقیہ کا معنی ہے: حفاظت کرنے والی، بچانے والی۔

❁...... ''وَسَمَّاهَا يَحْيَى بْنُ أَبِي كَثِيْرٍ الْكَافِيَةَ'' (اور یحیی بن کثیر رحمہ اللہ نے اس کا نام سورۃ کافیہ رکھا ہے)۔

یہ سورت ایسی ہے کہ یہ سورت سب چیزوں کے لیے کافی ہے، لیکن اگر یہ سورت نہ ہو، باقی سب کچھ ہو تو کافی نہیں ہے، لہٰذا انہوں نے کہا کہ یہ کافیہ ہے ''كَمَا جَاءَ فِي بَعْضِ الْأَحَادِيْثِ الْمُرْسَلَةِ'' (جیسا کہ بعض مرسل احادیث میں آیا ہے) یعنی سورت فاتحہ تو باقی کا عوض بن سکتی ہے، لیکن فاتحہ کا عوض کوئی نہیں بن سکتا۔ یعنی اتنی شان والی سورت ہے۔ اگر نماز میں فاتحہ ہو، باقی کوئی آیت نہ بھی پڑھی جائے تو گزارہ ہو سکتا ہے، لیکن سارا قرآن پڑھیں اور فاتحہ نہ پڑھیں پھر گزارہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مطلق قراءت نماز میں فرض ہے اور سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے۔

❁......اسی طرح فرمایا: ''وَيُقَالُ لَهَا سُوْرَةُ الصَّلَاةِ وَالْكَنْزِ ذَكَرَهُمَا الزَّمَخْشَرِيُّ فِي كَشَّافِهِ'' (علامہ زمخشری رحمہ اللہ اپنی کتاب کشاف میں فرماتے ہیں: اس کا نام صلوۃ بھی ہے اور کنز بھی ہے)۔ کنز کا معنی خزانہ ہے۔ یہ بھی اللہ کی رحمتوں کا خزانہ ہے، علوم کا خزانہ ہے اور معارف کا خزانہ ہے۔

کشاف تفسیر تو بہت اعلی ہے، لیکن علامہ زمخشری رحمہ اللہ کا تھوڑا سا رجحان معتزلہ کی طرف تھا۔ اب تو فوت ہو گئے، جو فوت ہو جائے اس کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں؟ بہر حال بحیثیت تفسیر تو انہوں نے بڑی محنت کی ہے، قواعد بیان کیے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

یہ سورت مکی بھی ہے، مدنی بھی ہے:

''وَهِيَ مَكِّيَّةٌ قَالَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ وَقَتَادَةُ وَأَبُو الْعَالِيَةِ''

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت قتادہ رحمہ اللہ اور حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ تینوں فرماتے ہیں کہ یہ سورت مکی ہے (یعنی ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے)۔''

''وَقِيلَ مَدَنِيَّةٌ قَالَهُ أَبُو هُرَيْرَةَ وَمُجَاهِدٌ وَعَطَاءُ بْنُ يَسَارٍ وَالزُّهْرِيُّ''

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت مجاہد رحمہ اللہ، حضرت عطاء رحمہ اللہ اور حضرت زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ مدنی سورت ہے۔''

چار صحابہ رضی اللہ عنہم کہہ رہے ہیں کہ مکی ہے اور چار صحابہ رضی اللہ عنہم کہہ رہے ہیں کہ مدنی ہے۔ اس کو صحابہ رضی اللہ عنہم کا اختلاف نہیں کہیں گے، یہ اختلاف نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ جن صحابہ رضی اللہ عنہم کو ہجرت سے پہلے مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سننے کا موقع ملا انہوں نے کہا: مکیہ ہے اور جن لوگوں نے مدینہ میں پہلی دفعہ سنی، اس سے پہلے انہوں نے سنی ہی نہیں، اس سے پہلے ان کے ذہن میں بھی یہ سورت نہیں آئی، جب انہوں نے مدینہ منورہ میں سنی تو انہوں نے کہا: یہ سورت مدینہ میں اتری ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

اختلافِ صحابہ کی وجہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں پڑھ رہے ہیں تو اس قسم کے اختلاف پیدا ہوئے کہ ایک کو وہ حکم پہلے پہنچ گیا ہے اور دوسرے کو وہ حکم پہلے نہیں پہنچا۔ دور وہ ویڈیو، ٹیلی فون کا دور تو نہیں تھا کہ تصویر بھی سامنے دیکھ لو۔ اب ایک صحابی نے ایک بات مکہ میں سنی اور یمن تشریف لے گئے، جہاد کرتے کرتے وہیں شہید ہو گئے، بعض صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک علم سیکھا اور پھر دین پھیلاتے پھیلاتے تاشقند اور بخارا پہنچ گئے۔ اب وہ غریب بیچارے واپس ہی نہیں آئے کہ انہیں پتا ہو کہ کوئی نیا حکم آیا ہے۔ بعض لوگ مدینہ منورہ سے نکلے اور کوفہ چلے گئے، بعض لوگ دمشق چلے گئے، بعض لوگ شام چلے گئے اور بحرین چلے گئے۔ دین پھیلاتے گئے، واپس مڑنے کا اتفاق ہی نہیں بنا اور پھر کوئی اتصال کا ذریعہ بھی نہیں تھا کہ پوچھ لیں: اس حکم کے بعد کوئی اور حکم تو نہیں آیا؟ تو جہاں جہاں انہوں نے جو بات پہنچائی انہیں علاقوں میں وہی بات چلتی گئی، پھیلتی گئی۔ ان کے شاگردوں کو تو وہی بات ملی۔ ان کے شاگردوں میں جو امام بنے ان کو بھی وہی بات ملی۔ اس میں ان کا قصور نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں...... نعوذ باللہ...... ان کی کوئی بد دیانتی

ہوتی ہے۔ اللہ ان کی قبروں پہ کروڑوں رحمتیں فرمادے۔

اب دیکھیں کہ صحابہ میں اختلاف ہو گیا، اس لیے کہتے ہیں "وَيُقَالُ نُزِلَتْ مَرَّتَيْنِ مَرَّةً بِمَكَّةَ وَمَرَّةً بِالْمَدِيْنَةِ." (دو مرتبہ نازل ہوئی، ایک دفعہ مکہ میں اور ایک دفعہ مدینہ منورہ میں۔) اچھا! دونوں طرف صحابہ ہیں: ایک طرف ابن عباس رضی اللہ عنہ ہیں اور ایک طرف ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ ہم ان دونوں کو غلط کیسے کہیں؟ پھر ایسی باتیں کیوں ہوتی ہیں؟ بعض علماء نے کہا ممکن ہے کہ دو دفعہ اللہ نے اتاری ہو: ایک دفعہ مکے میں اور ایک دفعہ مدینے میں۔ صحابہ تو دونوں طرف کے سچے ہیں، ان میں سے کوئی غلط نہیں کہتا۔

اکابر اور ائمہ کا ادب:

جب کسی بڑے آدمی کی بات ہو تو ہمیشہ بات کہنے کا ادب ہوتا ہے، انداز ہوتا۔ جیسے کسی نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ بڑے ہو یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ہیں؟ انہوں نے کہا: بڑے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لیکن پیدا میں پہلے ہوا تھا۔ کتنے ادب سے بات کی!! یہ نہیں کہا کہ میں بڑا ہوں، حالانکہ عمر میں بڑے تھے۔ اب بات بھی کہہ دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب بھی برقرار رکھا۔

تو اس لیے جن لوگوں کے اندر علم ہوتا ہے وہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا کوئی ایسا فرمان مبارک سنیں جو بظاہر اچھا نہ لگ رہا ہو تو وہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب میں نہیں سمجھ رہا...... اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں فرمائے...... میں تو بڑے ادب سے نام لوں گا اور کسی علم والے کی گستاخی کا مرتکب نہیں ہوں گا۔ اور بعض جو بے ادب ہو جاتے ہیں کہتے ہیں: او چھوڑو جی! کیا ہے، وہ بھی بندے تھے اور ہم بھی بندے ہیں۔ بندے تو تم ہو اس میں کوئی شک نہیں ہے، بندے تو سب ہیں، لیکن بندوں میں بھی تو فرق ہے۔ اگر بندوں میں فرق نہ کرو گے تو پھر اسی سے تو زندیقی آتی ہے۔

گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

اللہ کے انبیاء علیہم السلام بھی بندے ہیں، لیکن ان کا مقام ان کے ساتھ ہے۔

فاتحہ کا مکی ہونا راجح ہے:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وَالْأَوَّلُ أَشْبَهُ لِقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي﴾ الخ (پہلا قول زیادہ صحیح ہے کہ یہ سورت مکی ہے، ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ

الْمَثَانِي﴾ [الحجر: ۸۷] اور یہ آیت مکی ہے)۔

ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ آدھی سورت مکہ میں ہجرت سے پہلے نازل ہوئی اور آدھی ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی۔ لیکن یہ قول بالکل غریب ہے، ضعیف ہے، قابل حجت ہی نہیں ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۸، سورۃ الفاتحہ]

فاتحہ کی آیات کی تعداد:

اس کی سات آیات ہیں، اس میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔

- "وَقَالَ عَمْرُو بْنُ عُبَيْدٍ ثَمَانٍ" (حضرت عمرو بن عبید رحمہ اللہ نے کہا کہ آٹھ آیات ہیں)۔
- "وَقَالَ حُسَيْنٌ الْجُعْفِيُّ سِتَّةٌ" (حضرت حسین الجعفی رحمہ اللہ کہتے کہ چھ آیات ہیں)۔

یہ اقوال شاذ ہیں۔ چھ والا بھی شاذ ہے، آٹھ والا بھی شاذ ہے۔ صحیح قول یہ ہے کہ سات آیات ہیں۔ بہر حال سورت فاتحہ اتنی ہی ہے، مگر تقطیع اور شمار آیات میں اختلاف ہو گیا ہے، مثلاً:

- کسی نے کہا: ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ الگ آیت ہے اور ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ الگ آیت ہے۔
- کسی نے کہا: یہ ساری آخر تک ایک ہی آیت ہے۔
- کسی نے کہا: ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ سے آخر تک ایک ہی آیت ہے۔ تو اس نے کہا: یہ چھ آیات ہیں۔
- اور کسی نے ﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾ کو ایک آیت اور ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ الگ آیت شمار کی ہے۔ اس طرح سے آٹھ آیات شمار کی ہیں۔

لیکن راجح قول یہ ہے کہ یہ سات آیات ہیں۔ اس لیے سمجھا کریں۔ اختلافات کی وجہ اس طرح کی ہوتی ہے، اقوال بھی اسی لیے پیدا ہو جاتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۸، سورۃ الفاتحہ]

کیا بسم اللہ مستقل آیت ہے؟

"وَإِنَّمَا اخْتَلَفُوا فِي الْبَسْمَلَةِ هَلْ هِيَ آيَةٌ مُسْتَقِلَّةٌ مِنْ أَوَّلِهَا؟ كَمَا هُوَ عِنْدَ جُمْهُورِ قُرَّاءِ الْكُوفَةِ وَقَوْلِ جَمَاعَةٍ مِنَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِينَ وَخَلْقٍ مِنَ الْخَلَفِ أَوْ بَعْضُ آيَةٍ أَوْ لَا تُعَدُّ مِنْ أَوَّلِهَا بِالْكُلِّيَّةِ؟ كَمَا هُوَ

قَوْلُ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مِنَ الْقُرَّاءِ وَالْفُقَهَاءِ."

"اب اختلاف اس بات میں ہے کہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ مستقل آیت ہے یا نہیں؟ جمہور قراء کوفہ رحمہم اللہ، صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ یہ مستقل آیت ہے۔ یا یہ کہ آیت کا بعض حصہ ہے یا بالکل آیت ہی نہیں۔ جیسا کہ مدینہ کے قراء اور فقہاء رحمہم اللہ کا قول ہے۔) مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جہاں "بسم اللہ" کی بحث آئے گی وہیں جا کر اس کی بحث کروں گا۔"

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

سورۂ فاتحہ کے کلمات اور حروف:

علماء نے لکھا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے پچیس کلمات ہیں اور ایک سو تیرہ حروف ہیں۔

فاتحہ کو ام الکتاب کیوں کہتے ہیں؟

امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب التفسیر میں لکھا ہے کہ اس کو "أُمُّ الْكِتَابِ" اس لیے کہتے ہیں کہ اس سے کتاب شروع ہوئی ہے اور اسی سے نماز شروع ہوتی ہے۔ بعض نے کہا "أُمُّ الْكِتَابِ" اس لیے کہتے ہیں کہ قرآن پاک میں جتنے مضامین ہیں یہ سب کو مشتمل ہے اور یہ ان سب کا خلاصہ ہے۔ علامہ ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عربوں کی یہ عادت ہے کہ کوئی چیز ایسی ہو جو آگے جانے والی ہو اور اس کے پیچھے توابع ہوں تو اس کو "أُمٌّ" کہتے ہیں۔ تو گویا! سارے قرآن کا یہ خلاصہ ہے۔ اور یہ جلد جہاں جا کے دماغ اکٹھا ہوتا ہے اسے "أُمُّ الرَّأْسِ" کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جو لشکر میں فوج کا جھنڈا ہوتا ہے اسے بھی "أُمٌّ" کہتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، ۹، سورۃ الفاتحہ]

مکہ کو "أُمُّ الْقُرٰى" کہنے کی وجہ:

اور مکہ کا نام بھی "أُمُّ الْقُرٰى" ہے، کیونکہ سب سے پہلی جگہ یہی ہے۔ اور بعض علماء نے کہا اس لیے اس کا نام "أُمُّ الْقُرٰى" ہے، کیونکہ زمین کو یہاں سے بچھایا گیا۔

"وَيُقَالُ لَهَا أَيْضًا الْفَاتِحَةُ، لِأَنَّهَا تُفْتَتَحُ بِهَا الْقِرَاءَةُ وَافْتَتَحَتِ الصَّحَابَةُ بِهَا كِتَابَةَ الْمُصْحَفِ."

"اس سورت کا نام فاتحہ بھی ہے، کیونکہ نماز میں قراءت کی ابتداء اسی سے کی جاتی ہے اور صحابہ نے بھی اسی سے قرآن لکھنے کی ابتدا کی۔"

اور اس کا نام "مثانی" بھی ہے، کیونکہ یہ نماز کی ہر رکعت میں بار بار پڑھی جاتی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹، سورۃ الفاتحہ]

کیا بسم اللہ فاتحہ کا جز ہے؟

"وَقَالَ الْحَافِظُ أَبُوْ بَكْرٍ أَحْمَدُ بْنُ مُوْسٰى بْنِ مَرْدُوَيْهِ فِيْ تَفْسِيْرِهِ حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ زِيَادٍ...... عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ ، قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: (الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ) سَبْعُ آيَاتٍ "بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" إِحْدَاهُنَّ وَهِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْآنُ الْعَظِيْمُ، وَهِيَ أُمُّ الْكِتَابِ وَ فَاتِحَةُ الْكِتَابِ..."

اب مفسر رحمہ اللہ سورۂ فاتحہ کے اسماء کے بارے میں ذکر فرما رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ حافظ ابوبکر رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ سورت سات آیات پر مشتمل ہے اور اس میں ﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ بھی ایک آیت ہے۔ جیسا کہ خلاصۂ درس میں الحمد للہ! آپ پڑھ چکے ہیں کہ اس میں ائمہ رحمہم اللہ کا اختلاف ہے کہ کیا بسم اللہ اس سورت کا جز ہے یا جز نہیں، بلکہ ایک مستقل آیت ہے جو فصل ما بین السُّوَر کے لیے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے؟ تو اس لیے بعض ائمہ اس کے جز ہونے کے قائل ہیں۔ جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول ہے۔ اور بعض ائمہ فرماتے ہیں اصل میں جو سورۃ النمل میں ہے وہ تو قرآن کی اس سورت کا جز ہے، لیکن سورت النمل کے سوا جہاں بھی ہے وہ فصل کے لیے ہے، آیت مستقلہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس لیے اتاری ہے کہ ہر سورت کے درمیان فصل کے لیے لکھ دی جائے، تاکہ سورتوں کے علیحدہ ہونے کی وضاحت ہو سکے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ" اسی سورت کا نام ہے، "أُمُّ الْكِتَابِ" بھی اسی کا نام ہے اور "فَاتِحَةُ الْكِتَابِ" بھی اسی کا نام ہے۔ اور دارقطنی نے بھی اسی طرح کی ایک روایت نقل فرمائی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۹، سورۃ الفاتحہ]

"سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ" کی بحث:

"وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ عَنْ عَلِيٍّ وَابْنِ عَبَّاسٍ وَأَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّهُمْ فَسَّرُوْا قَوْلَهُ تَعَالٰى سَبْعاً مِّنَ الْمَثَانِيْ بِالْفَاتِحَةِ وَأَنَّ الْبَسْمَلَةَ هِيَ الْآيَةُ السَّابِعَةُ مِنْهَا."

اب بیہقی رحمہ اللہ نے حضرت علی، حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے یہ تفسیر نقل فرمائی ہے کہ انہوں نے

فرمایا: ﴿سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ﴾ فاتحہ کا نام ہے اور ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ سورۂ فاتحہ کی ایک ساتویں آیت ہے۔ مفسر ؒ فرماتے ہیں کہ اس کی مفصل بحث ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کی تفسیر میں ذکر کروں گا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۹، سورۃ الفاتحہ]

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں فاتحہ کیوں نہیں لکھی گئی تھی؟

مفسر ؒ فرماتے ہیں:

"وَقَدْ رَوَى الْأَعْمَشُ عَنْ إِبْرَاهِيمَ قَالَ: قِيلَ لِابْنِ مَسْعُودٍ: لِمَ لَمْ تَكْتُبِ الْفَاتِحَةَ فِي مُصْحَفِكَ؟ فَقَالَ: لَوْ كَتَبْتُهَا لَكَتَبْتُهَا فِي أَوَّلِ كُلِّ سُورَةٍ."

"امام اعمش ؒ نے حضرت ابراہیم نخعی ؒ سے روایت کی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آپ اپنے قرآن پاک میں سورۂ فاتحہ کیوں نہیں لکھتے؟...... کیونکہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جو مصحف (قرآن) اپنے پڑھنے کے لیے لکھا ہوا تھا اس میں فاتحہ کو شامل نہیں فرمایا تھا — انہوں نے جواب میں فرمایا: اگر میں فاتحہ کو لکھتا تو ہر سورت کے اول میں لکھتا (کیونکہ اسی سے قرآن کا افتتاح ہوتا ہے)۔"

"قَالَ أَبُو بَكْرِ بْنُ أَبِي دَاوُدَ يَعْنِي حَيْثُ يُقْرَأُ فِي الصَّلَاةِ" (حضرت ابوبکر بن ابو داؤد ؒ فرماتے ہیں چونکہ یہ نمازوں میں پڑھی جاتی ہے۔) لہٰذا اس کے بھول جانے کا کوئی خطرہ نہیں، لکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی لکھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قرآن پاک کو محفوظ کر دیا جائے اور قرآن پاک کی جو سورت رات دن ہزاروں دفعہ پڑھی جائے اور ہر مسلمان اسے پڑھ رہا ہے تو اس کے بھول جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس لیے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے مصحف مبارک میں اس کو نہیں لکھا تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۹، سورۃ الفاتحہ]

اور دراصل یہی وجہ تھی کہ معوذتین بھی نہیں تھیں۔ معوذتین ﴿قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ①﴾ [الفلق: ۱] اور ﴿قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ①﴾ [الناس: ۱] کو کہتے ہیں۔ یہ جو منکرین صحابہ روافض اور شیعہ ہیں یہ اسی وجہ سے انکار کرتے ہیں اور بہانہ بناتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سورت فاتحہ کو اور معوذتین کو قرآن نہیں مانتے تھے۔ یہ بات فقط تعصب، عناد کی وجہ سے ہے اور مسلمانوں کے دل میں شبہ ڈالنے کے لیے ہے۔ اصل وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں کتابت کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ورنہ جن لوگوں نے ساری زندگی قرآن کی حفاظت میں گزار دی اور جن کے ایمان کا سب سے بڑا گواہ خود قرآن ہو وہ کیسے انکار کر سکتے ہیں؟ ان کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ [البقرة:٥]

''اور یہ لوگ پورے کامیاب ہیں۔''

﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ [الانفال:٤]

''یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں مومن ہیں۔''

اور......﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ﴾ [الحجرات:٧] (ایسے ہی لوگ ہیں جو ٹھیک ٹھیک راستے پر آ چکے ہیں)۔

کتابتِ وحی:

آپ اندازہ فرمائیں! جب میرے آقا، خاتم الانبیاء، سردار الانبیاء ﷺ پیدا ہوئے ہیں تو سارے مکہ میں چار، پانچ آدمی لکھنے والے تھے۔ حضور ﷺ پر جب وحی آتی تھی تو وحی لکھنے والے کون کون تھے؟ ایک حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے، لیکن ان کی کتابت وحی پر ڈیوٹی نہیں تھی۔ ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ کاتب الوحی تھے۔ پھر جب مکہ فتح ہو گیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی کاتب الوحی بنے۔ اسی طریقے سے حضرت زید رضی اللہ عنہ یعنی چند ایک صحابہ تھے جو لکھنے والے تھے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّا أُمَّةٌ أُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ)) [بخاری، حدیث: ١٩١٣، باب: قول النبي ﷺ: لا نكتب...]

''ہم امی امت (کے لوگ) ہیں، نہ ہم لکھتے ہیں اور نہ ہم حساب کرتے ہیں۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ﴾ [الشوریٰ:٥٢]

''تمہیں اس سے پہلے نہ یہ معلوم تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے؟''

اے نبی! آپ کو کتاب اور ایمان کی تفاصیل کا اس وقت تک علم نہ ہوا جب تک ہم نے آپ پر وحی نہ اتاری۔ بہر حال اس زمانے میں لکھنے والے بھی نہ تھے۔

اور دوسری بات کہ لکھنے کی چیزیں قلم، دوات، سیاہی اور کاغذ وغیرہ بھی ناپید چیزیں تھیں، یعنی بالکل قلیل اور نادر چیزیں تھیں۔ کبھی لکڑیوں پر لکھا جاتا تھا، کبھی چمڑے پر لکھا جاتا تھا اور کبھی پتھر کو صاف کر کے اس پر لکھا جاتا تھا۔ اسی طرح بعض دفعہ دیواروں پر یاد کے طور پر لکھ دیا، کیونکہ کوئی اور چیز میسر نہ تھی۔ تو وضاحت آ گئی کہ اگر انہوں نے

نہیں لکھا تو اس کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مقصد لکھنے کا کیا ہے کہ قرآن محفوظ ہو جائے۔ اور جس کو ایک دن میں پڑھنے والے کروڑوں مسلمان ہوں تو اس کی حفاظت نہ ہونے کا کوئی شبہ ہی نہیں۔ اور اسی طرح تمام صحابہ کرام صبح وشام ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝١﴾ اور ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝١﴾ پڑھ کر اپنے بدن پر اور اپنے بچوں کے بدن پر دم کیا کرتے تھے، لہٰذا اس کے بھول جانے کا کوئی خطرہ ہی نہیں۔ ورنہ...... نعوذ باللہ!...... یہ بات نہیں کہ وہ ان سورتوں کو قرآن نہیں مانتے تھے۔

اسی طرح یہ شیعہ لوگ قراءت کے اختلاف سے بھی دھوکہ دیتے ہیں اور قرآن کی قراءتوں کو بھی نہیں مانتے۔ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت عطا فرمائے اور قرآن پاک پر صحیح ایمان نصیب فرمائے۔ اللہ تعالیٰ صحیح ایمان کی دولت سے مالا مال فرمائے۔

سب سے پہلے اترنے والی سورت:

اب مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک قول ہے کہ سب سے پہلے سورت فاتحہ اتری ہے، لیکن ایک صحیح روایت میں ہے کہ سب سے پہلے سورۂ مدثر نازل ہوئی اور ایک صحیح حدیث مبارکہ یہ بھی ہے کہ سب سے پہلے سورۃ العلق نازل ہوئی ہے۔ بہر حال! یاد رکھیں! سب سے پہلے سورت العلق کی چند آیات نازل ہوئیں، اس کے بعد وحی بند ہوگئی، تقریباً تین سال وحی بند رہی۔ پھر جب وحی آنا شروع ہوئی تو سورۃ المدثر کی چند آیات نازل ہوئیں، پوری سورت نہیں نازل ہوئی۔ اس کے بعد پھر سورت فاتحہ پوری نازل ہوئی۔ اس لیے جنہوں نے کہا جو سب سے پہلے پوری سورت نازل ہوئی وہ سورۂ فاتحہ ہے۔ سورۂ مدثر اور سورۂ علق کی چند آیات اتری تھیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۹، سورۃ الفاتحہ]

حضور ﷺ کی اطاعت کی اہمیت:

"ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِ الْفَاتِحَةِ" اب مفسر رحمہ اللہ سورۃ الفاتحہ کے فضائل میں منقول احادیث بیان فرما رہے ہیں۔ فرمایا:

((قَالَ الْإِمَامُ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلَ رَحِمَهُ اللَّهُ فِي مُسْنَدِهِ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ عَنْ شُعْبَةَ قَالَ حَدَّثَنِي خُبَيْبُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ حَفْصِ بْنِ عَاصِمٍ عَنْ أَبِي سَعِيدِ بْنِ الْمُعَلَّى رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ كُنْتُ أُصَلِّي فَدَعَانِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَلَمْ أُجِبْهُ حَتَّى صَلَّيْتُ فَأَتَيْتُهُ فَقَالَ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَأْتِيَنِي قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي

كُنْتُ أُصَلِّي قَالَ أَلَمْ يَقُلِ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ﴾)) [مسند أحمد، رقم:۱۷۸۵۱]

"امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ روایت فرماتے ہیں کہ ابو سعید بن المعلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نماز پڑھ رہا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آواز دی، بلایا۔ میں چونکہ نماز میں تھا، لہٰذا میں نے جواب بھی نہ دیا اور جانے میں جلدی بھی نہ کی۔ جب میں نے نماز پڑھ لی تو فوراً آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جو تمہیں بلایا تھا تم کیوں نہیں آئے؟ میں نے کہا: میں نماز میں مشغول تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے بندے! تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ﴾[1] (جب اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بلاوا آجائے تو جس حال میں بھی ہو، فوراً حاضری دو۔) تو تمہارا فرض تھا کہ نماز ہی توڑ دیتے، پہلے میرے پاس آتے۔"

تو اس صحابی رضی اللہ عنہ کو اس مسئلہ کا علم نہیں تھا کہ اگر اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بلائیں تو نماز بھی توڑ دینی چاہیے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۹، ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِ الْفَاتِحَةِ]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نماز باجماعت کی پابندی:

یہ نماز بھی فرض نہیں پڑھ رہے تھے، اس لیے کہ فرض نماز تو صحابہ کرام جماعت کے ساتھ ہی پڑھتے تھے، علیحدہ پڑھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ صحابہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مسلمان کبھی بغیر جماعت کے بھی نماز پڑھتا ہے۔ وہ تو فرماتے ہیں: ہمارے ہاں یہ رواج تھا کہ جب ہم دیکھتے کہ ایک آدمی آج جماعت میں نہیں آیا تو ہم سمجھتے تھے کہ بیمار ہے یا منافق ہے، کیونکہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ مسلمان آدمی ہو، اذان سنتا ہو، مساجد بھی ہوں اور نماز جا کر جماعت کے ساتھ ادا نہ کرے۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم سے تو اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ یعنی نماز کا ایسا اہتمام ہوتا تھا۔ اگر کبھی صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیر ہو جاتی اور کوئی جماعت کا آدمی نہ ملتا تو گھر میں تشریف لے جاتے اور اپنے بیوی بچوں کو پیچھے کھڑا کر کے خود امام بن جاتے تھے، تاکہ جماعت کی فضیلت مل جائے، جماعت کی فضیلت سے ہم محروم نہ ہو جائیں۔

تو صحابی رضی اللہ عنہ چونکہ نماز میں تھے اور حکم یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے بلائیں فوراً حاضر ہو جائیں، کیونکہ اللہ کے

---

[1] [الانفال:۲۴]

پیغمبر ﷺ جب بھی بلائیں گے تو کسی دین کے کام ہی کے لیے بلائیں گے۔ تو اس نماز پڑھنے کا اور نماز سکھلانے کا فریضہ کس نے ادا کیا؟ حضور ﷺ نے۔ تو صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں نماز کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکا، مجھے علم نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اچھا! کوئی بات نہیں۔ ہدایت بھی فرمادی۔

اس صحابی کو ایک خاص سورت کی تعلیم:

((ثُمَّ قَالَ لِي لَأُعَلِّمَنَّكَ سُورَةً هِيَ أَعْظَمُ السُّوَرِ فِي الْقُرْآنِ قَبْلَ أَنْ تَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ ثُمَّ أَخَذَ بِيَدِي فَلَمَّا أَرَادَ أَنْ يَخْرُجَ قُلْتُ لَهُ أَلَمْ تَقُلْ لَأُعَلِّمَنَّكَ سُورَةً هِيَ أَعْظَمُ سُورَةٍ فِي الْقُرْآنِ قَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ الَّذِي أُوتِيتُهُ، وَهٰكَذَا رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ))

[مسند احمد، حدیث: ۱۵۷۳۰، صحیح البخاری، حدیث: ۴۴۷۴]

پھر مجھ سے فرمایا: میں تمہیں ایک ایسی سورت سکھلاؤں گا جو قرآن میں سب سے بڑی شان والی سورت ہے۔ پھر حضور ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ یعنی آپ ﷺ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ سے تھام لیا...... یہ تقرب کا، محبت کا کنایہ ہوتا تھا۔ آپ دیکھتے ہیں نا! جیسے آدمی اپنے محبوب کے ساتھ چلے تو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ تو میرے آقا محمد رسول اللہ ﷺ کا یہ کمال تھا کہ آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ایسے پیش آتے تھے جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کی اولاد ہیں۔ حضور ﷺ آکر بیٹھتے تو صحابہ میں گھل مل جاتے، اکٹھے کھانا کھاتے، اکٹھے پانی پیتے۔ آپ ﷺ بیٹھے ہوتے تو کبھی اپنی ٹانگ مبارک، ران مبارک صحابی رضی اللہ عنہ کے اوپر رکھ دیتے اور کبھی صحابی کی ران پر سر مبارک رکھ کر سو جاتے۔ اتنے بے تکلف تھے۔ اصل میں تو یہ آپ ﷺ کی رحمت تھی، آپ ﷺ کی شفقت تھی اور امت کو آپ ﷺ کا سبق تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ ایسے حسن خلق کے ساتھ پیش آؤ، اخلاق جمیلہ کے ساتھ پیش آؤ..... تو صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا: مسجد سے نکلنے سے پہلے پہلے تمہیں ایک ایسی سورت بتلاؤں گا کہ جس کی شان بہت بڑی ہے۔ پھر حضور ﷺ چلتے آئے، چلتے آئے جب مسجد سے نکلنے کے قریب آگئے تو میں نے عرض کیا: حضور! آپ نے فرمایا تھا کہ آپ کو ایک سورت سکھلاؤں گا۔ ابھی تک تو آپ نے مجھے سورت مبارکہ نہیں سکھلائی۔

اس حدیث سے مستنبط مسائل:

اس ایک حدیث سے ائمہ نے کتنے کتنے مسئلے نکالے کہ آدمی نماز میں ہو اور رسول اللہ ﷺ بلائیں تو آدمی کیا

کرے؟ اسی طرح یہ مسئلہ بھی نکالا کہ آدمی اپنا ہاتھ چھوٹے بندے کے ہاتھ میں دے سکتا ہے، کیونکہ حضور ﷺ کی شان کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ اور اسی طرح محدثین نے یہ مسئلہ بھی نکالا کہ حضور ﷺ نے پڑھانے کا، ایک علم سکھانے کا وعدہ فرمایا، لیکن دیر کر دی، جلدی نہیں سکھلایا، تاکہ سیکھنے والے کو شوق رہے اور انتظار رہے اور وہ ذہنی طور پر تیار ہو جائے پھر حضور ﷺ اس کو تعلیم ارشاد فرمائیں۔ تو محدثین کا یہ کام ہے، ائمہ کرام کا یہ کام ہے کہ جب وہ احادیث مبارکہ کو پڑھتے ہیں تو ان سے مسائل نکالتے ہیں۔

امام اعمش رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا واقعہ:

کتابوں میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اپنے استاذ امام اعمش رحمہ اللہ کی خدمت میں تھے اور حدیث مبارک کا درس ہو رہا تھا۔ جب درس ختم ہو گیا تو استاذ نے آپ سے ایک مسئلہ پوچھا تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے جواب دے دیا اور امام اعمش رحمہ اللہ مطمئن ہو گئے اور بہت خوش ہوئے کہ میرے شاگرد نے بہت اچھا جواب دیا۔ لیکن آپ نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے پوچھا کہ آپ نے یہ مسئلہ ہمیں کس دلیل سے بتایا ہے؟ امام صاحب رحمہ اللہ نے جواب دیا: حضرت! آپ نے جو ہمیں پڑھایا ہے اسی سے نکالا ہے۔ آپ نے فلاں دن ہمیں جو فلاں حدیث رسول ﷺ پڑھائی تھی، یہ مسئلہ اس حدیث سے نکلتا ہے۔ تو حضرت بڑے خوش ہوئے اور فرمایا کہ بھئی! اصل بات یہ ہے کہ ہماری (محدثین کی) مثال ایسے ہے جیسے دواخانہ ہوتا ہے۔ دواخانے میں یہ ہوتا ہے کہ دوائیں جمع کر لیں اور نام لکھ کر ان کو ترتیب سے رکھ دیا اور تم لوگ حکیم ہو کہ دوا نکالتے ہو کہ یہ دوا کس کام لگے گی؟ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم احادیث کو جمع کر کے، محفوظ کر کے رکھ لیں، اب آگے احادیث کا استعمال کرنا فقہاء کا کام ہے۔ اس لیے امام اعمش رحمہ اللہ نے فرمایا:

"يَا مَعْشَرَ الْفُقَهَاءِ! أَنْتُمُ الْأَطِبَّاءُ وَنَحْنُ الصَّيَادِلَةُ" [جامع بیان العلم وفضلہ: ۲/۲۵۷]

"اے فقہا کی جماعت! تم طبیب ہو اور ہم تو پنساری ہیں۔"

اصل عالم تو تم ہو۔ جیسے طبیب کا کام ہوتا ہے کہ وہ مرض کی تشخیص کرے کہ مرض سردی سے ہے یا گرمی سے ہے؟ یہ بیماری بلڈ پریشر ہائی ہونے کی وجہ سے ہے یا لو ہونے کی وجہ سے ہے؟ یہ بیماری جراثیم کی وجہ سے ہے، یہ بیماری متعدی ہے، فلاں دوا کام کرے گی اور فلاں دوا کام نہیں کرے گی۔ یہ کام فقہاء کرام کا ہے کہ کونسی حدیث سے کونسا مسئلہ نکلتا ہے۔

اس لیے فرماتے ہیں: محدثین نے یہ مسئلہ نکالا کہ حضور پاک ﷺ نے سائل کو انتظار کروایا، تاکہ علم سیکھنے کے لیے اس کا شوق ذوق زیادہ سے زیادہ ہو جائے۔ شوق ہوگا تو بات سیکھے گا۔ اگر طالب علم کو شوق نہ ہو، وہ بس یہی سمجھے کہ استاذ کا ڈر ہے، کیا کروں؟ استاذ نے کہا ہے: پڑھنے آؤ! آجاؤں گا، لیکن جب اپنا دلی اشتیاق ہوگا تب فائدہ ہوگا۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں میں تمہیں بتاتا ہوں۔ اسی طرح ایک اور مسئلہ بھی نکالا کہ اگر کوئی آدمی مسئلہ پوچھے اور استاذ فرمادے کہ میں مسئلہ بتاؤں گا۔ پھر مسئلہ بتانے میں دیر کردے تو یہ بھی اس کو حق ہے، اس طرح بھی وہ کرسکتا ہے۔ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا تھا اور پھر بتلانے میں دیر کردی۔

وہ عظیم سورت یہ ہے:

جب حضور ﷺ باہر نکلنے لگے تو صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے یاد دلایا تو حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں! ٹھیک ہے، تم نے یاد دلا دیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْآنُ الْعَظِيْمُ الَّذِيْ أُوْتِيْتُهٗ))

"یہ سورت فاتحہ ہے، یہ سبعا من المثانی بھی ہے اور قرآن عظیم بھی ہے۔"

[مسند احمد بن حنبل، الحدیث:۱۷۸۵۱]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کی طرف سے ایک علمی تنبیہ:

"وَقَدْ وَقَعَ فِي الْمُوَطَّأِ لِلْإِمَامِ مَالِكِ بْنِ أَنَسٍ رَحِمَهُ اللّٰهُ مَا يَنْبَغِي التَّنْبِيْهُ عَلَيْهِ فَإِنَّهُ رَوَاهُ مَالِكٌ عَنِ الْعَلَاءِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ يَعْقُوْبَ الْحُرَقِيِّ أَنَّ أَبَا سَعِيْدٍ مَوْلٰى عَامِرِ بْنِ كُرَيْزٍ ...... فَأَبُوْ سَعِيْدٍ هٰذَا لَيْسَ بِأَبِيْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُعَلّٰى كَمَا اعْتَقَدَهُ ابْنُ الْأَثِيْرِ فِيْ جَامِعِ الْأُصُوْلِ وَمَنْ تَبِعَهُ فَإِنَّ ابْنَ الْمُعَلّٰى صَحَابِيٌّ أَنْصَارِيٌّ وَهٰذَا تَابِعِيٌّ مِنْ مَوَالِيْ خُزَاعَةَ......."

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ موطا امام مالک میں ابو سعید مولیٰ عامر بن کریز کی روایت ہے (اس سند کے اندر جو ابا سعید مولیٰ عامر بن کریز ہیں، یہ صحابی نہیں ہیں، بلکہ تابعی ہیں۔ یہ خبر دے رہے ہیں) کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نماز پڑھ رہا تھا اور حضور ﷺ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں رکھا اور حضور ﷺ کا ارادہ تھا کہ مسجد سے باہر تشریف لے جائیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم مسجد سے باہر نہ نکلو اور ایک ایسی سورت سیکھ لو کہ اللہ نے انجیل میں بھی نہیں اتاری، تورات میں بھی نہیں اتاری، زبور میں بھی نہیں اتاری اور اس جیسے سورت

قرآن میں بھی دوسری نہیں ہے۔ اس کے بعد ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دیا۔ میں نے کہا: آہستہ چلوں، کہیں ایسا نہ ہو مسجد سے نکل جاؤں اور وہ سورت سیکھنی رہ جائے۔ اس لیے میں اپنے آپ ذرا آہستہ کر لیا، تا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم مجھے وہ سورت سکھلا دیں۔ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے پوچھا: وہ کونسی سورت ہے جس کا آپ نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا؟ فرمایا: نماز شروع کرتے ہوئے کیسے قراءت کرتے ہو؟ میں نے پڑھنا شروع کیا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ①﴾ پھر میں جب سورت کے آخر تک پہنچا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابی! یہی وہ سورت ہے جس کا نام سبع المثانی بھی ہے اور قرآن عظیم کی یہی وہ سورت ہے جو سب سے اعظم شان والی سورت ہے، جو اللہ نے مجھے عطا فرمائی ہے۔

اب مفسر فرماتے ہیں:

"فَأَبُو سَعِيْدٍ هٰذَا لَيْسَ بِأَبِي سَعِيْدِ بْنِ الْمُعَلّٰى كَمَا اعْتَقَدَهُ ابْنُ الْأَثِيْرِ فِي جَامِعِ الْأُصُوْلِ وَمَنْ تَبِعَهُ."

"جیسے ابن الاثیر رحمہ اللہ اور اس کے ماننے والے اس دھوکے میں لگ گئے کہ انہوں نے ابو سعید کو ابی سعید المعلی بنا دیا، حالانکہ ان کو غلط فہمی لگی ہے، دھوکہ لگا ہے۔"

فرمایا:

"فَإِنَّ ابْنَ الْمُعَلّٰى صَحَابِيٌّ أَنْصَارِيٌّ وَهٰذَا تَابِعِيٌّ مِنْ مَوَالِي خُزَاعَةَ"

"یاد رکھنا! ابو سعید بن المعلی رضی اللہ عنہ صحابی ہیں، انصاری ہیں اور ابھی جن کا ذکر ہو رہا ہے یہ تابعی ہیں، صحابی نہیں ہیں۔" انہوں نے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بھی نہیں کی، بلکہ یہ غلام ہیں۔ بعض آدمیوں کو ابو سعید کے نام سے مغالطہ لگ جاتا ہے۔ اس لیے مفسر رحمہ اللہ نے کہا کہ ضروری تھا کہ میں تنبیہ کر دوں اور وہ سند بھی ساتھ ذکر کر دوں، تا کہ لوگ مغالطے میں نہ رہیں۔ آگے فرمایا:

"وَذَاكَ الْحَدِيْثُ مُتَّصِلٌ صَحِيْحٌ وَهٰذَا ظَاهِرُهُ مُنْقَطِعٌ إِنْ لَمْ يَكُنْ سَمِعَهُ أَبُوْ سَعِيْدٍ هٰذَا مِنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ."

ابی سعید المعلی رضی اللہ عنہ کی حدیث متصل ہے، کیونکہ صحابی رضی اللہ عنہ نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اور ابو سعید نے اگر خود حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے نہیں سنا تو یہ حدیث منقطع ہے۔

"فَإِنْ كَانَ قَدْ سَمِعَهُ مِنْهُ فَهُوَ عَلٰى شَرْطِ مُسْلِمٍ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ."

اب مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو سعید نے اگر خود حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے سنا ہے پھر تو امام مسلم کی شرط کے

مطابق اس حدیث مبارک کو ہم لے لیں گے۔ اگر انہوں نے ابی ابن کعب سے نہیں سنا پھر تو منقطع ہے، اس کے اندر انقطاع ہے۔

اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ بعض اوقات نام سے بڑا دھوکہ لگتا ہے۔ نام چونکہ ملتا جلتا ہے، ابی سعید بن المعلی اور ان کی کنیت بھی ابی سعید تھی۔ تو ابن الاثیر رحمۃ اللہ علیہ جیسے آدمی کو دھوکہ لگ گیا اس نے کہا ایک ہیں، حالانکہ ابی سعید بن المعلی صحابی ہیں اور یہ تابعی ہیں۔ کہاں تابعی اور کہاں صحابی۔ کیوں تابعی کا درجہ کتنا اوپر ہی کیوں نہ ہو جائے، لیکن صحابی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم کتنے بلند مرتبے تک پہنچ جائیں نبی علیہ السلام کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور جیسے تمام انبیاء علیہم السلام کروڑوں شان والے میرے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے اللہ نے ان کو اپنی اپنی شان عطا فرمائی ہے۔ جیسے میں نے عرض کیا تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۰۹، ذکر ما ورد فی فضل الفاتحۃ]

محمد بن جریر دو ہیں اور ان دونوں میں فرق:

ابو جعفر محمد بن جریر الطبری اس سے بھی لوگوں کو بڑے مغالطے لگے ہیں، کیونکہ بدقسمتی یہ ہے کہ وہ آدمی دو ہیں اور خدا کی قدرت کہ دونوں کا نام محمد ہے، دونوں کے باپ کا نام جریر ہے، دونوں کی کنیت بھی ابو جعفر ہے اور دونوں طبرستان کے ہیں، طبری کہلاتے ہیں۔ یہ مشکل اس لیے ہوگئی کہ جب ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کا نام آتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو شیعہ تھا، حالانکہ یہ مفسر قرآن ہیں، جن کا نام محمد بن جریر بن یزید الطبری رحمۃ اللہ علیہ ہے اور یہ شیعہ نہیں ہیں، بلکہ پکے سنی ہیں۔ جبکہ محمد بن جریر بن رستم الطبری رافضی شیعہ ہے۔

یہ جو فرقہ، ملنگوں کا ٹولہ ہے، یہ اس معاملہ میں بڑا تیز ہے۔ انہوں نے جو کام کرنا ہو تو پچاس پچاس سال چھپے رہیں گے، بالکل پکے سنی بن جائیں گے، بڑے بڑے عالم بن جائیں گے، بڑی بڑی جماعتوں کے امیر بن جائیں گے، پھر چالیس پچاس سال بعد اندر سے اپنا بغض نکالیں گے اور لوگوں کے دماغ میں یہی ہوگا کہ یہ تو ہمارا عالم ہے۔ کہیں گے کہ چالیس سال سے ہم نے دیکھا کہ ہماری مسجد کا امام ہے۔ یہ تو اپنا مسئلہ سچا کرنے کے لیے چالیس پچاس سال چھپے رہتے ہیں۔ اور دوسرا یہ کرتے ہیں جس راوی کی روایات چل رہی ہوں اس نام کے فرضی نام پیدا کر دیتے ہیں یعنی اس نام سے اور آدمی پیدا کر دیا اور اس سے روایتیں نقل کر دیں۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے حدیث گھڑنے والا واعظ:

اما احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے کسی ایک مسجد میں نماز پڑھی، نماز کے بعد ایک واعظ کھڑا ہو گیا اور

کہنے لگا کہ امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے مجھے یہ حدیث بیان کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں عبدالرزاق نے حدیث بیان کی، انہوں نے حضرت معمر رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يُخْلَقُ مِنْ كُلِّ كَلِمَةٍ مِنْهَا طَائِرٌ مِنْقَارُهُ مِنْ ذَهَبٍ وَرِيْشُهُ مَرْجَانٌ'' (جس نے ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کہا تو اس کے ہر کلمہ کے بدلے میں ایک پرندہ پیدا کیا جاتا ہے جس کی چونچ سونے کی اور پر مرجان کے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اس میں ورقے کا قصہ گھڑ کر سنا ڈالا، پس دونوں امام ایک دوسرے کو تعجب سے دیکھنے لگے، اور ایک نے دوسرے سے معلوم کیا کہ تم نے یہ روایت بیان کی ہے؟ لیکن ہر ایک نے کہا کہ یہ روایت تو میں نے آج سے پہلے کبھی نہیں سنی۔ جب وہ اپنے وعظ سے فارغ ہوا تو لوگوں سے ہدایا حاصل کیے اور مزید حاصل کرنے کی امید میں بیٹھا تھا، حضرت یحییٰ بن معین نے اس کو ہاتھ سے اشارہ کر کے بلایا، وہ یہ خیال کر کے آ گیا کہ کوئی ہدیہ ملے گا۔ جب آیا تو حضرت ابن معین نے اس سے پوچھا کہ یہ روایت تجھے کس نے بیان کی؟ اس نے جواب دیا کہ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے۔ تو ابن معین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں یحییٰ بن معین ہوں اور یہ احمد بن حنبل ہیں، یہ حدیث تو ہم نے کبھی نہیں سنی۔ پس اگر تجھے جھوٹ بولنا تھا تو کسی اور پر بولتا، اس واعظ نے کہا کہ تم یحییٰ بن معین ہو؟ آپ نے جواب دیا: جی ہاں! اس واعظ نے کہا کہ میں سنا کرتا تھا کہ یحییٰ بن معین بے وقوف ہے، آج مجھے اس کا یقین ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ کیسے معلوم ہوا کہ میں احمق ہوں؟ اس واعظ نے کہا: کیونکہ تمہاری بات سے لگتا ہے گویا تمہارے علاوہ دنیا میں کوئی یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل ہے ہی نہیں، میں نے سترہ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین سے حدیثیں لکھی ہیں، اس پر امام احمد نے اپنی آستین سے اپنا چہرہ چھپا دیا اور کہا کہ اسے جانے دو۔ وہ واعظ وہاں سے ان دونوں کو نظرِ حقارت سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔) [جامع الاصول فی احادیث الرسول للجزری، جز: ۱]

میری طرف غلط مسائل کی نسبت:

اب حج کے دنوں میں ایسا بھی ہوتا ہے...... اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے...... ہر سال ایسا ہوتا ہے کوئی ایک دفعہ کی بات نہیں ہے، کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے لوگ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ مولوی مکی نے یوں کہا ہے۔ اچھا ایک دفعہ ایک صاحب نے کسی مسئلہ کے بارے میں کہا یہ مسئلہ یوں ہے اور ہم نے خود مولوی مکی صاحب سے سنا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ مولوی مکی کو جانتے بھی ہیں؟ کہا: ہاں جی! بالکل اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں نے کہا: اچھا میں کون ہوں؟

کہا: پتا نہیں۔ او خدا کے بندے! تم اچھی طرح جانتے بھی ہو اور میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں، تمہیں پتا بھی نہیں۔ کہتے بھی ہو: مسئلہ میں نے بتایا ہے۔ مسئلہ بھی غلط بیان کر رہے ہو اور میری گردن پر ڈال رہے ہو؟ خدا کا خوف کرو۔ آدمی کو مسئلہ بیان کرنے میں بڑی احتیاط کرنی چاہیے۔ اچھا! کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دور کھڑا ہے اور بات بھی نہیں، آدھی آواز کان میں پہنچی اور آدھی نہیں پہنچی۔ کبھی یہ ہوتا ہے اس غریب نے آدھا مسئلہ سنا، آدھا نہیں سنا تھک گیا، پیشاب کی ضرورت پیش آگئی، وضو کے لیے دوڑ گیا، رش زیادہ پڑ گیا غریب کو دھکا لگا وہ آگے چلا گیا۔ بات سنی نہیں، لیکن کہہ دیا: مولوی جی نے کہا ہے۔ خواہ مخواہ کے لیے میرے گلے میں رسی ڈال دی۔ ایسا نہ کیا کریں، ہمیشہ بڑی احتیاط کیا کریں۔ اب دیکھیں! بڑے بڑے محدثین کو ٹھوکر لگ گئی۔ جبکہ ابو سعید اور ہیں اور ابو سعید المعلی اور آدمی ہیں۔ یہ صحابی ہیں اور وہ تابعی ہیں۔ کتنا بڑا فرق ہے؟ اس کی روایت منقطع ہے، جبکہ ان کی روایت بسند صحیح متصل ہے۔ لیکن غلط فہمی ہو گئی۔

حدیث ابی رضی اللہ عنہ:

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ، وَهُوَ يُصَلِّي فَقَالَ: يَا أُبَيُّ!...))

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابی! انہوں نے دیکھا تو سہی، لیکن جواب نہ دیا۔ پھر حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے یہ کیا کہ نماز میں ذرا تخفیف کر دی، پھر آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: میں نے جب تمہیں بلایا تھا تو تم نے مجھے جواب کیوں نہیں دیا؟ یا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی کہ جب اللہ کا نبی بلائے تو فوراً جاؤ، جس حالت میں بھی تم ہو۔ انہوں نے کہا: حضور! میں آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم محبوب رکھتے ہو کہ تمہیں ایسی سورت بتلاؤں جو تورات، انجیل اور زبور میں بھی نازل نہیں ہوئی۔ مجھے امید ہے کہ میں اس مسجد سے نہیں نکلوں گا، مگر تمہیں وہ پڑھا دوں گا۔ اب صحابی کہتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دروازے سے نکل جائیں اور مجھے نہ پڑھا سکیں، کیونکہ وعدہ تھا کہ دروازے سے نکلنے سے پہلے تمہیں سکھلا دوں گا۔ وہاں تک اگر بات ہی ختم نہ ہو اور باہر چلے جائیں اور میں علم سے محروم رہ جاؤں تو اسی لیے میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ جب دروازے کے قریب پہنچے تو میں نے کہا: حضور! وہ کونسی سورت مبارکہ ہے جس کا آپ نے وعدہ فرمایا

تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نماز میں کونسی سورت شروع کرتے ہو؟ میں نے کہا: فاتحہ۔ فرمایا: مجھے اس ذات پاک (اللہ) کی قسم ہے جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس جیسے سورت پہلے کسی کتاب میں بھی نہیں اتری۔

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۸۷۵، باب، ما جاء في فضل فاتحة...]

"وَرَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ عَنْ قُتَيْبَةَ عَنِ الدَّرَاوَرْدِيِّ عَنِ الْعَلَاءِ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فَذَكَرَهُ وَعِنْدَهُ: إِنَّهَا مِنَ السَّبْعِ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنِ الْعَظِيمِ الَّذِي أُعْطِيتُهُ ثُمَّ قَالَ: هٰذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ."

اللہ نے فرمایا: "وَهِيَ مَقْسُومَةٌ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي. "یہ سورت میرے اور میرے بندے کے درمیان آدھی آدھی تقسیم ہے۔ "هٰذَا لَفْظُ النَّسَائِيِّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ حَدِيثٌ حَسَنٌ غَرِيبٌ" اصل میں "وَهِيَ مَقْسُومَةٌ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي" کی وجہ سے غرابت آگئی ہے، ورنہ یہ حدیث علیحدہ صحیح ہے اور وہ حدیث علیحدہ صحیح ہے۔ یعنی ایک حدیث میں اس ٹکڑے کے زیادہ ہونے کی وجہ سے اس میں غرابت پائی گئی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۰، ذکر ما ورد في فضل الفاتحة]

حدیث عبد اللہ بن جابر رضی اللہ عنہ:

((عَنِ ابْنِ جَابِرٍ قَالَ: انْتَهَيْتُ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَقَدْ أَهْرَاقَ الْمَاءَ، فَقُلْتُ: السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيَّ، فَقُلْتُ: السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيَّ ...... ثُمَّ قَالَ: أَلَا أُخْبِرُكَ يَا عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ جَابِرٍ! بِخَيْرِ سُورَةٍ فِي الْقُرْآنِ؟ قُلْتُ: بَلَى يَا رَسُولَ اللّٰهِ! قَالَ: اقْرَأْ: ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ حَتَّى تَخْتِمَهَا.)) [مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۱۷۵۹۷]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں گیا اور حضور پاک ﷺ ابھی پانی ڈال کر تشریف لا رہے تھے، یعنی آپ پیشاب کرنے کے بعد تشریف لا رہے تھے (حالانکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ یوں بھی کہہ سکتے تھے: "بَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ" (حضور ﷺ نے پیشاب کیا) لیکن انہوں نے ایسا نہیں کہا۔ یہ ادب کا تقاضا ہے۔ لہٰذا حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے یوں بات کی کہ آپ ﷺ نے پانی انڈیلا اور تشریف لائے) تو میں نے کہا: "السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ!" آپ ﷺ نے جواب نہ دیا۔ میں نے پھر سلام کیا "السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ!" آپ نے جواب نہیں دیا۔ میں نے پھر کہا: "السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ!" آپ نے پھر بھی جواب نہیں دیا۔ کہتے ہیں:

میں آپ کے ساتھ چلتا آیا، حضور ﷺ میرے آگے آگے چل رہے تھے اور میں پیچھے پیچھے چل رہا تھا، حتیٰ کہ اپنی منزل، اپنے گھر مبارک میں تشریف لے گئے اور میں مسجد میں داخل ہوا اور مسجد میں بڑا غمگین اور اداس ہو کر بیٹھ گیا کہ حضور ﷺ نے مجھے سلام کا جواب نہیں دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ ناراض ہیں کہ میں نے تین دفعہ سلام کیا اور تینوں دفعہ میرے سرکار ﷺ نے جواب عطا نہیں فرمایا۔ اس لیے میں بڑا غمگین ہو کر بیٹھ گیا۔

کہتے ہیں کہ میں ابھی بیٹھا تھا کہ آقا ﷺ وضو فرما کر تشریف لے آئے اور فرمایا: ''عَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللهِ، وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللهِ، وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللهِ''۔ میں نے تین دفعہ سلام کیا تھا، اس لیے حضور ﷺ نے بھی تین دفعہ جواب دیا۔ اور میں نے تو صرف ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ!'' کہا تھا، لیکن حضور ﷺ نے ''وَرَحْمَةُ اللهِ'' کا بھی اضافہ فرما دیا۔ یہ ہے حسنِ کرم، یہ ہے تعلیم نبوت اور یہ ہے اللہ کے پاک پیغمبر ﷺ کی شان کہ آپ ﷺ کو اپنے غلاموں کا بھی اتنا خیال ہے کہ ان کا دل میں ملال ہوگا کہ میں نے جواب نہیں دیا، اس لیے تین دفعہ جواب ارشاد فرمایا۔ پھر صرف جواب نہیں، بلکہ تعلیم دی اور فرمایا:

((أَلَا! أُخْبِرُكَ يَا عَبْدَ اللهِ بْنَ جَابِرٍ! بِخَيْرِ سُوْرَةٍ فِي الْقُرْآنِ؟ قُلْتُ: بَلَى يَا رَسُوْلَ اللهِ! قَالَ: اقْرَأْ ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ حَتَّى تَخْتِمَهَا))

''کیا میں تمہیں سب سے افضل سورت نہ پڑھاؤں؟ میں نے کہا: حضور! بالکل پڑھائیں۔ فرمایا: سورت فاتحہ آخر تک پڑھو۔''

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جناب! یہ سند بڑی اچھی سند ہے۔ اور اس کے اندر جو ابن عقیل راوی ہے اس کو بڑے بڑے محدثین نے لیا ہے۔ ''وَعَبْدُ اللهِ بْنُ جَابِرٍ هٰذَا الصَّحَابِيُّ ذَكَرَ ابْنُ الْجَوْزِيِّ أَنَّهُ هُوَ الْعَبْدِيُّ وَاللهُ أَعْلَمُ'' اور عبداللہ بن جابر رضی اللہ عنہ صحابی ہیں، ان کے بارے میں ابن جوزی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ وہ عبدی قبیلے میں سے تھے۔ ''وَيُقَالُ إِنَّهُ عَبْدُ اللهِ بْنُ جَابِرٍ الْأَنْصَارِيُّ الْبَيَاضِيُّ'' اور بعض نے کہا کہ وہ بیاضی قبیلے میں سے تھے۔ [تفسیر ابن کثیر: 1/ 10، ذکر ما ورد فی فضل الفاتحة]

کیا قرآن کا بعض حصہ بعض سے افضل ہے؟

اب مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن کی ایک آیت یا سورت کسی دوسرے حصے سے افضل ہے یا نہیں؟ یہ بڑا اختلافی مسئلہ ہے کہ اگر سورت فاتحہ افضل ہے، آیۃ الکرسی افضل ہے تو باقی مفضول ہو گئیں، حالانکہ یہ تو سارا اللہ کا

کلام۔ بعض نے کہا کہ اللہ جسے چاہے شان عطا فرمادے۔ جیسے ہیں تو سارے اللہ کے بندے، لیکن میرے مدنی ﷺ جیسا بندہ کہاں پیدا ہوگا؟ ہیں تو سارے اللہ کے بندے، اللہ کے نبی بھی اللہ کے بندے ہوتے ہیں، لیکن اللہ نے جس کو اپنا خاص بندہ بنالیا اور پھر سید البشر، سید الاوّلین والآخرین، افضل البشر، خیر البشر اور امام الانبیاء والمرسلین کا مرتبہ عطا فرمایا، اس کا مقابلہ کون کرے؟ اس لیے قرآن بھی سارا اللہ کا کلام ہے، لیکن اللہ جس کے بارے میں چاہیں دوسرے سے افضل بنادیں۔ جیسے اللہ کے سارے رسول ﷺ شان والے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ﴾ [البقرۃ:۲۵۳]

''ہم نے اپنے رسولوں کو بھی ایک دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔''

جو شان حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہے وہ حضرت ہارون علیہ السلام کی نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اللہ کے دیگر رسول ہیں۔ اور اسی طرح قرآن میں بھی ہے کہ یہ سورت دوسری سورت سے افضل ہے، یہ سورت اس سے اعلیٰ ہے۔

اور انہوں نے اسی سے استدلال کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: سب سے اعظم سورت، سب سے افضل سورت اور ایسی سورت جو پہلے کسی کتاب میں نازل نہیں ہوئی وہ سورت فاتحہ ہے۔ اور اسی لیے مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وَذَهَبَتْ طَائِفَةٌ أُخْرٰى إِلٰى أَنَّهُ لَا تَفَاضُلَ فِي ذَالِكَ؛ لِأَنَّ الْجَمِيعَ كَلَامُ اللهِ.''

''اور ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ سارے کا سارا اللہ کا کلام ہے۔ ایک دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔''

باعتبار ثواب کے اللہ جس کو چاہیں زیادہ شان عطا فرمادیں، کیونکہ علماء نے کہا: اگر ہم یہ کہیں کہ یہ افضل ہے تو دوسرے کے بارے میں...... نعوذ باللہ!...... خیال کیا جائے گا کہ شاید یہ افضل نہیں ہے۔ تو ایسا نہ ہو کہ اللہ کے کلام کے بارے میں...... نعوذ باللہ!...... بے ادبی ہو جائے۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۱۰، ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِ الْفَاتِحَةِ]

حالانکہ قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک کی شان بیان کرنے سے دوسرے کی شان میں کمی نہیں آتی۔ مثلاً: جب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی شان بیان کی جائے تو یہ معنیٰ نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان ہی نہیں ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان بیان کی جائے تو یہ معنیٰ نہیں ہوتا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شان ہی نہیں ہے، جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شان بیان کی جائے تو یہ معنیٰ نہیں ہوتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان ہی نہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان بیان کی جائے تو یہ معنیٰ نہیں ہوتا کہ باقی صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان ہی نہیں۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی فضیلت:

اللہ نے مختلف فضیلتیں رکھی ہیں۔ مثلاً: بعض چیزیں اللہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ میں رکھی ہیں، حضرت حسین رضی اللہ عنہ میں نہیں رکھیں، حالانکہ دونوں بھائی ہیں، ایک ہی ماں باپ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے پیدا ہوئے ہیں۔ یعنی صلب بھی ایک ہے، بطن بھی ایک ہے، لیکن اللہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو علیحدہ طبیعت عطا فرمائی، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو علیحدہ طبیعت عطا فرمائی۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر فرمایا:

((إِنَّ ابْنِي هٰذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللّٰهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيْمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ))

[صحیح البخاری، رقم: ۲۷۰۴، باب: قَوْلِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم لِلْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ...]

"میرا یہ بیٹا سردار ہے، ایک دن میرا یہ بیٹا اتنا بڑا سردار بنے گا کہ ایک وقت آئے گا کہ اللہ ان کی وجہ سے مسلمانوں کی دو لڑتی جماعتوں کو بچالے گا۔"

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی پوری بھی ہوگئی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان جو جنگیں تھیں، لڑائیاں تھیں اور اختلافات تھے، ان میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے صلح کرلی اور مسلمان خون خرابے سے بچ گئے، حالانکہ ان جنگوں میں ہزارہا صحابہ شہید ہو چکے تھے۔ اگر ان جنگوں کو جاری رکھا جاتا تو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور کتنا خون بہتا؟ لیکن حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کمال دانشمندی کا فیصلہ کیا کہ صلح فرمالی، جھگڑا ختم ہوگیا اور اسلام کی قوت بھی مجتمع ہوگئی۔ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں پھر بڑی بڑی فتوحات ہوئیں، کیونکہ آپس کی لڑائی کی وجہ سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ ادھر ہی مشغول رہے اور ایک ملک بھی فتح نہ ہوسکا۔ وہ تو آپس کے فسادات ختم کرنے کی کوشش کرتے رہے، دوسرے ملکوں میں فوج کیسے بھیجتے؟ آپس میں جب آدمی معروف ہوجائے تو دشمن سے مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اور دشمن کی سب سے بڑی سازش یہی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑادو۔ یہ آپس میں لڑتے رہیں اور ہم اطمینان سے بیٹھیں۔ ان کو بھی پتا ہے کہ جب مسلمانوں نے آپس میں لڑنا چھوڑ دیا اور یہ اکٹھے ہوگئے تو ہماری خیر نہیں ہے۔

یہودیوں کا ایک بہت بڑا لیڈر گزرا ہے۔ بدبخت فوت ہوگیا ہے۔ اس سے کسی نے پوچھا کہ بھئی! تم لوگوں کو یہ بھی خوف ہے کہ کبھی مسلمان تم پر غالب آجائیں گے؟ ابھی تو تمہارے پاس دولت بھی بہت ہے، طاقت بھی بہت ہے۔ اس نے کہا: ہاں جس دن مسلمانوں نے لائن لگا کر یعنی ترتیب سے کام شروع کیا، مثلاً دروازے میں ترتیب

سے داخل ہوتا ہے، ترتیب سے نکلتا ہے۔ یعنی جس دن ڈسپلن میں آگئے اس دن ہمیں مار ڈالیں گے۔ اس نے کہا: ابھی تو مسلمان منتشر ہیں، کعبے میں داخل ہوتے ہیں تو لڑ لڑ کر ایک دوسرے کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔

حطیم اور حجرِ اسود پر بے ہنگم رش:

میزاب رحمت کے نیچے پانی بہتے ہوئے دیکھا نہیں کہ کسی کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے، کوئی گرا ہوا ہے، عورتیں گری ہوئی ہیں۔ پانی اوپر سے گر رہا ہے، عورتوں کا بدن نظر آ رہا ہے، دھکے دے رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میزاب رحمت سے پانی حاصل کر رہے ہیں۔ رحمت حاصل کر رہے ہو خود تو زحمت بن رہے ہو، مسلمان کا کوئی پتا ہے؟ کعبہ شریف کا دروازہ کھول دو ابھی تماشا دیکھنا۔ یعنی نہ کعبے کا ادب، نہ اللہ کے گھر کا ادب احترام۔ بھئی! اللہ موقع دے تو ادب کے ساتھ داخل ہو جاؤ، نہ موقع ملے تو حطیم میں نماز پڑھ لو۔ حطیم بھی کعبے کے اندر کا حصہ ہے۔ اگر اندر جانے کا شوق ہے تو جو ثواب اندر ہے وہی ثواب باہر (حطیم میں) ہے۔ جب تمہارا دل کرے حطیم میں جا کر نماز پڑھ لو۔ گویا! تم نے کعبے کے اندر نماز پڑھ لی۔ اب یہ کون سا طریقہ ہے کہ شوق تو ہو کہ کعبے کے اندر جاؤں اور بے ادبی کر کے اندر جائے، اس جانے کا کیا فائدہ؟ یا شوق تو ہو کہ میں حجرِ اسود کو بوسہ دوں اور چار عورتوں کو دھکا مارے اور کسی کو ٹکر مارے، کسی کو ہاتھ لگائے اس کے بعد ثواب سے زیادہ تو گناہ ہو گیا۔ جب اللہ نے فرمایا اشارہ کر دو بوسے کے برابر ہے۔ جو ثواب بوسہ لینے کا ہے وہی اشارہ کرنے کا ہے۔ تو بلا وجہ بے ادبی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

مسلمانوں میں جب اتفاق و اتحاد ہو جائے گا تو وہ دن کفر کا آخری دن ہوگا۔ اس لیے انہوں نے ایسا کیا ہوا ہے کہ ہمیں ادب کے نام پر، محبت کے نام پر تقسیم کر دیا، لڑا دیا اور تفرقہ ڈال دیا کہ مسلمان کبھی "اِعْتِصَامُ بِحَبْلِ اللّٰهِ" نہ کر سکیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ [آل عمران: ۱۰۳]

"اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھامے رکھو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو۔"

سورۂ فاتحہ میں زہر کا دم:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"نَقَلَهُ الْقُرْطُبِيُّ عَنِ الْأَشْعَرِيِّ...... عَنْ أَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ، قَالَ: كُنَّا فِي مَسِيْرٍ لَنَا......ذَكَرْنَاهُ لِلنَّبِيِّ

صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: وَمَا كَانَ يُدْرِيهِ أَنَّهَا رُقْيَةٌ اقْسِمُوا وَاضْرِبُوا لِي بِسَهْمٍ" [صحیح البخاری، حدیث: ۵۰۰۷، باب: فضل فاتحۃ الکتاب]

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم سفر کے اندر تھے، ایک جگہ ہم ٹھہرے۔ ایک لڑکی آئی، اس نے کہا: ہمارے قبیلے کے سردار کو کسی زہریلی چیز نے کاٹ لیا ہے اور ہماری جماعت غائب ہے، یعنی مرد نہیں ہے۔ تمہارے اندر کوئی پڑھنے والا ہو، کوئی منتر جانتا ہو تو آئے اور پڑھے۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ کھڑے ہونے، صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: ہم نہیں جانتے تھے کہ یہ رقیہ پڑھتا ہے۔ اس نے جا کر پڑھا، وہ ٹھیک ہو گیا۔ انہوں نے ہمیں دودھ بھی پلایا اور تیس بکریاں بھی دیں۔ جب وہ واپس آ گیا تو ہم نے کہا: ماشاء اللہ! تم تو کچھ پڑھنا جانتے تھے، تمہیں تو کوئی کلام آتی تھی۔ اس نے کہا: مجھے تو کوئی کلام نہیں آتی تھی، میں نے تو بس سورت فاتحہ پڑھی ہے اور اللہ نے شفا عطا فرما دی ہے۔ اس نے کہا: آپ کچھ نہ کرو، بکریاں بھی رہنے دو، حضور ﷺ کی خدمت میں جا کر پوچھیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: دیکھو بھائی! اس نے فاتحہ پڑھی ہے، اس کو کیسے پتا چلا کہ یہ منتر ہے؟ اس نے فاتحہ پڑھی، اللہ کا قرآن پڑھا، اللہ نے شفا دے دی کوئی بات نہیں۔ اچھا وہ بکریاں تمہارے پاس ہیں تو ان کے اندر میرا بھی حصہ رکھو۔ تاکہ صحابہ کو تسلی ہو جائے کہ یہ حلال ہے۔ اور بعض روایات میں آتا ہے کہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ خود پڑھنے والے تھے۔

ڈسے ہوئے کے لیے عربی محاورہ:

اصل میں ہوتا یہ ہے کہ جس کو سانپ کاٹے، بچھو ڈس لے تو کہتے ہیں: "لَدِيغٌ، لَدَغَتْهُ الْحَيَّةُ" لیکن عربی یہ بھی کہتے ہیں: "سَلِيمٌ سَلِيمٌ" یعنی خیر ہے، خیر ہے۔ جیسے کسی بیمار کو کہتے ہیں: "سَلَامًا سَلَامًا" یعنی ٹھیک ہے، خیریت ہے، خیریت ہے۔ تاکہ ایسا کلمہ زبان سے نکالا جائے جو باعث خیر ہو۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ کسی کی عیادت کے لیے جاؤ تو بیمار سے کہو: امید ہے جی کہ آپ رات کو ضرور مر جائیں گے۔ یہ کوئی عیادت تو نہ ہوئی۔ بس جی آپ کی حالت خراب ہے، آخری وقت نظر آتا ہے، ویسے میں دعا تو کر رہا ہوں، لیکن آپ کی امید لگتی نہیں ہے۔ یہ کوئی عیادت نہیں ہوتی۔ عیادت کا معنی ہوتا ہے کہ کوئی اچھا کلمہ منہ سے نکالو کہ اللہ سلامتی عطا فرمائیں گے، خیریت ہے۔ اللہ نے جو تکلیف دی ہے یہ آپ کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گی۔ "لَا بَأْسَ طَهُورٌ إِنْ شَاءَ اللهُ" اللہ پاک تمہارے گناہوں کو اس بیماری کے ذریعے دھو ڈالیں گے۔ فکر کیوں کر رہے ہو؟ مسلمان کو تو ہر حال میں فائدہ ہے، تم تو ایسے ہو جیسے سونے کو کٹھالیوں میں ڈالا جاتا ہے، تاکہ صاف ہو جائے۔ اللہ پاک کبھی کبھی اپنے پیارے بندوں کو بھی

تکلیف دے دیتے ہیں، تا کہ دکھ آئے، یہ روئیں، تضرع کریں اور میں ان کے گناہوں کو دھو ڈالوں اور میں ان کو معاف کر کے اور زیادہ اونچا کر دوں۔ لہٰذا اس موقع پر اگرچہ "لَدِیغ" ہی کہنا چاہیے تھا، لیکن "سَلِیم سَلِیم" اس لیے کہتے ہیں، تا کہ اچھا تفاؤل کیا جائے اور زبان سے اچھا کلمہ نکالا جائے۔

زبان سے برے کلمات ادا نہ کرو:

خدا کی قدرت ہے! بعض اوقات آدمی کے منہ سے غلط جملہ نکل جاتا ہے اور وہی اس کی ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔ میں ایک دن اخبار میں پڑھ رہا تھا کہ ایک عورت اپنی بچی سے جب ناراض ہوتی تو کہتی کہ خدا کرے تو جل جائے، مر جائے، تو مجھے تنگ کرتی ہے۔ انجام یہ ہوا کہ وہ لڑکی جل گئی اور پھر وہی عورت رو رہی ہے، پیٹ رہی ہے کہ ہائے ہائے! میری بچی جل گئی ہے۔ تم نے خود تو اسے بددعا دے کر اسے جلا ڈالا، اب چیخ رہی ہو؟ اس لیے حکم ہوتا ہے کہ منہ سے گندا لفظ نہ نکالو، جب بھی بات کرو تو اچھی بات کرو۔ لوگ اپنے بچوں کو خود بددعا دیتے ہیں کہ خدا تجھ پر لعنت کرے، خدا تجھے ہلاک کر دے، خدا تجھے اندھا کرے اور خدا تجھے ذلیل کرے۔ اور جب وہ ذلیل ہوتے ہیں تو یہ خود ذلیل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کبھی بھی ایسی گندی زبان استعمال نہ کریں۔ جب بھی بات کریں تو زبان سے اچھا لفظ نکالیں۔ اللہ آپ کو اور مجھے صحیح راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سورۂ فاتحہ کا ایک خاص فرشتہ کے ذریعہ سے نزول:

اب مفسر رحمہ اللہ سورۂ فاتحہ کے بارے میں ارشاد فرما رہے ہیں۔ اور سورۂ فاتحہ کی فضیلت کے بارے میں حدیث مبارکہ ذکر فرما رہے ہیں۔ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ یہ سورت مبارکہ دو دفعہ نازل ہوئی ہے: ایک دفعہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور ایک دفعہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے، لیکن راجح قول مبارک یہ ہے کہ یہ سورت ایک ہی دفعہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام اس سورت کو لے کر اترے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ سورت فاتحہ حضرت جبرائیل علیہ السلام لے کر نہیں آئے، بلکہ فاتحہ کے لیے اللہ کا ایک خاص فرشتہ نازل ہوا جو میرے پاک نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سورت فاتحہ لے کر آیا۔ جیسا کہ اس حدیث میں بھی آتا ہے:

"رَوٰی مُسْلِمٌ فِیْ صَحِیْحِهٖ وَالنَّسَائِیُّ فِیْ سُنَنِهٖ مِنْ حَدِیْثِ أَبِی الْأَحْوَصِ عَنْ عَمَّارِ بْنِ رُزَیْقٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عِیْسٰی عَنْ سَعِیْدِ بْنِ جُبَیْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بَیْنَمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَعِنْدَهٗ

جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامِ إِذْ سَمِعَ نَقِيْضًا فَوْقَهُ فَرَفَعَ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامِ بَصَرَهُ إِلَى السَّمَاءِ فَقَالَ هٰذَا بَابٌ قَدْ فُتِحَ مِنَ السَّمَاءِ، مَا فُتِحَ قَطُّ. قَالَ: فَنَزَلَ مِنْهُ مَلَكٌ فَأَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: أَبْشِرْ بِنُوْرَيْنِ أُوْتِيْتَهُمَا لَمْ يُؤْتَهُمَا نَبِيٌّ قَبْلَكَ: فَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَخَوَاتِيْمِ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ، لَمْ تَقْرَأْ حَرْفًا مِنْهُمَا إِلَّا أُعْطِيْتَهُ. وَهٰذَا لَفْظُ النَّسَائِيِّ.''

حضور ﷺ تشریف فرما تھے اور جبرائیل علیہ السلام بھی آپ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ جبرائیل علیہ السلام نے ایک آواز سنی ''فَرَفَعَ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ بَصَرَهُ إِلَى السَّمَاءِ'' تو انہوں نے اپنی نظر آسمان کی طرف کی، اس کے بعد انہوں نے عرض کیا: آقا! ''هٰذَا بَابٌ قَدْ فُتِحَ مِنَ السَّمَاءِ مَا فُتِحَ قَطُّ'' (آج آسمان کے دروازوں میں سے ایک ایسا دروازہ کھلا ہے جو کبھی نہیں کھلا) اور اللہ کا ایک فرشتہ اتر رہا ہے جو پہلے کبھی نہیں اترا۔ ابھی یہ حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کر رہے تھے کہ ایک فرشتہ اترا اور اس نے آ کر کہا: مجھے اللہ نے ایسے دو نور دے کر بھیجا ہے اور ایسے دو نور آپ کے پاس لایا ہوں کہ آپ سے پہلے کسی نبی کو یہ دو نور نہیں ملے ہیں۔ وہ دو نور کیا ہیں؟ فرمایا: ''فَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَخَوَاتِيْمِ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ'' اس نے کہا: حضور! سورۂ فاتحہ بھی ہے اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات بھی ہیں جن پر سورت ختم ہوتی ہے۔ یہ بھی نور ہیں۔

﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَإِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۗ﴾ [البقرۃ:۲۸۴]

''جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے، اور جو باتیں تمہارے دلوں میں ہیں، خواہ تم ان کو ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تم سے ان کا حساب لے گا۔''

اس آیت سے لے کر سورت کے آخر تک۔

[صحیح مسلم، حدیث:۸۰۶، باب: فَضْلِ الْفَاتِحَةِ... سنن النسائی، حدیث:۹۱۲ فضل فَاتِحَةِ الْكِتَابِ]

اسی سے یہ بھی سمجھ لیں کہ ستاروں کا بھی ایک نور ہے، چاند کا بھی ایک نور ہے، لیکن جب سورج کا نور آتا ہے تو باقی سب نور ماند پڑ جاتے ہیں۔ جب سورج اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا ہے اس وقت آپ لاکھ قمقمے جلائیں ان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

سارا قرآن نور ہے:

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا پورا قرآن نور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا﴾ [النساء:۱۷۴]

''اور ہم نے آپ کی طرف کھلا نور اتارا ہے۔''

اور ایک جگہ اللہ نے فرمایا:

﴿وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ﴾ [الاعراف:۱۵۷]

اے میرے بندو! میں نے مدنی پاک ﷺ کے ساتھ جو نور یعنی قرآن اتارا اس کی پیروی کیا کرو۔

قرآن، نبی اور مسلمان کے متعلق نور کا استعمال:

نور سے مراد نورِ ہدایت ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ جہاں لفظ نور آجائے آدمی یہ سمجھنا شروع کردے کہ نور ہے۔ جیسے انبیاء ﷺ کے بارے میں لفظ نور آیا تو یہ معنی نہیں کہ وہ بشر نہیں ہیں یا وہ اولادِ آدم نہیں ہیں، مراد نورِ نبوت ہے۔ قرآن کے بارے میں جہاں لفظ نور آئے وہاں مراد نورِ ہدایت ہے اور مسلمان کے بارے میں جہاں لفظ نور آئے گا وہاں مراد نورِ ایمان ہے۔ سمجھا کریں! تا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں صحیح عقیدے کی سمجھ اور اس میں استقامت نصیب فرمائے۔

حضور ﷺ پر اترنے والے دو نور:

تو میرے مدنی محمد مصطفیٰ ﷺ کو یہ دو نور ملے: ایک سورۃ الفاتحہ اور دوسرا خواتیم سورۃ البقرۃ۔ اسی لیے بعض علماء کرام نے اس حدیث مبارک کو سامنے رکھ کر یہ فرمایا کہ فاتحہ خاص فرشتہ لے کر آیا، یعنی جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے یہ فاتحہ نہیں اتری۔

خاص فرشتے کے ذریعے فاتحہ کے اترنے کا مطلب:

لیکن یاد رکھو! جمہور کا راجح قول یہ ہے کہ قرآن پاک کو لے کر اترنے والے جبرائیل امین علیہ السلام ہیں۔ اللہ نے وضاحت فرما دی۔ قرآن میں فرمایا:

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۝﴾

[الشعراء:۱۹۳،۱۹۵]

''اس کو امانت دار فرشتے لے کر آیا ہے۔ (اے پیغمبر!) تمہارے قلب پر اترا ہے، تا کہ تم ان (پیغمبروں) میں شامل

ہو جاؤ جو لوگوں کو خبردار کرتے ہیں۔ ایسی عربی زبان میں اترا ہے جو پیغام کو واضح کر دینے والی ہے۔''

اللہ نے فرمایا: قرآن لے کر اترنے والا روح الامین ہے۔ روح حضرت جبرائیل علیہ السلام کا لقب ہے۔ اور امین کا معنی ہے امانت والا، اللہ کی وحی کی حفاظت کرنے والا، اللہ کی وحی کو صحیح معنوں میں پہنچانے والا۔ تو سارے کا سارا قرآن جو لے کر اترا ہے وہ حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ اب دوسرے فرشتے کے اترنے کا معنی یہ ہے کہ وہ فاتحہ کے بارے میں خصوصی فضیلت بیان کرنے کے بارے میں اترا، یعنی فاتحہ کا خصوصی ثواب بیان کرنے کے لیے اترا، فاتحہ کے خصوصی نور ہونے کی شان بیان کرنے کے لیے اترا اور یہ اترنے کا واقعہ بھی مدینہ منورہ کا ہے۔ اور سورت فاتحہ کا نزول تو مکے میں ہو چکا ہے، لہٰذا جبرائیل علیہ السلام اس کو لے کر اترے اور دوبارہ مدینہ منورہ میں اللہ نے خاص دروازہ کھول کر ایک خاص فرشتے کے ذریعے اپنے پاک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع فرمایا۔ اب دونوں حدیثیں بھی جمع ہو گئیں اور کسی روایت میں اختلاف نہ رہا۔

فاتحہ اور تلاوت قرآن کو نماز کا درجہ کیوں ملا؟

اسی لیے اللہ نے اس سورت کو بڑی عظمت دی ہے۔ جیسے حدیث مبارک میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ فَنِصْفُهَا لِيْ وَنِصْفُهَا لِعَبْدِيْ.)) [صحیح مسلم، حدیث: ۳۹۵ باب: وُجُوبِ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ...]

''نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان آدھی آدھی تقسیم ہے۔ آدھی میرے لیے ہے اور آدھی میرے بندے کے لیے ہے۔''

یہاں لفظ ''الصَّلَاةَ'' ہے اور مراد فاتحہ ہے۔ فاتحہ کو اللہ نے نماز بھی فرمایا ہے، حدیث میں اس کا نام نماز بھی آیا ہے۔ تو یہ بھی فاتحہ کی اتنی بڑی عظمت ہے کہ لفظ فاتحہ کو نماز کے لفظ سے یاد کیا گیا۔ جیسے نماز کو قرأت کے لفظ سے یاد کیا گیا۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝﴾ [الاسراء: ۱۱۰]

''میرا مدنی! نہ تو قرآن کی قرأت بہت زور سے کریں اور نہ بالکل آہستہ کریں کہ کوئی سن نہ سکے، بلکہ درمیانی اعتدال کا راستہ اختیار فرمائیں۔''

یہاں بھی لفظ "صَلَاۃ" ہے اور مراد قراٴت قرآن ہے۔ یعنی "وَلَا تَجْهَرْ بِقِرَاءَتِكَ" اپنے قرآن کے پڑھنے کو نہ زیادہ زور سے پڑھیے اور نہ آہستہ پڑھیے۔ لفظ "صَلَاۃ" ہے مراد قراٴت ہے۔ یہاں لفظ صلوۃ ہے اور مراد فاتحہ ہے۔ جیسے اللہ نے نماز کو بھی قرآن فرمایا: ﴿إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا﴾ [الاسراء:۷۸] (بے شک صبح کی نماز (فرشتوں کے) حاضر ہونے کا وقت ہے۔) ﴿قُرْآنَ الْفَجْرِ﴾ سے مراد نمازِ فجر، صبح کی نماز ہے کہ یہ ایسا وقت ہے جس میں اللہ کے ملائکہ حاضر ہوتے ہیں، لہٰذا یہ بھی اس سورت کی شان ہے کہ اس سورت کو لفظ "صَلَاۃ" کے ساتھ تعبیر کیا گیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱۰، سورۃ الفاتحۃ، الکلام علی ما یتعلق بھذا....]

فاتحہ کے زیادہ نام عظمت شان کی دلیل ہے:

احادیث میں اس سورت کے بہت سارے نام آئے ہیں۔ اس سورت کا نام فاتحہ بھی آیا ہے، "أُمُّ الْكِتَابِ" بھی آیا ہے، "أُمُّ الْقُرْآنِ" بھی آیا ہے، "سَبْعُ الْمَثَانِيْ" بھی آیا ہے، "وَافِيَةٌ" بھی آیا ہے، "وَاقِيَةٌ" بھی آیا ہے، "شَافِيَةٌ" بھی آیا ہے اور اس سورت کا نام "صَلٰوۃٌ" بھی آیا ہے۔ تو احادیث میں اس سورت کے اتنے اسماء مبارکہ بیان ہوئے ہیں۔ اور جتنے نام زیادہ ہوں اتنی شان زیادہ ثابت ہوتی ہے۔ جیسے اللہ کے ننانوے نام ہیں، میرے مدنی پاک ﷺ کے کئی نام ہیں۔ اسی طریقے سے سورۂ فاتحہ کے بھی کئی اسماء مبارکہ ہیں۔

فاتحہ مضامینِ قرآن کا خلاصہ ہے:

اور پھر یاد رکھیں! علماء نے فرمایا: سارے قرآن پر نظر ڈالو سارے قرآن کا خلاصہ سورت فاتحہ ہے۔ یعنی سارے قرآن کا خلاصہ اللہ نے سورۂ فاتحہ میں بیان کر دیا ہے۔ سارے قرآن میں تین مسئلے ہیں: 1 ...... مسئلہ الوہیت، 2 ...... مسئلہ نبوت و رسالت 3 ...... اور مسئلہ آخرت۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تینوں مسئلے سورۂ فاتحہ میں بیان کر دیے ہیں۔ تو گویا سارے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں ہے۔

انسان کی زندگی کے تین دور:

اسی طرح علماء نے فرمایا: آدمی پر زندگی کے تین دور آئیں گے:

ایک دور وہ ہے جب وہ عدم میں تھا اللہ نے اس کو وجود بخشا۔ یعنی ہم تھے ہی نہیں، پیدا ہونے سے پہلے ہم کہاں تھے؟ اسی لیے قرآن کہتا ہے:

﴿هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا﴾ [الدھر:۱]

"تم پر ایک ایسا وقت بھی گزرا کہ جب تم کچھ بھی نہیں تھے۔"

کوئی تیرا نام ونشان ہی نہیں تھا، تیرا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اللہ ہمیں عدم سے وجود میں لے آئے کہ ہم کچھ نہیں تھے اور اس کے بعد والدین پیدا ہوئے، پھر والدین کے اصلاب کے اندر ایک پانی رکھا گیا، پھر اصلاب سے پانی گرا، پھر اس پانی کو ایک خاص مقام میں محفوظ رکھا گیا اور پھر اس کی حفاظت کے بعد اسی کے اندر تصویر وتخلیق کے سارے مراحل طے ہوئے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ ۝ يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝﴾

[الطارق:۵،۶،۷]

"اب انسان کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اسے کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟ اسے ایک اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے، جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔"

اب پانی کہاں جمع ہوا؟ قرآن کہتا ہے: ﴿فَجَعَلْنَاهُ فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝﴾ [المرسلات:۲۱] (ایک ٹھہرنے والی جگہ میں ہم نے اس پانی کو ٹھہرا دیا) ﴿إِلَىٰ قَدَرٍ مَّعْلُومٍ ۝﴾ [المرسلات:۲۲] (ایک مدت معلوم تک)۔ اور ایک جگہ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ [آل عمران:۶] (وہی ہے جو ماؤں کے پیٹ میں جس طرح چاہتا ہے تمہاری صورتیں بناتا ہے۔) پھر تصویر اور تخلیق کے مراحل طے ہوئے اور پھر حضرت انسان دنیا میں تشریف لے آئے۔

تو یاد رکھو! ایک ہمارا دور عدم تھا، پھر ایک دور وہ تھا جس میں اللہ ہمیں عدم سے وجود میں لے آئے۔ پیدا ہونے کے بعد پہلے بچپن آیا، پھر جوانی آئی، پھر بڑھاپا آیا، پھر شیخوخت آئی، پھر ہرم اور پھر موت آ گئی۔ اور دوسرا دور وجود میں آنے کے بعد مرنے کا دور ہو گیا۔ یہ دو دور ہو گئے۔ پھر ایک اصلی دور آئے گا قبر سے اٹھنے کے بعد، جس کو عالم آخرت کہتے ہیں۔ ایک عدم سے وجود میں آنے کا دور تھا، ایک وجود میں آ کر مرنے تک بھی دار دنیا کا دور تھا اور پھر مرنے کے بعد آخرت کا دور ہے۔ یہ تین دور ہو گئے۔ تو ان تینوں ادوار پر اللہ نے سورۂ فاتحہ میں روشنی ڈال دی کہ جب شروع کیا تو کہاں سے شروع کیا؟ فرمایا: "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" اس میں لفظ اللہ یعنی اسم جلالت آیا ہے، جو اُلوہیت پر دلالت کرتا ہے۔ اور ساری کائنات کو پیدا کرنے والا اور عدم سے نکالنے والا اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ

نے فرمایا:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ [السجدة:۴]

''اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے آسمان اور زمین کو اور اس مخلوق کو جو ان دونوں کے درمیان میں ہے چھ روز میں پیدا کیا اور پھر تخت قائم ہوا۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۝﴾ [النمل:۶۰]

''بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور تمہارے لیے آسمان سے پانی اتارا؟ پھر ہم نے اس پانی سے بارونق باغ اگائے، تمہارے بس میں نہیں تھا کہ تم ان کے درختوں کو اگا سکتے۔ کیا (پھر بھی تم کہتے ہو کہ) اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟ نہیں! بلکہ ان لوگوں نے راستے سے منہ موڑ رکھا ہے۔''

اس لیے فرمایا:

﴿اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾ [یس:۷۷]

''کیا آدمی کو یہ معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا، سو وہ اعتراض کرنے لگا۔''

تو ہمیں عدم سے نکالنے والا کون ہے؟ اللہ ہے۔ تو اب الوہیت کا ذکر اس میں آ گیا۔ اب جب ہم وجود میں آ گئے تو ہمیں اس کی رحمت کی ضرورت تھی تو ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کا دور آ گیا اور پھر جب آخرت آئے گی تو ہمیں فیصلے کی ضرورت تھی کہ حق کا فیصلہ ہو تو ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ کا ذکر آ گیا۔ اس لیے علماء نے فرمایا کہ گویا تینوں ادوار کو شامل ہونے والی ساری کی ساری نعمتیں سورۂ فاتحہ کے اندر آ گئیں۔

سورۂ فاتحہ آدھی اللہ کے لیے، آدھی بندہ کے لیے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

((قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ، وَلِعَبْدِيْ مَا سَأَلَ))

[صحیح مسلم، حدیث:۳۹۵، باب: وُجُوب قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ.....]

''سورۂ فاتحہ میرے اور میرے بندے کے درمیان میں تقسیم ہے، آدھی میرے لیے، آدھی میرے بندے کے

لیے۔ اور میرے بندے نے جو مانگا اس کو ملے گا۔"

علماء نے فرمایا: اب غور کرو! اللہ کے لیے بھی تقریباً پانچ صفتوں کا ذکر ہے اور بندے کے بارے میں بھی پانچ چیزوں کا ذکر ہے۔ پوری سورۂ فاتحہ کے اندر غور کریں تو پانچ چیزوں کا ذکر آئے گا: پہلی صفت آئے گی الوہیت، دوسری صفت رحمانیت، تیسری صفت رحیمیت، چوتھی صفت ربوبیت اور پانچویں صفت مالکیت۔ یہ ساری چیزیں سورۂ فاتحہ کے اندر موجود ہیں۔ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ میں الوہیت آ گئی، ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ میں ربوبیت آ گئی، ﴿الرَّحْمٰنِ﴾ میں رحمانیت آ گئی، ﴿الرَّحِيْمِ﴾ میں رحیمیت آ گئی اور ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ میں مالکیت آ گئی۔ اور پھر آگے فرمایا: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ (ہم اسی کی ہی عبادت کرتے ہیں۔) اس میں بندے کے لیے عبادت آ گئی، بندے کے لیے عبودیت آ گئی، ﴿وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ میں استعانت آ گئی، ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ میں طلب ہدایت آ گئی اور اسی طریقے سے ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ میں نعمت آ گئی اور ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ میں غضب اور گمراہی سے پناہ آ گئی۔ تو پانچ چیزیں اللہ کی صفات میں ذکر کی گئیں اور پانچ کا تعلق بندوں کے ساتھ ہے۔ اللہ ہمیں قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اللہ کی صفات میں سے پہلی صفت الوہیت آئی تو بندے کی صفات میں سے پہلی صفت عبادت اور عبودیت آ گئی۔ یعنی جب ہم نے اقرار کر لیا کہ الٰہ اور رب وہی ہے تو یہ بات بھی سمجھ گئے کہ عبادت کے لائق بھی وہی ہے۔ اور ہم نے اعتراف کر لیا کہ الوہیت اسی کی صفت ہے اور ساری دنیا، سارے عالم، ساری مخلوق کی حقیقی ربوبیت اسی کے لیے ہے، باقی دنیا کی ربوبیت عارضی ہوتی ہے۔

والدین کی اولاد پر شفقت:

ویسے تو ہمیں ماں باپ نے بھی پالا ہے، ہماری خدمت ماں باپ نے بھی کی ہے۔ قرآن نے ہمیں دعا سکھلائی ہے:

﴿رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ [الاسراء: ۲۴]

"یا اللہ! ہمارے والدین پر رحم فرما جیسے انہوں نے ہماری تربیت کی جبکہ ہم چھوٹے تھے۔"

لیکن ہمارے والدین کی تربیت دراصل اللہ تبارک وتعالیٰ کی محتاج ہے، کیونکہ اللہ نے ان کو بنایا، اللہ نے ان کے اندر رحم کا مادہ ڈالا اور اللہ نے ان کو اپنے بچے سنبھالنے کی تعلیم عطا فرمائی۔ تمام والدین اپنے بچوں کو پالیں گے، دوسرے بچوں سے ان کا کیا تعلق؟ لیکن اللہ رب العزت کی ربوبیت اتنی عام ہے کہ جس مخلوق پر نظر ڈالو گے تو

سب کو پالنے والا اللہ ہے۔ تو مدد اسی سے مانگیں، مدد کے قابل اور کون ہو سکتا ہے؟ جب پالنے والا وہ ہو، ہمیں عدم سے نکالنے والا وہ ہو تو پھر ہماری مدد کرنے والا بھی وہی ہو سکتا ہے اور کوئی مدد کے قابل نہیں ہو سکتا۔

ویسے اگر آپ غور کریں! بندہ کتنا عاجز ہوتا ہے!! بچہ پیدا ہوا، اپنے گھر کے اندر ہے، دروازہ بند ہے، فلیٹ بند ہے، چھوٹا سا بچہ ہے اور بے چارہ کھڑا بھی نہیں ہو سکتا، گھٹنوں پر گھسٹ رہا ہے اور پھر رہا ہے اس وقت نہ تو باہر سے اس کی کوئی مدد کرنے والا ہے، نہ خود کھڑے ہو کر کچھ کرنے والا ہے، نہ دروازہ کھول کر نکلنے کے قابل ہے، نہ دوڑنے کے قابل ہے، اب اس وقت سوائے اس مربی کے اور سوائے ماں باپ کے اور کوئی تربیت کرنے والا نہیں ہے۔ تو اسی طرح اگر آپ نظر ڈالیں کہ بندہ جب ہر لحاظ سے عاجز ہے، اس کی تربیت کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے، تو ان کی تربیت عارضی ہے اور اللہ کی تربیت حقیقی ہے، اس کی تربیت ساری دنیا، سارے عالم پر محیط ہے۔

اللہ کے سخت احکام کی مثال:

اور آگے ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝﴾ آ گیا۔ یاد رکھیں! علماء نے فرمایا: ﴿الرَّحْمٰنِ﴾ کا معنی یہ ہے کہ اس کی رحمت عام ہے، بے حد مہربان ہے۔ علماء نے فرمایا کہ اس کو مجموعِ رحمت ظاہراً بھی، باطناً بھی، صورۃً بھی اور معناً بھی ہوتی ہے۔ اچھا! کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ظاہراً تو رحمت نہیں، لیکن باطناً رحمت ہے۔ کیا معنی ہم مریض کو دوائی پلا رہے ہیں اور ہاورڈ کونین ہے اور کونین اتنی تلخ ہے کہ اگر زبان کو لگائیں تو بے چارے کے چودہ طبق روشن ہو جائیں۔ وہ کہتا ہے کہ بہت کڑوی ہے۔ آپ کہتے ہیں: نہیں جی! ضرور پینی ہو گی، بھائی! یہ تمہارا علاج ہے۔ وہ کہتا ہے: جی! بڑی سخت کڑوی دوا ہے۔ وہ کہتا ہے: ناک بند کر لو، آنکھیں بند کر لو۔ ایک دفعہ کسی طریقے سے اندر چلی جائے، بعد میں ہم تمہیں میٹھی چیز کھلا دیں گے، تمہیں شکر دے دیں گے، تمہیں اور کوئی حلوہ دیں گے اور تمہیں کوئی لڈو کھلا دیں گے، لیکن دوائی ضرور پئیں۔ بظاہر تو کڑوی ہے، لیکن اندر جانے کے بعد رحمت ہے۔ تو بظاہر بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں۔

عصمتِ عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق اترنے والی آیات کی حکمتیں:

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۭ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ﴾ [النور: ۱۱]

"تم اس بات کو اپنے لیے برا نہ سمجھو، بلکہ یہ تمہارے لیے بہتر ہی بہتر ہے۔"

میرے مدنی! آپ کی بیوی پر دشمنوں نے، یہودیوں نے جو تہمت لگائی ہے اس سے آپ کو بظاہر بڑی تکلیف ہو رہی ہے، حرم رسول اللہ پر تہمت لگی، حضور ﷺ پاک کی عزت وعصمت پر تہمت لگی، اللہ نے فرمایا: اس کو آپ برانہ سمجھیں، بظاہر یہ بری ہے، لیکن اس کے اندر بڑی حکمتیں ہیں۔ اگر یہ تہمتیں نہ لگتیں تو ہم قرآن کیوں نازل کرتے؟ اگر یہ تہمت نہ لگتی تو ہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گواہ کیوں بنتے؟ اگر یہ تہمت نہ لگتی تو ہم عرش سے قرآن اُتار کر بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کی عظمت میں اتنا بڑا اضافہ کیوں کرتے کہ قیامت تک پڑھا جائے گا۔ بظاہر تو یہ شر نظر آیا، لیکن باطن میں بڑی حکمت ہے۔ اور یہ واضح ہو گیا کہ کون ماؤں پر تہمت لگانے والے ہوتے ہیں؟ اور کون ماؤں کی صفائی دینے والے ہوتے ہیں؟ کون ایسے ہوتے ہیں جو ماؤں پر اعتراض کریں اور امہات المومنین سے دشمنی رکھیں؟ اور کون ہیں جو امہات المومنین پر اپنی جانیں قربان کر دیں؟

تو اللہ نے فرمایا: بظاہر تو شر نظر آیا کہ تہمت لگی، میرے مدنی پاک ﷺ کو تکلیف ہوئی، بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا بیمار ہو گئیں، ان کو اللہ کے نبی کا گھر چھوڑ کر اپنے ماں باپ کے گھر آنا پڑا اور بستر سے لگ گئیں، چلنے پھرنے کے قابل نہ رہیں اور چہ مگوئیاں شروع ہوئیں اور چند دنوں کے لیے یہودیوں کو اور منافق ٹولے کو بڑی خوشیاں ملیں، بڑی فرحت ملی اور بڑے بڑے اکڑ اکڑ کر چلتے تھے کہ دیکھا نبی کی بیوی کا یہ حال ہے۔ لیکن جب اللہ نے قرآن اتارا تو ان کا منہ کالا ہو گیا اور مدنی پاک ﷺ کی عصمت کے رکھوالے نے ہمیشہ کے لیے حضور ﷺ کی عصمت کے چاند کو بدر کامل بنا دیا اور اتنی بڑی عظمت ملی کہ ساری دنیا کے بارے میں بات کرو تو اس کے کفر واسلام میں شک ہو سکتا ہے، کفر واسلام میں دو رائے ہو سکتی ہیں، لیکن بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا پر جو تہمت لگائے اس کے کفر میں دوسری بات ہی کوئی نہیں۔ یعنی اس کے کافر ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں، کیونکہ وہ تو قرآن کا منکر ہو گیا اور جو قرآن کا منکر ہو اس کے کافر ہونے میں شک نہیں ہوتا۔

رحمٰن اور رحیم کی رحمت کے مفاہیم:

دنیا میں جو رحمتیں ہیں بعض اوقات ہمیں معلوم ہوتا ہے جی ہمیں بخار ہے، بڑی تکلیف ہے، لیکن ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ اس بخار کی وجہ سے اللہ ہمیں گناہوں سے پاک کرے گا، لیکن رحیم ایسی رحمت ہے جو اندر سے بھی رحمت ہو گی اور باہر سے بھی رحمت ہو گی، صورۃً بھی رحمت ہو گی اور معناً بھی رحمت ہو گی اور ظاہراً بھی رحمت ہو گی اور باطناً بھی رحمت ہو گی، تو اس لیے رحمٰن کی رحمت میں تو دوست دشمن سب شامل ہیں، لیکن رحیم کی رحمت میں قیامت والے

دن صرف مومن شامل ہوں گے، کیونکہ اندر باہر جو رحمت ہے، ظاہراً باطناً جو رحمت ہے اس کے حق دار قیامت والے دن صرف مومنین کاملین ہوں گے، کافر کسی رحمت کا مستحق نہیں ہوگا، البتہ دنیا میں سب کے لیے رحمت ہے۔
آپ بھی دنیا میں رہتے ہیں اور ہم بھی رہتے ہیں، آپ بھی دنیا میں رہتے ہیں اور کافر بھی دنیا میں رہتا ہے، آپ کی بھی اولاد ہوتی ہے اور کافروں کی بھی اولاد ہوتی ہے، آپ کو بھی ٹھنڈی ہوا لگتی ہے۔ اور پھر اس سے بڑی رحمت اور کیا ہے؟ آج توبہ کرلیں تو جنت کے حق دار بن جائیں گے۔ ان کے لیے بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ تو شانِ رحمت بھی آگئی اور شانِ رحیمیت بھی آگئی۔ ''رَحۡمٰنٌ'' ''فَعۡلَانٌ'' کے وزن پر ہے، مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کا معنی ہے نہایت مہربان۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۱ فصل: فی فضلھا (النسائی)]

ماں کی اور رب کی رحمت کی مثال:

اور پھر میرے مدنی پاک سرکار دو عالم ﷺ پر کروڑوں صلوۃ وسلام ہوں۔ آپ نے ایک دن عجیب مثال دی! اگر کوئی سمجھنے والا ہو تو میرے مدنی ﷺ کے ایک ایک فرمان کے اندر ایسے موتی ہیں، ایسی حکمتیں ہیں، ایسی ہدایتیں ہیں اور ایسے راستے ہیں کہ آدمی کبھی ناکام ہو ہی نہیں سکتا۔
حضور ﷺ نے ایک دن دیکھا کہ ایک عورت جنگ کے بعد اپنے بچے کو ڈھونڈ رہی ہے، بچہ نہیں مل رہا، جنگ میں گم ہوگیا، بے چاری رو رہی ہے۔ جو بچہ آئے اس کو پکڑ لیتی ہے، اس کو سینے سے چمٹا لیتی ہے، پھر دیکھتی ہے اور کہتی ہے کہ میرا بچہ تو نہیں ہے، پھر بے چاری بھاگ پڑتی ہے، آخر اپنا بچہ اسے مل گیا، سینے سے چمٹا لیا اور بوسے دے رہی ہے اور چوم رہی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: میرے صحابہ! کتنی محنت کے بعد جب اس عورت کو اس کا بچہ ملا ہے، کتنی شیفتگی اور والہانہ طریقے سے محبت میں دیوانہ ہوکر اس کو چوم رہی ہے، کیا یہ عورت اپنے اس بچے کو اپنے ہاتھ سے آگ میں ڈالے گی؟ صحابہ نے عرض کیا: حضور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ماں اپنے بچے کو آگ میں ڈالے؟ فرمایا: اللہ تو اس سے بھی زیادہ رحم والے ہیں۔ وہ اپنے بندوں کو آگ میں کیسے ڈالیں گے؟
اللہ تو آگ میں نہیں ڈالنا چاہتے، اللہ تبارک وتعالیٰ تو ہمیں جہنم سے چھڑانا چاہتے ہیں، لیکن تم اپنے آپ کو زبردستی گراؤ، اس کی رحمت سے نکال کر تو یہ علیحدہ بات ہے۔ اس لیے فرمایا: ﴿الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝﴾ اور اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ دنیا میں ہم نے اچھا کیا، برا کیا، کوئی بدلہ بھی تو ہو، فیصلہ بھی تو ہو، اس لیے فرمایا: ﴿مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝﴾

قیامت کے دن کا مالک کون؟ قیامت کے دن کا مالک بھی میرا اللہ ہے۔ اور پھر اس دن فیصلہ ہوگا اور اس کے بعد یہ ساری صفتیں اللہ کی طرف آ گئیں۔

صراطِ مستقیم پر استقامت:

جب مالک وہ ہے، رب وہ ہے تو مدد کے قابل بھی وہ ہے۔ اور جب رب بھی تو ہے، مالک بھی تو ہے، رحمٰن بھی تو ہے، رحیم بھی تو ہے تو میرا اللہ! ہم راستہ کس سے مانگیں؟ جب ایسا رب مل جائے، ایسا رحمٰن مل جائے، ایسا رحیم مل جائے تو پھر راستہ کی ہدایت اسی سے مانگی ہے۔ اسی لیے انسان کہتا ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (میرا اللہ! مجھے سیدھا راستہ عطا فرما۔) ایسا راستہ نہیں کہ جس راستہ پر ایک دن تو چلوں اور دوسرے دن بھٹک جاؤں۔ راستہ بھی سیدھا اور اس پر استقامت بھی نصیب فرما۔ کیونکہ آپ نے خود ارشاد فرمایا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ [حم السجدة: ۳۰]

”جن لوگوں نے (دل سے) اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر (اس پر) مستقیم رہے ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم اندیشہ نہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم جنت (کے ملنے) پر خوش رہو جس کا تم سے (پیغمبروں کی معرفت) وعدہ کیا جایا کرتا تھا۔“

ہدایت کے چار مراتب:

اسی لیے علماء نے فرمایا: ہدایت کے تین مراحل ہوتے ہیں: 1 ...... پہلا انابت ہوتا ہے، 2 ...... پھر ہدایت ہوتا ہے 3 ...... اور پھر استقامت ہوتا ہے۔

اور بعض علماء نے فرمایا: چار مراحل ہوتے ہیں: 1 ...... ایک انابت ہوتا ہے، 2 ...... ایک ہدایت ہوتا ہے، 3 ...... ایک استقامت ہوتا ہے 4 ...... اور ایک ربط علی القلب ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآن کہتا ہے:

﴿وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ﴾ [الزمر: ۵۴]

”اور تم اپنے رب کی طرف رجوع کرو۔“

یہ انابت ہے۔ اس کے بعد بندہ مانگتا ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھلا۔) یہ ہدایت ہے۔ اب جناب! جب ہدایت بھی نصیب ہوگئی، اس کے بعد استقامت کا مرحلہ آئے گا۔ اللہ

نے فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ (جو میری ربوبیت اور الوہیت کا اقرار بھی کرتے ہیں اور اس پر ثابت قدم بھی رہتے ہیں۔) ثابت قدم رہنے کا کیا مطلب؟ عالم ارواح میں کس چیز کا اقرار کیا تھا؟ ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۚ قَالُوْا بَلٰى ۚ﴾ (اور پوچھا تھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا تھا: کیوں نہیں؟) پھر میرے بندے اس پر جمے ہوئے ہیں، ثابت قدم ہیں، توحید کے عقیدے پر پہاڑ کی طرح کھڑے ہیں۔ کبھی نہیں ہوسکتا کہ وہ غیر سے مدد مانگیں، کبھی نہیں ہوسکتا کہ وہ غیر کو سجدہ کریں، کبھی نہیں ہوسکتا کہ وہ غیر کو حاجت روا اور مشکل کشا مانیں، کبھی وہ غیر کی نذر ونیاز مانیں، کبھی وہ غیر کو پکاریں اور کبھی نہیں ہوسکتا کہ وہ غیر کے آگے آئیں اور انہیں کے سامنے جھک جائیں۔ وہ تو مانتے ہی مجھے ہیں، تو اس پر قائم ہیں۔ فرمایا: پھر اس سے بھی آگے کی سٹیج ہے کہ جب میرے بندے انابت کا مرحلہ بھی طے کر گئے، ہدایت کا مرحلہ بھی طے کر گئے، استقامت کا مرحلہ بھی طے کر گئے تو اللہ فرماتے ہیں: ہم ان کے دلوں کو اپنے ہاتھوں سے مضبوط کر دیتے ہیں۔ فرمایا:

﴿وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝﴾ [الکہف: ۱۴]

''اور ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیے، جبکہ وہ (دین میں) پختہ ہو کر کہنے لگے کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ہم تو اس کو چھوڑ کر اور معبود کی عبادت نہ کریں گے، کیونکہ اس صورت میں ہم نے یقیناً بڑی بے جا بات کہی۔''

﴿اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا﴾ [القصص: ۱۰]

''قریب تھا کہ وہ یہ سارا راز کھول دیتیں، اگر ہم نے ان کے دل کو سنبھالا نہ ہوتا۔''

فرمایا: دیکھا نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی اماں اور موسیٰ علیہ السلام کی بہن تو راز کھول دیتیں، لیکن ہم نے ان کے دلوں کو گرہ لگا دی کہ صبر کرو، راز نہ کھلے، ہم موسیٰ علیہ السلام کی حفاظت کریں گے۔ جب رحمٰن بھی وہ ہے اور رحیم بھی وہ ہے تو ہم ہدایت کا راستہ کس سے مانگیں؟ اللہ تعالیٰ سے مانگیں۔

علماء نے فرمایا کہ اس پر ایک نظر ڈالو! انسان جب تیاری کرتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنی جگہ متعین کرتا ہے۔ جب آپ سفر کریں گے تو ارادہ کریں گے کہ کہاں جانا ہے؟ آپ کہیں گے: جی مدینہ منورہ...... ان شاء اللہ!......، پھر فیصلہ کرتے ہیں کہ اب مدینہ شریف جانا ہے تو کتنے دن رہیں گے؟ کم از کم آٹھ دن۔ تو اچھا بھائی! آٹھ دن کھانا

بیٹا، سامان اور کپڑے وغیرہ سب ساتھ رکھ لو۔ اچھا بھائی! سرمہ، برش اور کنگھا وغیرہ بھی ساتھ رکھ دو، سامان تیار ہو گیا۔ اب ہم نے جانا ہے تو کون سا راستہ اختیار کریں؟ جی یہ سڑک بالکل سیدھی ہے، سیدھا مدینہ شریف جائے گی۔ اب کیا کریں؟ سواری کا بھی فیصلہ بھی کریں کہ بہترین گاڑی ہے، ایئر کنڈیشنر بھی ہے اور سیٹیں بھی آرام دہ ہیں، اسی پر بیٹھ جائیں۔ یہ بھی فیصلہ ہو گیا۔

اسی طرح اب دیکھیں! ساری تیاری ہو رہی ہے۔ پہلے اللہ کی حمد و ثنا ہو رہی ہے، اس کی تمجید بیان ہو رہی ہے، اس کی الوہیت کا اقرار ہو رہا ہے، اس کی ربوبیت کا اقرار ہو رہا ہے، اس کی رحمانیت کا اقرار ہو رہا ہے، اس کی رحیمیت کا اقرار ہو رہا ہے، اس کی مالکیت کا اقرار ہو رہا ہے، پھر اپنی بندگی کا اقرار ہو رہا ہے اور اسی سے مدد مانگی جا رہی ہے۔ منزل ہماری جنت ہے، پھر اس کے لیے ہم راستہ پوچھ رہے ہیں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (صراط مستقیم کی ہدایت عطا فرما) اور پھر راستے میں ضرورت ہوتی ہے کہ کس کے ساتھ سفر کیا جائے؟ کیونکہ ساتھی اچھا ہوگا تو سفر میں آرام ہوگا۔ تو اب کس کا راستہ پوچھ رہے ہیں؟ کہا: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ (اللہ ہمیں ان کے ساتھ چلانا جو تیرے انعام والے بندے ہیں) میرے اللہ! جو تیرے خاص بندے ہیں۔ پھر ان کے بارے میں فرمایا:

﴿الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾

[النساء:۶۹]

”جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیا، صدیقین، شہدا، اور صالحین۔ اور وہ کتنے اچھے ساتھی ہیں!“

اب سواری بھی مل گئی، سفر بھی مل گیا اور ساتھ بھی مل گیا، اب ڈر ہوتا ہے کہ ساتھی تو ہمیں بہت اچھے مل گئے، لیکن آگے راستے میں کوئی ڈاکو ڈاکہ ڈال کر ہمیں لوٹ نہ لے، ہمیں راستے سے ہٹا نہ دے۔ اس لیے دعا مانگی: ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ (اللہ! جن پر تیرا غضب ہے ان سے بھی بچانا اور جو گم کردہ راہ ہیں ان سے بھی بچانا) دو ڈاکو ہوتے ہیں مال کے اور یہ ڈاکو ہیں ایمان کے۔ مال چلا جائے تو بندہ جی لیتا ہے، لیکن ایمان چلا جائے تو پھر بندہ کہاں جائے؟

تلاوت سے پہلے تعوذ:

اس لیے علماء نے فرمایا: سورۂ فاتحہ پر نظر ڈالیں! جس طرز سے بھی نظر ڈالیں گے اسی طریقے کے اندر اس میں،

حکمتوں کا دریا ہے۔ ایسا دریا ہے جس کے موتی نہ آج تک ختم ہو سکے ہیں اور نہ قیامت تک ختم ہو سکیں گے۔ اور پھر اللہ پاک نے فرمایا: میرا مدنی ﷺ! جب سورۂ فاتحہ کو شروع کریں تو سب سے پہلے میری پناہ میں آئیں۔ "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" پڑھ کر شیطان سے میری پناہ پکڑیں۔

سارے قرآن میں نظر ڈالو! دشمنوں کے بارے میں سارے قرآن میں تین آیتیں ملتی ہیں، جن کا مفہوم یہ ہے اللہ نے فرمایا: میرا مدنی!

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾ [الاعراف:۱۹۹]

"اگر دشمن مخالفت کریں ناں! دشمن اگر آپ کو ستائیں تو آپ معاف کریں، آپ چھوڑ دیں اور دشمنوں سے اعراض کر لیں اور منہ پھیر لیں (یہ بھی دشمن کا علاج ہے)۔"

دشمن اگر دشمنی کرتا ہے تو معاف کر دو اور تم اس سے ہٹ جاؤ۔ اگر وہ ضد کرے کہ میں نے یہیں بیٹھنا ہے تو آپ کہہ دیں کہ آپ بیٹھ جائیں، میں ادھر بیٹھ جاتا ہوں۔ بات ختم ہو گئی، معاملہ حل ہو گیا۔ اور اس کے بعد دشمن کا دوسرا علاج بیان فرمایا کہ دشمن کے ساتھ احسان کرو۔ اللہ نے فرمایا:

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ﴾ [حم السجدۃ:۳۴]

- "تم بدی کا دفاع ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی، وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایسا ہو جائے گا جیسے وہ (تمہارا) جگری دوست ہو۔"

وہ برائی کرے تو تم احسان کرو، وہ برائی کرے تو تم بھلائی کرو، وہ تمہیں گالیاں دے تو تم اس کو دعائیں دو، وہ تمہیں گالیاں دے تو تم شام کو اس کے گھر کھانا لے کر کھڑے ہو، وہ تمہارے لیے دشمنیاں ڈھونڈ رہا ہے تو تم اس کے لیے بھلائیاں تلاش کرو۔ اور تیرے اور اس کے درمیان دشمنی ہے تو تم احسان کی مار دو تو ہو سکتا ہے کہ وہ تیرا گہرا دوست بن جائے کیونکہ دنیا میں احسان سے زیادہ کوئی مار نہیں ہے۔ اگر تم اپنے دشمن کو مارنا چاہتے ہو اور اس کو اپنا دوست بنانا چاہتے ہو تو تم اس کے ساتھ احسان کرو اور اس کے ساتھ بہتر سلوک کرو۔

حضور ﷺ کے کفار پر احسانات:

۱۔ دیکھا نہیں کہ حضور ﷺ کو مکے والوں نے اتنا تنگ کیا کہ میرے مدنی ﷺ ہجرت کر رہے ہیں، لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں: علی! یہ میرے پاس مکہ والوں کی امانتیں ہیں، تم رات رہ جاؤ، بعد میں ہجرت کر لینا اور ہر

کسی کی امانت اس کے گھر پہنچا دینا۔

ایک طوائف پر احسان:

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک طوائف، زانیہ، فاحشہ یعنی جھنڈے لگا کر گناہ کرنے والی عورت ایک دن کہ سے مدینہ آ گئی۔ حضور ﷺ کے سامنے آئی تو آپ ﷺ نے پوچھا: تو ادھر کیسے آ گئی؟ کہنے لگی: حضور! کیا کریں؟ مکے کے جتنے سردار تھے وہ تو آپ نے بدر میں مار ڈالے، ہمارے پاس تو کھانے کو روٹی نہیں رہی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اس کی بھی مدد کرو، ہمارے دروازے پر آئی ہے تو اس کو بھی دے دو، ہمارے دروازے سے کوئی خالی نہ جائے۔ انہی چیزوں نے تو ان کو مسلمان کیا، انہی چیزوں نے تو گنہگاروں کو متقی بنایا اور جو فاسق و فاجر تھے ان کو تقویٰ کے اعلیٰ مرتبوں پر پہنچا دیا۔ دشمن کا ایک علاج ہے اعراض کرنا اور ایک علاج ہے اس پر احسان کرنا کہ وہ ظلم کرے تو احسان کرو، وہ گالیاں دے تو تم دعا کرو۔

تعوذ کا فائدہ:

اور دشمن کا ایک علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ [الاعراف: ۲۰۰]

میرا مدنی! اگر شیطان حملہ کرے تو اس کا علاج یہ ہے کہ پھر تم میری پناہ پکڑ لو، کیونکہ علماء نے فرمایا کہ وہ دشمن تو نظر آنے والا تھا اس کا علاج تو ممکن تھا۔ شیطان ایسا دشمن ہے جو نظر آنے والا نہیں ہے۔ اس کا علاج کوئی نہیں تھا۔ تو فوراً ہم اللہ کی پناہ میں آ جائیں۔ اچھا! پھر یاد رکھو! جو انسانوں میں دشمن ہے وہ دشمنی کرے۔ مثلاً ہمیں قتل کر ڈالے ہم شہید ہو گئے تو ہمیں کونسا نقصان ہو گیا ہے؟ یعنی دنیا میں اگر انسان دشمن ہے، کوئی مخالف ہے، اس نے ہمیں بے گناہ مار ڈالا، ہمیں قتل کر دیا، ہم تو شہید ہوں گے ناں! وہ ظالم بنا، قاتل بنا، ہمارا تو مرتبہ بلند ہو گیا۔ اور اسی طرح اگر وہ ہم پر غالب آ گیا، ہم جناب مغلوب ہو گئے، تب بھی ہمیں اجر اور ثواب ملا۔ لیکن اگر یہ شیطان دشمن کسی کو مار ڈالے وہ تو جہنمی ہو گیا۔ انسانوں کے دشمن کا مارا ہوا شہید بن جاتا ہے، لیکن شیطانی دشمنی سے مارا ہوا اللہ کی رحمت سے ہمیشہ کے لیے مردود بن جاتا ہے۔ وہ دشمن ہمیں مارے تو ہمیں اجر ملتا ہے اور اس دشمن کی مار اگر ہم قبول کر لیں اور اس کے آگے مغلوب ہو جائیں اور شیطان ہم پر غالب آ جائے پھر تو جہنم ہی جہنم ہے۔ تو یہ اتنا خطرناک دشمن ہے۔

اس کے لیے اللہ نے اپنے پاک پیغمبر ﷺ کو تعلیم دی کہ جب فاتحہ شروع کرو یا قرآن کی کوئی اور سورت شروع کرو تو پہلے "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ" پڑھو۔ بعض احادیث میں دوسرے کلمات بھی ثابت ہیں۔ مثلاً: "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ" لیکن جو قرآن میں تعلیم دی گئی ہے وہ "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ" ہی ہے۔ اور اس کے بعد "بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" پڑھیں۔

تعوذ کب پڑھیں؟

اب رہی یہ بات کہ تعوذ کب پڑھنا چاہیے؟ تلاوت کے شروع میں یا تلاوت کرنے کے بعد؟ اس معاملے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔

پہلا قول:

بعض علماء نے فرمایا: جب تلاوت مکمل کرلیں تو اس وقت تعوذ پڑھیں، کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۹۸﴾﴾ [النحل:۹۸]

اس آیت میں فا ہے۔ اور فا تعقیب کے لیے ہوتی ہے۔ تو معنی یہ ہوگا کہ جب تم قراءتِ قرآن کر چکو تو پھر اللہ کی پناہ پکڑو۔ لہٰذا تلاوتِ قرآن کے بعد تعوذ پڑھنی چاہیے۔

دوسرا اور راجح قول:

راجح قول یہ ہے کہ قرآن پڑھنے سے پہلے تعوذ پڑھنی چاہیے۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ جب تم قرآن پاک پڑھنے کا ارادہ کرو تو تعوذ پڑھا کرو۔ جیسے وضو کے بارے میں فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ﴾ [المائدۃ:۶]

"جب تم نماز پڑھنے کا ارادہ کرو تو وضو کرو۔"

اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ نماز کے بعد وضو کرو؟ معنی یہ ہوتا ہے کہ جب ارادہ کرو نماز کا تو وضو کرو۔ اسی طرح یہ معنی بھی ہوگا کہ جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو تو تعوذ پڑھو۔

تیسرا قول:

بعض علماء نے دونوں کو جمع کر دیا، انہوں نے کہا: تلاوت شروع کرنے سے پہلے بھی تعوذ پڑھو اور جب تلاوت

مکمل کرلو تو پھر بھی تعوذ پڑھو، تا کہ اول و آخر دونوں میں اللہ کی پناہ میں آ جائیں۔ تو اس لیے بعض علماء نے ان دونوں اقوال کو جمع فرما دیا ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳ ملخصیً الاستعاذۃ واحکامہا]

اور اس کے بعد ہم "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" پڑھیں۔ تو پہلے تعوذ کے ذریعہ سے ہم اللہ کی پناہ میں آ گئے اور پھر جب ہم نے تسمیہ پڑھی تو اللہ کی رحمت میں آ گئے۔ پہلے ہم اللہ کی پناہ میں آئے، جب ہم نے اللہ سے مدد مانگی تو پھر اللہ کی رحمت میں آ گئے۔ تو جو اللہ کی پناہ اور اللہ کی رحمت میں آ جائے تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

سورۂ فاتحہ کی فضیلت:

جب اللہ کی پناہ میں آ گئے اور اللہ کی رحمت میں آ گئے تو اب جناب ہم سورۂ فاتحہ میں آ گئے۔ اس لیے علماء نے فرمایا: ویسے تو سارا قرآن شان والا ہے، اللہ کا سارا کلام شان والا ہے، لیکن سورۂ فاتحہ اتنی شان والی سورت ہے اور اتنی عظمت والی سورت ہے کہ یہ قرآن کا نور ہے، سورت فاتحہ حفاظت اور نگہداشت کرنے والی ہے اور ہمیں ظاہری اور باطنی امراض سے شفا دینے والی ہے۔

مسئلہ قراَتِ فاتحہ خلف الامام:

اسی لیے بعض حدیثوں میں اتنی بڑی فضیلت آئی کہ کوئی نماز نہیں جب تک کہ فاتحہ نہ پڑھی جائے۔ اب اس کے اندر بھی مسئلہ سمجھ لیں! بعض علماء کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ کوئی نماز بھی ہو جب تک سورۂ فاتحہ نہیں پڑھیں گے نماز ہوگی ہی نہیں۔ مثلاً: سارا قرآن پڑھ لے، لیکن فاتحہ نہ پڑھے تو نماز نہیں ہوگی۔ بعض ائمہ کرام امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے اور اسی طرح علمائے اہلِ حدیث کا مسلک ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قرآن میں سے جہاں سے پڑھ لے نماز ہو جائے گی۔ باقی ائمہ فرماتے ہیں: نماز نہیں ہوتی، اس لیے کہ اللہ نے فرمایا:

((قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ)) [صحیح مسلم، حدیث: ۳۹۵ باب: وُجُوبِ قِرَاءَةِ ...]

اس حدیث میں فاتحہ ہی کو نماز کہا گیا ہے۔ تو گویا جب فاتحہ نہیں ہوگی تو لازماً نماز بھی نہیں ہوگی۔ اور ایک حدیث میں آیا ہے:

((لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ)) [صحیح البخاری، حدیث:۷۵۶، باب وجوب القراءۃ...]

فاتحہ کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی۔ اس لیے جب تک فاتحہ نہیں پڑھے گا نماز ہو ہی نہیں سکتی۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قرآن نے یہ بھی کہا ہے:

﴿فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ [المزمل:۲۰]

"جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جاسکے تم لوگ پڑھ لیا کرو۔"

اور اسی طرح صحیح مسلم میں ایک حدیث موجود ہے کہ جب ایک صحابی نے نماز میں غلطی کی اور پھر حضور ﷺ نے اس کو نماز پڑھنا سکھلایا تو اس میں فرمایا:

((ثُمَّ اقْرَأْ مَا تَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ)) [صحیح البخاری، حدیث:۷۵۷، باب وجوب القراءۃ للإمام...]

"جو کچھ تمہیں قرآن سے آتا ہو پڑھ لیا کرو۔"

اصل میں دیکھو تو جھگڑا ہے ہی نہیں، تھوڑی سی سمجھنے والی بات ہے۔ یعنی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مثلاً ایک آدمی کو سورۂ فاتحہ نہیں آتی، قرآن کی دوسری دو تین آیات یاد ہیں، کیا اس کی نماز ہو جائے گی؟ کہتے ہیں کہ نماز ہو جائے گی۔ یعنی یہ مطلب نہیں کہ وہ ایسا کرے، بلکہ اگر اس نے ایسا کیا تو نماز ہو جائے گی۔ باقی ائمہ فرماتے ہیں کہ نماز نہیں ہوگی۔ تو نماز کے متعلق مسئلہ پیدا ہو گیا۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر آپ اکیلے ہیں تو فاتحہ پڑھیں گے اور ہر رکعت میں پڑھیں گے، اگر آپ امام ہیں تب بھی آپ فاتحہ پڑھیں گے۔ امام اور منفرد میں کوئی جھگڑا ہے ہی نہیں، کسی امام کا اختلاف ہے ہی نہیں، سب کہتے ہیں کہ فاتحہ پڑھے۔ اب مسئلہ صرف یہ ہے کہ امام موجود ہو اور ہم اس کے پیچھے نماز پڑھیں۔ ہم مقتدی ہیں تو اب ہم کیا کریں؟ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر امام موجود ہے، چاہے جہری نماز ہے چاہے سری نماز ہے، یعنی پانچوں نمازوں میں امام بھی پڑھے اور مقتدی بھی ضرور پڑھے۔ ان کے نزدیک مقتدی کا پڑھنا بھی ضروری ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر امام موجود ہے تو مقتدی کے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، امام کا پڑھنا مقتدی کے لیے کافی ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جن نمازوں میں امام زور زور سے پڑھ رہا ہے اور تم قرآن سن رہے ہوں تو پھر فاتحہ نہ پڑھو، اگر ایسی نماز ہے جس میں تم امام کی قراءت نہیں سن رہے تو پھر تم فاتحہ پڑھ سکتے ہو۔

بہر حال! ان تمام ائمہ نے احادیث سے استدلال کیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں فرمائے۔ لمبی بحثوں میں پڑنا یہ علماء کا کام ہوتا ہے۔ ایک تو موٹی سی بات ہے، یہ عقیدہ رکھ لیں کہ تمام ائمہ برحق ہے ہیں اور سب نے حدیثوں کو پکڑا ہے۔ جنہوں نے کہا کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی انہوں نے کہا حدیث ہے:

((لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۷۵۶، باب: وجوب القراءۃ...]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا: نہیں مقتدی نہ پڑھے۔ اس لیے نہ پڑھے کہ قرآن کہتا ہے:

﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ [الاعراف: ۲۰۴]

''جب قرآن پڑھا جائے تو تم قرآن سنو اور خاموش رہو، تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

سنو کا مقصد یہی ہے کہ ہم نہ پڑھیں اور دوسرا یہ کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جہاں جہاں حکم ہے کہ نماز فاتحہ کے بغیر نہیں ہوتی وہاں مطلقاً بات ہے۔ اور جہاں اللہ کے نبی ﷺ نے نماز پڑھنے کی تعلیم دی ہے، امام کے بھی فرائض بتلائے ہیں اور مقتدی کے بھی فرائض بتلائے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب امام ''اَللّٰهُ اَكْبَرُ'' کہے تم بھی ''اَللّٰهُ اَكْبَرُ'' کہو، جب امام رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو، جب امام سجدہ کرے تم بھی سجدہ کرو، جب امام سلام پھیرے تو تم بھی سلام پھیرو۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: جب امام ﴿وَلَا الضَّالِّينَ﴾ کہے تو تم ''اٰمِيْنَ'' کہو اور جب امام پڑھے تو تم چپ کرو۔ اب حضور ﷺ نے دونوں کو مسئلہ سمجھا دیا کہ امام کے ذمے کیا کام ہے اور ہمارے ذمے کیا کام ہے کہ جب امام پڑھے تو ہمارے ذمہ کیا ہے؛ ہم چپ کریں اور جب ﴿وَلَا الضَّالِّينَ﴾ کہے ہم سن رہے ہیں تو ہم آمین کہیں۔ تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرما دیا کہ امام کے پیچھے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

چونکہ امام ابن کثیر رحمہ اللہ خود امام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک پر ہیں، اس لیے انہوں نے وہ حدیث مبارک بھی نقل کی ہے۔ حضرت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت مبارکہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر نماز میں فاتحہ نہ ہو تو نماز ناقص ہے، خداج، نامکمل ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: حضور! اگر ہم امام کے پیچھے ہوں؟ (سب سے پہلے یہ سمجھیں کہ صحابہ کے دور میں بھی ایسی بات تھی کہ امام کے پیچھے نہیں پڑھتے تھے، ورنہ اگر ہر کوئی امام کے پیچھے پڑھتا ہوتا تو پھر صحابی کو پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ پوچھنا تو تب ہوتا ہے جب نہ پڑھنے والے ہوں۔ اگر سارے پڑھنے والے ہوتے تو سوال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟) تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عجیب آدمی ہو ''اِقْرَأْ بِهَا فِيْ نَفْسِكَ'' تم فاتحہ پڑھا کرو، لیکن جی میں پڑھا کرو۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۳۹۵، باب: وجوب قراءۃ الفاتحۃ...]

تو جی میں پڑھنا ہمیں بتلا دو ہم حاضر ہیں کہ جی میں کیسے پڑھا جاتا ہے؟ معنی یہ ہے کہ تدبر کیا کرو، کیونکہ پڑھا تو زبان سے جاتا ہے۔ جب زبان سے نہیں پڑھا جائے گا، زبان نہیں ہلائیں گے، جی میں اور دل میں پڑھیں گے تو دل میں تو تدبر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا﴾ [محمد:۲۴]

"بھلا کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے! یا دلوں پر وہ تالے پڑے ہوئے ہیں جو دلوں پر پڑا کرتے ہیں؟"

انہوں نے کہا: دیکھو! حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کتنی سختی فرما رہے ہیں کہ "اِقْرَأْ بِهَا فِي نَفْسِكَ" امام کے پیچھے بھی پڑھا کرو۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دیکھو! حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کیا فرما رہے ہیں کہ نفس میں پڑھا کرو۔ امام پڑھ رہا ہے اور تم ایک ایک لفظ پر غور کر رہے ہو۔ اگر جی میں پڑھنے کا کوئی اور طریقہ ہو تو ہمیں سمجھا دو۔

بہرحال! تمام ائمہ برحق ہیں۔ اللہ ان سب کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ ان سب کا مقصد کیا تھا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی نہ کسی حدیث تک پہنچنا، اتباع کتاب اللہ اور اتباع سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا مقصد تھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے اور اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں قرآن وسنت کی اتباع نصیب فرمائے۔ آمین۔

غیر اللہ کے نام کا صدقہ، چھترا:

اگر کوئی آدمی اللہ کے واسطے خیرات کرے تو بالکل ٹھیک ہے۔ روزانہ اللہ کے نام پر خیرات کرے کہ یا اللہ! تیرے نام پر، تیری رضا کے لیے خیرات کر رہا ہوں، اس کا بدلہ، اجر وثواب تو مجھے عطا فرما۔ روزانہ خیرات کریں کوئی منع نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ خیرات میں غیروں کو شامل نہ کیا کرو۔ خیال کرنا! اگر چھوٹا بچہ کہہ دے کہ ابا جان! یہ بکری کا بچہ مجھے بڑا پسند ہے، یہ آپ مجھے دے دیں۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں یہ پیر کا بکرا ہے۔ یہاں آکر شرک آ گیا، پیر کے نام پر پکا ہو گیا، بیٹے کو بھی نہیں دے رہا۔ سمجھ آ گئی اندر کوئی بلا ہے۔ جیسے کفار کہا کرتے تھے: ﴿هَٰذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَٰذَا لِشُرَكَائِنَا﴾ [الانعام:۱۳۶] (اور بزعم خود کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا حصہ ہے اور یہ اس کے شریکوں کا حصہ ہے) یہاں شرک آ جاتا ہے۔ اللہ کی بکری ہے تو سارے بچے لے جائیں، لیکن ایک پیر کے نام کا ہے تو اللہ کے غیر کا نام آ گیا۔ اس سے بچا کرو۔ ورنہ کون کہتا ہے کہ خیرات نہ کرو۔

اللہ کے بندے! اگر آدمی اپنی بیوی سے ملاقات کرے، ہمبستری کرے اور ابھی غسل نہ کیا ہو تو کھانا پینا جائز ہے۔ بہتر یہ ہے کہ نہ کھائے، لیکن اگر مجبوری ہو تو استنجا کرلے، پھر وضو کرلے؛ وضو کرنے کے بعد (جیسے اب رمضان شریف ہے) میاں بیوی لیٹ گئے، سحری کا وقت جا رہا ہے، اب اگر غسل کرے تو سحری نہیں کرسکتا۔ تو اس کے لیے اجازت ہے کہ جلدی جلدی استنجا کرلے اور وضو کرکے کھالے۔

شوافع کی دوسری دلیل:

((وَلِمُسْلِمٍ نَحْوُهُ حَدِيثٌ آخِرُ قَالَ مُسْلِمٌ وَحَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ الْحَنْظَلِيُّ أَخْبَرَنَا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ عَنِ الْعَلَاءِ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ صَلَّى صَلَاةً لَمْ يَقْرَأْ فِيهَا بِأُمِّ الْقُرْآنِ فَهِيَ خِدَاجٌ ثَلَاثًا غَيْرُ تَمَامٍ. فَقِيلَ لِأَبِي هُرَيْرَةَ: إِنَّا نَكُونُ وَرَاءَ الْإِمَامِ؟ فَقَالَ: اقْرَأْ بِهَا فِي نَفْسِكَ؛ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: قَالَ اللهُ تَعَالَى: قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ، وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ، فَإِذَا قَالَ الْعَبْدُ: ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾، قَالَ اللهُ تَعَالَى: حَمِدَنِي عَبْدِي، وَإِذَا قَالَ: ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ﴾، قَالَ اللهُ تَعَالَى: أَثْنَى عَلَيَّ عَبْدِي...))

[صحیح مسلم، حدیث: ۳۹۵، باب: وجوب قراءۃ الفاتحۃ...]

اب مفسر رحمہ اللہ ایک اور حدیث مبارکہ نقل فرما رہے ہیں جس کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت فرمایا ہے۔ اور یہ حدیث مبارک بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص نماز پڑھے اور اس میں فاتحہ نہ پڑھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ "فَهِيَ خِدَاجٌ" فرمایا۔ اب "خِدَاجٌ" کا کیا معنی ہوتا ہے؟ ناقص اور غیر تام، یعنی وہ نماز پوری نہیں ہوئی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: ہم جب امام کے پیچھے ہوتے ہیں تو پھر کیا کریں؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر تم اپنے جی میں پڑھ لیا کرو۔ اس میں یہ بھی استدلال فرما رہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فاتحہ کو "أُمُّ الْقُرْآنِ" بھی فرمایا ہے۔ یعنی جیسے اس کا نام فاتحہ ہے، اسی طرح اس کا نام "أُمُّ الْقُرْآنِ" بھی ہے۔

سورۂ فاتحہ میں بندے کا حصہ:

اس لیے کہ میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ" اب مفسر رحمہ اللہ نے استدلال کیا کہ سورۂ فاتحہ کو صلوٰۃ بھی کہا گیا ہے، کیونکہ یہاں صلوٰۃ سے مراد نماز نہیں، فاتحہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صلوٰۃ یعنی فاتحہ میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔

انہوں نے فرمایا: جب فاتحہ کو نماز کہا گیا ہے تو اگر تم امام کے پیچھے بھی ہو تو پھر اپنے جی میں پڑھ لو، کیونکہ حدیث میں آتا ہے جب بندہ کہتا ہے: ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ﴾ تو اللہ فرماتے ہیں: ''حَمِدَنِي عَبْدِي'' (میرے بندے نے میری حمد بیان کی) اور جب بندہ ﴿الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ﴾ کہتا ہے تو اللہ فرماتے ہیں: ''أَثْنَى عَلَيَّ عَبْدِي'' (میرے بندے نے میری تعریف اور میری ثنا بیان کی) اور جب بندہ کہتا ہے: ﴿مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ﴾ جب اس نے اعتراف کیا کہ مالک جزاء اللہ ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''مَجَّدَنِي عَبْدِي'' (میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی، میرے مجد کا اقرار کیا) اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اللہ ایک مرتبہ فرماتے ہیں: ''فَوَّضَ إِلَيَّ عَبْدِي'' (میرے بندے نے اپنے آپ کو مجھے سونپ دیا) کہ تو ہی مالک ہے، تیرا منشا ہے جو چاہیں کریں، مالک جو آپ ہیں۔ جب بندہ ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ﴾ (تیری ہی خاص عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) کہتا ہے تو اللہ فرماتے ہیں: ''هٰذَا بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ.'' (یہ میرے اور بندے کے درمیان مشترک ہے اور میرے بندے نے جو چاہا میں اس کو دوں گا، جو مانگا اس کو ملا) جب بندے نے اعتراف کیا کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں تو بندہ عابد بنا اور میں معبود بنا اور جب بندے نے اقرار کیا کہ تجھ ہی سے مدد مانگتا ہوں، اب میں مدد دینے والا اور بندہ مدد مانگنے والا بنا تو جب میرا بندہ مجھ سے مانگ رہا ہے تو میں اس کو دوں گا۔ اب جب بندے نے ﴿اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۙ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ٪﴾ کہا، یہ خالص دعا ہے نا! تو اللہ فرماتے ہیں ''هٰذَا لِعَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ.'' [1] (یہ حصہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے نے جو چاہا میں اس کو دوں گا۔) بندہ مجھ سے مانگ رہا ہے کہ مجھے صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرما اور ایسے لوگوں کا راستہ نصیب فرما جن پر تیرا انعام ہے، ان لوگوں کے راستے سے بچا جن پر تیرا غضب ہے اور جو گمراہ ہیں۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۳۹۵، بَابُ وُجُوبِ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ...]

اور اس کے بعد مفسر رحمہ اللہ ان احادیث سے فاتحہ کا مسئلہ بیان نہیں کر رہے کہ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھی جائے یا نہ پڑھی جائے، بلکہ سورۂ فاتحہ کے اسماء پر استدلال فرما رہے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کے اسماء میں ''أُمُّ الْكِتَابِ'' بھی آیا ہے، ''صَلٰوة'' بھی آیا ہے۔ کیونکہ بعض حضرات نے اس کا انکار کیا تھا، اس لیے اس پر حدیثیں ذکر فرما رہے ہیں۔ باقی فاتحہ کا جو مسئلہ ہے وہ تو مشہور و معروف ہے۔ اور تمام ائمہ کرام کے پاس اپنے اپنے دلائل ہیں، ادلہ ہیں،

---

[1] [أخرجہ مسلم، رقم: ۳۹۵]

روایات، احادیث ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ اور ان شاء اللہ جب وہ مقام آئے گا تو وہ بھی ذکر فرمائیں گے۔

"اَلْكَلَامُ عَلٰى مَا يَتَعَلَّقُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ مِمَّا يَخْتَصُّ بِالْفَاتِحَةِ مِنْ وُجُوْهٍ"

اب بیان فرماتے ہیں کہ ان احادیث میں بعض چیزیں فاتحہ کی خصوصیات بتی ہیں۔ "(أَحَدُهَا) أَنَّهُ قَدْ أُطْلِقَ فِيْهِ لَفْظُ الصَّلَاةِ" (سب سے پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ فاتحہ کو نماز کہا گیا ہے۔) گویا کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں۔ ویسے الحمد اللہ! کوئی نماز ایسی نہیں جو فاتحہ کے بغیر ہو۔ فاتحہ کے بغیر نماز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ جب آپ اکیلے ہوں گے تب بھی فاتحہ ہے، اگر آپ امام ہیں تب بھی سورت فاتحہ ہے، اگر آپ مقتدی ہیں تب بھی امام تو نماز میں فاتحہ پڑھے گا۔ تو فاتحہ موجود ہے۔ اب اختلاف صرف اس بات پر ہے کہ امام بھی پڑھے اور مقتدی بھی پڑھے یا مقتدی خاموش رہے، لیکن نماز تو کوئی ایسی نہیں جو فاتحہ کے بغیر ہو، ہر نماز کے اندر الحمد للہ! سورۂ فاتحہ موجود ہے۔ اس لیے اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فاتحہ کو نماز کہا گیا ہے، حالانکہ لفظ صلوۃ سے مراد قرأت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا﴾ [الاسراء:١١٠]

"اور تم اپنی نماز نہ بہت اونچی آواز سے پڑھو اور نہ بہت پست آواز سے، بلکہ ان دونوں کے درمیان (معتدل) راستہ اختیار کرو۔"

تو "صَلٰوةٌ" سے مراد قرأت ہے کہ زور سے قرأت نہ کریں، بلکہ درمیانی آواز سے قرأت کریں۔ فرمایا: "أَيْ بِقِرَاءَتِكَ كَمَا جَاءَ مُصَرَّحًا بِهِ فِي الصَّحِيْحِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ......" اب مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں "قَسَمْتُ الصَّلَاةَ" کا لفظ آیا ہے اور آگے جو تقسیم بیان کی گئی ہے وہ فاتحہ کی کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فاتحہ کو "الصَّلَاةَ" (نماز) کہا گیا ہے جو اس کی عظمتِ شان پر دلالت کرتی ہے۔ اور نماز کے اندر سب سے بڑا رکن بھی فاتحہ ہے، کیونکہ ہر نماز میں فاتحہ پڑھی جاتی ہے اور پھر اس پر عبادت اور نماز کا اطلاق کیا جا رہا ہے، حالانکہ یہ تو نماز کا جز ہے، نماز میں اور بھی تو ارکان ہیں، لیکن اس کو اتنی اہمیت دی گئی ہے۔ اس سے فاتحہ کی عظمتِ شان واضح ہوتی ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۚ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾ [الاسراء:٧٨]

''اور صبح کی نماز بھی بے شک صبح کی نماز (فرشتوں کے) حاضر ہونے کا وقت ہے۔''

''وَالْمُرَادُ صَلَاةُ الْفَجْرِ كَمَا جَاءَ مُصَرَّحًا بِهِ فِي الصَّحِيحَيْنِ: أَنَّهَا تَشْهَدُهُ مَلَائِكَةُ اللَّيْلِ وَمَلَائِكَةُ النَّهَارِ''

اب قرآن فجر سے فجر کی نماز مراد ہے۔ صحیحین کے اندر صحیح حدیث صراحتاً موجود ہے کہ فجر کی نماز کا وقت ایسا رحمت کا وقت ہے کہ جو دن کے فرشتے ڈیوٹی پر آتے ہیں وہ بھی اتر چکے ہوتے ہیں اور رات والے چڑھنے کے لیے تیار کھڑے ہوتے ہیں، دونوں قسم کے ملائکہ مل جاتے ہیں۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۶۴۸، باب: فضل صلاۃ الفجر فی جماعۃ]

تو ملائکہ کے حاضر ہونے کا وقت ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت کا وقت ہے۔ صبح کی نماز جس کو نصیب ہو جائے وہ سمجھ لے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔

قراءت خلف الامام:

اس کے بعد فرماتے ہیں:

''فَدَلَّ هٰذَا كُلُّهُ عَلَى أَنَّهُ لَا بُدَّ مِنَ الْقِرَاءَةِ فِي الصَّلَاةِ وَهُوَ اتِّفَاقٌ مِنَ الْعُلَمَاءِ''

اب اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نماز میں قراءت یعنی قرآن کا پڑھنا ضروری ہے۔ یہ تو اتفاق ہے، اس کے اندر تو کوئی جھگڑا ہی نہیں ہے۔

''وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فِي مَسْأَلَةٍ نَذْكُرُهَا فِي الْوَجْهِ الثَّانِي، وَذٰلِكَ أَنَّهُ هَلْ يَتَعَيَّنُ لِلْقِرَاءَةِ فِي الصَّلَاةِ فَاتِحَةُ الْكِتَابِ أَمْ تُجْزِىءُ هِيَ أَوْ غَيْرُهَا؟''

لیکن اختلاف اس بات میں ہے کہ اگر ایک آدمی فاتحہ نہ پڑھے، یعنی فاتحہ کے بغیر کسی اور جگہ سے قرآن پڑھ لے تو کیا نماز ہو جائے گی؟ ''عَلٰى قَوْلَيْنِ مَشْهُوْرَيْنِ'' اس بارے میں دو قول بڑے مشہور ہیں۔ بعض ائمہ کہتے ہیں کہ نماز نہیں ہوگی، ''فَعِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ وَمَنْ وَافَقَهُ مِنْ أَصْحَابِهِ وَغَيْرِهِمْ، أَنَّهَا لَا تَتَعَيَّنُ بَلْ مَهْمَا قَرَأَ مِنَ الْقُرْآنِ أَجْزَأَهُ فِي الصَّلَاةِ'' لیکن امام ابوحنیفہ ؒ اور جو لوگ ان کے موافق ہیں وہ فرماتے ہیں کہ قرآن کہیں سے بھی پڑھ لیں نماز ہو جائے گی۔

مثلاً: ایک آدمی نے فاتحہ نہیں پڑھی، قرآن کی کوئی اور سورت پڑھ لی تو کیا نماز ہوگئی یا باطل ہے کہ دوبارہ

پڑھے؟ وہ صرف یہ فرماتے ہیں کہ ہو جاتی ہے، اس کو دوبارہ نماز نہیں پڑھنی پڑے گی۔ یہ نہیں کہتے کہ لوگ ایسا کریں۔ بات کو سمجھا کریں۔ جیسا کہ اگر ایک آدمی کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکے تو اس کے لیے حکم ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھ لے۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ ہمیشہ بیٹھ کر ہی پڑھے۔ اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کے مقابلہ میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کو آدھا ثواب ملتا ہے۔ ایک آدمی جب کھڑے ہو کر پڑھے گا تو پورا ثواب ہے، بیٹھ کر پڑھے گا تو آدھا ثواب ہے۔ اگر کوئی عذر ہے، مجبوری ہے تو بیٹھ کر بھی پڑھ سکتا ہے۔ یہ مراد نہیں ہوتا کہ ضرور بیٹھ کر ہی پڑھا کرے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ کیا قرآن پاک کا کہیں سے بھی پڑھنا کافی ہو جائے گا یا نہیں؟ اس سے نماز ہوتی ہے یا نہیں؟ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے ساتھی فرماتے ہیں کہ نماز ہو جائے گی۔ وَاحْتَجُّوا بِعُمُوْمِ قَوْلِهٖ تَعَالٰی ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ﴾ اور وہ اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جو کچھ تمہیں قرآن میں سے آتا ہو پڑھ لیا کرو۔

"وَبِمَا ثَبَتَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ مِنْ حَدِيْثِ أَبِيْ هُرَيْرَةَ فِيْ قِصَّةِ الْمُسِيْءِ فِيْ صَلَاتِهٖ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ لَهٗ إِذَا قُمْتَ إِلَى الصَّلَاةِ فَكَبِّرْ ثُمَّ اقْرَأْ مَا تَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ."

اور جیسا کہ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی موجود ہے اس شخص کے قصے میں جو نماز میں غلطی کرتا تھا۔ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ تو تکبیر کہو اور جو تمہیں قرآن یاد ہو وہ پڑھ لیا کرو۔ "قَالُوْا فَأَمَرَهٗ بِقِرَاءَةِ مَا تَيَسَّرَ وَلَمْ يُعَيِّنْ لَهُ الْفَاتِحَةَ وَلَا غَيْرَهَا فَدَلَّ عَلٰى مَا قُلْنَا." احناف کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو تمہیں آسانی سے یاد ہو پڑھ لیا کرو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فاتحہ یا اس کے علاوہ کوئی سورت متعین نہیں فرمائی، لہٰذا ہماری بات ثابت ہو گئی۔ ان کا استدلال اسی سے ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱، ۱۲، الكلام على ما يتعلق بهذا الحديث]

اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ یاد رکھیں! تمام ائمہ متبع قرآن وسنت ہیں۔ اب دیکھیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول بھی نقل فرما رہے ہیں، لیکن امام صاحب یہ نہیں کہتے کہ میری بات یہ ہے، بلکہ امام صاحب نے اس آیت اور اس حدیث مبارک سے استدلال پکڑا جو بخاری میں بھی ہے اور مسلم میں بھی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ان کا مستدل بھی قرآن اور حدیث سے ہوتا ہے۔

باقی فرق یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ائمہ کی فہم میں اختلاف ہوتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک امام کو ایک حدیث

ملی اور ایک امام کو دوسری حدیث ملی تو اس وجہ سے جس کو جو ملی گئی اسی پر قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ جیسے امام جب مصر میں تشریف لے آئے اور وہاں آ کر مطالعہ زیادہ وسیع ہوا تو آپ نے اپنے بہت سے اقوال کو چھوڑ دیا۔ اس لیے کتابوں میں اکثر امام شافعی رحمہ اللہ کے دو قول ہوتے ہیں: ایک ''قولِ قدیم'' کہلاتا ہے اور ایک ''قولِ جدید'' کہلاتا ہے۔ ان کا قولِ قدیم مصر میں آنے سے قبل کا ہے اور قولِ جدید مصر آنے کے بعد کا ہے۔

اسی طرح احناف رحمہم اللہ کی کتابوں میں دیکھیں کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ، امام محمد بن حسن الشیبانی رحمہ اللہ اور امام زفر رحمہ اللہ سب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں، لیکن ان کو بعد میں علوم کی وسعت کے ساتھ علوم کا ذخیرہ ملا تو انہوں نے اپنے استاذ کا قول چھوڑ کر کئی مسائل میں رجوع کر لیا، اس لیے کہ ان کا مقصد اتباع کتاب و سنت ہوتا ہے۔ اب فرق یہ ہوتا ہے کہ ہم کہتے ہیں: یہ کھلی چھٹی ہر آدمی کو نہ دی جائے۔ اگر ہر آدمی کے ہاتھ میں استرا پکڑا دیا جائے تو پھر اللہ رحمت فرمائے کس کا ناک کان سلامت رہے گا؟ یہ اختیار صرف ان کو دو جو علماء ہیں، جن کے پاس اتنا علم ہے اور اتنے دلائل ہیں، کیونکہ قرآن نے بھی ہمیں یہی حکم دیا ہے۔ فرمایا:

﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل: ۴۳]

''اگر تمہیں علم نہیں تو (دوسرے) اہل علم سے پوچھو۔''

اور ان کے مقابلے میں تو ہم بالکل جاہل ہیں۔ اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہے کہ کہاں ان کا تقویٰ، ان کی پرہیز گاری، ان کی عظمت اور کہاں ہم لوگوں کا حال؟ تو اس لیے ہمیشہ ان کو احترام کی نظر سے دیکھا جائے اور ان کے بارے میں حسنِ ظن رکھا جائے۔ جمیع ائمہ محدثین، جمیع ائمہ فقہاء کی کوئی ذاتی غرض نہیں ہوتی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان پر کروڑوں رحمتیں فرمائے۔ کیا ان کا مقصد یہ تھا کہ ہم ایک مسئلہ غلط بیان کریں اور قیامت تک ہم پر عذاب آتا رہے؟ ان کو کوئی فائدہ تھا، کوئی لالچ تھی، کوئی پیسہ تھا، کوئی دولت تھی، کوئی زمین تھی، کوئی جائیداد تھی، کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی طرف سے تحقیق کی اور محنت کی کہ ہم امتِ رسول اللہ ﷺ کے لیے دین کو واضح کر دیں۔ انسان ہے کسی جگہ خطا ہو گئی، کہیں سہو ہو گیا، ایک بات پہنچی ایک نہیں پہنچی، اسی طریقے سے اب احکامات میں مثلاً نماز ہے، حضور ﷺ کی زندگی میں ابھی نماز فرض نہیں تھی، آپ پہلے بھی نماز پڑھتے تھے۔

حضور ﷺ جب معراج پر تشریف لے گئے تو تمام انبیاء علیہم السلام کے امام بنے۔ آپ ﷺ نے تو دو رکعت نماز

وہاں بھی پڑھائی اور اسی طرح تمام انبیاء ﷺ نماز پڑھتے تھے۔ پھر جب سورت ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝۱﴾ نازل ہوئی تو اس کے بعد تین سال وحی نازل نہیں ہوئی، تب بھی حضور ﷺ نماز پڑھتے تھے، اس وقت تو سورت فاتحہ اتری بھی نہیں تھی۔ آخر اس وقت حضور ﷺ نماز میں کیا پڑھتے تھے؟ اس لیے ہمیشہ بڑے ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے کہ دماغ میں کہوں گا کہ سیاہ اتفاق سے ہوگیا، سیاہ نہیں ہے، اصل میں سنہری ہے تو اس ذہن کے ساتھ اگر وہ چلے گا تو پھر حق پر نہیں پہنچے گا۔ حق پر پہنچنے کا معنی یہ ہوتا ہے کہ دماغ کو کھلا رکھ لے کہ اللہ کے احکام ہیں۔

اچھا! اسی طرح حضور ﷺ پوری زندگی امام رہے، آپ ﷺ نے دس نمازیں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے پیچھے پڑھیں، ایک نماز حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑھی اور اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے بھی نمازیں پڑھیں۔ کسی صحیح حدیث مبارک میں یہ بات نہیں ملتی کہ ان نمازوں میں حضور ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھی ہو۔ جب آپ مقتدی ہیں تو آپ نے کیا کیا؟ اور اسی طرح کسی صحیح حدیث میں یہ الفاظ نہیں ملیں گے مثلاً: یہ کہ مقتدی کے لیے یہ حکم ہے، ایک عام فتویٰ ہے کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی، اس کے بغیر نماز ناتمام ہے، اس کے بغیر نماز ناقص ہے، لیکن یہ حکم مقتدی کے لیے ہے، منفرد کے لیے ہے، امام کے لیے ہے، بغیر جماعت کے لیے ہے؟ اب اس کے لیے سارے ذخیرے کو سامنے رکھنا پڑے گا۔ تو "كِتَابُ الصَّلٰوة" کھول کر آپ ساری احادیث پڑھنا شروع کر دیں، پھر انصاف کے ساتھ دیکھیں کہ آپ فیصلہ کیا کرتے ہیں؟ اللہ تبارک وتعالیٰ سب کی نمازیں قبول ومنظور فرمائے، سب کی حاضری قبول ومنظور فرمائے، سب کی تحقیقوں پر ان کو قیامت تک اجر عطا فرمائے۔ اب آپ اسی سے اندازہ لگائیں کہ یہ خود شافعی المسلک ہیں، لیکن پہلا قول امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا نقل کیا ہے۔ اپنے امام کا قول دوسرے نمبر پر ذکر فرمایا۔ سمجھتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردوں کے بھی شاگرد ہیں، لہٰذا استاذ کا مرتبہ استاذ کا مرتبہ ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلے ان کو حق دیا، ان کا قول پہلے نقل فرمایا اور اپنے امام کا قول بعد میں نقل فرمایا۔

اس لیے فرماتے ہیں: "وَالْقَوْلُ الثَّانِيْ: أَنَّهُ تَتَعَيَّنُ قِرَاءَةُ الْفَاتِحَةِ فِي الصَّلَاةِ وَلَا تُجْزِئُ الصَّلَاةُ بِدُوْنِهَا" باقی حضرات فرماتے ہیں کہ فاتحہ ضروری ہے، اس کے بغیر نماز نہیں ہوگی۔ "وَهُوَ قَوْلُ بَقِيَّةِ الْأَئِمَّةِ مَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ وَأَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ وَأَصْحَابُهُمْ وَجُمْهُوْرُ الْعُلَمَاءِ" امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، ان کے

اصحاب اور جمہور علماء ﷭ کی رائے یہی ہے۔

"وَاحْتَجُّوا عَلَى ذَٰلِكَ بِهٰذَا الْحَدِيثِ الْمَذْكُورِ حَيْثُ قَالَ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِ: مَنْ صَلَّى صَلَاةً لَمْ يَقْرَأْ فِيهَا بِأُمِّ الْقُرْآنِ فَهِيَ خِدَاجٌ وَالْخِدَاجُ هُوَ النَّاقِصُ كَمَا فُسِّرَ بِهِ فِي الْحَدِيثِ غَيْرُ تَمَامٍ وَاحْتَجُّوا أَيْضًا بِمَا ثَبَتَ فِي الصَّحِيحَيْنِ مِنْ حَدِيثِ الزُّهْرِيِّ عَنْ مَحْمُودِ بْنِ الرَّبِيعِ عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ، وَفِي صَحِيحِ ابْنِ خُزَيْمَةَ وَابْنِ حِبَّانَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تُجْزِئُ صَلَاةٌ لَا يُقْرَأُ فِيهَا بِأُمِّ الْقُرْآنِ. وَالْأَحَادِيثُ فِي هٰذَا الْبَابِ كَثِيرَةٌ وَوَجْهُ الْمُنَاظَرَةِ هَاهُنَا يَطُولُ ذِكْرُهُ وَقَدْ أَشَرْنَا إِلَى مَأْخَذِهِمْ فِي ذٰلِكَ رَحِمَهُمُ اللّٰهُ." [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۲، الکلام علی ما يتعلق بهذا الحديث]

"ان حضرات نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جو شخص نماز پڑھے اور اس میں فاتحہ نہ پڑھے تو یہ نماز ناقص ہوگی، یعنی تمام نہیں ہوگی۔ اور اس کے بعد فرماتے ہیں: حضرت عبادہ بن صامت ؓ کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اس شخص کی نماز نہیں ہے جو فاتحہ نہ پڑھے۔ اسی طرح ابن خزیمہ اور ابن حبان نے حضرت ابو ہریرہ ؓ سے حدیث نقل فرمائی ہے کہ اس کی نماز پوری نہیں ہوگی جو فاتحہ نہ پڑھے۔ (مفسر ؒ فرماتے ہیں کہ) اس باب میں بہت سی احادیث ہیں، لیکن مناظرانہ انداز میں بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اللہ تعالیٰ سب پر رحمتیں نازل فرمائے۔ ان کے پاس یہ احادیث ہیں اور احناف کے پاس قرآن پاک کی آیت مبارکہ ہے اور صحیح بخاری و مسلم کی حدیث مبارکہ ہے۔ آپ اسی سے اندازہ فرمالیں کہ احناف کی دلیل قرآن کی آیت اور وہ حدیث ہے جو ہم نے ابھی پڑھی ہے، جس کو امام بخاری ؒ اور امام مسلم ؒ نے روایت کیا ہے، لیکن دوسرے مذاہب کے دلائل میں ابن حبان، ابن خزیمہ اور باقی لوگوں کا حوالہ دیا۔ تو جب تمہاری باری آتی ہے تو دوسری کتابوں کی روایات کو بخاری اور مسلم پر ترجیح دیتے ہو؟ اگر امام ابو حنیفہ ؒ بخاری اور مسلم کی حدیثوں پر عمل کریں تب بھی ناراضگی ہو تو اس کا کوئی علاج ہے؟

بعض احادیث کا صحیح معنی:

اسی لیے تو میں نے عرض کیا کہ ان کی یہ دقتِ نظر ہے۔ جیسے عصر کے بعد نماز ہے، فجر کے بعد نماز ہے۔ اب جو نماز سے روکنے والی حدیثیں ہیں کہ فجر کے بعد نماز نہ پڑھو جب تک سورج نہ نکلے، عصر کے بعد نماز نہ پڑھو جب تک

سورج غروب نہ ہو جائے۔ بخاری و مسلم کی حدیثیں ہیں اور جن احادیث میں اجازت کی گنجائش ہے اس پائے کی احادیث مبارکہ نہیں ہیں۔ جن میں اجازت ہے ایک تو عبد مناف کو حکم ہے کہ حضور ﷺ نے حکم دیا کہ لوگوں کو منع نہ کرو، جب نماز پڑھیں پڑھنے دو، جب طواف کریں کرنے دو، جب چاہیں جس وقت ان کا جی چاہے نماز پڑھیں یا طواف کریں۔ اب یہ دیانت داری کی بات ہے، آپ محلے کے ایک امام یا چوکیدار کو حکم دیں مسجد بند نہ کیا کرو، لوگ جب چاہیں انہیں نماز پڑھنے دیا کرو، ان کو کیوں روکتے ہو؟ تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے کہ جب چاہیں فجر والی ظہر کو پڑھ لیں، ظہر والی عصر کو پڑھ لیں۔ معنی ہوتا ہے جی مسجد بند نہ کیا کرو، اس میں اوقات کی اجازت تو نہیں۔

وہاں بھی حضور ﷺ نے عبد مناف کو فرمایا تھا، کیونکہ عبد مناف کا معاملہ یہ تھا کہ جس کو چاہا آنے دیا، جس کو چاہا روک دیا اور جس کو چاہا طواف کرنے دیا۔ جیسے حضور ﷺ حدیبیہ میں موجود ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکے میں آ گئے، قریش مکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کہتے ہیں: تم احرام باندھے ہوئے ہو، تم تو طواف کر لو، عمرہ بھی کر لو۔ تمہارے تو بڑے احسان ہیں ہم پر، لیکن ہم حضور ﷺ کو نہیں کرنے دیتے۔ انہوں نے کہا: حضور ﷺ نہیں کریں گے تو میں بھی نہیں کروں گا، میں بھی بغیر عمرے کے واپس چلا جاؤں گا۔ جب میرے آقا نہ کریں میں کیسے کروں؟ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہر وقت میں اجازت ہے۔ جہاں وقت بتایا وہاں فرمایا: ''لَا صَلَاةَ بَعْدَ الْفَجْرِ'' فجر کے بعد نماز نہ پڑھو۔) اتنا کھلا لفظ جیسے ''لَا صَلَاةَ إِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ'' ہے۔ یہاں تو یہ کہتے ہو کہ سب کے لیے یہ اثر کر رہا ہے وہاں اثر نہیں کر رہا؟ وہاں ''لا'' کی تکوار نہیں چل رہی؟ یہاں ''لا'' تکوار کا کام دیتا ہے۔ اور اس حدیث مبارک میں تکوار کا کام نہیں دیتا؟ وہاں تو کھلے لفظوں میں نفی آ رہی ہے، فجر کے بعد نہیں جب تک سورج نہ نکلے، عصر کے بعد نہیں جب تک سورج نہ ڈوبے، یعنی حضور ﷺ عصر کا نام لے رہے ہیں اور پھر سورج ڈوبنے کا نام لے رہے ہیں، ادھر فجر کا نام لے رہے ہیں، سورج نکلنے کا نام لے رہے ہیں اور جہاں فرما رہے ہیں: نہ روکو، وہاں وقت کا نام نہیں لے رہے۔ جب چاہیں نماز پڑھیں۔ اس لیے جمیع ائمہ کا ماخذ کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنا مذہب واضح کر دیا۔ ہمارا کام کتاب اللہ کی اتباع ہے، ہمارے مراجع سنتِ رسول اللہ ﷺ ہے، اصحابِ رسول اللہ ہیں، بلکہ یہاں تک بھی انہوں نے فرما دیا کہ اگر کل کوئی اتنا بڑا عالم آ جائے جس کو تحقیق ہو جائے کہ میرا کوئی قول حضور ﷺ کے فرمان کے خلاف ہے یا صرف میری تحقیق ہے، لیکن حضور ﷺ کی حدیث مبارک مل جائے تو حضور ﷺ کی حدیث کو لو، میرے قول کی کیا حیثیت ہے؟

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر بعض نامناسب اعتراضات:

اس کے باوجود بھی اگر ہم معاف نہ کریں، گالیاں دیں، ان پر تہمتیں لگائیں، ان کی شان میں کوتاہیاں کریں، ان کے عیب ڈھونڈیں، ان کے نسب پر بحث کریں، ان کی قومیت پر بحث کریں، عمل پر بحث کریں اور اس بات پر بحث کریں کہ انہوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی، پھر تو کوئی بندہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ حضور ﷺ نے بھی کوئی کتاب نہیں لکھی، اس کا کیا جواب دیں گے؟ کیا کتاب کے نہ لکھنے سے حضور ﷺ کی شان میں کوئی کمی آجائے گی؟ ساری دنیا کی کتابیں تو حضور ﷺ کے فرمان سے لکھی جارہی ہیں، ساری دنیا کو جو علم پہنچ رہا ہے، جو فیض پہنچ رہا ہے وہ میرے مدنی پاک ﷺ سے ہی تو پہنچ رہا ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ کے ایک ایک لفظ سے تو کتابیں لکھی گئیں، حضور ﷺ کے ایک ایک فرمان اور ایک ایک حدیث پر کتابیں لکھی گئیں اور قیامت تک لکھی جائیں گی وہ سارا فرمان تو محمد عربی ﷺ کا ہے۔ تو اگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے غلام اور شاگرد آپ کی علمی تحقیقات پر کتابیں لکھتے رہے ہیں تو وہ کتابیں کس کی شمار ہوں گی؟

اس ساری بحث کا مقصد یہ ہے کہ کسی کے بارے میں دل میں برا خیال نہ آئے، بدظنی نہ رکھو، بدگمانی نہ رکھو اور اللہ والوں کے ساتھ عداوت نہ رکھو۔ جو آدمی اللہ والوں سے عداوت رکھتا ہے اور ان کی شان میں کوتاہی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی پکڑ آئے گی۔ اس لیے اللہ نے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا﴾ [الاحزاب: ۵۸]

''اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ان کے کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچاتے ہیں تو انہوں نے بہتان طرازی اور کھلے گناہ کا بوجھ اپنے اوپر لاد لیا ہے۔''

اسی طرح حدیث قدسی میں آتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

((مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۶۵۰۲، باب التواضع]

''جو میرے دوستوں کے ساتھ دشمنی کرے اس سے میں جنگ کا اعلان کر دیتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ جنگ کرے۔''

اللہ تعالیٰ ہمیں سب ائمہ کا ادب نصیب فرمائے۔ وہ بڑے لوگ تھے، بڑی شان تھی۔ اگر امام بخاری رحمہ اللہ بات کریں تو ان کو زیب دیتا ہے، ان کی شان ہے، ان کا مقام ہے اور ان کی عظمتیں ہیں۔ امام مسلم رحمہ اللہ بات کریں، ان کی شان ہے۔ اللہ نے اتنا بڑا علم عطا فرمایا ہے۔ اللہ پاک ان پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔

امام ترمذی رحمہ اللہ کے نزدیک امام بخاری رحمہ اللہ فقیہ نہیں تھے:

امام ترمذی رحمہ اللہ بات کریں تو ان کو زیب دیتا ہے۔ اگرچہ امام ترمذی رحمہ اللہ امام بخاری رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں، امام بخاری رحمہ اللہ کا اتنا بڑا مقام ہے۔ اس کے باوجود ساری ترمذی دیکھ لیں! جہاں حدیث کا مسئلہ آیا، نقد و جرح کا مسئلہ آیا اور سند کا مسئلہ آیا تو امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنے استاذ محمد بن اسماعیل سے پوچھا: اس حدیث کے بارے میں، سند کے بارے میں آپ کا کیا فرمان ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: یہ حدیث صحیح ہے، یہ حدیث غلط ہے، یہ حدیث ضعیف ہے، یہ راوی ثقہ ہے، یہ راوی ضعیف ہے، یہ راوی قابلِ حجت ہے، یہ راوی قابلِ حجت نہیں ہے۔ اور جہاں کوئی فقہ کا مسئلہ آیا تو اپنے استاذ امام بخاری رحمہ اللہ کا ایک قول بھی نقل نہیں کیا، کیونکہ امام ترمذی رحمہ اللہ سمجھتے تھے کہ امام بخاری رحمہ اللہ حدیث میں مقام رکھتے ہیں۔ تفقہ اور فقہ علیحدہ چیز ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہر آدمی کا ایک فن ہے، اللہ نے ان کو حدیث میں امام بنایا ہے، ایک آدمی تفسیر میں مقام رکھتا ہے، حدیث میں اتنا قابل نہیں ہوتا، ایک آدمی کو اللہ نے حدیث میں اتنا اونچا مقام دیا ہوتا ہے، لیکن تفسیر قرآن میں اتنا مقام نہیں ہوتا۔

مؤذنین اور قرآن پڑھنے والوں کی خدمات:

میں تو یہ کہتا ہوں آج کا جو مولوی دیہات کی مسجد میں چار بچے لے پڑھا رہا ہے اس کے لیے بھی دعا کرو کہ وہ دین کا نام تو لے رہا ہے۔ وہ چاہے کسی جماعت سے بھی تعلق رکھتا ہو، مسجد میں بیٹھا ہے، بھیک مانگ کر کھانا کھا رہا ہے، بچے جاتے ہیں، بستیوں سے ایک ایک روٹی لے کر آتے ہیں، پھر بھی وہ پڑا ہوا ہے، صبح کی نماز پڑھ کر چار پانچ بچے بچیاں لے کر بیٹھا ہے، ظہر تک اللہ کا قرآن پڑھا رہا ہے۔ میں کہتا ہوں: ان کے لیے بھی دعا کرو۔ یہی لوگ ہیں جن کی وجہ سے دین باقی ہے، یہی لوگ ہیں جو دین کی جوگ جگائے ہوئے ہیں۔ بستیوں میں اللہ کے قرآن کی آواز گونج رہی ہے، اللہ کے قرآن کی خدمت ہو رہی ہے، کسی انداز میں بھی کر رہا ہے، وہ آدمی کیسا بھی ہو، اگر وہ قرآن پڑھا رہا ہے، ایک حدیث کا ترجمہ بتا رہا ہے اور کچھ بھی نہیں، ایک آدمی کھڑا اذان دے رہا ہے تو اس کے لیے بھی دعا کرو۔ اللہ کا نام پانچ وقت بلند کر کے لوگوں کو جگا رہا ہے۔ اگر ہم اس میں کیڑے نکالنے شروع کر دیں گے تو پھر کیسے کام ہوگا؟

اگر ہم ہر مؤذن کو دیکھیں اور کہیں یار بلال رضی اللہ عنہ جیسا نہیں لگتا۔ پھر تو کام ہو گیا۔ ان شاء اللہ پھر تو کسی مسجد میں

بلال رضی اللہ عنہ کے جوتوں کے برابر بھی کوئی نہیں ہے۔ اگر ہر مؤذن کے بارے میں ہم یہی سوچ سوچیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نظر آئے، ابومحذورہ رضی اللہ عنہ نظر آئے اور عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نظر آئے، یہ تو بڑا مشکل اور ناممکن ہے۔ وہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دور تھا، گزر گیا۔ اللہ تعالیٰ اس دور پر بھی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے، ان صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔

لوگوں کی اسلام سے بیزاری:

اب تو جو کچھ باقی ہے اسی پر شکر کرو، کیونکہ اب تو دنیا قرآن کی منکر ہے، حدیثوں کی منکر ہے۔ اب تو دنیا کھلم کھلا اعلان کرتی ہے کہ اسلام ایک مذہب ہے، انسان کا پرسنل معاملہ ہے، ذاتی معاملہ ہے، وہ اپنے گھر میں عبادات کرتا رہے۔ اسلام کا کیا تعلق کہ ہم اس کو قانون میں لے آئیں، دستور میں لے آئیں، آئین میں لے آئیں یا نظام حکومت کے طور پر تسلیم کریں؟ وہ کہتے ہیں کہ نہیں اسلام تو ہر ایک کا ذاتی مسئلہ ہے، پرسنل معاملہ ہے، نماز پڑھے نہ پڑھے، روزہ رکھتا ہے تو رکھے، نہیں رکھتا تو نہ رکھے۔ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے، پسند نہ پسند ہے۔ جیسے کوئی آدمی منہ دھولیتا ہے اور کوئی آدمی نہیں دھوتا، بعض لوگ استنجا کر لیتے ہیں اور بعض لوگ صرف کاغذ استعمال کرتے ہیں۔ یہ ذاتی مسئلے ہیں۔

اب تو دنیا اس دور میں چلی گئی کہ اسلام اور قرآن کو دین ماننے کے لیے بھی تیار نہیں۔ وہ اسلام کو مذہب مانتے ہیں، دین نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک مذہب ہے۔ مذہب عبادات کے مجموعہ کا نام ہے کہ نماز پڑھا کرو، روزہ رکھا کرو، حج کیا کرو، زکوٰۃ دیا کرو، خیرات کیا کرو، اچھے کام کیا کرو اور برے کاموں سے بچا کرو۔ بس بات ختم ہوگئی۔ وہ کہتے ہیں: یہ تو پرسنل معاملہ ہے۔ اسلام مذہب ہے، دین نہیں ہے۔

جب دنیا دین کا مکمل انکار کرنے کے لیے آچکی ہو اور اس دور میں بھی کوئی دین کا نام لے رہا ہو تو بڑی غنیمت ہے۔ اگر پھر بھی ہم کیڑے نکالیں گے، لوگوں کو لڑائیں گے، لوگوں کو برائیوں پر ابھاریں گے اور انتشار ڈالیں گے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ لوگ اسلام سے اور زیادہ بدظن ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسلام کی طرف جوڑنے کی توفیق دے اور توڑنے سے بچائے۔ اللہ تعالیٰ اس رسی کو مضبوطی سے تھامنے کی توفیق دے اور ہمیں کتاب وسنت کی صحیح اتباع نصیب فرمائے۔

قرأتِ فاتحہ کی بقایا بحث:

پھر اس کے بعد فرماتے ہیں:

''ثُمَّ إِنَّ مَذْهَبَ الشَّافِعِيِّ وَجَمَاعَةٍ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ أَنَّهُ تَجِبُ قِرَاءَتُهَا فِي كُلِّ رَكْعَةٍ وَقَالَ آخَرُونَ: إِنَّمَا تَجِبُ قِرَاءَتُهَا فِي مُعْظَمِ الرَّكَعَاتِ.''

''امام شافعی رحمہ اللہ اور اہل علم کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ ہر رکعت میں فاتحہ ضروری ہے۔ اور باقی ائمہ فرماتے ہیں: ایک میں پڑھ لی اور ایک میں نہ پڑھی تو کوئی حرج نہیں۔''

''وَقَالَ الْحَسَنُ وَأَكْثَرُ الْبَصْرِيِّينَ: إِنَّمَا تَجِبُ قِرَاءَتُهَا فِي رَكْعَةٍ وَاحِدَةٍ مِنَ الصَّلَوَاتِ أَخْذًا بِمُطْلَقِ الْحَدِيثِ لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ.''

حضرت حسن بصری اور بصرے والے حضرات رحمہم اللہ فرماتے ہیں: ایک رکعت میں بھی پڑھ لی تب بھی نماز ہوگی، کیونکہ حدیث میں تو مطلق آیا ہے کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ ہر رکعت کی قید نہیں ہے کہ ہر رکعت میں ضروری ہے۔

''وَقَالَ أَبُو حَنِيفَةَ وَأَصْحَابُهُ وَالثَّوْرِيُّ وَالْأَوْزَاعِيُّ: لَا تَتَعَيَّنُ قِرَاءَتُهَا، بَلْ لَوْ قَرَأَ بِغَيْرِهَا أَجْزَأَهُ لِقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ.''

''امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، ان کے ساتھی، امام ثوری رحمہ اللہ اور امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سورت فاتحہ متعین نہیں ہے، بلکہ اگر اس کے علاوہ کوئی اور سورت پڑھے گا تب بھی کافی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قرآن میں سے جو آسان ہو پڑھ لیا کرو۔)

''وَقَدْ رَوَى ابْنُ مَاجَةَ مِنْ حَدِيثِ أَبِي سُفْيَانَ السَّعْدِيِّ عَنْ أَبِي نَضْرَةَ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ مَرْفُوعًا: لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ فِي كُلِّ رَكْعَةٍ بِالْحَمْدِ وَسُورَةٍ فِي فَرِيضَةٍ أَوْ غَيْرِهَا. وَفِي صِحَّةِ هَذَا نَظَرٌ وَمَوْضِعُ تَحْرِيرِ هَذَا كُلِّهِ فِي كِتَابِ الْأَحْكَامِ الْكَبِيرِ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ.''

اب کہتے ہیں کہ ایک حدیث میں آتا ہے جس کو امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ جو شخص ہر رکعت میں حمد نہ پڑھے اور سورت نہ پڑھے چاہے وہ فرض نماز ہو یا نفل ہو تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ لیکن مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی صحت پر مجھے اعتراض ہے۔ یعنی حدیث صحیح نہیں ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۲، الکلام علی ما یتعلق بهذا الحدیث]

کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟

''والوجه الثالث: هَلْ تَجِبُ قِرَاءَةُ الْفَاتِحَةِ عَلَى الْمَأْمُومِ؟''

اب تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ مقتدی پڑھے یا نہ پڑھے؟ ایک مسئلہ تو یہ تھا کہ مطلقاً قرآن کی کوئی آیت پڑھے یا سورۂ فاتحہ پڑھے، ایک مسئلہ یہ تھا کہ فاتحہ ہر رکعت میں پڑھے یا ایک رکعت میں پڑھے یا تین رکعتوں میں پڑھ لے تو کافی ہو جائے گی۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ مقتدی پڑھے یا نہ پڑھے؟ فرماتے ہیں: ''فِيهِ ثَلَاثَةُ أَقْوَالٍ لِلْعُلَمَاءِ'' اس میں علماء کے تین اقوال ہیں:

1 ...... ''أَحَدُهَا أَنَّهُ تَجِبُ عَلَيْهِ قِرَاءَتُهَا كَمَا تَجِبُ عَلَى إِمَامِهِ لِعُمُومِ الْأَحَادِيثِ الْمُتَقَدِّمَةِ'' ایک قول تو یہ ہے کہ مقتدی پر بھی قرأت واجب ہے جیسے امام پر واجب ہے۔ اس لیے کہ جو حدیثیں ہم پڑھ چکے ہیں وہ عام ہیں۔

2 ...... ''وَالثَّانِي لَا تَجِبُ عَلَى الْمَأْمُومِ قِرَاءَةٌ بِالْكُلِّيَّةِ لَا الْفَاتِحَةُ وَلَا غَيْرُهَا وَلَا فِي الصَّلَاةِ الْجَهْرِيَّةِ وَلَا السِّرِّيَّةِ، لِمَا رَوَاهُ الْإِمَامُ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ فِي مُسْنَدِهِ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: مَنْ كَانَ لَهُ إِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الْإِمَامِ لَهُ قِرَاءَةٌ وَلَكِنْ فِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ . وَرَوَاهُ مَالِكٌ عَنْ وَهْبِ بْنِ كَيْسَانَ عَنْ جَابِرٍ مِنْ كَلَامِهِ، وَقَدْ رُوِيَ هَذَا الْحَدِيثُ مِنْ طُرُقٍ وَلَا يَصِحُّ شَيْءٌ مِنْهَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللَّهُ أَعْلَمُ'' دوسرا قول یہ ہے کہ مقتدی پر فاتحہ پڑھنا واجب ہی نہیں ہے چاہے نماز جہری ہو یا سری ہو۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے یہ حدیث نقل فرمائی ہے کہ جس شخص کا امام ہے تو امام کا پڑھنا اس کا پڑھنا ہے۔ لیکن مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی اسناد کے اندر کمزوری ہے، ضعف پایا جاتا ہے۔ طرق تو اور بھی ہیں، لیکن کوئی طریق صحیح نہیں ہے۔ اگر طریق صحیح نہ ہوں اور متعدد طرق ہوں تو حدیث حسن اور صحیح کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ (جبکہ یہ حدیث صحیح سند کے ساتھ امام ترمذی رحمہ اللہ کے استاذ امام احمد بن منیع رحمہ اللہ کی مسند میں مروی ہے۔ امداد اللہ)

اور دوسری بات یہ کہ فقط یہی حدیث ہو تو پھر تو بات ٹھیک ہے، پھر تو حدیث کمزور اور ضعیف ہے۔ لیکن حدیث ضعیف بھی ہو اور طرق بھی متعدد ہوں، اس کا اصل بھی صحیح حدیث میں موجود ہو تو پھر کیا حکم دیں گے؟ امام صاحب تو فرماتے ہیں کہ قرآن میں ہے: ﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ [الاعراف: ۲۰۴] (اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو کان لگا کر سنو، اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحمت ہو۔) ایک تو قرآن کی یہ آیت ہے اور دوسرا مسلم شریف میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتدی کو سکھلایا اور فرمایا: جب امام تکبیر کہے تم بھی تکبیر کہو، جب وہ پڑھے تو تم چپ رہو۔ اسی حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب امام ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ کہے تو تم آمین کہو۔ تو اس حدیث میں واضح ہو گیا کہ نماز میں

مقتدی امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھے، بلکہ صرف جہری نمازوں میں آمین کہے۔

جہری نمازوں میں فاتحہ امام کے پیچھے نہ پڑھے:

"وَالْقَوْلُ الثَّالِثُ أَنَّهُ تَجِبُ الْقِرَاءَةُ عَلَى الْمَأْمُومِ فِي السِّرِّيَّةِ لِمَا تَقَدَّمَ وَلَا يَجِبُ ذٰلِكَ فِي الْجَهْرِيَّةِ لِمَا ثَبَتَ فِي صَحِيحِ مُسْلِمٍ" جو سری نمازیں ہیں ان میں تو فاتحہ پڑھے، لیکن جو جہری نمازیں ہیں ان میں نہ پڑھے۔ یعنی فجر، مغرب اور عشاء میں تو نہ پڑھے۔ ظہر اور عصر سری نمازیں ہیں ان میں پڑھے۔ یہ حکم مسلم شریف کی حدیث سے ثابت ہے۔

اب صحیح مسلم کی حدیث نقل فرما رہے ہیں۔ فرمایا:

"عَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا... وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوا." [صحیح مسلم، رقم: ۴۰۴، باب التشهد في الصلاة]

"حضور ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا امام اس لیے بنایا گیا ہے کہ تم اس کی اقتداء اور پیروی کرو کہ جب وہ اللہ اکبر کہے تم بھی اللہ اکبر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم چپ رہو۔"

"وَقَدْ صَحَّحَهُ مُسْلِمُ بْنُ الْحَجَّاجِ أَيْضًا" امام مسلم رحمہ اللہ نے اس کو صحیح حدیث کہا ہے۔ "فَدَلَّ هٰذَانِ الْحَدِيثَانِ عَلَى صِحَّةِ هٰذَا الْقَوْلِ" یہ دو حدیثیں تو اس قول کی صحت پر دلالت کر رہی ہیں کہ بھائی! جہری نماز (فجر، مغرب اور عشاء) میں مقتدی نہ پڑھے۔ چلو تین میں تو ہمارے ساتھ آ گئے نا! پانچ نمازوں میں تین زیادہ ہیں یا کم ہیں؟ تو ان تین کے لیے انہوں نے بھی مان لیا کہ صحیح حدیثیں موجود ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: "وَهُوَ قَوْلٌ قَدِيمٌ لِلشَّافِعِيِّ رَحِمَهُ اللّٰهُ: وَرِوَايَةٌ عَنِ الْإِمَامِ أَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلٍ" امام شافعی رحمہ اللہ بھی پہلے یہی کہتے تھے کہ جہری نمازوں میں مقتدی کو قرأت نہیں کرنی چاہیے۔ وہ بھی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے قول پر تھے۔

"وَالْغَرَضُ مِنْ ذِكْرِ هٰذِهِ الْمَسَائِلِ هَاهُنَا بَيَانُ اخْتِصَاصِ سُورَةِ الْفَاتِحَةِ بِأَحْكَامٍ لَا تَتَعَلَّقُ بِغَيْرِهَا مِنَ السُّوَرِ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ."

اب مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ سب اس لیے ذکر کیا ہے کہ فاتحہ کی بڑی شان ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کوئی غلط ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۲، الکلام علی ما یتعلق بہذا الحدیث]

سری نمازوں میں بھی مقتدی پر فاتحہ نہیں ہے:

اب دیکھیں نا! مسلم شریف کی دو حدیثیں اور قرآن کی آیت۔ تو جہری میں تو جھگڑا ہی ختم ہو گیا۔ باقی زیادہ سے زیادہ سری نمازوں کا مسئلہ رہے گا۔ اس بارے میں بھی ان کے پاس وہی عموم حدیث ہے، مقتدی کا لفظ اس میں نہیں ہے۔ اس سب کے باوجود ہم یہ کہتے ہیں کہ تمام امام حق پر ہیں۔ اللہ ان پر رحمت فرمائے۔ ہم ان کی شان میں گستاخی نہیں کر سکتے۔ اللہ ہمیں قیامت تک محفوظ رکھے۔ ہم تو اپنے استاذ کی بے ادبی نہیں کر سکتے تو امام کی بے ادبی کیسے کریں گے؟ ہم نے جس سے ایک سبق پڑھا ہو، دو سبق پڑھے ہوں ہم تو اب بھی اپنے ملک میں جاتے ہیں تو جن جن استاذوں سے میں نے پڑھا ہے...... الحمد للہ!...... ان کی زیارت کے لیے، ان کی ملاقات کے لیے اور ان سے دعائیں حاصل کرنے کے لیے سینکڑوں میل سفر کر کے جاتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔ جو آدمی اپنے بڑے بھائی کو بھی گالی نہ دے سکے وہ اپنے باپ کو کب گالی دے گا؟ جو آدمی اپنے عام علماء کی توہین نہ کر سکے وہ صحابہ کے بارے میں بھی زبان نہیں کھولے گا۔ اب اگر ہمارے دلوں میں شان کم ہوتی جائے گی تو پھر آہستہ آہستہ خدا جانے بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچے گی؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح راستے پر قائم رکھے۔

سونے سے پہلے فاتحہ اور سورۂ اخلاص کا فائدہ:

''وَقَالَ الْحَافِظُ أَبُو بَكْرٍ الْبَزَّارُ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعِيدٍ الْجَوْهَرِيُّ حَدَّثَنَا غَسَّانُ بْنُ عُبَيْدٍ عَنْ أَبِي عِمْرَانَ الْجَوْنِيِّ عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا وَضَعْتَ جَنْبَكَ عَلَى الْفِرَاشِ وَقَرَأْتَ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ وَقُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ فَقَدْ أَمِنْتَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ إِلَّا الْمَوْتَ''

[مسند البزار، حدیث: ۷۳۹۳]

''حضرت ابوبکر بن بزار رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم رات کو سونے کے لیے بستر پر لیٹو۔ اگر اس وقت سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھ لو تو اللہ کی رحمت سے ہر چیز سے امان میں آ جاؤ گے ما سوائے موت کے۔''

یعنی موت تو نہیں ٹل سکتی، باقی ہر چیز سے تمہاری حفاظت ہو جائے گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں ہر پریشانی سے، ہر تکلیف سے، ہر حادثے سے، ہر جادو سے اور موت کے سوا ہر چیز سے محفوظ فرما دیں گے۔ تو کتنی بڑی نعمت ہے؟ لہٰذا سوتے وقت کونسا مشکل ہے کہ آدمی سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھ لے۔ دو منٹ نہیں لگتے۔

تلاوتِ قرآن سے پہلے تعوذ پڑھنا:

اب مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى: ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ. وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ وَقَالَ تَعَالَى: ﴿ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ. وَقُلْ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَحْضُرُونِ﴾ وَقَالَ تَعَالَى: ﴿ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ. وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ. وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ فَهٰذِهِ ثَلَاثُ آيَاتٍ لَيْسَ لَهُنَّ رَابِعَةٌ فِي مَعْنَاهَا وهو أن الله تعالى يَأْمُرُ بِمُصَانَعَةِ الْعَدُوِّ الْإِنْسِيِّ وَالْإِحْسَانِ إِلَيْهِ لِيَرُدَّهُ عَنْهُ طَبْعُهُ الطَّيِّبُ الْأَصْلِ إِلَى الْمُوَادَّةِ وَالْمُصَافَاةِ، وَيَأْمُرُ بِالِاسْتِعَاذَةِ بِهِ مِنَ الْعَدُوِّ الشَّيْطَانِيِّ لَا مَحَالَةَ إِذْ لَا يَقْبَلُ مُصَانَعَةً وَلَا إِحْسَانًا وَلَا يَبْتَغِي غَيْرَ هَلَاكِ ابْنِ آدَمَ لِشِدَّةِ الْعَدَاوَةِ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أَبِيهِ آدَمَ مِنْ قَبْلُ كَمَا قَالَ تَعَالَى: ﴿يَا بَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ﴾ "

ایک تو انسانوں میں سے دشمن ہوتا ہے اور دوسرا جنوں میں سے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان آیات میں حکم دیا ہے کہ انسانوں میں سے جو دشمن ہے اس کے ساتھ بہتر سلوک کرو، اس کے ساتھ احسان کرو، اس کی برائی کا بدلہ بھلائی سے دو اور اس کی گالیوں کا بدلہ دعاؤں سے دو، تاکہ وہ راضی ہو جائے اور آہستہ آہستہ تمہارے اور اس کے درمیان مودت قائم ہو جائے۔

شیطان کی انسان سے دشمنی:

اور جب شیطان دشمن کا معاملہ آجائے تو پھر میری پناہ میں آجاؤ، کیونکہ بندے تو کسی احسان سے راضی ہو سکتے ہیں، شیطان تو احسان سے راضی نہیں ہو سکتا تا!

ہمارے ایک زمیندار (پتا نہیں مر گئے ہیں یا زندہ ہیں؟) ایک مثال دیتے تھے۔ مثال بڑی فٹ آتی تھی۔ کہتے تھے کہ خنزیر نے تمہارے سلام کا جواب تو نہیں دینا، تمہیں اٹھا کر ٹکڑے کر دینا ہے۔ مثال بڑی اچھی تھی۔ شیطان پر تم جو بھی احسان کرو اس کو احسان سے کیا مطلب ہے؟ اس کو تو عداوت ہے، وہ تمہیں ہلاک کرنا چاہتا ہے، وہ تمہیں

برباد کرنا چاہتا ہے۔ نہ اس کو تمہارے مال کی ضرورت ہے، نہ احسان کی ضرورت ہے اور نہ تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے، کیونکہ وہ تو قیامت تک ملعون ہو گیا ہے۔ تمہاری دعاؤں سے وہ کیوں راضی ہوگا؟ تمہاری اچھائیوں سے وہ کیوں راضی ہوگا؟ بابا آدم علیہ السلام سے دشمنی ختم نہیں ہوئی اور جب تک اللہ پاک اس کو موت نہیں دیں گے یہ دشمنی چل رہی ہے۔ اس لیے فرماتے ہیں کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور یہ بھی فرمایا:

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا﴾

[الاعراف:۲۷]

"اے اولادِ آدم! تمہیں شیطان کسی دھوکے میں نہ ڈال دے جیسے تمہارے والدین کو اس نے جنت سے نکلوا دیا تھا۔ ایسی حالت سے کہ ان کا لباس بھی ان سے اتروا دیا، تا کہ ان کو ان کا پردہ کا بدن دکھلائی دینے لگے۔"

اور فرمایا:

﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ۭ﴾

[فاطر:۶]

"شیطان تمہارا دشمن ہے۔ دشمن کو دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنی جماعت کی طرف بلاتا ہے، تا کہ وہ بھی جہنمی بنیں۔"

کیونکہ اس کو تو پتا کہ میں نے تو جہنم میں جانا ہے۔ اب وہ اپنی برادری اکٹھی کر رہا ہے، تا کہ وہ بھی جہنم میں جائے۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/ ۱۲، ۱۳، تفسیر الاستعاذۃ واحکامہا]

ہمارے ایک مجذوب کی مثال:

ویسے ہمارا ایک فقیر تھا، طالب علم تھا، بے چارہ سیدھا سادھا مجذوب آدمی تھا۔ وہ پڑھتا تھا۔ کبھی کبھی کہتا تھا: جی صاحب! ساری رونق تو جہنم میں ہوگی، گانے والے ادھر ہوں گے، بجانے والے سارے ادھر ہوں گے، ادھر تو تم سب مولوی وغیرہ تسبیح والے ہوں گے، کوئی ہاتھ میں تسبیح لیے ہوئے ہوگا، کسی نے پگڑی باندھی ہوئی ہوگی، رونق وغیرہ تو سب ادھر ہوگی، سارے رونق میلے ادھر ہوں گے۔ آپ لوگ جنت میں سارے داڑھیوں والے مولوی چپ چپاتے کوئی قصہ نہیں، کوئی قوالی نہیں، کوئی مجرا نہیں، کوئی گانا نہیں، کچھ نہیں، زیادہ سے زیادہ تم لوگوں کو شوق چڑھے گا تو تم لوگ قرآن پڑھ لو گے بس!! کیونکہ اللہ نے فرمایا شیطان اپنی پارٹی کو لے جا رہا ہے کہ میں جہنم میں اکیلا تو نہ رہوں، وہ بھی تو اپنی پارٹی بنا رہا ہے۔

﴿أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۚ بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا ﴾ [الکہف:۵۰]

''لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم شیطان اور اس کی ذریت کو میرے سوا دوست بناتے ہو؟ اور وہ تمہارا دشمن ہے۔ (اللہ تعالیٰ کا) کتنا برا متبادل ہے جو ظالموں کو ملا ہے۔''

''وَقَدْ أَقْسَمَ لِلْوَالِدِ آدَمَ عليه السلام أَنَّهُ لَهُ لَمِنَ النَّاصِحِينَ وَكَذَبَ فَكَيْفَ مُعَامَلَتُهُ لَنَا وَقَدْ قَالَ: ﴿فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝﴾''

اتنا تو فرق کرو کہ ابا آدم علیہ السلام کے سامنے اس نے خیر خواہی کی قسمیں کھائیں اور جھوٹ بولا، قسم کھا کر بھی جھوٹ بولا اور انہیں جنت سے نکلوایا اور تمہارے سامنے تو اس نے تمہاری خیر خواہی کی قسم بھی نہیں کھائی، بلکہ کھل کر اور قسم کھا کر کہا: میں تمہیں گمراہ کروں گا۔ پھر اس کی عداوت کا کیا عالم ہوگا؟ وہاں تو خیر خواہی کی قسمیں کھائی تھیں اور یہاں گمراہ کرنے کی قسمیں کھا رہا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝﴾ [ص:۸۲]

''شیطان نے کہا: اے رب کریم! مجھے تیری عزت اور جلال کی قسم! میں ان سب کو گمراہ کروں گا۔''

﴿إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝﴾ [ص:۸۳]

''مگر جو بندے خالص تیرے بندے ہیں ان پر میرا زور نہیں چلے گا۔''

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝﴾ [النحل:۹۸،۹۹]

''میرا مدنی! جب آپ قرآن پڑھنے کا ارادہ کریں تو پہلے ''أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ'' پڑھ لیا کریں، کیونکہ جب آپ میری پناہ میں آجائیں گے یقیناً اس کا کوئی غلبہ، کوئی طاقت اور کوئی قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر (دل سے) بھروسہ رکھتے ہیں۔''

﴿إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ ۝﴾ [النحل:۱۰۰]

''اس کا غلبہ ان لوگوں پر ہے جو شیطان سے دوستی بناتے ہیں اور جو شرک کرتے ہیں۔''

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳ تفسير الاستعاذة وأحكامها]

تلاوت کے بعد تعوذ پڑھنے کا فائدہ:

''قَالَتْ طَائِفَةٌ مِنَ الْقُرَّاءِ وَغَيْرِهِمْ: نَتَعَوَّذُ بَعْدَ الْقِرَاءَةِ وَاعْتَمَدُوا عَلَى ظَاهِرِ سِيَاقِ الْآيَةِ، وَلِدَفْعِ الْإِعْجَابِ بَعْدَ فَرَاغِ الْعِبَادَةِ.''

قراء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ جب قرآن کی تلاوت کر لے، قرآن پڑھ لے تو تعوذ بعد میں پڑھے، کیونکہ ظاہر آیت کا یہی حکم ہے۔ ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ﴾ [النحل:۹۸] (جب تم قرآن کی تلاوت کر چکو تو تعوذ پڑھو) اور اس لیے بھی کہ قرآن پڑھنے کے بعد دل میں کوئی عجب وتکبر بھی پیدا نہ ہو کہ میں دس پارے پڑھے ہیں، تیس پارے پڑھے ہیں، میں بڑا قرآن پڑھنے والا ہوں۔ تو تعوذ پڑھ لے گا تو شیطان کے ان وسوسوں سے، ریا سے اور تکبر سے بچ جائے گا۔

مشہور قاری حضرت حمزہ رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں۔ مفسر فرماتے ہیں:

''وَمِمَّنْ ذَهَبَ إِلَى ذَلِكَ حَمْزَةُ فِيمَا نَقَلَهُ عَنْهُ ابْنُ قَلُوقَا وَأَبُو حَاتِمٍ السِّجِسْتَانِيُّ، حَكَى ذَلِكَ أَبُو الْقَاسِمِ يُوسُفُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ جُبَارَةَ الْهُذَلِيُّ الْمَغْرِبِيُّ فِي كِتَابِهِ الْكَامِلِ وَرُوِيَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَيْضًا وَهُوَ غَرِيبٌ. وَنَقَلَهُ مُحَمَّدُ بْنُ عُمَرَ الرَّازِيُّ فِي تَفْسِيرِهِ عَنِ ابْنِ سِيرِينَ فِي رِوَايَةٍ عَنْهُ قَالَ: وَهُوَ قَوْلُ إِبْرَاهِيمَ النَّخَعِيِّ وَدَاوُدَ بْنِ عَلِيٍّ الْأَصْبَهَانِيِّ الظَّاهِرِيِّ. وَحَكَى الْقُرْطُبِيُّ عَنْ أَبِي بَكْرِ بْنِ الْعَرَبِيِّ عَنِ الْمَجْمُوعَةِ عَنْ مَالِكٍ رَحِمَهُ اللَّهُ: أَنَّ الْقَارِئَ يَتَعَوَّذُ بَعْدَ الْفَاتِحَةِ، وَاسْتَغْرَبَهُ ابْنُ الْعَرَبِيِّ.''

انہوں نے کہا: فاتحہ پڑھ کر پھر پڑھے۔ ''وَحَكَى قَوْلًا ثَالِثًا وَهُوَ الِاسْتِعَاذَةُ أَوَّلًا وَآخِرًا جَمْعًا بَيْنَ الدَّلِيلَيْنِ، نَقَلَهُ الرَّازِيُّ.'' بعض لوگوں نے کہا کہ تعوذ پہلے بھی پڑھے اور جب قرآن مکمل کرے تب بھی پڑھے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳، تفسیر الاستعاذة وأحكامها]

تلاوت سے پہلے تعوذ پڑھنا صحیح ہے:

اور جمہور کا قول یہ ہے کہ قرآن پڑھنے سے پہلے پڑھے، تاکہ وساوس سے بچے ''وَمَعْنَى الْآيَةِ عِنْدَهُمْ ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾ أَيْ إِذَا أَرَدْتَ الْقِرَاءَةَ'' جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو۔ ''كَقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ﴾ أَيْ إِذَا أَرَدْتُمُ الْقِيَامَ'' جب تم

نماز پڑھنے کا ارادہ کرو تو وضو کرو۔" وَالدَّلِيلُ عَلٰى ذٰلِكَ الْأَحَادِيثُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِذٰلِكَ. "اور اس پر دلیل احادیث مبارکہ ہیں۔ بہر حال! جمہور کا قول یہ ہے کہ قرآن شروع کرنے سے پہلے تعوذ، پھر تسمیہ پڑھیں اور پھر قرآن پاک کی تلاوت کریں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳ تفسیر الاستعاذة وأحكامها]

رات کے وقت نماز میں تعوذ پڑھنا:

"قَالَ الْإِمَامُ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ رَحِمَهُ اللّٰهُ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ بْنِ أَنَسٍ حَدَّثَنَا جَعْفَرُ بْنُ سُلَيْمَانَ عَنْ عَلِيِّ بْنِ عَلِيٍّ الرِّفَاعِيِّ الْيَشْكُرِيِّ عَنْ أَبِي الْمُتَوَكِّلِ النَّاجِيِّ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ فَاسْتَفْتَحَ صَلَاتَهُ وَكَبَّرَ قَالَ: سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالَى جَدُّكَ، وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ، وَيَقُولُ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ ثَلَاثًا، ثُمَّ يَقُولُ: أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ. وَقَدْ رَوَاهُ أَهْلُ السُّنَنِ الْأَرْبَعَةِ مِنْ رِوَايَةِ جَعْفَرِ بْنِ سُلَيْمَانَ عَنْ عَلِيِّ بْنِ عَلِيٍّ وَهُوَ الرِّفَاعِيُّ، وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: هُوَ أَشْهَرُ شَيْءٍ فِي هٰذَا الْبَابِ، وَقَدْ فُسِّرَ الْهَمْزُ بِالْمُوتَةِ وَهِيَ الْخَنْقُ، وَالنَّفْخُ بِالْكِبْرِ وَالنَّفْثُ بِالشِّعْرِ. كَمَا رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ مِنْ حَدِيثِ شُعْبَةَ عَنْ عَمْرِو بْنِ مُرَّةَ عَنْ عَاصِمٍ الْعَنَزِيِّ عَنْ نَافِعِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ الْمُطْعِمِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ دَخَلَ فِي الصَّلَاةِ قَالَ: اللّٰهُ أَكْبَرُ كَبِيرًا ثَلَاثًا، الْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيرًا ثَلَاثًا، سُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ثَلَاثًا، اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ."

اب مفسر رحمہ اللہ استعاذہ کے بارے میں احکام نقل فرمارہے ہیں کہ "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ" کس وقت وقت پڑھیں؟

ایک قول تو یہ ہے کہ تلاوت ختم کرنے کے بعد پڑھیں۔ انہوں نے ظاہر آیت کو لے لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ﴾ (جب تم قرأت قرآن، تلاوت قرآن کر چکو تو اللہ کی پناہ پکڑو۔) تو اس لیے بعض ائمہ کا قول یہ ہوا کہ جب آدمی تلاوت کرلے تو آخر میں "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ" پڑھے، تاکہ شیطان قرآن کی تلاوت کی وجہ سے اس کو تکبر میں، ریا میں اور شہرت طلبی میں مبتلا نہ کردے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ جب قرآن شروع کرے تب بھی "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ" پڑھے اور جب ختم کرے تب بھی "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ" پڑھے، تاکہ پہلے بھی اللہ کی پناہ میں آجائے اور بعد میں

بھی اللہ کی پناہ میں آ جائے۔

اب یہ تین قول آ گئے، لیکن راجح قول جمہور کے نزدیک یہ ہے "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" پہلے پڑھیں۔ یہ سب کے نزدیک زیادہ راجح قول ہے۔

اسی پر مفسر رحمہ اللہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی نقل کردہ حدیث مبارکہ کا ذکر فرما رہے ہیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نماز کے لیے کھڑے ہوتے اور نماز شروع فرماتے ہوئے تکبیر کہتے تو "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ، وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" تین دفعہ پڑھتے اور پھر "أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ۔" پڑھتے۔ [مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۱۱۴۷۳]

معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فاتحہ پڑھنے سے پہلے پہلے "أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ" پڑھتے تھے۔ اس سے مفسر رحمہ اللہ کا استدلال یہ ہے کہ قرآن پڑھنے سے پہلے تعوذ پڑھنا چاہیے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳ تفسير الاستعاذة وأحكامها]

ایک بات یہ بھی یاد رکھیں کہ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع فرماتے تو تکبیر کے بعد یہ کلمات پڑھتے تھے:

﴿إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾... ﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهُ ۚ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ﴾

[شعب الایمان، حدیث: ۲۸۶۳]

"میں اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا سب سے یکسو ہو کر اور میں شرک کرنے والوں سے نہیں ہوں...... آپ فرما دیجیے کہ بالیقین میری نماز، میری ساری عبادت، میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے، جو مالک ہے سارے جہان کا اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور مجھ کو اس کا حکم ہوا ہے اور میں سب ماننے والوں سے پہلا ہوں۔"

اور اسی طرح یہ بھی آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "اللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ، كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، اللّٰهُمَّ نَقِّنِي مِنَ الْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، اللّٰهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَايَ بِالْمَاءِ

وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ" بھی پڑھا ہے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۴، باب: ما یقول بعد التکبیر]

تعوذ کے مختلف کلمات:

تو یاد رکھیں! اصل بات یہ ہے کہ مختلف اوقات میں، مختلف نمازوں میں حضور پاک ﷺ کا کلام مبارک ہے۔ تو بعض روایات میں یہ بھی موجود ہے کہ کبھی آپ نے یہ پڑھا، کبھی آپ نے یہ پڑھا۔ جیسے کبھی تو آپ ﷺ نے "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ" پڑھا اور کبھی "أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ" پڑھا۔ اور بعض روایتوں میں تو "أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ" بھی ملتا ہے۔ اس لیے یہ تعارض نہیں ہوتا اور پھر یہ رات کی نماز ہے، تہجد کی نماز ہے اور نوافل کے اندر بڑی وسعت ہوتی ہے۔ نوافل کے اندر آدمی "اَللّٰهُ أَكْبَرُ كَبِيْرًا وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّأَصِيْلًا" اسی طرح "اَللّٰهُ أَكْبَرُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" بھی پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح "اَللّٰهُ أَكْبَرُ إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" جو بھی پڑھ رہا ہے، ٹھیک ہے، کیونکہ نفل کے اندر بڑی وسعت ہوتی ہے اور حضور ﷺ کا مختلف اوقات مبارکہ میں یہ پڑھنا ثابت ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳، تفسیر الاستعاذة وأحکامها]

نماز میں ثنا:

بعض ائمہ کرام نے جیسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب نے "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ" ہی کو زیادہ افضل جانتے تھے، یعنی زیادہ افضل اور اولیٰ یہ ہے۔ نماز میں پڑھنے کے لیے یہی معروف ثنا پڑھے۔ اب جناب! حضور ﷺ نے شیطان مردود کے فتنے سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی پناہ پکڑی ہے، جو سننے والا ہے، دیکھنے والا ہے۔

"هُمَزَةٌ" اور "لُمَزَةٌ" کا معنی:

"مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ" اور اسی کو اہل السنن الاربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔

"هَمْز" کا ایک معنی "خَنْق" ہوتا ہے۔ اور "خَنْق" کا معنی یہ ہے کہ کسی کا گلا گھونٹ کر مار ڈالنا۔ یعنی کسی کو

ایسی موت دینا کہ گلا ہی بند ہو جائے کہ زبان پر کلمہ شریف بھی نہیں آرہا ہے۔

ایمان پر موت کی حالتیں:

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اہل اللہ کی بھی زبان بند ہو جاتی ہے، لیکن ان کا معاملہ تو اللہ کے ساتھ ہے نا! ان کے دل میں کلمہ ہے اور اس سے پہلے وہ اللہ کا ذکر کرتے رہے، ان کی موت ایمان پر آئی، یہ تو اللہ جانتا ہے، ہم تو اس کی گواہی نہیں دے سکتے۔ ہم ان کے ظاہری حالات کے مطابق کہیں گے: الحمد اللہ! آدمی صالح تھا، پوری زندگی دین پر گزری۔ خدا خاتمہ اچھا کر دے اور اللہ پاک جنت نصیب کر دے۔ کیونکہ ہم تو ظاہر جانتے ہیں، باطن کے معاملات اللہ کے سپرد ہیں، لیکن ایک آدمی کا موت کے وقت ہم کلمہ بھی سن لیں کہ وہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" پڑھ رہا ہو اور لوگوں کو گواہ بنا رہا ہو کہ تم بھی گواہ بن جاؤ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" اور موت آ جائے تو ہم کہیں گے: سبحان اللہ! حضور ﷺ نے فرمایا: "مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ" جس کا آخری کلمہ اللہ کی توحید کا کلمہ ہو تو سمجھو کہ جنت میں داخل ہو گیا۔ یعنی جب اللہ نے خاتمہ اچھا کر دیا "خِتَامُهُ مِسْكٌ" ہو گیا تو اگلی منزلیں خود بخود آسان ہو جائیں گی۔ [سنن أبي داود، حديث: ٣١١٦، باب في التلقين]

حضور ﷺ کی دعا:

اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا: میرے اللہ! مجھے اس کے ایسے حملے سے بچانا کہ وہ ہماری گردن گھونٹ ڈالے اور ہم اللہ کے ذکر سے محروم ہو جائیں، یا میرا اللہ! اس کے کبر کے حملے سے بچانا اور اس کے شر کے حملے سے بچانا۔

شیطانی حملوں کے مختلف طریقے:

شیطان کے حملے مختلف طریقے کے ہوتے ہیں۔ اہلِ علم کو گمراہ کرنے کے لیے اس کے الگ طریقے ہیں، اہلِ عبادت کو گمراہ کرنے کے لیے الگ طریقے ہیں اور جہلاء کو گمراہ کرنے کے الگ طریقے ہیں، حتیٰ کہ بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی قدرت سے بعض اہل اللہ کے ایسے حالات فرمائے کہ شیطان ان کے سامنے آ گیا، کیونکہ شیطان مختلف شکلوں میں سامنے آسکتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے شیطان کو کیسے پکڑا؟

جیسے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے شیطان کو پکڑ بھی لیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جب صدقہ کی کھجوروں پر پہرہ دیتے تھے

اور شیطان شرارت کرنے کے لیے آتا تھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے آخر پکڑ لیا۔ اس نے کہا: آپ مجھے چھوڑ دو تو تمہیں ایک ایسا کلام سکھا دیتا ہوں کہ آئندہ کوئی جن تیرے قریب ہی نہیں آئے گا۔ تو اس نے قرآن پاک کی آیات اور آیت الکرسی کی تعلیم دی۔ صبح کو جب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہی تو شیطان تھا، لیکن ...... کبھی جھوٹا بندہ بھی سچ بول لیتا ہے۔ وہ تھا تو جھوٹا، لیکن تمہیں جو بات کہہ گیا بات ٹھیک ہے۔ [صحیح البخاري، حدیث: ۲۳۱۱، باب: إِذَا وَكَّلَ رَجُلًا فَتَرَكَ الوَكِيلُ ...]

شیطان کے ستر ہزار جال:

بہرحال شیطان نے کہا: میں عابد لوگوں کو گمراہی میں ڈالنے کے لیے ستر ہزار نورانی جال استعمال کرتا ہوں۔ یعنی وہ جال بظاہر نور کے ہوتے ہیں اور روشن خیال آدمی ان میں ایسے الجھ جاتا ہے کہ اس کو نور دین سمجھتے ہوئے گمراہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ بدعات میں الجھ گئے، کیونکہ شیطان نے مزین کر دیا کہ یہ بدعت نہیں ہے، یہ تو دین ہے۔ اس کو دین بنا کر ان کے دماغوں میں بٹھا دیا ہے۔ اب آدمی لاکھ زور لگا تا رہے، دین کو کیسے چھوڑیں گے؟ ان بے چاروں نے تو یہی سمجھا ہوا ہے کہ یہ دین ہے۔ اسی طریقے سے وہ آدمی کو گمراہ کرنے کے لیے مختلف حیلے اور بہانے استعمال کرتا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "أَعُوذُ بِاللَّهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ" سے پناہ پکڑی۔

اب اسی کے مطابق مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دوسری حدیث میں بھی آیا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

"كَمَا رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ مِنْ حَدِيثِ شُعْبَةَ عَنْ عَمْرِو بْنِ مُرَّةَ عَنْ عَاصِمٍ الْعَنَزِيِّ عَنْ نَافِعِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ الْمُطْعِمِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ دَخَلَ فِي الصَّلَاةِ قَالَ: اللَّهُ أَكْبَرُ كَبِيرًا ثَلَاثًا، الْحَمْدُ لِلَّهِ كَثِيرًا ثَلَاثًا، سُبْحَانَ اللَّهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ثَلَاثًا، اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ. قَالَ عَمْرٌو: هَمْزُهُ الْمُوتَةُ وَنَفْخُهُ الْكِبْرُ وَنَفْثُهُ الشِّعْرُ، وَقَالَ ابْنُ مَاجَهْ: حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ الْمُنْذِرِ حَدَّثَنَا ابْنُ فُضَيْلٍ حَدَّثَنَا عَطَاءُ بْنُ السَّائِبِ عَنْ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمَنِ السُّلَمِيِّ عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ وَهَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ قَالَ: هَمْزُهُ الموتة وَنَفْخُهُ الْكِبْرُ وَنَفْثُهُ الشِّعْرُ. وَقَالَ الْإِمَامُ أَحْمَدُ: حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ يُوسُفَ، حَدَّثَنَا شَرِيكٌ عَنْ يَعْلَى بْنِ عَطَاءٍ عَنْ رَجُلٍ حَدَّثَهُ أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا أُمَامَةَ الْبَاهِلِيَّ يَقُولُ: كَانَ

رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ كَبَّرَ ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ قَالَ: أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ.
وَقَالَ الْحَافِظُ أَبُو يَعْلَى أَحْمَدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ الْمُثَنَّى الْمَوْصِلِيُّ فِي مُسْنَدِهِ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ بْنِ أَبَانِ الْكُوفِي، حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ هَاشِمِ بْنِ الْبَرِيدِ عَنْ يَزِيدَ بْنِ زِيَادٍ عَنْ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ عُمَيْرٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِي لَيْلَى عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: تَلَاحَى رَجُلَانِ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَمَزَّعَ أَنْفُ أَحَدِهِمَا غَضَبًا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنِّي لَأَعْلَمُ شَيْئًا لَوْ قَالَهُ لَذَهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ: أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ"

دوسری حدیث نافع بن جبیر بن المطعم ﷛ سے آتی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳ تفسیر الاستعاذۃ واحکامہا]

غصہ دبانے کا عمل:

"وَقَالَ الْحَافِظُ أَبُو يَعْلَى أَحْمَدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ الْمُثَنَّى الْمَوْصِلِيُّ فِي مُسْنَدِهِ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ بْنِ أَبَانِ الْكُوفِي، حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ هَاشِمِ بْنِ الْبَرِيدِ عَنْ يَزِيدَ بْنِ زِيَادٍ عَنْ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ عُمَيْرٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِي لَيْلَى عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: تَلَاحَى رَجُلَانِ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَصَدَّعَ أَنْفُ أَحَدِهِمَا غَضَبًا، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنِّي لَأَعْلَمُ شَيْئًا لَوْ قَالَهُ لَذَهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ: أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ." [الاحادیث المختارۃ، حدیث: ۱۲۳۶]

حضرت ابی ابن کعب ﷛ روایت فرماتے ہیں: دو آدمیوں نے حضور پاک ﷺ کے قریب جھگڑا کیا، آپس میں کسی بات پر جھگڑ پڑے، غصے میں آدمی کی ناک سرخ ہوگئی، پھول گئی، جیسے ناک پھٹ رہی ہو...... آپ نے دیکھا ہے کہ جب آدمی کو غصہ آتا ہے اس کی آنکھیں سرخ ہوتی ہیں اور نتھنے پھڑک رہے ہوتے ہیں۔ تو حضور ﷺ نے جب اس کی حالت کو دیکھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے ایک ایسی چیز کا پتا ہے اگر یہ پڑھ لے تو غصہ چلا جائے گا۔ اور وہ چیز ہے "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ" یعنی فوراً اللہ کی پناہ میں آجائے، کیونکہ اللہ معاف فرمائے! انسان غصے کی حالت میں حدود سے نکل جاتا ہے۔ غصے کے عالم میں انسان کی زبان سے ایسے ایسے الفاظ صادر ہوتے ہیں کہ اللہ کی پناہ۔ اللہ معاف فرمائے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: اگر یہ پڑھ لیتا اور اللہ کی پناہ میں آجاتا تو

شیطان کے فتنے سے بچ جاتا، کیونکہ غصے میں یہ بھی طریقہ ہے کہ اور غصہ دلایا، حتیٰ کہ آدمی پھر کفر بکنا شروع کر دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ آدمی غصے میں پہلے اسے گالی دیتا ہے، پھر اس کے باپ کو گالی دیتا ہے، پھر اس کے مرشد کو گالی دیتا ہے، پھر اس کے استاد کو گالی دیتا ہے، پھر اس کے دین کو گالی دیتا ہے، پھر اس کے ایمان کو گالی دیتا ہے اور اس کے مذہب کو گالی دیتا ہے۔ انسان حدودِ کفر میں داخل ہو گیا۔

غصہ کی حالتیں اور علاج:

تو اگر آدمی غصہ کے وقت "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ" پڑھ لے تو شیطان کے حملے سے بچ گیا۔ جب شیطان کے حملے سے بچ گیا تو الحمد للہ!۔ اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا: اگر غصہ بہت زیادہ ہو اور آدمی کھڑا ہو تو بیٹھ جائے۔ اور فرمایا: بہت زیادہ غصہ آیا ہے اور بیٹھا ہے تو لیٹ جائے اور اس سے بھی غصہ نہیں اتر رہا تو "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ" پڑھ کر وضو کر لے تو غصہ چلا جائے گا۔ [سنن أبي داود، حدیث: ۴۷۸۲، ۴۷۸۳، باب: ما يُقال عند الغضب]

غصہ کرنا بڑی خطرناک چیز ہے!

غصہ کرنا بھی بڑی بری چیز ہے۔ اس لیے ایک حدیث مبارک میں آتا ہے کہ ایک صحابی حضور ﷺ کی خدمت میں آئے، انہوں نے عرض کیا: "أَوْصِنِيْ" مجھے آپ نصیحت فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "لَا تَغْضَبْ" غصہ نہ کیا کرو۔ اس نے دوبارہ عرض کیا: حضور! مزید کوئی نصیحت فرمائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بس غصہ نہ کیا کرو۔ اس نے دوبارہ عرض کیا: حضور! مزید کوئی نصیحت فرمائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بس غصہ نہ کیا کرو۔

[صحيح البخاري، حدیث: ۶۱۱۶، باب: الحذر من الغضب]

اللہ پاک معاف فرمائے۔ غصہ ایسی چیز ہے۔ دیکھا نہیں کہ لوگ آجاتے ہیں کہ جی گھر میں لڑائی ہو گئی اور میں نے بیوی کو طلاق دے دی، گھر میں لڑائی ہو گئی اور میں نے بیٹے کو عاق کر دیا، گھر میں لڑائی ہو گئی اور میں نے گھر والوں کو گھر سے نکال دیا۔ تو یہ ساری چیزیں غصے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور خدا کی قدرت ہے کہ غصہ ایک آگ ہے اور شیطان بھی آگ ہے۔ جب دو آگیں مل جائیں تو پھر آدمی پھٹے گا نہیں تو اور کیا ہوگا؟ غصے میں آگ ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں! ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے بدن سے چنگاریاں نکل رہی ہیں اور بال کھڑے ہو رہے ہیں اور آدمی سرخ ہو رہا ہے اور بدن سارا گرم ہو گیا ہے۔ اور شیطان بھی آگ ہے۔ کیونکہ ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ﴾ [الكهف: ۵۰]

(شیطان تو اصل جن ہے) اور جن آگ سے بنی ہوئی مخلوق ہے۔ اس لیے آپ نے فرمایا: اگر یہ کلمہ پڑھ لیتا تو یہ غصہ چلا جاتا۔

''وَكَذَا رَوَاهُ النَّسَائِيُّ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ'' امام نسائی ﷫ کی کتاب ''(عمل) الیوم واللیلۃ'' اس کے اندر انہوں نے...... ماشاء اللہ!...... بڑی عجیب دعائیں لکھی ہیں۔

غصہ کا نبوی وظیفہ:

((عَنْ يُوسُفَ بْنِ عِيسَى الْمَرْوَزِيِّ عَنِ الْفَضْلِ بْنِ مُوسَى عَنْ يَزِيدَ بْنِ زِيَادِ بْنِ أَبِي الْجَعْدِ، بِهِ. وَقَدْ رَوَى هَذَا الْحَدِيثَ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ عَنْ زَائِدَةَ، وَأَبُو دَاوُدَ عَنْ يُوسُفَ بْنِ مُوسَى عَنْ جَرِيرِ بْنِ عَبْدِ الْحَمِيدِ، وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ فِي ''الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ'' عَنْ بُنْدَارٍ عَنِ ابْنِ مَهْدِيٍّ عَنِ الثَّوْرِيِّ، وَالنَّسَائِيُّ أَيْضًا مِنْ حَدِيثِ زَائِدَةَ بْنِ قُدَامَةَ ثَلَاثَتُهُمْ عَنْ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ عُمَيْرٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي لَيْلَى عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: اسْتَبَّ رَجُلَانِ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ))

''حضور ﷺ کے پاس دو آدمی لڑ پڑے''

((فَغَضِبَ أَحَدُهُمَا غَضَبًا شَدِيدًا حَتَّى يُخَيَّلَ إِلَيَّ أَنَّ أَحَدَهُمَا يَتَمَزَّعُ أَنْفُهُ مِنْ شِدَّةِ غَضَبِهِ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: إِنِّي لَأَعْلَمُ كَلِمَةً لَوْ قَالَهَا لَذَهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ مِنَ الْغَضَبِ))

''ایک آدمی کو بہت زیادہ غصہ آیا، مجھے تو محسوس ہوا کہ اس کا ناک غصے سے پھٹ پڑے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے ایسی چیز آتی ہے کہ اگر یہ پڑھ لے تو اس کا غصہ چلا جائے گا۔''

اس نے پوچھا: وہ کیا کلمہ مبارک ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ. قَالَ: فَجَعَلَ مُعَاذٌ يَأْمُرُهُ فَأَبَى وَجَعَلَ يَزْدَادُ غَضَبًا.))

مفسر ﷫ فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ ﷜ ایک جھگڑنے والے کو فرمایا: ''اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ'' پڑھو تو وہ اور زیادہ غصے میں آنے لگا۔ پڑھے تو فائدہ ہو۔

[سنن أبي داود، حدیث: ۴۷۸۰، باب: ما يقال عند الغضب]

''وَهَذَا لَفْظُ أَبِي دَاوُدَ، وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: مُرْسَلٌ، يَعْنِي أَنَّ عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ أَبِي لَيْلَى لَمْ يَلْقَ مُعَاذَ بْنَ

جَبَلٍ فَإِنَّهُ مَاتَ قَبْلَ سَنَةِ عِشْرِينَ. قُلْتُ: وَقَدْ يَكُونُ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ أَبِي لَيْلَى سَمِعَهُ مِنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ كَمَا تَقَدَّمَ وَبَلَّغَهُ عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ فَإِنَّ هَذِهِ الْقِصَّةَ شَهِدَهَا غَيْرُ وَاحِدٍ مِنَ الصَّحَابَةِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُم۔"

"لَاحَوْلَ" کا مطلب اور فائدہ:

ہمارے ہاں بھی بڑا رواج ہے کہ جب کوئی آدمی "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ" کہتا ہے تو دوسرا کہتا ہے: اچھا آپ نے مجھے شیطان سمجھا ہے؟ خدا کے بندے! "لَاحَوْلَ" پڑھنے کا مطلب یہ نہیں کہ صرف شیطان پر پڑھا جاتا ہے، "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" تو ایک ایسا کلمہ ہے جنت کے خزانوں میں سے خزانہ ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شیطان سے بچنے کی ہماری کوئی طاقت نہیں، نیک کام کرنے کی ہماری کوئی قوت نہیں، سب تیرے ہاتھ میں ہے، تو ہی بلند ہے، تو ہی عظیم ہے اور میں اپنے عجز کا اعتراف کرتا ہوں کہ میرے پاس کیا ہے؟ "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" مشکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی کوئی صحیح بات قبول بھی نہیں کرتا۔ اس لیے اس بندے نے بھی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی بات کو قبول نہیں کیا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت مرسل ہے، لیکن متعدد طریقوں سے موجود ہے اور بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ روایت کی ہے۔ بات ٹھیک ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کا سماع حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے نہ ہو، لیکن انہیں یہ حدیث مبارک حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے پہنچی ہو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳، تفسیر الاستعاذۃ وأحکامہا]

صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعض جھگڑے انسانی تقاضے سے ہوئے تھے:

"قَالَ الْبُخَارِيُّ: حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ، حَدَّثَنَا جَرِيرٌ عَنِ الْأَعْمَشِ عَنْ عَدِيِّ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ قَالَ سُلَيْمَانُ بْنُ صرد رضی اللہ عنہ: اسْتَبَّ رَجُلَانِ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ عِنْدَهُ جُلُوسٌ، فَأَحَدُهُمَا يَسُبُّ صَاحِبَهُ مُغْضَبًا قَدِ احْمَرَّ وَجْهُهُ"

"حضرت سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دو آدمیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھگڑا کیا، وہ آپس میں ایک دوسرے کو گالی دے رہے تھے۔ ایک آدمی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔"

"فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنِّي لَأَعْلَمُ كَلِمَةً لَوْ قَالَهَا لَذَهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ لَوْ قَالَ: أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ

الشَّیطَانِ الرَّجِیْمِ"

"حضور ﷺ نے فرمایا: مجھے ایک کلمہ آتا ہے 'أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ' اگر یہ پڑھ لے تو غصہ چلا جائے گا۔"

"فَقَالُوْا لِلرَّجُلِ أَلَا تَسْمَعُ مَا يَقُوْلُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَ: إِنِّيْ لَسْتُ بِمَجْنُوْنٍ. وَقَدْ رَوَاهُ أَيْضًا مَعَ مُسْلِمٍ وَأَبِيْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ مِنْ طُرُقٍ مُتَعَدِّدَةٍ عَنِ الْأَعْمَشِ بِهٖ." [صحیح البخاری، حدیث: ۶۱۱۵، بَابُ: الحَذَرِ مِنَ الغَضَبِ]

"لوگوں نے اس آدمی سے کہا: بھائی! تم سن نہیں رہے جو حضور ﷺ فرما رہے ہیں؟ اس آدمی نے کہا: میں کوئی پاگل ہوں؟"

یہ غصے کی بات ہوتی ہے۔ یاد رکھیں! صحابہ رضی اللہ عنہم بھی انسان تھے۔ اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ تو انسان غصے میں آجاتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ آپس میں غصے ہو گئے، جھگڑا ہو گیا۔ اسی طریقے سے ایک دفعہ حضور ﷺ بھی جلال میں آگئے۔ تو یہ بشری تقاضا ہے۔ اس لیے ایسی باتوں سے آدمی یہ مطلب نہ نکالے کہ حضور ﷺ کے سامنے گالیاں دے رہے تھے۔

تو یہ ایک تقاضائے انسانیت ہے، تقاضائے بشریت ہے اور فطری تقاضا ہے۔ انسانوں میں جھگڑے بھی ہوتے ہیں، انسانوں میں محبت بھی ہوتی ہے اور انسانوں میں اختلاف بھی ہوتے ہیں۔ کبھی بڑے بڑے لوگ بھی غصے میں آکر ایسی بات زبان سے نکالتے ہیں جو ان کی شان کے مطابق نہیں ہوتی، کیونکہ آخر بشر ہیں، انسان ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو چکا۔ یہ ان کے احوالِ حقیقیہ ہوتے ہیں، لیکن دشمن انہی باتوں کو...... نعوذ باللہ!...... تہمت بناتے ہیں کہ حضور ﷺ کے سامنے گالیاں دے رہے ہیں اور پھر حضور ﷺ کا فرمان قبول نہ کیا اور کہا کہ میں کوئی مجنون ہوں، میں کوئی دیوانہ ہوں؟ تو یہ بات نہیں، یہ تو بشری تقاضا ہے۔

حضور ﷺ کی دو بیویوں میں غصہ:

حضور ﷺ اپنی ایک بیوی کے گھر تشریف فرما تھے تو دوسری بی بی نے ایک پیالے میں ہدیہ بھیجا تو جس کے گھر میں آپ ﷺ موجود تھے اس بی بی صاحبہ کو جو غصہ آیا تو انہوں نے پیالے کو ایسا ہاتھ مارا کہ پیالہ ہی ٹوٹ گیا۔ بیویوں کے اندر یہ بات ہوتی ہے کہ حضور ﷺ میرے گھر میں ہیں تو تم کیوں ہدیہ بھیج رہی ہو؟ تاکہ میری بجائے حضور ﷺ تیرا ذکر بھی کریں اور تیرا فکر بھی کریں؟ انہوں نے گوارا نہ کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "غَارَتْ أُمُّكُمْ" (تمہاری ماں کو غصہ آ گیا)۔ اور حضور پاک ﷺ نے گھر سے پیالہ اٹھایا اور فرمایا: پیالے کے بدلے میں

پیالہ لے جاؤ۔ اور اس پیالے سے جو طعام گرا تھا حضور ﷺ نے اس طعام کو اٹھا کر رکھ دیا۔

[صحیح البخاری، حدیث:۵۲۲۵، بَابُ الْغَيْرَةِ]

تو یہ بشری تقاضا ہے۔ بشری تقاضا انبیاء علیہم السلام کے اندر بھی موجود ہے۔ ہر انسان کے اندر موجود ہے۔ تو ایسی باتوں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں یا اللہ کے نیک بندوں کے بارے میں سوئے ظن اور بدگمانی اختیار نہیں کرنی چاہیے۔

"وَقَدْ جَاءَ فِي الْإِسْتِعَاذَةِ أَحَادِيثُ كَثِيرَةٌ يَطُولُ ذِكْرُهَا هَاهُنَا وَمَوْطِنُهَا كِتَابُ الْأَذْكَارِ وَفَضَائِلِ الْأَعْمَالِ وَاللهُ أَعْلَمُ."

تعوذ کے بارے میں میرے آقا محمد مصطفیٰ ﷺ کی بہت ساری حدیثیں موجود ہیں۔ اگر دیکھنا چاہو تو کتاب الاذکار اور فضائل الاعمال کی کتابوں کے اندر دیکھو۔ کیونکہ یہ تفسیرِ قرآن ہے۔ اس میں تو مفسرین بطورِ استدلال صرف چند حدیثیں ذکر کر دیتے ہیں، لہٰذا یہاں موقع نہیں ہے کہ استعاذہ کے بارے میں ساری حدیثیں جمع کرتے جائیں۔

"وَقَدْ رُوِيَ أَنَّ جِبْرِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَوَّلَ مَا نَزَلَ بِالْقُرْآنِ عَلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَهُ بِالْإِسْتِعَاذَةِ كَمَا قَالَ الْإِمَامُ أَبُو جَعْفَرِ بْنُ جَرِيرٍ: حَدَّثَنَا أَبُو كُرَيْبٍ، حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ سَعِيدٍ، حَدَّثَنَا بِشْرُ بْنُ عُمَارَةَ، حَدَّثَنَا أَبُورَوْقٍ عَنِ الضَّحَّاكِ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: أَوَّلُ مَا نَزَلَ جِبْرِيلُ عَلَى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: يَا مُحَمَّدُ! اسْتَعِذْ قَالَ: أَسْتَعِيذُ بِاللهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ثُمَّ قَالَ: قُلْ: بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ثُمَّ قَالَ: اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ قَالَ عَبْدُ اللهِ: وَهِيَ أَوَّلُ سُورَةٍ أَنْزَلَهَا اللهُ عَلَى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِلِسَانِ جِبْرِيلَ. وَهٰذَا الْأَثَرُ غَرِيبٌ وَإِنَّمَا ذَكَرْنَاهُ لِيُعْرَفَ فَإِنَّ فِي إِسْنَادِهِ ضَعْفًا وَانْقِطَاعًا وَاللهُ أَعْلَمُ."

اب مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام سب سے پہلے جب قرآن لے کر اترے تو سب سے پہلے استعاذہ حضور ﷺ کو پڑھایا۔ جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ جب جبرائیل علیہ السلام آئے تو انہوں نے حضور ﷺ سے کہا: آپ پناہ پکڑیں۔ آپ ﷺ نے پڑھا: "أَسْتَعِيذُ بِاللهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ" پھر جبرائیل علیہ السلام نے کہا: حضور! "بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ" پڑھیں۔ آپ ﷺ نے "بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ" پڑھا، پھر جبرائیل علیہ السلام کہا کہ اب ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ

عَلَقٍ ﴿٢﴾ [العلق: ۱، ۲] پڑھیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے روایت تو ذکر کر دی، تا کہ آپ لوگوں کو پتا چل جائے کہ یہ بات بھی کہی گئی، لیکن اس کی سند ضعیف ہے، اس کے اندر انقطاع ہے اور قابلِ حجت نہیں ہے۔

احناف کے نزدیک تعوذ واجب ہے:

شوافع کے نزدیک تلاوت سے پہلے تعوذ پڑھنا واجب نہیں ہے۔

"وَجُمْهُورُ الْعُلَمَاءِ عَلَى أَنَّ الِاسْتِعَاذَةَ مُسْتَحَبَّةٌ لَيْسَتْ بِمُتَحَتِّمَةٍ يَأْثَمُ تَارِكُهَا" جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ "أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ" کا پڑھنا مستحب ہے، واجب نہیں، متحتم نہیں، بلکہ مستحب ہے کہ آدمی پہلے "أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ" پڑھے۔

"وَحَكَى الرَّازِيُّ عَنْ عَطَاءِ بْنِ أَبِي رَبَاحٍ وُجُوبَهَا فِي الصَّلَاةِ وَخَارِجِهَا كُلَّمَا أَرَادَ الْقِرَاءَةَ"

امام رازی رحمہ اللہ اور عطا بن ابی رباح رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ واجب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ ﴿٩٨﴾ [النحل: ۹۸] میں امر وجوب کے لیے ہے۔ چاہے نماز میں بھی ہو تب بھی تعوذ کا پڑھنا واجب ہے اور نماز کے علاوہ بھی جب قرآن پڑھے تو تعوذ پڑھنا واجب ہے۔

ابن سیرین رحمہ اللہ کا مذہب:

"وَقَالَ ابْنُ سِيرِينَ: إِذَا تَعَوَّذَ مَرَّةً وَاحِدَةً فِي عُمْرِهِ فَقَدْ كَفَى فِي إِسْقَاطِ الْوُجُوبِ"

ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس آدمی نے زندگی میں ایک دفعہ تعوذ پڑھ لیا تو واجب پر عمل ہو گیا جو اللہ نے حکم دیا ہے۔ تو ہم نے ایک دفعہ تو پڑھ لیا، لہٰذا وجوب تو ختم ہو گیا۔ اس لیے جمہور فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھنے سے پہلے...... خواہ نماز میں ہو یا خارج نماز ہو...... تعوذ پڑھنا مستحب ہے۔

واجب ہونے کی دلیل:

"وَاحْتَجَّ الرَّازِيُّ لِعَطَاءٍ بِظَاهِرِ الْآيَةِ (فَاسْتَعِذْ) وَهُوَ أَمْرٌ ظَاهِرُهُ الْوُجُوبُ وَبِمُوَاظَبَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْهَا وَلِأَنَّهَا تَدْرَأُ شَرَّ الشَّيْطَانِ وَمَا لَا يَتِمُّ الْوَاجِبُ إِلَّا بِهِ فَهُوَ وَاجِبٌ وَلِأَنَّ الِاسْتِعَاذَةَ أَحْوَطُ وَهُوَ أَحَدُ مَسَالِكِ الْوُجُوبِ وَقَالَ بَعْضُهُمْ: كَانَتْ وَاجِبَةً عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دُونَ

أُمَّتِهِ، وَحُكِيَ عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ لَا يَتَعَوَّذُ فِي الْمَكْتُوبَةِ وَيَتَعَوَّذُ لِقِيَامِ رَمَضَانَ فِي أَوَّلِ لَيْلَةٍ مِنْهُ."

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جن حضرات نے کہا کہ تعوذ واجب ہے وہ فرماتے ہیں کہ قرآن میں ہے: ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴾ [النحل:۹۸] یہ امر کا صیغہ ہے اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر مواظبت فرمانا یعنی ہمیشہ پڑھنا بھی وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ اور پھر اس سے شیطان کو دفع کیا جاتا ہے۔ اور شیطان کو دفع کرنا بھی تو واجب ہے کہ آدمی اس کے فتنے سے بچے۔ اور جب یہ واجب ہے تو اس کے دفع کے لیے پڑھنا بھی واجب ہے۔ اس لیے انہوں نے فرمایا کہ واجب ہے۔ لیکن بعض علماء نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو واجب تھا، لیکن امت کے لیے واجب نہیں، امت کے لیے مستحب ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ سے ایک روایت یہ ہے کہ وہ فرض نمازوں میں تو تعوذ نہیں پڑھتے تھے، لیکن جب رمضان میں تراویح پڑھتے تو پہلی رات تو پڑھ لیتے تھے، بعد میں نہیں پڑھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بس ایک دفعہ پڑھ لیا ہے تو کافی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/ ۱۴ تفسیر الاستعاذة وأحكامها]

"[مَسْأَلَةٌ] وَقَالَ الشَّافِعِيُّ فِي "الْإِمْلَاءِ": يَجْهَرُ بِالتَّعَوُّذِ وَإِنْ أَسَرَّ فَلَا يَضُرُّ، وَقَالَ فِي "الْأُمِّ" بِالتَّخْيِيرِ؛ لِأَنَّهُ أَسَرَّ ابْنُ عُمَرَ وَجَهَرَ أَبُو هُرَيْرَةَ"

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب نماز میں پڑھے یا ویسے پڑھے تو زور سے پڑھے، لیکن اگر کسی نے آہستہ بھی پڑھا تو نقصان اور گناہ نہیں۔ اور کتاب "الام" کے اندر ان کا دوسرا قول یہ بھی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: اس کا اختیار ہے کہ زور سے پڑھے یا آہستہ پڑھے، یہ اس کی مرضی ہے، کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ آہستہ پڑھتے تھے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ زور سے پڑھتے تھے۔

"وَاخْتَلَفَ قَوْلُ الشَّافِعِيِّ فِيمَا عَدَا الرَّكْعَةِ الْأُولَى هَلْ يُسْتَحَبُّ التَّعَوُّذُ فِيهَا عَلَى قَوْلَيْنِ وَرَجَّحَ عَدَمَ الِاسْتِحْبَابِ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ"

پہلی رکعت کے علاوہ دوسری رکعتوں میں تعوذ پڑھنے کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ کے اقوال میں اختلاف ہے کہ صرف پہلی رکعت میں پڑھے یا دوسری رکعتوں میں بھی پڑھے؟ اس بارے میں دو قول ہیں۔ راجح قول یہ ہے کہ صرف پہلی رکعت میں پڑھنا مستحب ہے، باقی رکعتوں میں پڑھنا مستحب نہیں ہے۔

"فَإِذَا قَالَ الْمُسْتَعِيذُ: أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ كَفَى ذَلِكَ عِنْدَ الشَّافِعِيِّ وَأَبِي حَنِيفَةَ وَزَادَ

بَعْضُهُمْ: أَعُوذُ بِاللهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ"

"وَقَالَ آخَرُونَ بَلْ يَقُولُ: أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ إِنَّ اللهَ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، قَالَ الثَّوْرِيُّ وَالْأَوْزَاعِيُّ، وَحُكِيَ عَنْ بَعْضِهِمْ أَنَّهُ يَقُولُ: أَسْتَعِيذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، لِمُطَابَقَةِ أَمْرِ الْآيَةِ وَلِحَدِيثِ الضَّحَّاكِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ الْمَذْكُورِ، وَالْأَحَادِيثُ الصَّحِيحَةُ كَمَا تَقَدَّمَ أَوْلَى بِالْاِتِّبَاعِ مِنْ هَذَا وَاللهُ أَعْلَمُ."

بعض نے کہا "أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ إِنَّ اللهَ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ" پڑھے، لیکن مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہی حدیثیں صحیح ہیں۔

دیکھیں! صحابہ میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ آہستہ پڑھتے تھے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ زور سے پڑھتے تھے، لیکن کوئی جھگڑا، کوئی اختلاف نہیں۔ یہ تو ہماری بدقسمتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اختلاف سے بچائے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۴، تفسیر الإستعاذة وأحكامها]

اب دیکھیں! کسی آدمی نے آمین آہستہ کہہ دیا، کسی نے زور سے کہہ دیا، ٹھیک ہے، کوئی لڑنے والی تو بات ہی نہیں۔ اور یہ اختلاف بھی اولویت اور غیر اولویت میں ہے۔ یعنی بعض ائمہ کے نزدیک زور سے کہنا اولیٰ ہے اور بعض کے نزدیک آہستہ کہنا اولیٰ ہے۔

اب جو لوگ آمین زور سے کہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد گونج جاتی تھی۔ اس لیے ہم زور سے کہیں گے تو گونجے گی۔ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بھائی! اصل مسئلہ دیکھو کہ فاتحہ اور آمین دعا ہے اور قرآن کا حکم ہے: ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾ [الاعراف: ۵۵] (دعا آہستہ مانگو) اور حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا﴾ [مریم: ۳] (حضرت زکریا علیہ السلام نے جب دعا مانگی تو خفیہ طریقے سے اپنے رب کو پکارا)۔ اب دونوں کے پاس دلیل ہے، یعنی آمین کہنے کا منکر تو کوئی نہیں، آمین سب کہہ رہے ہیں، کچھ حضرات زور سے کہہ رہے ہیں اور کچھ حضرات آہستہ کہہ رہے ہیں۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے تعوذ زور سے پڑھا اور بعض نے آہستہ پڑھا۔ اس لیے یہ جھگڑے والی بات ہوئی ہی نہیں۔

یہ جھگڑا کیوں پیدا ہوتا ہے؟ جب جہل آجائے تو پھر جھگڑا ہوگا۔ علم ہوتا نہیں ہے، آدمی اپنی بات پر اڑ جاتا ہے اور دوسرے کو غلط کہتا ہے۔ حالانکہ اس کے پاس بھی حدیث ہے اور اس کے پاس بھی حدیث ہے۔ اللہ تعالیٰ سب

پر رحمتیں نازل فرمائے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جڑنے کی توفیق دے، مسلمانوں کے دلوں کو جوڑ دے اور ٹوٹنے سے بچائے۔ ہمارے بعض بزرگوں کا جملہ ہے کہ دعا کرو اللہ جوڑ پیدا کرے۔ یعنی اللہ دلوں کو جوڑ دے اور آپس میں محبت و پیار پیدا کر دے۔

انڈیا کے ہائی کورٹ میں ایک انگریز جج تھا۔ اس کے پاس آمین کا جھگڑا آگیا کہ بعض نے کہا: تم آمین زور سے کیوں کہتے ہو؟ اور اس پر ایک دوسرے کے سر پھاڑ ڈالے۔ بالآخر مقدمہ ہائی کورٹ جا پہنچا۔ جج نے دونوں کا مقدمہ سن کر فیصلہ لکھا کہ میں ان دونوں مولویوں کو سزا دے رہا ہوں، کیونکہ آہستہ آمین بھی ان کے دین میں ثابت ہے اور زور سے آمین بھی ان کے دین میں ثابت ہے، لیکن شر والی آمین کہیں ثابت نہیں ہے، لہٰذا دونوں کو سزا دو، تا کہ آئندہ جھگڑا نہ کریں۔ اس لیے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں لڑنے اور اختلاف کرنے سے بچائے، کیونکہ اس کا فائدہ دشمن کو ہوگا۔ مسجدیں ویران ہوں گی تو شیطان خوش ہوگا اور کافر خوش ہوگا کہ دیکھو! مسلمان کیسے لڑ رہے ہیں!! اللہ تعالیٰ ہمیں ان چھوٹے چھوٹے اختلافات کو وسعتِ قلب کے ساتھ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آگے فرمایا:

"[مَسْأَلَةٌ] ثُمَّ الِاسْتِعَاذَةُ فِي الصَّلَاةِ إِنَّمَا هِيَ لِلتِّلَاوَةِ وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ وَمُحَمَّدٍ. وَقَالَ أَبُو يُوسُفَ: بَلْ لِلصَّلَاةِ"

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: استعاذہ نماز کے اندر تلاوت کے لیے پڑھتے ہیں، امام ابویوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ نماز کا جز ہے، اس لیے مقتدی بھی تعوذ پڑھے۔ ان دونوں قولوں کے درمیان فرق سمجھیں کہ جب تم نے تلاوت کرنی ہے کہ اکیلے نماز پڑھ رہے ہو تو اس وقت تعوذ پڑھو، لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مقتدی تعوذ نہیں پڑھے گا، بلکہ صرف ثنا پڑھے گا، وہ تلاوت نہیں کر رہا۔ امام ابویوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ نماز کا حصہ ہے، لہٰذا مقتدی جیسے ثنا پڑھتا ہے اسی طرح تعوذ بھی پڑھے گا۔ اس لیے فرمایا: "وَقَالَ أَبُو يُوسُفَ: بَلْ لِلصَّلَاةِ" استعاذہ پڑھنا نماز کا حصہ ہے۔ اس قول کے مطابق ماموم (مقتدی) بھی تعوذ پڑھے گا۔ چاہے تلاوت کر رہا ہے یا تلاوت نہیں کر رہا۔ اسی طرح عید کی نماز میں بھی، تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد بھی اور تکبیراتِ عید سے پہلے بھی تعوذ پڑھے گا۔ جمہور کہتے ہیں کہ تکبیرات کے بعد استعاذہ پڑھے گا۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ تعوذ کے لطائف وفضائل بیان کرتے ہیں کہ یہ ہمارے منہ کو پاک کرنے والا ہے۔ رفث

کہتے ہیں جس کے اندر شہوت ہو۔ قرآن میں آتا ہے کہ جب احرام باندھ لو تو رفث نہ ہو، شہوت انگیز باتیں نہ ہوں، حتیٰ کہ اپنی بیوی سے بھی ایسی باتیں نہ کرو جس سے شہوانیت ٹپکے۔ اس لیے جب ہمارے منہ سے لغو اور شہوت انگیز باتیں نکلتی ہیں تو منہ گندا ہو جاتا ہے۔ آدمی جب تعوذ پڑھتا ہے، اللہ کی پناہ میں آتا ہے تو اس کا منہ پاک ہو کر اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اب تلاوتِ قرآن پاک کرے۔ کیونکہ ایک ظاہری پاکی ہے وہ وضو سے حاصل ہو گئی اور ایک باطنی پاکی ہے وہ استعاذہ سے حاصل ہوتی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۵، تفسیر الاستعاذۃ وأحکامہا]

ایک بزرگ کی عمر ۸۰ سال تھی۔ ایک بڑھیا ان کے پاس مسئلہ پوچھنے کے لیے آئی۔ خادم نے آکر بتایا تو بزرگوں نے فرمایا: اسے اندر آنے دو اور تم لوگ بھی اندر بیٹھو۔ بزرگوں نے جب اس بڑھیا کو مسئلہ بتا کر رخصت کر دیا تو خدام نے پوچھا: حضرت! آپ کی عمر ۸۰ سال ہو گئی اور وہ عورت آپ سے بھی زیادہ بوڑھی تھی۔ کیا آپ کو کوئی خوف تھا کہ ہمیں بیٹھنے کا حکم فرمایا تھا؟ فرمایا: شیطان کسی وقت بھی حرکت دے سکتا ہے اور دل کے اندر برا خیال آ سکتا ہے۔ دشمن کو ایسا موقع دینا ہی نہیں چاہیے۔ ان بزرگوں کے دل کے اندر خوف تھا کہ کہیں شیطان ہمیں گناہ میں مبتلا نہ کر دے۔

اس لیے حدیث شریف کے اندر ہے کہ آدمی ساری عمر نیکیاں کرتا ہے اور جنت کے قریب ہو جاتا ہے، لیکن آخری وقت کوئی ایسا کلمہ منہ سے نکل جاتا ہے کہ جس سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی ساری زندگی شیطانیت اور کفر پر رہتا ہے، لیکن آخری وقت توبہ اور کلمہ نصیب ہو گیا تو وہ جنت میں چلا گیا۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۶۵۹۴، باب: فی القدر]

اس لیے آدمی اللہ کی پناہ میں آئے اور عاجزی کا اظہار کرے کہ یا اللہ! میں کمزور ہوں اور دشمن چالاک ہے اور نظر بھی نہیں آتا کہ میں اس کو دفع کر سکوں اور نہ میں اس کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ صرف وہی اس کو دفع کر سکتا ہے، جس نے اس کو پیدا کیا ہے۔ یا اللہ! یہ تو ایسا دشمن ہے جو نہ تو محبت کی بات سے راضی ہوتا ہے اور نہ ہدیہ لے کر خوش ہوتا ہے۔ دشمن سے معافی مانگو تو وہ راضی ہو جاتا ہے، لیکن یہ راضی نہیں ہوتا۔ یا اللہ! آپ ہی اس کو دفع کر سکتے ہیں۔

اللہ پاک قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَٰنٌ ۚ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا﴾ [الاسراء: ۶۵]

"میرے خاص بندوں پر تیرا ذرا قابو نہ چلے گا اور آپ کا رب کافی کارساز ہے۔"

یعنی شیطان اتنا بڑا لعین ہے کہ یہ اللہ کے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء رحمہم اللہ پر بھی حملہ کرنے سے نہیں چوکتا۔ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں، ان پر اللہ کی طرف سے پہرہ رہتا ہے۔ ایک دفعہ ایک بچھو نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈنگ مارا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بچھو بڑا شیطان ہے، نہ نبی کا خیال کرتا ہے اور نہ ولی کا خیال کرتا ہے۔ اس لیے آدمی کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ فلاں بڑا بچھو ہے، یعنی کسی کا خیال نہیں رکھتا۔

"وَقَدْ نَزَلَتِ الْمَلَائِكَةُ لِمُقَاتَلَةِ الْعَدُوِّ الْبَشَرِيِّ فَمَنْ قَتَلَهُ الْعَدُوُّ الظَّاهِرُ الْبَشَرِيُّ كَانَ شَهِيْدًا"

ظاہری دشمن کے مقابلے میں اللہ نے فرشتوں کو اتارا جنھوں نے آ کر کافروں کو مارا۔ انسان اگر کافر کے ہاتھ سے مارا جائے تو شہید ہو جاتا ہے، لیکن جس کو شیطان نے مارا وہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا، وہ فتنوں اور گناہوں میں پڑ گیا، کیونکہ شیطان تو انسان کو دیکھتا ہے، لیکن انسان شیطان کو نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے ہم بھی اس ذات کی پناہ میں آ جائیں جس کو شیطان نہیں دیکھ سکتا۔

استعاذہ کا معنی ہوتا ہے "اَلْاِلْتِجَاءُ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى" اللہ کی پناہ پکڑنا کہ اے اللہ! ہمیں ہر شر والے کے شر سے بچا۔ عیاذہ ہوتا ہے شر سے بچنا، اللہ کی پناہ میں آنا۔ اور اس کے مقابلے میں لیاذہ ہوتا ہے۔ اس کا معنی خیر مانگنا۔ جیسے متنبی شاعر نے کہا:

يَا مَنْ أَلُوْذُ بِهِ فِيْمَا أُؤَمِّلُهُ
وَمَنْ أَعُوْذُ بِهِ مِمَّنْ أُحَاذِرُهُ
لَا يَجْبُرُ النَّاسُ عَظْمًا أَنْتَ كَاسِرُهُ
وَلَا يَهِيْضُوْنَ عَظْمًا أَنْتَ جَابِرُهُ

"میں اس ذات سے خیر مانگتا ہوں جس کے ساتھ میں امیدیں رکھتا ہوں اور میں اس ذات سے پناہ پکڑتا ہوں جس سے میں ڈرتا ہوں۔ میرے اللہ! جس ہڈی کو تو توڑ ڈالے اسے کون بنائے؟ اور جس کو تو جوڑے اس کو کون توڑ سکتا ہے؟"

تو "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" کا معنی یہ ہے کہ میں اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں، تا کہ شیطان مجھے دین کے معاملے میں نقصان نہ پہنچائے اور دنیا کے معاملے میں بھی نقصان نہ پہنچائے، یا جس چیز کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے اس سے نہ روک دے۔ اللہ نے مجھے نماز کا حکم دیا ہے، شیطان وسوسہ ڈال کر روک نہ دے۔ یا وہ کام جن کے کرنے سے اللہ نے منع کیا ہے شیطان مجھے اس کے اندر نہ ڈال دے، کیونکہ شیطان کو انسان سے صرف اللہ تعالیٰ

ہی روک سکتے ہیں۔ اس لیے اللہ نے حکم دیا ہے کہ بندوں کے اندر اگر کوئی تیرا دشمن ہے تو صبر کر، وہ برا کرے تو اچھا کر، تا کہ اس کا شر کبھی نہ کبھی رک جائے۔ فرمایا:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۚ إِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ [الاعراف:۱۹۹، ۲۰۰]

"(اے پیغمبر!) درگزر کا رویہ اپناؤ، اور (لوگوں کو) نیکی کا حکم دو، اور جاہلوں کی طرف دھیان نہ دو۔ اور اگر کبھی شیطان کی طرف سے تمہیں کوئی کچوکا لگ جائے تو اللہ کی پناہ مانگ لو۔ یقیناً وہ ہر بات سننے والا، ہر چیز جاننے والا ہے۔"

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۚ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ۝﴾ [المومنون:۹۶]

"آپ ان کی بدی کے بدلے میں ایسا برتاؤ کر دیجیے جو بہت ہی اچھا (اور نرم) ہو۔ ہم خوب جانتے ہیں جو جو کچھ یہ (آپ کی نسبت) کہا کرتے ہیں۔"

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝﴾ [حم السجدۃ:۳۴]

"اور نیکی بدی برابر نہیں ہوتی (بلکہ ہر ایک کا اثر جدا ہے تو اب) آپ (مع اتباع) نیک برتاؤ سے (بدی کو) ٹال دیجیے، پھر یکایک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جاوے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے۔"

ان تین آیات کے اندر اللہ نے فرمایا: انسان سے بچنا ہو تو صبر کرو، برائی کا بدلہ اچھائی سے دو، لیکن شیطان کسی اچھائی کو قبول کرتا ہی نہیں۔ اگر شیطان تیرا دشمن ہے تو اللہ کی پناہ پکڑ، کیونکہ شیطان تیرا ایسا دشمن ہے جس پر رشوت بھی اثر نہیں کرتی، تیرا مال بھی اثر نہیں کرتا۔ تو کوئی اچھا کام کرے تو وہ بھی اثر نہیں کرتا، کیونکہ اس کی اصل ہی شریر ہے، اس پر نیکی کیا اثر کرے گی؟ اس لیے اس کے فتنے سے بچنے کا یہی حل ہے کہ انسان فوراً اس کی پناہ میں آجائے۔ اور اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا، مگر وہ جس نے اس کو پیدا کیا ہے۔

اہلِ لغت علماء فرماتے ہیں: لفظ شیطان "شَطَنَ" سے مشتق ہے جس کا معنی بعد ہے کہ خیر سے دور ہو گیا۔ اس طرح اپنے فسق کی وجہ سے انسان سے بھی دور ہے اور اس کے ہر اچھے کام سے بھی دور ہے۔ اور بعض نے کہا: شیطان "شَاطَ" سے مشتق ہے۔ آگ سے پیدا ہوا۔ بعض علماء فرماتے ہیں: دونوں معنی صحیح ہیں۔ عربی کا ایک شعر ہے:

أَيُّمَا شَاطِنٍ عَصَاهُ عَكَاهُ
ثُمَّ يُلْقَى فِي السِّجْنِ وَالْأَغْلَالِ

''کوئی شیطان اگر انکار کرتا تو سلیمان علیہ السلام اس کو زنجیریں ڈال کر قید میں ڈال دیتے تھے۔''

تو معلوم ہوا کہ شیطان ''شَطَنَ'' سے مشتق ہے۔

امام سیبویہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ محاورات عرب کے اندر بھی جب کوئی برا کام کرے تو ''تَشَيْطَنَ فُلَانٌ'' کہتے ہیں۔ اسی لیے جو بھی سرکش ہو جائے جن ہو یا انسان ہو یا حیوان ہو اس کو بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ شیطان ہے۔ انسان سرکش ہو جائے تو کہتے ہیں کہ یہ تو بڑا شیطان ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ﴾ [الانعام:۱۱۲]

''اور اسی طرح ہم نے ہر (پچھلے) نبی کے لیے کوئی نہ کوئی دشمن پیدا کیا تھا، یعنی انسانوں اور جنات میں سے شیطان قسم کے لوگ۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوذر! انسان کے شیطانوں کے شر سے اور جن کے شیطانوں کے شر سے پناہ پکڑا کرو۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں ہوتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۵، تَفْسِيْرُ الْاِسْتِعَاذَةِ وَاَحْكَامِهَا]

نماز کو خراب کرنے والی تین چیزیں:

اسی طرح مسلم شریف میں بھی ایک حدیث آتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نماز کو تین چیزیں توڑ ڈالتی ہیں: عورت گزرے تو وہ بھی نماز کو توڑ ڈالتی ہے، گدھا گزرے تو وہ بھی نماز کو توڑ ڈالتا ہے اور سیاہ کتا گزرے تو وہ بھی نماز کو توڑ ڈالتا ہے۔ صحابی کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: یا رسول اللہ! یہ کالے کتے اور سفید کتے میں کیا فرق ہے؟ حالانکہ کتا تو کتا ہوتا ہے۔ سرخ بھی کتا ہے اور کالا بھی کتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرق ہے کہ کالا کتا شیطان ہوتا ہے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۵۱۰، بَابُ: قَدْرِ مَا يَسْتُرُ الْمُصَلِّي]

بعض لوگ کہتے ہیں کہ دیکھو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو کتے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ نماز اس لیے ٹوٹتی ہے کہ جب انسان کی توجہ اور دل اللہ سے کسی دوسری چیز میں مبتلا ہو جائے تو نماز ختم ہو گئی۔ نماز یا تو ٹوٹے

کی شرارت کی وجہ سے، گدھا بھی شرارت میں مشہور ہے۔ وہ آپ کے سامنے آ کر کھڑا ہو جائے گا اور شور کرنے لگے گا تو آپ کی نماز تو ختم ہو گئی۔ کتا اور ہو بھی سیاہ رنگ کا بڑا شیطان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو آوازیں لگانی شروع کر دے یا حملے کا ارادہ کر دے تو آپ کی نماز ٹوٹ گئی۔ اور عورت کے فتنۂ جمال میں انسان مبتلا ہو جاتا ہے کہ عورت گزری اور یہ اس کو دیکھ رہا ہے تو نماز ختم ہو گئی۔ بہر حال یہ پہلے کے مسائل ہیں، حکم یہ ہے کہ اگر عورت گزر جائے تو نماز کا خشوع ٹوٹ جاتا ہے، کیونکہ ایک حدیث میں موجود ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں آگے سوئی ہوئی ہوتی تھی اور حضور ﷺ نماز پڑھتے تھے۔[1] لہٰذا اوپر والا حکم ابتدائی حکم تھا۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ نماز ختم نہیں ہوتی، بلکہ خشوع اور خضوع ٹوٹ جاتا ہے کہ انسان اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، عورت کا خیال آیا تو توجہ ہٹ گئی اور انسان کا وہ خشوع اور خضوع قائم نہ رہا۔ نماز ہو جاتی ہے، وگرنہ حج کے موقع کتنی عورتیں ہوتی ہیں۔ میں نے کئی دفعہ ان سے بچنے کی کوشش کی ہے، حتیٰ کہ بیت اللہ کے قریب بھی جا کر کھڑا ہوا تب بھی کوئی عورت آ کر آگے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اللہ ہدایت عطا فرمائے۔ جن لوگوں کے ساتھ عورتیں ہوتی ہیں وہ ان کو سمجھائیں کہ جب اذان ہو جائے تو واپس آ جائیں، لوگوں کی نمازیں خراب نہ کریں، ان کے خشوع اور خضوع کو نہ توڑیں اور آگے نماز نہ پڑھیں۔ حالانکہ منتظم تو زور لگاتے ہیں کہ باہر نکلو، لیکن کوئی نہ کوئی اندر رہ جاتی ہے اور بعض عورتیں تو مردوں کے کپڑوں میں ہوتی ہیں، ان کو پہچان ہی نہیں سکتے کہ کون ہیں؟ جب نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو بعد میں پتا چلتا ہے کہ یہ تو عورت ہے۔

لفظ شیطان کا اشتقاق:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لفظ شیطان "شَطَنَ" سے مشتق ہے "شَاطَ" سے نہیں، اس پر دو دلائل بیان کرتے ہیں۔

حضرت زید بن اسلم رحمہ اللہ اپنے والد سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک ٹچر پر سوار کیا گیا، وہ اچھلنے کودنے لگا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو مارتے کہ یہ آرام کرے، لیکن وہ اور زیادہ ناچنا شروع کر دیتا، حتیٰ کہ آپ اس سے اتر آئے اور فرمایا کہ بڑا شیطان جانور ہے۔ میں اس سے اترا تو میں نے اپنے خیالات کو بدلا ہوا پایا۔ یعنی اس شیطان کا اتنا اثر ہوا کہ میری طبیعت کے خیالات بھی الجھ گئے۔

[تاریخ المدینۃ لابن شبۃ: ۲/۸۲۲، تسییر عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ إلی الشام]

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۵۱۳، باب: التطوع خلف المرأۃ]

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خچر پر شیطان کا اطلاق کیا۔ اس لیے مفسر رحمہ اللہ استدلال کر رہے ہیں کہ ہر چیز "كُلُّ مُتَمَرِّدٍ مِنْ جِنِّيٍّ وَإِنْسِيٍّ وَحَيَوَانٍ شَيْطَانًا." "(ہر سرکش چاہے وہ انسان میں سے سرکش ہو یا جنات میں سے کوئی سرکش جن ہو یا حیوانات میں سے کوئی سرکش حیوان ہو تو اس پر بھی شیطان کا اطلاق آتا ہے) کہتے ہیں: بڑا شیطان جانور ہے، یہ انسان نہیں، شیطان ہے۔ اور جن پر تو شیطان کا اطلاق ہے ہی، کیونکہ اصل میں ابلیس جن تھا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۵ تفسیر الاستعاذة وأحكامها]

"رَجِيْمٌ" کا معنی:

"رَجِيْمٌ" کا معنی ہوتا ہے مردود، چھوڑا ہوا، اللہ کی رحمت سے دھتکارا ہوا۔ اس لیے وہ آدمی جو کھانا چھوڑ دے اس کو انگریزی میں ڈائٹنگ کہتے ہیں اور عربی میں "رَجِيْمٌ" کہتے ہیں، کیونکہ وہ بھی کھانا چھوڑ دیتا ہے۔

"رَجِيْمٌ" کا وزن "فَعِيْلٌ" ہے، لیکن معنی مفعول کا ہے۔ جیسے کہتے ہیں "قَتِيْلٌ" بمعنی "مَقْتُوْلٌ" تو یہ بھی مفعول کے معنی میں ہے کہ شیطان کو ہر بھتری سے دفع کر دیا گیا ہے۔ جیسے اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ﴾ [الملک: ۵]

"ہم نے آسمانِ دنیا کو چاند ستاروں کے ساتھ زینت دی اور ہم نے ان کو شیطانوں کو دفع کرنے کے لیے بنایا۔"

اور فرمایا:

﴿وَحِفْظًا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَارِدٍ ۝﴾ [الصّٰفّٰت: ۷]

"اور اللہ نے ان کو حفاظت کا ذریعہ بنایا ہر سرکش شیطان سے۔"

تاکہ نہ سن سکیں ملأ اعلیٰ کی باتیں اور ہر طرف سے ان کو مارا اور دھتکارا جاتا ہے۔ ہاں اگر کوئی بات اچک لے تو اس کے پیچھے بھی شہابِ ثاقب لگ جاتا ہے۔ اور فرمایا:

﴿وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ۝﴾ [الحجر: ۱۶]

"اور ہم نے آسمان میں بہت سے برج بنائے ہیں اور اس کو دیکھنے والوں کے لیے سجاوٹ عطا کی ہے۔"

"بُرُوْجٌ" کہتے قصورِ عالیہ، بڑی بڑی بلڈنگیں۔ جیسے مکہ کے اندر بڑی بڑی بلڈنگ کا نام برج رکھتے ہیں، اسی پر مفسرین فرماتے ہیں کہ آسمان کے اندر بارہ برج ہیں۔ ہم نے ان کو دیکھنے والوں کے لیے زینت بنایا۔ تو "رَجِيْمٌ" کا ایک معنی ہو گیا "مَرْجُوْمٌ" دھتکارا ہوا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "رَجِیۡم" "رَاجِمٌ" کے معنی میں ہے، "فَعِیۡلٌ" "فَاعِلٌ" کے معنی میں ہے۔ "رَاجِمٌ" کا معنی ہے لوگوں کو وسوسوں اور مکر کے ساتھ مارنے والا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: پہلا قول راجح اور مشہور ہے۔ محاوراتِ عرب میں بھی اس کا عام استعمال ہے۔ "قَتِیۡلٌ" بمعنی "مَقۡتُوۡلٌ" اور "جَرِیۡحٌ" بمعنی "مَجۡرُوۡحٌ" ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۶ تَفۡسِیۡرُ الۡاِسۡتِعَاذَةِ وَاَحۡکَامِهَا]

بسم اللہ قرآن کا جز ہے:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن کو بسم اللہ سے شروع کیا۔ اس بات کے اندر تو اتفاق ہے کہ آیت ﴿اِنَّهٗ مِنۡ سُلَيۡمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ﴾ [النمل: ۳۰] قرآن کا جز ہے، لیکن سورتوں کی ابتداء میں جو بسم اللہ ہے اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: ہر سورت کے ساتھ ایک آیت ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ مستقل آیت ہے اور یہ ہر سورت کے درمیان فصل (فاصلہ) کے لیے لکھی جاتی ہے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سلفاً و خلفاً جو پہلے علماء گزرے ہیں ان کے بہت زیادہ اقوال ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۶ تَفۡسِیۡرُ الۡاِسۡتِعَاذَةِ وَاَحۡکَامِهَا]

ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ کیوں؟

سنن ابی داؤد کے اندر صحیح سند کے ساتھ ایک صحیح حدیث ہے:

((عَنِ ابۡنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ لَا يَعۡرِفُ فَصۡلَ السُّوۡرَةِ حَتّٰى تَنَزَّلَ عَلَيۡهِ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ))

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ میرے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نہیں جانتے تھے کہ دو سورتوں کے درمیان فصل کرنے کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ (سارا قرآن اللہ کا کلام ہے۔ ایک سورت کو دوسری سورت سے علیحدہ کیسے کیا جائے؟) تو اللہ نے "بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ" نازل کی۔"

[سنن ابی داؤد، حدیث: ۷۸۸، بَابُ مَنۡ جَهَرَ بِهَا]

اب ایک سورت ختم ہو گئی تو دوسری سورت کو شروع کرنے سے پہلے "بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ" آ گئی۔ تو سورۂ فاتحہ، سورۂ بقرۃ اور سورۂ آلِ عمران کے درمیان فرق آ گیا۔ اس حدیث سے ہمیں معلوم ہوا کہ "بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ

الرَّحِيمِ ''سورتوں کے درمیان فصل کے لیے اتری ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۶، تفسیر الاستعاذۃ واحکامہا]

ایک ضعیف روایت:

((عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ الْبَسْمَلَةَ فِي أَوَّلِ الْفَاتِحَةِ فِي الصَّلَاةِ وَعَدَّهَا آيَةً))

''بی بی ام سلمہ ﷞ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ نے نماز کے دوران سورۂ فاتحہ کے شروع میں بسم اللہ پڑھی اور آپ ﷺ نے اس کو ایک آیت شمار فرمایا۔ (یعنی یہ بھی ایک آیت ہے)۔''

[السنن الکبریٰ، حدیث: ۲۳۸۵، باب: الدَّلِيلِ عَلَى أَنَّ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ آيَةٌ...]

یہ روایت ضعیف ہے، کیونکہ اس کے اندر ایک راوی عمر بن ہارون بلخی ضعیف ہے۔

بعض صحابہ ﷡ فرماتے ہیں کہ بسم اللہ ہر سورت کا حصہ ہے، لیکن سورت براءت کا حصہ نہیں ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباس ﷠، ابن زبیر ﷠، ابو ہریرہ ﷛ اور حضرت علی ﷛ کا اور تابعین میں سے حضرت طاؤس ﷫، سعید بن جبیر ﷫، مکحول ﷫، زہری ﷫، عبد اللہ بن مبارک ﷫، امام شافعی ﷫ اور امام احمد بن حنبل ﷫ کا ہے۔ اور ایک قول کے مطابق اسحاق بن راہویہ ﷫ بھی ان کے ساتھ ہیں۔

امام شافعی ﷫ کا ایک قول یہ ہے کہ کسی اور سورت کی آیت تو نہیں، لیکن فاتحہ کی آیت ہے۔ یہ قول ضعیف ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہ ﷫، ان کے اصحاب اور امام مالک ﷫ فرماتے ہیں کہ نہ تو یہ فاتحہ کی آیت ہے اور نہ کسی اور سورت کی آیت ہے، بلکہ یہ مستقل آیت ہے۔ اور یہ آیت مستقلاً اللہ نے اس لیے نازل فرمائی، تاکہ سورتوں کے درمیان میں فصل ہو سکے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۶، تفسیر الاستعاذۃ واحکامہا]

نماز میں بسم اللہ کا حکم:

اب رہا یہ مسئلہ کہ بسم اللہ کو نماز میں زور سے پڑھیں یا آہستہ پڑھیں؟ اس کے اندر بھی وہی اختلاف ہے کہ جو اس کو فاتحہ کی آیت سمجھتے ہیں ان کے ہاں اس کو جہر (زور) کے ساتھ پڑھا جائے گا اور جو اس کو فاتحہ کی آیت نہیں سمجھتے وہ اس کو آہستہ پڑھیں گے۔ بہر حال راجح قول یہ ہے اور صحیح احادیث میں بھی یہی ملتا ہے کہ حضور ﷺ بسم اللہ کو زور سے نہیں پڑھتے تھے۔

ایک بات یاد رکھیں کہ آہستہ پڑھنے والوں کے پاس بھی دلائل ہیں اور زور سے پڑھنے والوں کے پاس بھی دلائل ہیں۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ اولیٰ اور افضل کیا ہے؟ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک افضل یہ ہے کہ زور سے پڑھو، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ افضل یہ ہے کہ آہستہ پڑھو۔ ورنہ پڑھتے تو سب ہیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابہ میں سے حضرت ابن عباس، ابو ہریرہ، ابن عمر اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم بسم اللہ کو زور سے پڑھتے تھے۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ خلفائے راشدین بھی زور سے پڑھتے تھے، لیکن یہ روایت ضعیف ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھی اور بسم اللہ زور سے پڑھی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: میں تمہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسی نماز پڑھا رہا ہوں۔

[سنن النسائی، حدیث: ۹۰۵، قراءة: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ]

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام ترمذی رحمہ اللہ اور امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع کرتے تو "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھتے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کی سند مضبوط نہیں ہے۔

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۴۵، باب: مَنْ رَأَى الْجَهْرَ بِـ بِسْمِ اللّٰهِ...]

صحیح بخاری کے اندر روایت ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کیسی تھی؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ((كَانَ يَمُدُّ مَدًّا)) "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت مد کے ساتھ تھی۔"

[صحیح البخاری، حدیث: ۵۰۴۵، باب: مَدِّ الْقِرَاءَةِ]

یہ پڑھنے کا طریقہ بتا رہے ہیں۔ نماز کے بارے میں پوچھا ہی نہیں گیا تھا۔ چونکہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ شافعی تھے، اس لیے سارے تابعین کے نام بتائے کہ فلاں صحابی اور تابعی زور سے پڑھتے تھے۔ اصول یہ ہے کہ جس امام سے پڑھا ہوگا اس کے قول کو ترجیح دیں گے۔ اس لیے ان کے حق میں یہاں پورا صفحہ لکھا ہے۔ بہر حال آگے جا کر انصاف کریں گے اور دوسرے قول کو نقل کریں گے۔

مستدرک حاکم اور ابو داؤد کے اندر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرأت کو روک روک کر پڑھتے تھے۔ مثلاً ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾، ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ①﴾، ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ②﴾ یعنی علیحدہ علیحدہ پڑھتے تھے۔

مستدرک کے اندر ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں نماز پڑھائی اور بسم اللہ نہ پڑھی۔ وہاں جو مہاجر صحابہ تھے انہوں نے اعتراض کیا کہ آپ نے بسم اللہ کیوں نہیں پڑھی؟

[المستدرک علی الصحیحین للحاکم، حدیث:۸۵۱]

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ جو احادیث اور آثار بیان کیے ہیں یہ ہمارے مسلک کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ باقی ان احادیث پر معارضہ کہ یہ حدیث ضعیف ہے، اس کے اندر یہ بحث ہے۔ یہ اس کی تفصیل کا مقام نہیں ہے، یہ بحث آگے آئے گی۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ بسم اللہ کو نماز کے اندر زور سے نہ پڑھا جائے۔ خلفائے اربعہ سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ زور سے بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔

اب خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی بات کتنی مضبوط ہوگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں خلفاء رضی اللہ عنہم، عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ، صحابہ کی بہت بڑی تعداد اور تابعین کی جماعت بھی بسم اللہ زور سے نہیں پڑھتے تھے۔ (یہاں پر امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ان حضرات کے نام نہیں لیے اور صرف "وَطَوَائِفُ مِنْ سَلَفِ التَّابِعِيْنَ وَالْخَلَفِ" کہہ دیا ہے)۔ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بسم اللہ پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ نہ زور سے پڑھے، نہ آہستہ پڑھے۔ زندگی میں ایک مرتبہ پڑھ لی تو کافی ہے۔

اسی سے اندازہ لگالیں کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کچی بات کبھی بھی نہیں لیتے تھے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم سے حکم لیا ہے۔ لیکن چونکہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ خود شافعی المسلک ہیں، اس لیے ان کے لیے تو پورا صفحہ نقل کردیا اور جمہور ائمہ رحمہم اللہ جو خلاف ہیں ان کی آخر میں دو تین سطریں نقل فرمادیں۔ انصاف تو کردیا کہ بات ذکر فرمادی۔

آپ دیانت داری سے غور کریں تو...... الحمد للہ ثم الحمد للہ!...... امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جس قول کو بھی لیا ہے اگر اس قول کی تحقیق میں لگ جائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ صحیح اتباع ان کی تھی کہ انہوں نے سب سے پہلے قرآن پاک کو لیا۔ اگر قرآن میں وہ مسئلہ نہیں ملا تو حدیث پاک کے دروازے پر آئے، اگر وہاں نہیں ملا تو صحابہ کے دروازے پر آئے۔ اور صحابہ میں سے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو اول درجہ دیا۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم میں مسئلہ نہیں ملا تو عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا، ان میں نہیں ملا تو اصحاب بدر رضی اللہ عنہم کو دیکھا، اصحاب حدیبیہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا پھر عام صحابہ رضی اللہ عنہم

کے اقوال پر نظر ڈالی۔ اتنی باریک بینی سے وہ قول لیتے ہیں، تا کہ حضور ﷺ کی کوئی حدیث مبارک رہ نہ جائے اور آپ کے تمام فرامین پر عمل ہو جائے۔

صحیح مسلم کے اندر ہے کہ جب حضور ﷺ نماز شروع کرتے تو "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہہ کر ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ①﴾ پڑھتے تھے۔

ترمذی کے اندر یہ روایت موجود ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی۔ کوئی بسم اللہ زور سے نہیں پڑھتا تھا، بلکہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ①﴾ سے پڑھا کرتے تھے۔ اور مسلم شریف کے اندر یہ الفاظ بھی ہیں کہ بسم اللہ نہ اول میں ہے اور نہ آخر میں ہے۔

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۴۶، باب: فِي افْتِتَاحِ الْقِرَاءَةِ بِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ... صحیح مسلم، حدیث: ۳۹۹]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے اس مسئلہ میں تمام ائمہ کے ماخذ نقل کر دیے ہیں۔

آخر میں اس بات پر آ گئے اتنی بات تو ٹھیک ہے کہ جو زور سے بسم اللہ پڑھے اس کی نماز بھی ہو جاتی ہے، کوئی آہستہ بھی پڑھ لے تو اس کی نماز خراب نہیں ہوتی۔ شکر ہے کہ اتنا تو ہو گیا کہ نماز ہو جاتی ہے۔

بہرحال! حضور ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عمل سے ثابت ہے کہ وہ زور سے بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔ اللہ سب پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۶، ۱۷، تَفْسِيْرُ الْاِسْتِعَاذَةِ وَاَحْكَامِهَا]

بسم اللہ اسمِ اعظم ہے:

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کی نسبت سوال کیا۔ آپ نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بڑے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اور فرمایا کہ اللہ کا جو اسم اعظم ہے اس کے اندر اتنا قریب ہے جیسے کسی کی آنکھ کے اندر سفیدی اور سیاہی ایک دوسرے کے قریب ہے۔ ایک تو اس کے اندر اسم ذات اللہ آ گیا اور "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" صفات آ گئیں۔ [المستدرک علی الصحیحین للحاکم، حدیث: ۲۰۲۷]

اسم اعظم میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تحقیق:

امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تحقیق یہی ہے کہ اسم اعظم لفظ اللہ ہے۔ اور یہ اسم اصل اور موصوف ہے اور باقی

جتنے اسماء ہیں اسی کی صفتیں آئی ہیں۔ اور آپ قرآن میں جہاں بھی نظر ڈالیں گے تو آپ کو یہی نظر آئے گا۔ جیسے:

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴾ [الحشر:۲۲]

"وہ اللہ وہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ چھپی اور کھلی ہر بات کو جاننے والا ہے، وہی ہے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے۔"

اور اسی طرح فرمایا:

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ [الحشر:۲۳]

"وہ اللہ وہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، جو بادشاہ ہے، تقدس کا مالک ہے، سلامتی دینے والا ہے، امن بخشنے والا ہے، سب کا نگہبان ہے، بڑے اقتدار والا ہے، ہر خرابی کی اصلاح کرنے والا ہے اور بڑائی کا مالک ہے۔ پاک ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔"

سب اللہ کی صفات آرہی ہیں۔ اسی طرح کتابوں میں ہے کہ ایک بہت بڑے اللہ والے گزرے ہیں، ان کی وفات ہوگئی۔ ان کے کسی شاگرد یا معتقد نے انہیں خواب میں دیکھا (سچے لوگوں کے خواب بھی سچے اور پاک ہوتے ہیں) کہ وہ...... ماشاء اللہ...... جنت کے بڑے اعلیٰ کمروں اور اعلیٰ لباس میں ہیں۔ انہوں نے پوچھا: حضرت! کیا معاملہ ہوا؟ انہوں نے فرمایا: میرے اللہ نے مجھے بخش دیا ہے۔

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کی فضیلت:

تمام علماء اور صوفیاء اسی لفظ اللہ پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ)) [سنن الترمذی، حدیث:۲۶۳۸، باب: ما جاء فيمن يموت ...]

اور اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى لَا يُقَالَ فِي الْأَرْضِ: اَللّٰهُ، اَللّٰهُ))

"قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ دنیا میں کوئی اللہ اللہ کہنے والا باقی رہے گا۔"

[صحیح مسلم، حدیث:۱۴۸، باب: ذهاب الإيمان آخر الزمان]

تو یہ اسم اعظم ہے۔

اسمِ اعظم کا فائدہ:

اور اسمِ اعظم کی یہ شان ہوتی ہے کہ" إِذَا دُعِيَ بِهِ اسْتُجَابَ. "(جب اس کے ساتھ دعا مانگی جائے تو وہ دعا فوراً منظور ہو جاتی ہے) اس لیے آدمی کوشش کرے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے اس اسم اور لفظ کے ساتھ دعا مانگا کرے۔ لیکن جتنا اخلاص ہوگا اور جتنی دل سے دعا نکلے گی اتنا اثر ہوگا۔

دعا قبول ہونے کی ایک مقبول حالت:

حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک آدمی حاضر ہوئے اور عرض کیا: حضرت! میں بڑا پریشان ہوں، مجھ پر ایک مصیبت آگئی ہے۔ آپ میرے لیے دعا کریں۔ انہوں نے فرمایا: عجیب آدمی ہو! تم خود جاؤ اور دعا کرو۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ میں مصیبت والوں کی دعا جلدی سنتا ہوں۔ تو تمہارے ساتھ تو اللہ کا وعدہ ہے، میرے ساتھ تو اللہ کا وعدہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَمَّن يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ﴾ [النمل:٦٢]

"بھلا وہ کون ہے کہ جب کوئی بے قرار اسے پکارتا ہے تو وہ اس کی دعا قبول کرتا ہے اور تکلیف دور کر دیتا ہے۔"

اللہ کے سوا کوئی مشکل کو حل کرنے والا نہیں ہے۔ اس لیے پریشانی میں جب بھی آدمی کے دل سے دعا نکلتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرماتے ہیں۔ اور یاد رکھیں! کبھی کبھی اس لیے مصیبت آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ میرا بندہ پریشان ہو اور مجھ سے مانگے، زار زار روئے، تاکہ میں اس کی وجہ سے اس کے درجات بھی بلند کر دوں اور اس کی باقی آرزوئیں بھی پوری کر دوں۔

بسم اللہ سے رزق کی تنگی دور ہوتی ہے:

مجھ سے بھی بعض بزرگ اور دوست پوچھتے ہیں کہ ہمارے رزق میں تنگی اور تکلیف ہے تو وہ بھی یہی آیت پڑھا کریں۔ جتنا اللہ تعالیٰ توفیق دیں کوئی پابندی نہیں ہے۔ جس وقت چاہیں پڑھیں، دن کو پڑھیں، رات کو پڑھیں، چلتے ہوئے پڑھیں، بیٹھے ہوئے پڑھیں، طواف میں پڑھیں، لیکن چھوڑیں نہیں۔ اگر سو دفعہ پڑھنا شروع کر رہے ہوں تو سو دفعہ پڑھنا ہے۔ ان شاء اللہ چند دنوں میں اللہ تعالیٰ انقلاب پیدا کر دیں گے، سب غربت پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ اور اس کو یقینِ کامل کے ساتھ پڑھیں، کیونکہ اسی کے ساتھ اللہ نے قرآن کو کھولا اور شروع کیا ہے،

اسی سے خطوط اور ہر کار خیر کھلتی ہے اور اسی سے خطبہ شروع ہوتا ہے۔ تو یہ اللہ کے اسماء ہیں۔ اور اللہ نے حکم دیا ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ [الاعراف: ۱۸۰]

''اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں، لہٰذا اسے انہی ناموں سے پکارو۔''

میں تمہاری پکار کو سنتا ہوں۔ کچھ لوگ حساب وغیرہ کرتے ہیں، لیکن میں حساب وغیرہ کا قائل نہیں ہوں۔ یہ متکلمین علماء کی تحقیقات ہیں۔ اس کا قرآن وحدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بس آپ اس کو ہر وقت پڑھیں تو چند دنوں کے اندر اس کے اثرات دیکھیں گے۔ اللہ کی رحمت سے اس عمل کے ذریعے بہت جلدی انقلاب آتا ہے، لیکن پڑھنے والا کچھ یقین بھی رکھتا ہو۔ اگر اس کے اپنے اندر یقین نہ ہو تو اس کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کا علم لدنی ہوتا ہے:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام نے اپنے بیٹے کو ایک معلم کے پاس چھوڑا اور کہا کہ بچے کو پڑھائیں۔ استاذ نے کہا: بسم اللہ پڑھو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: بسم اللہ کا کیا مطلب ہے؟ استاذ نے کہا: مجھے تو مطلب نہیں آتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تم اچھے استاذ ہو کر تمہیں بسم اللہ کا مطلب ہی نہیں آتا تو مجھے کیا پڑھاؤ گے؟ اب اس استاذ کو کیا پتہ تھا کہ یہ نبی ہیں۔ اور نبیوں کو تو اللہ تعالیٰ خود علم دیتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۷، فصل فی فضلها (البسملة)]

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضور ﷺ کا علم دیکھیں کہ زندگی میں کبھی کسی مدرسے میں گئے اور نہ ہی کبھی کسی استاذ کے پاس بیٹھے، لیکن پورے عالم کو اور ان لوگوں کو پڑھا دیا جو امی تھے۔ اور ان کو ایسا پڑھایا کہ ان کو پورے عالم کا نظام سمجھا دیا، پوری دنیا کی باریک سے باریک باتیں پڑھا دیں اور سمجھا دیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ [الکہف: ۶۵]

''ہم نے ان کو اپنی طرف سے علم دیا ہے۔''

تو ان کا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟

قرآن کو کمانے اور کھانے کا ذریعہ بنانے کی مذمت:

یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم قرآن کے اندر غور نہ کریں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ بعض لوگوں نے قرآن کو تعویذ بنا کر

اپنی روٹی کا سہارا بنادیا، بعض لوگوں نے مردے پر پڑھ کر روٹی کھانے کا ذریعہ بنالیا اور بعض لوگوں نے قرآن کو چادر کے اندر رکھ کر نیچے سے لوگوں کو گزار کر حفظ وامان کا ذریعہ بنادیا، لیکن قرآن جو پیغام لے کر آیا تھا اس پر کسی نے عمل نہ کیا، اس کو کسی نے سمجھنے کی کوشش نہ کی۔

قرآن کی من مانی ترجمانی:

بعض لوگوں نے اگر کوشش بھی کی تو اردو کے تراجم سے اور سطحی علوم سے علم حاصل کیا، وارثانِ علم سے علم کو حاصل نہ کیا۔ یہ بھی بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔ وگرنہ دیکھیں! کوئی آدمی کسی کو انجینئر نہیں مانتا، ڈاکٹر نہیں مانتا۔ ہر انگریزی جاننے والا ڈاکٹر، انجینئر یا کمپیوٹر کا ماہر نہیں بن جاتا۔ اسی طرح دیگر علوم مثلاً طبعیات اور بینکنگ کا ماہر نہیں بن جاتا، بلکہ ان کے علیحدہ علیحدہ شعبے ہیں۔ تو ہر عربی جاننے والا یا اردو جاننے والا قرآن کا ماہر کیسے بن سکتا ہے؟ اس لیے یہ غلط فہمی ہے کہ دنیاوی علوم کے لیے تو استاذ کی ضرورت سمجھیں اور قرآن کے لیے صرف اردو پڑھیں اور جو مرضی آئے ترجمہ کرتے پھریں اور اپنی مرضی کے مسائل نکالتے پھریں اور اپنی اپنی تعبیرات کرتے پھریں اور جدھر مرضی آئے موڑتے رہو اور جو فائدہ پہنچائے اس کی طرف ترجمہ کرلو۔ یاد رکھو! قرآن اس وقت سمجھ آئے گا جب وارثانِ علم کے دروازے پر جا کر قرآن سمجھا جائے۔

تتمہ قصہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام:

اس روایت کے اندر اس واقعہ کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے، لیکن ایک اور روایت کے اندر تفصیل ہے۔ اگرچہ یہ اسرائیلی روایت ہے۔

اس لیے دیکھیں! پہلے دن استاذ نے کہا: بسم اللہ پڑھو۔ تو انہوں نے پوچھا: بسم اللہ کیا ہوتی ہے؟ استاذ نے کہا: تم بسم اللہ کا معنی جانتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں میں تو جانتا ہوں۔ تو استاذ نے کہا: تم مجھے بتلاؤ۔ انہوں نے فرمایا: تم میری جگہ پر آؤ، میں تمہاری جگہ پر آتا ہوں۔ استاذ تم بنے بیٹھے ہو تو میں کیوں سمجھاؤں؟ نبی کسی کے پیچھے تھوڑا بیٹھتا ہے؟ نبی تو امام ہوتا ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۷، فصل فی فضلھا (البسملۃ)]

ابوجہل کی اونٹنی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ:

ایک واقعہ ہے۔ اگرچہ روایت ضعیف ہے، لیکن کوئی عقیدے کی بات نہیں ہے کہ جس میں آدمی درایت اور

صحت کی کوشش کرے۔

حضور ﷺ بچپن میں ایک راستے سے آرہے تھے تو گم ہو گئے۔ ابو جہل نے دیکھا کہ حضور ﷺ جنگل میں اکیلے ہیں تو اس نے اپنی اونٹنی کو بٹھا دیا اور کہا: "تَعَالَ یَا مُحَمَّدُ!" آئیں میں آپ کو گھر پہنچا دوں۔ ابو جہل کہتا ہے کہ میں نے محمد (ﷺ) کو پیچھے بٹھایا تو میری اونٹنی چلے ہی نا۔ میں حیران ہو گیا کہ میری اونٹنی اتنی قیمتی ہے اور چلے نہیں۔ (اس زمانے میں اس اونٹنی کی نکیل سونے کی تھی اور اس کا ہار بھی۔ جب ابو جہل بدر میں قتل ہوا تو وہی اونٹنی حضور ﷺ کو ملی اور حضور ﷺ نے اس اونٹنی کو حجۃ الوداع پر ذبح کیا۔ اس وقت بھی ابو جہل کے وارثوں نے بڑی کوشش کی کہ حضور ﷺ اس اونٹنی کے بدلے سو اونٹنیاں لے لیں، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں یہ اب ذبح ہوگی۔) میں نے سوچا تو کچھ سمجھ نہ آیا۔ اگر اس کو ماروں گا تو دوڑ پڑے گی اور بچہ گر پڑے گا۔ تو میں نے بچے کو آگے بٹھایا تو اونٹنی چل پڑی۔ اللہ کے نبی ﷺ پیچھے آنے کے لیے تو آتے ہی نہیں، وہ تو ہمیشہ آگے اور امام ہوتے ہیں۔ اور میرے مدنی ﷺ تو امام الانبیاء ہیں۔ اللہ کے کروڑوں صلوۃ وسلام ہوں میرے مدنی محمد ﷺ پر۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کا تتمہ:

بہر حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بسم اللہ کا مطلب بتایا: "اَلْبَاءُ بَهَاءُ اللّٰهِ" "ب" سے مراد اللہ تعالیٰ کا "بہا" یعنی بلندی ہے؛ "وَالسِّیْنُ سَنَاؤُہٗ" "س" سے اللہ کی سمو اور بلندی کی طرف اشارہ ہے؛ "وَالْمِیْمُ مَمْلَکَتُہٗ" "م" سے مراد اس کی مملکت یعنی بادشاہی ہے؛ "اللہ" سے اشارہ ہے کہ وہی الٰہ ہے اور کوئی الٰہ نہیں ہے؛ "رحمن" کہتے ہیں دنیا اور آخرت میں رحم کرنے والے کو اور "رحیم" کہتے ہیں۔ آخرت میں کرم و رحم کرنے والے کو۔

یہ پرانی روایت ہے۔ اب بھی بعض لوگوں نے قرآن کی تفسیر کے اندر ایسے ایسے رموز اور نکات نکالے ہیں، لیکن ہماری شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ ہماری تفسیر وہی ہے جس کو محمد مصطفیٰ ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۷، فَصْلٌ فِیْ فَضْلِهَا (البسملة)]

حروف مقطعات کی تفسیریں:

لوگ جب نئی بات سنتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں۔ لیکن اصل اصول سوچو کہ قرآن میرے اللہ کا ہے اور حضور ﷺ پر اتارا گیا ہے، حضور ﷺ کے بغیر ہم قرآن سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اور جو چیزیں ہمیں حضور ﷺ نے

سمجھائی ہیں انہیں پر ہمارا عمل ہے، ورنہ بڑے بڑے لوگوں نے لکھا ہے۔ مثلاً "الٓمّٓ" میں "الف" سے مراد اللہ ہے، "لام" سے مراد جبرائیل ہے اور "میم" سے مراد محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اسی طرح "حٰمٓ" میں "حاء" سے حنان کی طرف اشارہ ہے، "میم" سے اللہ کے اسم منان کی طرف اشارہ ہے۔ بعض لوگوں نے یہ تفسیریں کی ہیں، لیکن ایسی تفسیروں کی اور تعیین کی کیا ضرورت ہے؟ جب میرے مدنی پاک ﷺ نے ایسے نہیں کیا تو ہم کرنے والے کون ہیں؟ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملنگوں کو موقع مل گیا۔ انہوں نے بھی ایک تفسیر گھڑی کہ "کٓهٰیٰعٓصٓ" میں "کاف" سے مراد کربلا، "ہاء" اور "یاء" سے ہلاکتِ یزید مراد ہے، "عین" سے عطشِ حسین اور "صاد" سے صبرِ حسین مراد ہے۔ اسی طرح سے ہم نے ان کو موقع دیا ہے۔ اگر ہم قرآن کے اندر ایسے جوڑ لگا سکتے ہیں تو دشمن کو بھی موقع ملتا ہے وہ ایسے جوڑ کیوں نہ لگائے؟ اگر آپ (اہلِ بدعت) اذان سے پہلے اور اذان کے بعد ڈیڑھ گھنٹے کا صلوٰۃ وسلام پڑھ سکتے ہیں تو کیا ان کو حق نہیں ہے کہ وہ اذان کے اندر ایک ٹکڑا لگالیں۔ اس طرح تو دین کا سارا مذاق بن جائے گا، بچوں کا کھیل بن جائے گا۔ جس کی مرضی آئے گی قرآن سے کھیلتا رہے گا، قرآن کو توڑتا رہے گا اور قرآن کے اندر اپنی من مانیاں اور تعبیرات کرتا رہے گا۔ اللہ سے دعا کریں کہ اللہ سب کو ہدایت دے۔ اس لیے کبھی قرآن سے تجاوز نہ کریں۔ قرآن خود وضاحت کرے گا یا زبانِ مصطفیٰ بیان کرے گی یا صحابہ بیان فرمائیں گے۔ اللہ نے میرے مدنی ﷺ کو بھیجا ہی اس لیے ہے۔ فرمایا:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ [آل عمران: ۱۶۴]

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں پاک صاف بنائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے۔"

میرا مدنی! لوگوں کو قرآن پڑھ کر سنا دو اور کتاب وحکمت کی تعلیم بھی دے دو۔ پھر...... نعوذ باللہ!...... یہ مطلب ہوگا کہ حضور ﷺ ہم سے تعلیم چھپا گئے، کچھ مسئلے رکھ گئے۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ اسلامی ممالک میں قرآن پاک نافذ فرمائے، سنتِ رسول نافذ فرمائے اور ان پر اسی طرح عمل کرنے کی توفیق دے جیسے اصحابِ رسول اللہ ﷺ اور ائمہ محدثین رحمہم اللہ اور ائمہ فقہاء رحمہم اللہ نے عمل کیا۔ آج بھی اللہ کے قرآن کے مقابلے میں ہماری عقل اور آراء کوئی قیمت نہیں رکھتیں۔

نحوی ترکیب:

اب ایک اور مسئلہ کہ باء حرف جر ہے۔ یہ کس کے متعلق ہے؟ بعض حضرات نے کہا کہ یہ جملہ اسمیہ ہے اور شروع میں مبتداء محذوف ہے اور وہ ہے: "اِبْتِدَائِیْ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" بعض نے کہا: جملہ فعلیہ ہے اور فعل مقدر ہے: "أَبْدَءُ"، "أَشْرَعُ" یا "أَقْرَءُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"۔ علماء نحو کے نزدیک یہ دو طرح کی تراکیب ہیں اور یہ دونوں صحیح ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۸، فَصْلٌ فِیْ فَضْلِهَا (اَلْبَسْمَلَةِ)]

ہر کام "بِسْمِ اللّٰهِ" سے شروع کریں:

جو کام بھی کرو کھڑا ہونا، بیٹھنا، کھانا، پینا، وضو کرنا اور نماز پڑھنا، ہر کام سے پہلے اللہ کا نام لیں، کیونکہ اللہ کے نام سے برکت بھی ہوگی، مدد بھی ہوگی اور اللہ کے نام سے وہ عمل قبول بھی ہوگا۔

اس لیے حدیث مبارک میں آتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت جبرائیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور سب سے پہلے جو پیغام لے کر آئے وہ "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" تھا۔ حضور ﷺ نے اس کو پڑھا، پھر جبرائیل علیہ السلام نے پڑھایا "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" حضور ﷺ نے اس کو پڑھا۔ پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا: اب اللہ کا نام لے کر ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ①﴾ [العلق:۱] پڑھیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳، اَلْكَلَامُ عَلٰى مَا يَتَعَلَّقُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ]

لہٰذا پڑھیں تو اللہ کے نام سے، بیٹھیں تو اللہ کے نام سے اور اٹھیں تو اللہ کے نام سے۔ ہر کام کی ابتداء بسم اللہ سے کریں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ⑲﴾ [آل عمران: ۱۹۰]

جو میرے مومن بندے ہیں ان کی صفت یہ ہے کہ کھڑے ہیں میرا ذکر ہے، بیٹھے ہیں تو میرا ذکر ہے، لیٹے ہیں تو میرا ذکر ہے اور اگر آسمانوں پر نظر پڑے تو میرا ذکر ہے، زمینوں پر نظر پڑے تو میرا ذکر ہے: یا اللہ! تو نے کیسا آسمان بنایا! کیسی زمینیں بنائیں! سبحان تیری قدرت ہے!! اور یہ سارا کارخانہ قدرت تو نے بے فائدہ تو نہیں بنایا ہے، لازماً اس کا حساب و کتاب ہوگا، جزاء و سزا ہوگی۔ میرے اللہ! اپنی رحمت کے ساتھ ہمیں اپنی جہنم سے بچالے۔

مومن بندے کی صفت بھی یہی ہے کہ ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ وضو ہے تب بھی، وضو نہیں ہے تب بھی، گھر کو جا رہا ہے تب بھی، گھر سے آ رہا ہے تب بھی ذکر کرتے ہوئے آئے جائے۔ اگر بیٹھا ہوا ہے تب بھی غور کر رہا ہے کہ میرے اللہ نے اتنا بڑا کارخانہ بنا دیا ہے۔ شمس و قمر ہیں، زمینیں ہیں اور مخلوقات ہیں ان کو بے فائدہ تو نہیں بنایا۔ بہر حال ان کے اندر اس کی ضرور کوئی حکمتیں ہیں۔ لازمی بات ہے کہ اس کے اندر کوئی جزا و سزا ہو، کوئی فیصلے کا دن ہو۔

اسم سے مراد مسمّیٰ ہے یا غیر مسمّیٰ:

اسم سے مراد مسمّیٰ ہے، ذات کا نام ہے یا غیر مسمّیٰ مراد ہے؟ اس میں تین اقوال ہیں:

1. ...... پہلا قول یہ ہے کہ اسم سے مراد مسمّیٰ ہے۔ یہ ابو عبیدہ رحمہ اللہ اور سیبویہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔
2. ...... دوسرا قول یہ ہے کہ اسم غیر مسمّیٰ ہے اور نفس تسمیہ ہے۔
3. ...... تیسرا قول جو راجح ہے وہ یہ کہ اسم مسمّیٰ بھی نہیں اور تسمیہ بھی نہیں ہے۔

اگر اسم سے مراد لفظ ہے جو ہم ادا کر رہے ہیں، جو ہماری صوت (آواز) سے نکل رہا ہے تو واضح بات یہ ہے کہ یہ غیر مسمّیٰ ہے۔ اگر اسم سے مراد ذات باری تعالیٰ ہے تو بات ہی واضح ہے۔ لہٰذا اشکالات، الجھنوں اور باریکیوں میں ہمیں پڑنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ورنہ اس پر فرق ضالہ نے بڑی بڑی بحثیں کی ہیں اور لوگوں کو انہیں تحقیقات میں الجھا دیا ہے۔ اس لیے انسان فرق ضالہ سے احتراز کرے اور جس پر قرآن و سنت کی تحقیق ہے اس پر اپنے آپ کو قائم و دائم رکھے۔

فرق ضالہ نے اس پر بڑے بڑے دلائل دیے کہ کبھی کبھی اسم ہوتا ہے، لیکن چیز نہیں ہوتی۔ جیسے معدوم اسم تو ہے، لیکن کوئی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح کبھی ایک چیز کے کئی نام ہوتے ہیں، کبھی نام ایک ہوتا ہے، لیکن جن چیزوں کا نام ہے وہ بہت ہیں۔ جیسے ''نار'' اگر یہ عین مسمّیٰ ہے تو جب ہم نام لیں تو ہماری زبان جل جائے۔ اسی طرح برف کا نام لیں تو زبان ٹھنڈی ہو جائے کہ اسم کا نام لیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسم اور ہے اور مسمّیٰ اس کا غیر ہے۔ جیسے قرآن پاک کے اندر اللہ پاک نے فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ [الاعراف: ۱۸۰]

''اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں، لہٰذا اسے انہی ناموں سے پکارو۔''

اور حدیث پاک میں آیا ہے:

((إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ اِسْمًا)) [صحیح البخاری، حدیث: ۷۳۹۲، باب: إِنَّ لِلّٰهِ مِائَةَ اسْمٍ إِلَّا وَاحِدًا]

''اللہ کے ننانوے نام ہیں۔''

اب اللہ کی ذات ایک ہے، لیکن اسماء متعدد ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ①﴾ [العلق: ۱]

''پڑھو اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے سب کچھ پیدا کیا۔''

یہاں اسم کی اضافت رب کی طرف ہے۔ اضافت مغایرت چاہتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ یعنی ''فَادْعُوْهُ بِاَسْمَائِهٖ'' اس سے معلوم ہوا کہ اسم اور مسمّی کے درمیان مغایرت ہوتی ہے۔ اور بعض نے کہا کہ اسم عین مسمّی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ⑦⑧﴾ [الرحمٰن: ۷۸]

''بڑا بابرکت نام ہے تمہارے پروردگار کا جو عظمت والا بھی ہے، کرم والا بھی۔''

اللہ کی ذات مبارک ہے اور اسم کی تعظیم کے لیے اس تبارک کو استعمال کیا گیا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ اگر کسی کی بیوی کا نام زینب ہو اور اس نے کہا کہ زینب کو طلاق ہے تو اس کو طلاق ہو جائے گی۔ اگر زینب ایک چیز ہے اور نام دوسری چیز ہے اور اصل مسمّی غیر ہے تو پھر طلاق نہیں ہونی چاہیے۔ اس لیے نتیجہ یہ ہوا کہ اسم اور مسمّی ایک چیز ہوتی ہے۔ مفسر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ ذات جو اس اسم کے ساتھ مسمّی ہے اس کو طلاق ہو گی۔ بعض نے کہا: اسم تسمیہ کی مدد کے لیے آیا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی اسم کا غیر ہے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مختار یہ ہے کہ اسم مسمّی کا بھی غیر ہے اور تسمیہ کا بھی غیر ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۸، فَصْلٌ فِيْ فَضْلِهَا (الْبَسْمَلَةِ)]

اللہ کا ذاتی نام:

اللہ اسمِ جلالہ اور اللہ کا نام ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ لفظ اللہ اسمِ اعظم ہے، کیونکہ قرآن میں اللہ کے جتنے نام آئے ہیں وہ صفات ہیں اور لفظ اللہ موصوف ہے۔ معلوم ہوا کہ اسمِ اعظم لفظ اللہ ہے۔ جیسے قرآن پاک میں آتا ہے:

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ②②﴾ [الحشر: ۲۲]

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ [الحشر:۲۳]

﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ [الحشر:۲۴]

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۚ﴾ [الاسراء:۱۱۰]

''اللہ کو لفظ اللہ سے پکارو یا لفظ رحمٰن سے پکارو، اللہ کے سب نام اچھے اچھے ہیں۔''

اللہ کے ناموں کی تعداد:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔ایک کم ایک سو، جو انہیں یاد کر لے جنتی ہے۔(یاد کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ یاد کر لے گا تو جنتی ہوگا، بلکہ یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو یاد کر کے ان کے مقتضاء پر عمل کرے۔پھر جنت ملے گی)۔

[صحیح البخاری، حدیث:۷۳۹۲، باب: إِنَّ لِلّٰهِ مِائَةَ اسْمٍ إِلَّا وَاحِدًا]

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض روایات میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے سے کم اور بعض میں زیادہ منقول ہیں۔ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پانچ ہزار نام ہیں۔ایک ہزار تو قرآن شریف اور صحیح حدیث میں ہیں اور ایک ہزار توراۃ میں اور ایک ہزار انجیل میں اور ایک ہزار زبور میں اور ایک ہزار لوحِ محفوظ میں ہیں۔بہرحال صحیح احادیث میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔[تفسیر ابن کثیر:۱/۱۹، فَصْلٌ فِیْ فَضْلِهَا (الْبَسْمَلَةِ)]

کسی کو قاضی الحاجات کہنا:

بعض اسماء صفاتی ہوتے ہیں۔اس لیے ہمیشہ لحاظ ہونا چاہیے۔جیسے''قَاضِی الْحَاجَاتِ'' اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، لیکن ہمارے لوگ جہالت اور اندھی تقلید کی وجہ سے کہتے ہیں کہ ہمارے حضرت قَاضِی الْحَاجَاتِ ہیں۔......نعوذ باللہ!......وہ صفت جس کا اللہ پر اطلاق ہو اس کا کسی بندے کے لیے استعمال کرنا، پیر اور پیغمبر پر استعمال اور اللہ کے کسی فرشتے پر استعمال کرنا اس سے شرک کا شائبہ ہوتا ہے۔

کسی کو مشکل کشا کہنا:

مثلاً مشکل کشا، یہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ یہ بھی اللہ کی صفت ہے، کیونکہ جب کسی کو کوئی مشکل پیش آئے تو اللہ کے سوا کوئی اس کو حل نہیں کر سکتا۔ قرآن میں ہے:

﴿وَإِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ﴾ [الانعام:17]

"اگر اللہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچائے تو خود اس کے سوا اسے دور کرنے والا کوئی نہیں۔"

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ [التغابن:11]

"کوئی مصیبت اللہ کے حکم کے بغیر نہیں آتی۔"

اور اسی طرح ایک اور جگہ پر فرمایا:

﴿قُل لَّن يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا﴾ [التوبہ:51]

"ہمیں ہرگز کوئی مصیبت نہیں پہنچتی جب تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نہ لکھے۔"

اور کبھی کوئی مصیبت نہیں کھلتی جب تک اللہ تبارک وتعالیٰ نہ کھولے۔ اب ہم کسی کو مشکل کشا مانیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ صفت جو اللہ کی تھی وہ غیر کے لیے ثابت کر رہے ہیں۔ اور یہی چیزیں انسانوں کو شرک تک لے جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو محفوظ فرمائے۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو صحیح لکھنے کی توفیق دے، وگرنہ لوگ وہ کتاب لے آتے ہیں کہ فلاں عالم نے اپنے استاذ کو یوں لکھا تھا۔ بھائی! وہ تو عالم تھے، انہوں نے تو بطور مجاز کہہ دیا ہوگا۔ جیسے آدمی کہتا ہے کہ یہ دوا اتنی اچھی تھی کہ میں کھاتا گیا اور میری بیماری چلی گئی۔ اب وہ مجازاً کہہ رہا ہے، ورنہ بیماری ہمیشہ اللہ کے حکم سے جاتی ہے، لیکن جب ہم ان لفظوں کو عام کریں گے اور عامۃ الناس میں آئیں گے تو پھر شرک ہی پھیلے گا۔ بہرحال وہ کہیں گے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی مشکل کشا ہیں، حاجت روا ہیں۔ تو انہوں نے کہا: جب حضرت علی رضی اللہ عنہ مشکل کشا ہیں، حاجت روا ہیں پھر تو اللہ کے ولی بھی حاجت روا ہیں، مشکل کشا اور قاضی الحاجات ہیں، بلکہ بعض بزرگوں کے لقب "قَاضِی الْحَاجَاتِ" لکھے گئے۔ اللہ تعالیٰ اس سے مسلمانوں کو محفوظ فرمائے اور اللہ پاک ہدایت عطا فرمائیں۔

شرک کے وہم کی چیزوں سے بھی بچو:

پاکپتن شریف میں بہت بڑے اللہ والے ہیں۔ اللہ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ اللہ تعالیٰ تمام اولیاء کی قبروں کو نور سے بھر دے، ان کی قبروں پر رحمتوں کی بارش برسا دے۔ لیکن جو بعد میں لوگ آتے ہیں ان میں معصیت ہے۔ انہوں نے لکھا ہے: اللہ، پھر آگے ہے محمد ﷺ، پھر آگے ہیں چار یار، یہ ایک پلڑا ہو گیا۔ اور اگلے پلڑے میں ہیں بابا فرید۔ اب جاہل آدمی جب دیکھے گا تو کیا سمجھے گا؟ لکھنے والوں کی اگرچہ نیت اچھی ہو۔ انہوں نے شاید یہ تاثر دیا ہو کہ ہم اللہ کو بھی مانتے ہیں، حضور ﷺ کو بھی مانتے ہیں، چار یاروں کو بھی مانتے ہیں اور بطور مرشد بابا فرید گنج شکر کو بھی مانتے ہیں۔ لیکن جب عام جاہل پڑھتا ہے تو سوچتا ہے کہ ایک طرف تو سارے آگئے اور ایک طرف اکیلا بزرگ کھڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کے برابر اس کا وزن ہے۔ اس لیے جاہل آدمی شرک میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جہاں پر ایسی چیزوں کا وہم پڑتا ہو آدمی کو چاہیے کہ اس سے بچے۔

ایک حدیث سے بہترین دلیل:

لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ہمیں "یا محمد" نہیں لکھنے دیتے۔ بھائی! آپ "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" لکھیں مجال ہے کہ کوئی آپ کو منع کرے، آپ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" لکھیں مجال ہے کہ آپ کو کوئی منع کرے۔ یہ (سعودی عرب والے) سخت موحد ہیں کہ اللہ لکھا ہے اور محمد لکھا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے کہا: "مَا شَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ" (جو اللہ چاہیں اور آپ چاہیں) تو حضور ﷺ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا اور فرمایا:

((أَجَعَلْتَنِيْ لِلّٰهِ عَدْلًا؟ قُلْ: مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ)) [السنن الکبری للنسائی، حدیث:۱۰۷۵۹]

"تم نے مجھے اللہ کا شریک بنا دیا؟ یوں کہو جو اللہ تنہا چاہے۔"

میرا چاہنا تو اللہ کے تابع ہے۔ اتنی بات پر حضور ﷺ صحابی کو روک رہے ہیں۔ صحابی سے کوئی شرک کا ڈر نہیں تھا۔ صرف اس لیے منع کیا کہ میرے بعد آنے والی امت شرک میں مبتلا نہ ہو جائے۔

ضروری اصلاح:

اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ یا حرفِ ندا ہے۔ اس کے ساتھ پکارا جاتا ہے۔ جب تم لکھو گے "یا اللّٰہ!" اور

دوسری طرف "یا محمد!" تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ جس طرح اللہ کو پکارنا جائز ہے اسی طرح حضور ﷺ کو پکارنا جائز ہے۔ تو شرک کی طرف آ گئے۔ پھر آگے بڑھے "یا غوثِ اعظم" شیعہ کہیں گے "یا علی" اور لوگ آئیں گے: یا پیر یا دستگیر اب بات چل گئی۔ اور انسان عقیدہ حقہ کی پٹڑی سے اترتا چلا گیا۔ جب ٹرین پٹڑی سے اتر جائے تو تباہی ہی تباہی ہے۔

لوگ کہتے ہیں: وہابی ہے اس لیے "یا محمد" دیکھ کر جل گیا ہے۔ اگر وہ جلتا ہے تو وہابیوں کی اذان اور نماز میں "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" سے تو بغض نہیں، مگر تیرے شرک سے بغض ہے، تیری کفر والی عادات سے بغض ہے۔ انہی سے بچانا چاہتے ہیں۔ جو تیرے خیر خواہ ہیں تو نے انہی کو اپنا دشمن بنایا ہوا ہے۔ اللہ ہمیں صحیح عقیدوں کی سمجھ عطا فرمائے۔

بسم اللہ صرف دو پیغمبروں پر اتری:

مفسر رحمہ اللہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کے فضائل میں جو احادیث مبارکہ ہیں وہ ذکر فرما رہے ہیں۔ ابن مردویہ نے ابن بریدہ سے، انہوں نے اپنے والد حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" مجھ پر اتری ہے۔ مجھ سے پہلے کسی اور پیغمبر پر نہیں اتری ماسوائے حضرت سلیمان علیہ السلام کے۔

یعنی یہ آیت حضرت سلیمان علیہ السلام پر اتری یا یہ آیت اللہ نے مجھے عطا فرمائی ہے۔ کیونکہ سورۃ النمل کے اندر موجود ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو خط لکھا تھا تو اس میں ابتداء "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" سے کی تھی۔ فرمایا:

﴿اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ [النمل: ۳۰]

"وہ سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہے اور اس میں یہ (مضمون) ہے (اول) "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"۔"

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۷، فصل فی فضلها (البسملة)]

خط لکھنے کا مسنون طریقہ:

اسی سے علماء نے ایک مسئلہ نکالا ہے۔ اور اس کے اندر غفلت بھی ہوتی ہے۔ جب بھی آدمی خط لکھے تو پہلے اپنا نام

لکھے اور اس کے ساتھ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" سے ابتداء کرے۔ لیکن ہمارے ہاں رواج یہ ہے کہ اوپر اس کا نام لکھتے ہیں جس کی طرف خط بھیجتے ہیں اور اپنا نام آخر میں جا کر لکھتے ہیں۔ یہ طریقہ سنت کے خلاف ہے۔ سنت طریقہ یہ ہے کہ اپنا نام پہلے ہو اور ابتداء بسم اللہ سے ہو اور آخر میں والسلام کہہ دیا جائے۔ آج کل جو رواج ہے کہ لوگ پیڈ چھپوا لیتے ہیں، اس سے بھی کام چل جاتا ہے، کیونکہ اوپر آدمی کا اپنا نام موجود ہوتا ہے۔ یہ بھی سنت کے مطابق طریقہ ہو جاتا ہے۔

بسم اللہ کے اترنے کی عظمت:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب اللہ نے یہ آیت اتاری تو بادل مشرق کی طرف سے ہٹ گئے، یعنی مطلع صاف ہو گیا اور ہوائیں تھم گئیں، دریاؤں کی روانی رک گئی، جانوروں نے بھی اپنے کان جھکا لیے بات سننے کے لیے اور آسمانوں سے شیاطین کو رجم کیا گیا، مارا گیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۷، الفصل فی فضلها (البسملة)]

بسم اللہ کی برکت:

اور اللہ تعالیٰ نے حلف اٹھایا کہ مجھے اپنی عزت اور جلال کی قسم ہے کہ کسی چیز میں بھی میرا یہ نام لیا جائے گا تو میں اس میں برکت ڈال دوں گا۔ اسی لیے حکم ہے کہ ہر کام کی ابتداء "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" سے کریں۔ وضو کر رہے ہیں، کھانا کھا رہے ہیں، پانی پی رہے ہیں، حتیٰ کہ اگر میاں بیوی مل رہے ہیں تو اپنے کپڑے اتارنے سے پہلے "بِاسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا" پڑھیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: جو یہ پڑھ لیں گے اگر اللہ نے ان کے مقدر میں اولاد لکھی ہے تو وہ اولاد صالح ہو گی، نافرمان نہیں ہو گی۔ اور جس بات کی اللہ قسم کھا لیں اس پر مسلمان کا ایمان ہونا چاہیے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۱۴۱، باب: التَّسْمِيَةِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ وَعِنْدَ الْوِقَاعِ]

جہنم سے حفاظت کا عمل:

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جہنم کے ۱۹ داروغوں سے جو بچنا چاہے وہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھا کرے، کیونکہ اس کے حروف بھی ۱۹ ہیں اور جو فرشتے جہنم پر متعین ہیں ان کی تعداد بھی ۱۹ ہے۔ ہر حرف ہر فرشتے سے بچاؤ بن جائے گا۔ جب آدمی اس کی پکڑ سے بچ گیا تو معنی یہ ہوا کہ جہنم سے بچ گیا۔ اسے ابن

عطیہ رحمۃ اللہ علیہ اور قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بیان کیا ہے۔

ابن عطیہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کو کہ جہنم پر جو فرشتے مقرر ہیں ان فرشتوں کی تعداد بھی ۱۹ ہے، اسی طرح بسم اللہ میں بھی ۱۹ حروف ہیں۔ یہ انہوں نے اس مناسبت سے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث موجود ہے کہ ایک دفعہ جب "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ" کے جواب میں ایک صحابی نے "رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيهِ" پڑھا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے ۳۰ سے اوپر فرشتوں کو دیکھا کہ وہ جلدی کر رہے تھے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں یہ کلمات لے کر اللہ کی خدمت میں جاؤں۔[1] چونکہ اس میں بھی ۳۰ سے اوپر حروف بنتے ہیں اور اتنے ہی فرشتے اترے۔ اس لیے اس حدیث مبارکہ سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول مبارک کی تقویت ہوتی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۷، ۱۸ فصل فی فضلھا (البسملۃ)]

ویسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں اور بڑے فقہاء صحابہ میں سے ہیں۔ اور صحابہ کی یہ شان ہے کہ وہ اپنی طرف سے کوئی ایسی بات نہیں کہتے جب تک کہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فرمان مبارک سے تائید نہ ملے۔ اگر وہ بھی مسائل کے اندر اجتہاد بھی کرتے ہیں تو وہ بھی قرآن وسنت کی روشنی میں ہوتا ہے۔

شیطان کو تکبر کرنے کا موقع نہ دو:

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث مبارک نقل کی ہے حضرت ابو تمامہ کہتے کہ ایک صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سواری پر بیٹھے تھے، اونٹنی کو جھٹکا لگا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم گرنے لگے، صحابی نے کہا: اللہ شیطان کو ہلاک کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم یوں نہ کہو۔ اس سے شیطان بڑا بنتا ہے کہ میں اپنی قوت سے ان کو گرا رہا تھا۔ جب ایسا موقع آجائے تو بسم اللہ یعنی اللہ کا نام لیا کرو۔ جب تم اللہ کا نام لیتے ہو تو وہ ایسے ہو جاتا ہے جیسے مکھی ہو۔ [مسند احمد، حدیث: ۲۰۵۹۲، سنن ابی داؤد، حدیث: ۴۹۸۲]

وہ کہتا ہے باوجود اس کے کہ ان کو تکلیف پہنچی ہے، پھر بھی وہ میری طرف سے نہیں سمجھتے، بلکہ اللہ کی طرف سے سمجھتے ہیں کہ نفع ہے کہ نقصان اللہ کی طرف سے ہے، گرتا ہے یا چڑھتا ہے تو اللہ کی طرف سے ہے۔

وضو میں بسم اللہ نہ پڑھنے کا نقصان:

اسی طرح امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں بھی موجود ہے اور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۷۹۹، باب: فضل "اللھم ربنا لک الحمد"]

فرمایا:

((وَلَا وُضُوْءَ لِمَنْ لَمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ تَعَالٰى عَلَيْهِ))

''جو شخص وضو کے وقت بسم اللہ نہ پڑھے گویا اس کا وضو ہی نہیں ہے۔''

[مسند احمد، حدیث: ۹۴۱۸، ترمذی: ۲۵، باب: فِي التَّسْمِيَةِ عِنْدَ الْوُضُوْءِ]

اس لیے یاد رکھیں! ''لا'' کا استعمال کبھی فضیلت کی نفی کے لیے ہوتا ہے۔ ایک آدمی نے وضو کے وقت بسم اللہ نہیں پڑھی تو اس کا وضو ہو جاتا ہے، لیکن اس وضو سے جو برکات اور کمالات حاصل ہونے تھے وہ حاصل نہیں ہوں گے۔ اس لیے علماء نے فرمایا کہ ''لا'' کا استعمال کبھی نفی جنس کے لیے ہوتا ہے اور کبھی نفی کمال کے لیے ہوتا ہے۔

حاکم کی اطاعت:

اور بعض علماء تو فرماتے ہیں کہ وضو سے پہلے بسم اللہ پڑھنا واجب کے درجہ میں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اللہ کی اطاعت کریں، اللہ کے رسول کی اطاعت کریں اور اولوالامر کی اطاعت کریں۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت غیر مشروط اطاعت ہے۔ اولی الامر سے مراد حاکم اور ولی الامر گھر کا بڑا ہے۔ اسی طرح سفر میں ایک امیر بنایا جاتا ہے تو وہ ولی الامر ہے۔ اس کے حکم کی بھی اطاعت کریں گے، لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کا کوئی حکم اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ اگر ہمارا کوئی حاکم یا امیر ہمیں کوئی ایسا حکم دیتا ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول کے خلاف ہے تو اس کی اطاعت نہیں ہوگی۔ اسی طرح خاوند اپنی بیوی کو جو بھی حکم کرے اس کی اطاعت کرے، لیکن خاوند ایسا حکم دیتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے خلاف ہے تو پھر بیوی پر اطاعت واجب نہیں ہے۔

ایک صحابی رئیسِ لشکر کا واقعہ:

جیسے ایک حدیث مبارک ہے کہ حضور ﷺ نے ایک صحابی کو امیر بنا کر بھیجا۔ اس صحابی کی طبیعت میں بڑا جلال اور غصہ تھا، چھوٹی چھوٹی بات پر ناراض ہو جاتے تھے۔ وہ کسی بات پر اپنے نوجوانوں پر ناراض ہو گئے اور انہوں نے ایک گڑھا تیار کرنے کا حکم دیا۔ گڑھا تیار ہو گیا۔ لکڑیوں کا حکم دیا تو لکڑیاں بھی آ گئیں۔ حکم دیا کہ آگ جلاؤ۔ آگ بھی جلالی۔ اب انہوں نے کہا: میں حکم دیتا ہوں کہ سب اس آگ میں کود جاؤ۔ صحابہ نے کہا: ہم نے آپ کے

کہنے پر گڑھا کھودا ہے، لکڑیاں بھی لائے ہیں، آگ بھی جلائی ہے۔ اسی آگ سے بچنے کے لیے تو ہم نے محمد عربی ﷺ کا کلمہ پڑھا ہے اور تم ہمیں پھر آگ کے اندر کودنے کا حکم دیتے ہو؟ یہ حکم نہیں مانتے۔ جب آگ ٹھنڈی ہوئی تو ان کا غصہ بھی ختم ہو گیا۔ جب واپس حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے اچھا کیا۔ اگر تم خدانخواستہ آگ میں چلے جاتے تو قیامت تک اسی آگ میں جلتے رہتے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۴۳۴۰، باب: سَرِيَّةُ عَبْدِ اللهِ بْنِ حُذَافَةَ السَّهْمِيِّ...]

کیونکہ وہ خودکشی تھی اور وہ حرام موت ہے۔ اس لیے تم نے بہت اچھا کیا کہ تم نے ایسے حاکم کی اطاعت نہیں کی جس کا حکم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے خلاف ہو۔

ائمہ مجتہدین کی خدمات کے فائدے:

حضور ﷺ کے زمانہ میں ان مسئلوں کے اندر کوئی تکلیف نہیں تھی، کیونکہ جب کوئی مسئلہ پیش آتا تو صحابہ رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کے پاس حاضر ہو کر عرض کرتے کہ آپ کا یہ حکم مشورہ کے طور پر ہے یا اجتہاد مبارک ہے۔ حضور ﷺ کے زمانہ کے گزر جانے کے بعد امت کے لیے مشکلات آنے والی تھیں کہ ہم کیسے فیصلہ کریں کہ یہ حکم ضروری تھا، مشورہ تھا، اجتہاد تھا یا رائے تھی؟ اس لیے اللہ نے ان ائمہ اربعہ کو پیدا کیا۔ اللہ ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ انہوں نے پھر قرآن و حدیث کے ذخیرہ کو جمع کیا، اسماء الرجال پر نظر ڈالی اور پھر ہمیں سمجھایا کہ یہ حکم وجوب کے لیے ہے، یہ حکم استحباب کے لیے ہے، یہ سنت موکدہ ہے، غیر موکدہ ہے، یہ فرض کفایہ ہے یا یہ فرض عین ہے۔ انہوں نے ان احکامات کے اندر حضور ﷺ کے قول و عمل کو سامنے رکھ کر ہمارے لیے ایک آسانی پیدا کر دی۔ اگر وہ ہمارے لیے حل پیدا نہ کرتے تو ہم تباہ ہو جاتے۔

قرآن و حدیث میں مشکلات اور ان کا حل:

اب دیکھیں! قرآن نے ہمیں حکم دیا:

﴿يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلٰوةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۚ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝﴾ [الجمعۃ: ۹]

"اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف لپکو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔

یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھو۔"

"فَاسْعَوْا" امر کا صیغہ ہے۔ اور اس کے بعد آگے فرمایا:

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ [الجمعۃ:۱۰]

"پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔"

اب ہم کیسے فیصلہ کریں کہ دونوں امر وجوب کے لیے ہیں؟ اس طرح تو اذان کے بعد مسجد میں آنا بھی واجب ہوتا اور جمعہ کے بعد مسجد سے نکلنا اور تجارت کرنا واجب ہوتا۔

بعض احادیث میں تو یہ بھی ہے کہ جب آدمی ایک نماز پڑھ لے، مثلاً: مغرب کی نماز پڑھ لی اور اب عشاء کی نماز کی انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے کے بارے میں لکھ دو کہ وہ نماز پڑھ رہا ہے۔ فرشتے کہتے ہیں: یا اللہ! وہ تو بیٹھا ہوا ہے، نماز تو نہیں پڑھ رہا؟ اللہ فرماتے ہیں کہ نماز کے لیے ہی تو بیٹھا ہوا ہے، اس لیے سارا وقت نماز پڑھنے کا لکھ دو۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۶۴۷، باب: فضل صلاۃ الجماعۃ]

اب اگر کوئی جمعہ کے بعد اس حدیث کے مطابق بیٹھنا چاہے کہ میں عصر تک بیٹھا رہوں۔ اور ادھر قرآن پاک میں ہے کہ جمعہ کے بعد باہر نکلو۔ تو کیا کرے گا؟ اس لیے علماء نے تحقیق کر کے فرمایا کہ پہلا امر وجوب کے لیے ہے اور دوسرا امر اباحت کے لیے ہے کہ اب جمعہ ہو گیا تو آپ جا کر کام کریں تو یہ جائز ہے۔ اللہ آپ کے رزق میں برکت دیں گے۔ لیکن اگر کام نہیں ہے اور آدمی حرم کے اندر آیا ہوا ہے کہ میں جمعہ کا دن حرم میں گزاروں تو وہ جمعہ کی نماز کے بعد بیٹھ جائے یا طواف میں لگ جائے، عبادت میں لگ جائے تو کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اللہ کے حکم کا مخالف نہیں ہوگا۔ الحمد للہ! علماء نے اتنی تحقیقات کی ہیں کہ چودہ سو سال گزر گئے ہیں، دنیا کے کسی مسئلے کے بارے میں پریشان ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور انہوں نے مسائل کے ایسے ایسے دروازے کھولے ہیں کہ کوئی بھی نیا مسئلہ آ رہا ہے تو اس کا حل ان کے پاس موجود ہے۔

اس لیے علماء کرام اللہ کے اس حکم کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وضو کے اول میں بسم اللہ پڑھنا واجب ہے۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ ہر کام کے اندر واجب ہے، صرف وضو کے اندر ہی واجب نہیں ہے۔ اور اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ اور ایک جماعت اس طرف ہے کہ جب جانور ذبح کرنے لگے تو بسم

اللہ پڑھے۔ بعض کہتے ہیں کہ شروع میں بسم اللہ پڑھنی واجب ہے اور بعض فرماتے ہیں: مطلقاً واجب ہے۔
[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۸، فَصْلٌ فِيْ فَضْلِهَا (الْبَسْمَلَةِ)]

صحبت سے قبل بسم اللہ کی فضیلت کی ایک حدیث کی تحقیق:

امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب کے اندر بسم اللہ کی تفسیر میں کئی فضیلتیں لکھی ہیں۔ ان کے اندر ایک یہ ہے کہ جب آدمی اپنی بیوی سے مجامعت کرنا چاہتا ہے تو بسم اللہ پڑھے تو اس سے جو اولاد پیدا ہوگی اور جب تک وہ سانس لے گی فرشتے اس کی نیکیاں لکھیں گے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے اس حدیث کی بہت سی معتبر کتابوں میں تلاش کیا، لیکن مجھے یہ حدیث کہیں نہیں ملی۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۸، فَصْلٌ فِيْ فَضْلِهَا (الْبَسْمَلَةِ)]

کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ:

صحیح مسلم شریف کے اندر حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو فرمایا کہ جب کھانا کھانے لگو تو ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' پڑھو اور دائیں ہاتھ سے کھایا کرو اور اپنے سامنے سے کھایا کرو۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۵۳۷۶، باب: التَّسْمِيَةِ عَلَى الطَّعَامِ]

اصول یہ ہے کہ جب آدمی کھانا شروع کرنے سے پہلے ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' پڑھتا ہے تو شیطان بھاگ جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب آدمی کھانا شروع کرنے سے پہلے ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' پڑھتا ہے تو شیطان کے چیلے جنات کہتے ہیں کہ بھاگو! یہاں کھانے کو کچھ نہیں ملے گا۔ اور جس دسترخوان پر ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' نہ پڑھی جائے تو وہ کہتے ہیں کہ آؤ، بیٹھ جاؤ (یہ ساری اپنی برادری ہے۔) یہاں ہم سب مل کر کھائیں گے۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۰۱۸، باب: آدَابِ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ]

اس لیے ضروری ہے کہ آدمی کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھے۔

کھانا کھانے کے بعد کی دعا:

اور کھانا کھانے کے بعد ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' پڑھے یا:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَطْعَمَنَا، وَسَقَانَا، وَجَعَلَنَا مُسْلِمِيْنَ))

[سنن الترمذی، حدیث: ۳۴۵۷، باب: مَا يَقُوْلُ إِذَا فَرَغَ مِنَ الطَّعَامِ]

اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَطْعَمَنَا، وَسَقَانَا، وَكَسَانَا مِنَ الْعُرْيِ وَآوَانَا وَجَعَلَنَا مُسْلِمِيْنَ))

ساری تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں کھلایا، پلایا اور ہمیں کپڑا پہنایا اور جس نے ہمیں پناہ دی۔ اس کا ہم شکر ادا کرتے ہیں جس نے ہمیں مسلمانوں کی صف میں بنایا۔ یہ کہنے سے اللہ تعالیٰ اس کے رزق میں برکتیں عطا فرماتے ہیں۔

خلافِ شرع دعوتوں کا حکم:

آج جتنے بڑے آدمی کی دعوت ہوتی ہے وہ اتنی ہی اسلام کے خلاف ہوتی ہے۔ کھڑے ہو کر کھائیں گے، پلیٹیں ہاتھوں میں لے کر کھائیں گے۔ اللہ معاف فرمائے! نہ خدا کا نام ہے، نہ رسولِ خدا ﷺ کا نام ہے اور نہ کسی کو "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" یاد ہے اور نہ کھانے کے بعد کی دعا پڑھتے ہیں اور بائیں ہاتھ سے کھاتے ہیں، کیونکہ انگریز کی سنت بائیں ہاتھ سے کھانا ہے اور حضور ﷺ کی سنت دائیں ہاتھ سے کھانا ہے۔

اسی لیے ایسی دعوتوں میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ خاص طور پر اہلِ علم اور علماء حضرات جن کی لوگ اتباع کرتے ہیں۔ امام مسجد ہے، عالم ہے، خطیب ہے۔ اللہ نے اس کو عزت دی ہے۔ ایسی منکرات والی دعوت میں نہ جائے۔ اگر کبھی جانا بھی پڑ جائے تو ان پر جبر کریں کہ سنت طریقہ اختیار کریں۔ وقتی طور پر وہ لوگ ناراض ضرور ہوں گے۔ اگر ہم لوگ خوشامد کر کے بیٹھے رہیں گے تو تبدیلی کیسے آئے گی؟ کہتے ہیں کہ اتنا بڑا گناہ تو نہیں ہوگا، لیکن یہ گناہ بنتے بنتے کہاں تک چلا جائے گا؟ اس لیے ایسے منکرات سے اعراض کریں۔ اگر جائیں تو ان کو سنت طریقہ بتلائیں کہ ہم مسلمان ہیں، کلمہ پڑھنے والے ہیں، کھانا نیچے بیٹھ کر کھاؤ۔ حضور ﷺ نے اوپر بیٹھ کر، ٹیک لگا کر کھانے سے منع فرمایا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ٹیک لگا کر کھانا متکبرین کی علامت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: کھانے کے وقت عاجزی کے ساتھ بیٹھیں۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں یہ نعمتیں عطا نہ کرتے تو ہم کہاں سے لاتے؟ اور اگر اللہ تعالیٰ ہمیں یہ نعمت تو دیں، لیکن کھانے کی توفیق نہ دیں۔ اگر کھا بھی لیں، لیکن ہضم کرنے کی توفیق نہ دیں کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو زہر بنا دیں تو ہم کیا کریں گے؟

اس لیے عاجزی اور تواضع کے ساتھ اللہ کی ان نعمتوں کو استعمال کرنا چاہیے۔ اور جہاں جائیں وہاں سنت کا پرچار کریں۔ اگر ایک سنت بھی زندہ ہو جائے تو کئی رحمتیں حاصل ہوتی ہیں۔

صحبت سے پہلے کی دعا:

بعض علماء فرماتے ہیں کہ ہر کام کی ابتداء میں بسم اللہ واجب ہے۔ جیسا کہ صحیحین کی روایت میں ہے:

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَوْ أَنَّ أَحَدَهُمْ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَأْتِيَ أَهْلَهُ قَالَ: بِاسْمِ اللَّهِ، اللَّهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ، وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا)) [صحیح بخاری، حدیث: ۳۲۸۸، باب: مَا يَقُولُ إِذَا أَتَى أَهْلَهُ، مسلم، حدیث: ۱۴۳۴، واللفظ لمسلم]

"جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے مجامعت کا ارادہ کرے تو اس کو چاہیے کہ پہلے 'اللَّهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ، وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا' پڑھ لے۔"

اگر عربی عبارت نہ آئے تو اردو میں کہہ لے: اے اللہ! ہم دونوں کو شیطان کے حملہ سے بچا، شیطان کو ہم سے دور کر دے۔ اور اگر تو ہمیں اولاد دے تو اس کو بھی شیطان کے حملہ سے محفوظ فرما۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اگر اللہ نے اولاد مقدر کی ہے تو پھر اس دعا کی برکت سے شیطان اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، کیونکہ وہ اللہ کی پناہ میں آ جاتا ہے۔

دیکھو! کتنی آسان اور بڑی چیز ہے کہ میاں بیوی ملنے سے پہلے یہ دعا پڑھ لیں تو آگے جو اولاد ہوگی وہ شیطان کے حملہ سے محفوظ ہو جائے گی۔ وہ نافرمانی سے، بے حیائی سے، بے دینی سے اور تمام خرافات سے محفوظ ہو جائے گی۔ لیکن آج کل مسلمان اتنا گر گیا ہے کہ اس عمل کو چادر کے بغیر کھلم کھلا عمل میں لاتا ہے جس کو شیطان دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اور اگر اس عمل سے امید ہو جائے تو شیطانی اثرات کا پورا پورا اثر موجود ہوتا ہے۔ اس جنس کے معاملے میں اب شیطان کو بھگانے کی ضرورت ہی نہیں، بلکہ شیطان خود شرماتا ہوگا۔ اور انسان سے خود سیکھتا ہوگا کہ مجھے کوئی طریقے بتاؤ کہ میں لوگوں کو بتاؤں۔

خدا سے مانگنے کے لیے وسیلے پکڑنا:

اللہ پاک سے ہی مانگنا چاہیے۔ اگر اللہ سے نہ مانگیں تو اللہ ناراض ہوتے ہیں، لیکن ہم بندوں سے مانگتے ہیں۔ ڈھونڈ رہے ہیں کہ کس کے ذریعے مانگیں؟ بلکہ یہاں تک کہتے ہیں: ان کو کیا پتا ہے بادشاہ کو ملنا ہو تو وزیر کے پاس جانا پڑتا ہے۔ اور وزیر کو ملنے سے پہلے اس کے سیکرٹری کے پاس جانا پڑتا ہے۔ سپاہی سے اجازت لیتا ہے، اندر جاتا ہے اور پھر پرچی بھیجتا ہے۔ بغیر واسطہ اور وسیلہ کے کوئی کام نہیں چلتا۔ یہ مثالیں دیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کے

بندے یہ نہیں جانتے کہ یہ اللہ کی مثال دے رہے ہیں اور اللہ کی کوئی مثال نہیں ہے۔ جو اللہ کو بادشاہ کے ساتھ مثال دے وہ تو مسلمان ہی نہیں ہے۔ اس کی صفت ہے ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [الشوریٰ:۱۱] (اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے) جب اس کی کوئی مثل ہی نہیں تو پھر کہنا کہ بادشاہ کے پاس بغیر واسطے کے نہیں جاسکتے، مکان پر بغیر سیڑھیوں کے نہیں چڑھ سکتے تو خدا تک اس کے پیاروں کے بغیر کیسے جاسکتے ہیں؟ اس مثال کے دینے سے پہلے اپنے ایمان کو تو دیکھو! بھلا اس کی کوئی مثال بھی ہوسکتی ہے؟ وہ تو مثل سے پاک ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مالک کی بندوں کے ساتھ مثال دینا صحیح نہیں ہے۔ بندے تو سفارش اس لیے ڈھونڈتے ہیں کہ کیا پتا وہ مہربانی کرے یا نہ کرے۔ بعض اوقات ایک آدمی کا ٹھیک ٹھاک مقدمہ ہوتا ہے، وہ حق پر بھی ہے، مدعی بھی ہے، سچا بھی ہے اور دلائل بھی ہیں، لیکن پھر بھی وہ روتا رہتا ہے۔

میری جائیداد کے ایک مقدمہ کا واقعہ:

میرا اپنا ایک جائیداد کا معاملہ تھا۔ میرے ایک دوست ہیں، اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے میرے پاس آنا تھا اور نہیں آئے؟ میں نے کہا: میں آیا تو تھا، لیکن جان بوجھ کر آپ کو نہیں ملا۔ انہوں نے کہا: کیوں؟ میں نے کہا: آپ بہت بڑے عہدے پر ہیں، میں آپ کے پاس آؤں اور آ کر کہوں کہ سفارش کریں تو اچھی بات نہیں لگتی تھی۔ اور جس کو آپ کہیں گے وہ بھی عدالت کے اہم عہدے پر ہے۔ مجھے عدالت کے معاملہ میں سفارش کرنا یا کرانا اچھا نہیں لگا۔ آپ کی مہربانی کہ آپ نے پوچھ لیا ہے۔ انہوں نے کہا: مکی صاحب! آپ نے بات سمجھی نہیں ہے۔ الحمدللہ! آپ حق پر ہیں۔ بعض اوقات افسر اتنا معروف ہوتا ہے کہ وہ کیس پڑھتا ہی نہیں ہے اور فیصلہ کر دیتا ہے۔ حق والا ہمیشہ روتا رہ جاتا ہے۔ تو سفارش کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ آپ کے معاملے کو اچھی طرح دیکھ لیں گے تو حق واضح ہو جائے گا۔ یہ سفارش نہیں، بلکہ توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے۔

خدا سب کی سنتا اور جانتا ہے:

یہ خطرہ تو بندے سے ہوسکتا ہے، خدا کے ہاں کوئی ڈر ہے کہ وہ معاملہ کو نہیں دیکھیں گے یا ان کو کسی بات کا پتا نہیں ہے؟ حالانکہ اللہ تو فرما رہے ہیں مجھ سے مانگو۔

﴿وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا﴾ [الاعراف:۱۸۰]

"اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں، لہٰذا اسے انہی ناموں سے پکارو۔"

میرا ایک نام نہیں کئی، نام ہیں، مانگو۔ اور میں تمہاری شہ رگ کے بھی زیادہ قریب ہوں۔ تم مانگو، میں تمہاری دعائیں سنتا ہوں۔ اور پھر فرماتے ہیں: نہ مانگو تو میں ناراض ہوجاتا ہوں۔ اس خدا کے لیے ضرورت ہے کہ ہم وسیلے اور واسطے اور ذرائع ڈھونڈیں؟ تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان خدا کو بھول جاتا ہے اور وسیلہ میں ہی گم ہوجاتا ہے۔

شرکیہ باتیں:

کہتا ہے خدا نے سارے اختیارات انبیاء ﷺ کو دے دیے، انبیاء ﷺ نے سارے اختیارات اولیاء کو دے دیے اور اولیاء اللہ نے اپنے اختیارات جو آگے پیر اور خلفاء تھے ان کو تقسیم کر دیے، یعنی اللہ تعالیٰ ...... نعوذ باللہ! ...... اب فارغ ہیں ...... إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ...... دعا کیا کرو کہ اللہ مسلمانوں کو صحیح عقیدہ عطا فرمائے۔ باقاعدہ شعر لکھا ہے:

شعر

خدا کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے؟

مجھے جو کچھ لینا ہے میں لے لوں گا محمد ﷺ سے

اس لیے اس نے آگے لکھا ہے کہ تم نے خدا سے مانگنا ہے تو مانگو، میں تو عبدالقادر سے ہی مانگوں گا۔

کیونکہ ماذون بھی ہے، مالک بھی ہے، مختار بھی ہے

کار عالم کا مدبر بھی ہے عبد القادر

آگے کہتا ہے: بندے چڑتے ہیں تو چڑیں:

بندہ عبد القادر کا بھی ہے قادر

میرا تو قادر بھی یہی ہے۔ یہ وہابیوں کو چڑا رہا ہے، جہنم کا راستہ بنا رہا ہے، حالانکہ ہر چیز پر قادر اللہ ہے۔ خدا کی قدرت کہ پیر صاحب کا نام عبدالقادر ہے وہ تو عبد ہیں، لیکن یہ ان کو قادر بنا رہا ہے اور متصرف فی الامور بنا رہا ہے۔

پھر کہتا ہے: قرآن میں ہے:

﴿فَالْمُدَبِّرٰتِ أَمْرًا ۝﴾ [النازعات:٥]

"جن کاموں کی اللہ ان کو تدبیر دیتے ہیں، حکم دیتے ہیں وہ فرشتے اس کام کی تدبیر کرتے ہیں۔"

یاد رکھیں! اللہ کی شان یہ ہے کہ میرا بندہ مجھ سے نہ مانگے تو میں ناراض ہوجاتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر رحمت کا

کمال ہے کہ روزانہ اللہ عرش سے آسمانِ دنیا پر اجلال فرماتے ہیں، جیسے ان کی شان کو زیبا ہے۔ پھر فرماتے ہیں: کوئی مانگنے والا ہے میں اس کو دوں؟ اس لیے تہجد کے وقت مانگنے کا حکم ہے کہ وہ رحمت کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت ندا آتی ہے: کون ہے رزق مانگنے والا؟ کون ہے اولاد مانگنے والا؟ کون ہے اپنی حاجات مانگنے والا؟ میں اس کی حاجتیں پوری کروں۔ اس لیے اللہ کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ نہ مانگو تو میرا رب ناراض ہو جاتا ہے۔ اس لیے بعض شعراء نے فرمایا:

ے اَللّٰهُ يَغْضِبُ إِنْ تَرَكْتَ سُؤَالَهُ
وَبَنِيْ آدَمَ حِيْنَ يُسْأَلُ يَغْضِبُ

[غرر الخصائص الواضحۃ، ص: ۳۷۳]

''اللہ ناراض ہوتے ہیں جب تو مانگنا چھوڑے اور بنی آدم ناراض ہوتے ہیں جب تو مانگنا شروع کرے۔''

صفتِ رحمت کا اطلاق:

رحمٰن سب کے لیے ہے اور رحیم مومنوں کے لیے ہے۔ اس لیے علماء نے فرمایا: رحمٰن کے اندر رحیم کی بنسبت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے، کیونکہ وہ تمام مخلوق کو شامل ہے اور رحیم صرف مومنوں کے ساتھ خاص ہے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رحمٰن کا اطلاق دنیا اور آخرت کے لیے ہوتا ہے اور رحیم کا اطلاق صرف آخرت کے لیے ہے۔ جیسے اللہ کسی دوسرے کا نام نہیں ہے، اسی طرح رحمٰن بھی کسی اور کا نام نہیں رکھا گیا ہے۔

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۖ أَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى ۚ﴾ [الاسراء: ۱۱۰]

''کہہ دو: چاہے تم اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو پکارو، جس نام سے بھی (اللہ کو) پکارو گے (ایک ہی بات ہے) کیونکہ تمام بہترین نام اسی کے ہیں۔''

مسیلمہ کذاب کا جھوٹ اور شیعوں کا تقیہ:

مسیلمہ کذاب نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو اس نے اپنا نام رحمٰن الیمامہ رکھ لیا۔ اس نے جھوٹا نام رکھا۔ اللہ نے اس کو قیامت تک جھوٹ کی ایسی چادر پہنا دی کہ ہر کوئی اس کو کذاب کہتا ہے، وہ اس کا لقب بن گیا۔ اور دنیا کے اندر ضرب المثل بن گئی کہ تو کوئی مسیلمہ ہے کہ اتنا بڑا جھوٹ بول رہا ہے؟ اس لیے یاد رکھیں! جو آدمی اللہ کی کسی نعمت کا انکار کرے اللہ اس نعمت سے اس کو محروم کر دیتے ہیں۔ دیکھیں! پوری امت میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کتنی

بڑی شان اور نعمت ہے۔ جن لوگوں نے صدیق کی صداقت کا انکار کیا ان کا مذہب بھی جھوٹ پر آ گیا۔ ملنگوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صداقت کا انکار کیا تو ان کے دین کی بنیاد ہی تقیہ اور جھوٹ ہے۔ ظاہر کچھ ہو، اندر کچھ ہو۔ وہ کہتے ہیں: اگر ہمارے دین کے دس حصے کیے جائیں تو نو حصے تقیے میں چھپے ہوئے ہیں۔ تقیہ کا معنی ہوتا ہے کہ سچ کو چھپاؤ اور جھوٹ کو ظاہر کرو۔

جیسے کہتے ہیں کسی سنی کا جنازہ ہو تو شامل ہو جاؤ، تا کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ جنازہ نہیں پڑھتا، لیکن جنازے کی دعا میں یہ کہو کہ اے اللہ! اس کو جہنم میں بھیج۔ کذب ان کے دین کی بنیاد بن گیا، کیونکہ صدیق کی صداقت کا انکار کر بیٹھے، عدالتِ فاروق کا انکار کر بیٹھے، عثمان کی حیا کا انکار کر بیٹھے کہ ان میں حیا ہے ہی نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علم کا انکار کر بیٹھے کہ ان میں علم ہے ہی نہیں، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی مصالحت کا انکار کر بیٹھے، اس لیے صلح کا جذبہ ہی نہیں ہے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حقیقی جذبہ کا انکار کر بیٹھے، اس لیے محض زبانی دعوے ہیں۔

سلمان رشدی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا۔ اللہ کی اس پر لعنت ہو، اللہ اس کو دنیا و آخرت میں ذلیل کریں اور ضرور کریں گے۔ کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ جس نے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی ہے وہ نہیں بچ سکا، اس پر اللہ کا عذاب ضرور آئے گا۔ لوگوں سے کہیں گے کہ بالکل ضرور اتحاد ہونا چاہیے۔

شیعوں کی گستاخیاں:

لیکن ہمارے قانون میں لکھا ہے کہ ماسوا شیعہ کے اور کوئی عہدے دار نہیں بن سکتا۔ نفرت تو تم پیدا کر رہے ہو۔ اگر ایک آدمی صحابہ کو گالی دے گا تو دوسرا اس پر ضرور مشتعل ہوگا۔ اگر گالی دینا بند کر دو تو اشتعال خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اگر کوئی آدمی میرے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے تو کیا ہم چپ ہو جائیں گے؟ وہ بڑا بے غیرت مسلمان ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں توہین سنے اور پھر چپ ہو جائے۔ اگر وہ توہین کرنے والی زبان چپ ہو جائے تو ہم خواہ مخواہ جوش میں آئیں گے؟ اسی پر غور کریں کہ جھگڑے کی بنیاد کیا ہے؟

مولانا محمد علی جالندھری رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ:

حضرت مولانا محمد علی جالندھری رحمۃ اللہ علیہ پنجابی زبان میں بڑی اچھی مثال دیتے تھے: کسی افسر نے کہا کہ آپ مولوی لوگ ہیں، کبھی قادیانیوں کے پیچھے ہیں اور کبھی شیعہ کے پیچھے ہیں۔ مولویوں کو تو کوئی بلا پڑ گئی ہے، ہر وقت کوئی نہ کوئی

فتنہ برپا کیے رہتے ہو، تم ہی لوگ ساری دنیا کو لڑا رہے ہو۔ کبھی اس سے جھگڑا ہے اور کبھی اس سے جھگڑا ہے۔

حضرت مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ نے بڑی پیاری بات فرمائی کہ بھائی! گزارش یہ ہے کہ بستیوں میں جہاں کوئی انتظام نہ ہو تو باری باری ہر کوئی پہرہ دیتا ہے، پہرے دار پھرتے رہتے ہیں، جہاں کہیں کتے وغیرہ بھونکیں تو وہ بستی والوں کو جگاتے رہتے ہیں کہ خبردار، خبردار! کتے بھونک رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کوئی چور ہے۔ وہ چوکیدار جو دو روپے تنخواہ لیتا ہے وہ کہیں کوئی شور سنے گا تو جگائے گا یا نہیں جگائے گا؟ ہم جو محمد مدنی ﷺ کے نام پر کھا رہے ہیں۔ جہاں کہیں کوئی کتا بھونکے گا تو ہم شور مچائیں گے۔ فرمایا: بھونکنا تم بند کرا دو ہم چپ ہو جائیں گے۔ ہم تو دین کے نام پر روٹی کھاتے ہیں۔ لوگ ہماری عزت کرتے ہیں، کیا ہمارا قد بڑا ہے؟ یا ہم زیادہ خوبصورت ہیں؟ نہیں، بلکہ عزت اس لیے کرتے ہیں کہ قرآن پڑھاتا ہے اور مدنی ﷺ کا نام لیتا ہے۔ ہم تو دینِ رسول ﷺ کے سپاہی ہیں۔ اگر کوئی اہلِ بیت کو بھونکے گا، ہم چیخیں گے، صحابہ کو بھونکے گا ہم چیخیں گے۔ ہماری تو ڈیوٹی ہی یہی ہے کہ ہم شور مچائیں گے، لوگوں کو خبردار کریں گے کہ لوگ تمہارے ایمان پر ڈاکہ نہ ڈال لیں۔ ان آوازوں کو بند تم کر دو، پھر تم مولوی کو دیکھو گے کہ وہ چپ کر کے گھر میں قرآن پڑھائے گا۔

اختلاف اور فتنوں کا اصل سبب:

اصل بات دیکھیں کہ فتنہ کس وجہ سے پیدا ہوا؟ وگرنہ ایسے ہو گیا جیسے کسی نے میٹھے کی لکیر لگائی اور اس پر مکھی آ کر بیٹھی تو کسی نے اس کو ڈنڈا مار دیا۔ وہ کہنے لگے کہ میں نے تو میٹھے کی لکیر لگائی تھی، میں نے سوٹا نہیں مارا تھا۔ اصل بات ان کی ہے جو میٹھے کی لکیر لگا رہے ہیں۔ کوئی آدمی اہلِ بیت اور اصحابِ رسول کی شان کے خلاف لفظ نہ بولے، آپ ﷺ کی رسالت، ختمِ نبوت اور جامعیت کے خلاف بات نہ کرے، کوئی آدمی اللہ کی توحید کے خلاف بات نہ کرے، لیکن اگر کوئی آدمی قبر کا طواف کرے گا تو مسلمان کو غیرت آئے گی۔ اگر وہ روکے گا تو کہتے ہیں کہ وہابی ہے، ہمارے بزرگوں کی توہین کرتا ہے۔ جب تم میرے خدا کے کعبے کے برابر کعبہ بنا ڈالو اور میرے مدنی ﷺ کے روضے کے برابر روضہ بنا ڈالو تو کون مسلمان نہیں چیخے گا؟

نہ تم صدمے ہمیں دیتے ، نہ ہم فریاد یوں کرتے
نہ کھلتے راز سربستہ ، نہ یوں رسوائیاں ہوتیں

اگر تم ہمیں نہ ستاؤ تو ہم کیسے بات کریں گے؟ ادھر خانہ کعبہ میں کہتے ہو: یا اللہ! اور پھر کہتے ہو: یا علی! ادھر کہتے

ہو: یا رحمن اور ادھر کہتے ہو: یا داتا، یا بابا فرید گنج شکر! تو ہمیں چیخنے پر کس نے مجبور کیا؟ یہاں اللہ کا سجدہ کر رہے ہو تو کہہ رہے ہو: "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَىٰ" اور وہاں قبر پر سجدہ کر رہے تو کہہ رہے ہو: حضرت! میں تمہاری قبر پر پڑا ہوں۔ توحید والا بندہ چیخے گا کہ ایک طرف تم دعویٰ کر رہے ہو کہ ہم محمد مدنی ﷺ کے غلام ہیں اور اس طرف تم کام وہ کر رہے ہو جو نہ مدنی پاک ﷺ نے کیے، نہ خلفاء رضی اللہ عنہم نے کیے اور نہ اہل بیت رضی اللہ عنہم نے کیے۔ تم نام مدینے کا لے رہے ہو اور جا الٹ رہے ہو۔ تو راستے کے اندر جو کھڑا ہے وہ کہے گا کہ مدینے کا یہ راستہ نہیں ہے۔ تم نام سنت کا لو اور انگوٹھے چومو گے تو میں چیخوں گا۔ اور تم کہو گے کہ وہابی ہے۔ اب اس بات کا علاج کس کے پاس ہے؟ اللہ تعالیٰ عقل عطا فرمائے۔

درود کی جگہ انگوٹھے چومنا:

قرآن فرماتا ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ [الاحزاب:۵۶]

"اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود بھیجو اور خوب سلام بھیجا کرو۔"

کیا "صَلُّوْا" کا معنی انگوٹھا ہے؟ جب یہ معنی نہیں ہے تو انگوٹھا کہاں سے آ گیا؟ اللہ فرماتے ہیں: تم میرے مدنی پاک ﷺ پر درود بھیجو۔ اور میرے مدنی پاک ﷺ فرماتے ہیں: جو مجھ پر ایک دفعہ درود بھیجے اللہ اس پر دس مرتبہ رحمتیں فرماتے ہیں۔[1] یہ نہیں فرمایا کہ جو ایک دفعہ انگوٹھا چومے اللہ اس پر دس دفعہ رحمت فرمائے گا۔ اللہ کے لیے حق اور باطل کو پہچانیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

((الْبَخِيلُ الَّذِي مَنْ ذُكِرْتُ عِنْدَهُ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ)) [سنن الترمذی، حدیث:۳۵۴۶]

"سب سے بڑا بخیل وہ ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے۔"

یہ نہیں فرمایا کہ جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ انگوٹھے نہ چومے تو وہ بہت بڑا وہابی ہے۔

ایک آدمی خانہ کعبہ کے سامنے نماز پڑھ رہا ہو، لیکن خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ کی ہوئی ہو تو تم کیا کہو گے؟ یہی کہ اس کو پکڑ کو

[1]..... [صحیح مسلم، حدیث:۳۰۸، باب الصَّلَاةِ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ بَعْدَ التَّشَهُّدِ]

سیدھا کرو۔ اگر وہ سیدھا کھڑا ہوتا تو کیا تم شور کرتے؟ اصل بات یہ ہے کہ جب تم سیدھے چل پڑو گے تو کسی کو شور کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اگر میں تمہارا دشمن ہوں تو خاموش رہوں گا اور اگر تمہارا خیر خواہ ہوں تو شور کروں گا۔

اللہ کے ناموں پر عمل بھی مقصود ہے:

صحیحین کی حدیث مبارکہ میں ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ اِسْمًا مِائَةً إِلَّا وَاحِدًا، مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ))

''اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو ان کو یاد کرے گا جنت میں داخل ہوگا۔''

[صحیح البخاری، حدیث: ۷۳۹۲ باب: إِنَّ لِلّٰهِ مِائَةَ اسْمٍ إِلَّا وَاحِدًا، صحیح مسلم، حدیث: ۲۶۷۷]

بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''مَنْ أَحْصَاهَا'' کا معنی یہ ہے کہ جس نے ان کو گنا یعنی جس نے ان کو پڑھا۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''مَنْ أَحْصَاهَا'' کا معنی یہ ہے کہ جس نے ان کو یاد کیا۔ اصل ترجمہ یہ ہے کہ نام بھی یاد کرے اور اس پر عمل بھی کرے۔ اگر نام تو یاد ہیں، لیکن عمل نہیں ہے تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔

ایک آدمی پورا قرآن یاد کرلے، لیکن قرآن پاک کی کسی آیت پر عمل نہ کرے تو لازمی بات ہے کہ قیامت کے دن معرضین (اعراض کرنے والوں) میں سے اٹھایا جائے گا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا قرآن اس کے گریبان کو پکڑے گا اور اللہ سے آکر شکایت کرے گا۔ جیسے صحیح احادیث میں حضور ﷺ نے فرمایا: قرآن بندے کی گردن میں حائل ہوگا، آکر کہے گا: اے میرے پروردگار! اس بندے اور میرے درمیان فیصلہ کریں۔ اس نے مجھے دنیا میں چھوڑ رکھا تھا۔ صرف یاد کرنا مقصود نہیں ہوتا۔

اللہ کے ناموں سے مقصود:

بلکہ مقصود یہ ہے کہ مثلاً ''اللہ'' ہے۔ اس کا معنی توحید الوہیت ہے۔ اگر توحید نہ ہو تو اللہ اللہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اسی طرح ''اَلرَّحْمٰنُ'' ''نہایت رحمت والا، جس کی رحمت عام ہے، مومن اور کافر سب کو شامل ہے، دنیا اور آخرت کو شامل ہے اور انسان وحیوان کو شامل ہے۔ جب اس کی رحمت عامہ کو سمجھے، لیکن اس کا شکر ادا نہ کرے تو کیا فائدہ ہوا؟

اور اسی طرح ''اَلسَّمِيْعُ''، ''اَلْبَصِيْرُ''، ''اَلْخَبِيْرُ'' اور ''عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ'' بھی پڑھ رہا ہے اور اس کے بعد

غیروں کو بھی پکار رہا ہے۔ تو "اَلسَّمِیْعُ" پر کیا عقیدہ ہوا؟ سننے والا تو صرف اللہ ہے، باقیوں کا سننا عارضی اور ایک حد تک سننا ہے۔ اسی طرح "اَلْبَصِیْرُ" پڑھ رہا ہے کہ میرا اللہ دیکھنے والا ہے، لیکن پھر گناہ بھی کر رہا ہے۔ تو اللہ کے دیکھنے پر کیا یقین ہوا؟ اسی طرح "اَلْخَبِیْرُ" کہتا ہے کہ اللہ جاننے والا ہے، لیکن بری بری باتیں کر رہا ہے، برے برے خیالات عمداً بنا رہا ہے اور یہ عقیدہ بھی رکھتا ہے کہ اللہ "عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ" ہے۔ یہ تو لفظی بات ہوئی، ان اسماء پر ان کا ایمان حقیقی نہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ سب کی سنتا ہے:

یہی وجہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ اسمائے حسنیٰ کے ساتھ دعا مانگتے ہیں، لیکن دعا قبول نہیں ہوتی ہے۔ بھائی! جب اسمائے حسنیٰ پر ایمان ہی نہ ہو، صحیح یقین ہی نہ ہو تو دعا کیسے منظور ہوگی؟ ایک ہے مطلقاً فریاد کا سننا، وہ تو کافروں اور جانوروں کی بھی اللہ سنتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نمازِ استسقاء کے لیے جا رہے تھے۔ جب ایک چیونٹی پر گزرے تو راستے ہی میں آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ واپس آجاؤ، بارش ہو جائے گی۔ لوگوں نے کہا: ہم نے تو ابھی نمازِ استسقاء بھی نہیں پڑھی اور دعا بھی نہیں مانگی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: میں نے ایک چیونٹی کو دیکھا کہ وہ پاؤں اوپر کیے ہوئے ہے اور اللہ سے دعا مانگ رہی ہے:

"اَللّٰهُمَّ لَا تُعَذِّبْنَا بِذُنُوْبِ عِبَادِكَ" [مرقاۃ المفاتیح: ۷/ ۲۶۸۲، باب: ما یحل أکلہ وما یحرم]

"اے اللہ! بندے گناہ کرتے ہیں، ان کی وجہ سے ہمیں برباد نہ کر۔"

دعا مانگنے کی صحیح حالت:

مانگنے کے لیے تو جانور، کیڑے مکوڑے اور حشرات الارض بھی مانگتے ہیں۔ مانگنے کے لیے کافر بھی مانگتا ہے، لیکن مومن کے مانگنے اور ان کے مانگنے میں فرق ہی نہ ہو تو کیا فائدہ ہوگا؟ اصل بات یہ ہے کہ مومن ایمان کامل کے ساتھ دعا مانگے کہ اس کا توحیدِ الوہیت پر ایمان ہو، اللہ کے معنیٰ کو سمجھ رہا ہو، رحمٰن کی صفت کو سمجھ رہا ہو، رحیم کی صفت کو سمجھ رہا ہو اور پھر زبان سے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" نکلے، "یَا اَللّٰهُ!" "یَا رَحْمٰنُ" "یَا رَحِیْمُ" نکلے، جب اللہ کے اسماء پڑھے تو اس خشیت طاری ہو، تضرع طاری ہو، طبیعت کے اندر اضطراب اور تڑپ ہو تو پھر دیکھیں کہ

دعا منظور ہوگی۔

اللہ کا ذاتی نام مشتق ہے یا غیر مشتق:

بعض حضرات نے کہا: اللہ کے پانچ ہزار اسماء ہیں، لیکن لفظ "اَللّٰہُ" ایسا اسم ہے کہ یہ کسی غیر کا نام نہیں رکھا گیا۔ لفظ "اَللّٰہُ" کا کوئی مشتق منہ نہیں ہے کہ جس سے یہ مشتق ہو۔

بعض نے کہا: یہ اسم جامد ہے۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ، امام خطابی رحمہ اللہ، امام الحرمین اور امام غزالی رحمہم اللہ وغیرہ نے فرمایا: الف لام لفظ "اَللّٰہُ" کے اندر لازم ہیں۔ اور یہ ایسا نام ہے کہ تمام نام اس کی صفات بن کر آئے ہیں۔ اور معبودِ برحق کے سوا اور کسی پر لفظ "اَللّٰہُ" کا اطلاق نہیں کیا گیا۔ اگر آپ "یَا اَللّٰہُ" کہیں گے تو لازماً الف لام کا اظہار ہوگا۔ "اَلرَّحْمٰنُ" کے اندر بھی الف لام ہے، لیکن جب شروع میں حرفِ ندا لگائیں گے تو "یَا رَحْمٰنُ" کہیں گے، یہاں پر الف لام نہیں پڑھیں گے، کیونکہ یہاں الف لام لازم نہیں ہے۔

بعض نے کہا کہ لفظ "اَللّٰہُ" مشتق ہے۔ وہ رؤبہ بن العجاج شاعر کے قول سے دلیل پکڑتے ہیں:

لِلّٰہِ دَرُّ الْغَانِیَاتِ الْمُدَّہِ
سَبَّحْنَ وَاسْتَرْجَعْنَ مِنْ تَأَلُّہِیْ

"اَللّٰہُ" "اِلٰہٌ" سے مشتق ہے۔ اس شعر میں "تَأَلُّہٌ" مصدر ہے۔

❁ ...امام سیبویہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اصلی کلمہ "لَہٌ" تھا۔ الف لام داخل ہوا تو "اَللّٰہُ" بن گیا۔ جیسے "اَلنَّاسُ" اصل میں ناس تھا۔ الف لام داخل ہوا تو "اَلنَّاسُ" بن گیا۔

❁ ...علامہ فراء رحمہ اللہ اور کسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کی اصل "اَلْاِلٰہُ" ہے۔ ہمزہ کو گرا دیا اور لام کو لام میں مدغم کر دیا تو "اَللّٰہُ" ہو گیا۔

❁ ...بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ "وَلَہٌ" سے مشتق ہے، معنی ہے مضطرب ہونا۔ جیسا کہ جب آدمی کا دماغ چل جائے، عورت کسی کی محبت میں آ کر اپنا دماغ کھو بیٹھے تو اس کو عربی میں "وَلَہٌ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح بندے جب اللہ کی صفات کو دیکھتے ہیں تو حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔

❁ ...بعض کہتے ہیں کہ "وِلَاہٌ" تھا۔ واو کو ہمزہ میں بدل دیا تو "اِلٰہٌ" بن گیا، جیسے "وِشَاحٌ" کی واو کو ہمزہ سے بدل دیا تو "اِشَاحٌ" بن گیا۔

❁......اور بعض نے کہا: ''اَلِهَ یَألَهُ اَلِهْتُ فُلَانًا اَیْ سَکَنْتُ فُلَانًا'' یہ ''اَلِهْتُ'' سے مشتق ہے۔ معنی ہے ''اَسْکَنْتُ اِلَیْهِ'' میں نے فلاں کا سہارا پکڑا یا سکون پکڑا۔ ''وَالْعُقُوْلُ لَاتَسْکُنُ اِلَّا عَلٰی ذِکْرِہٖ'' عقل کو سکون اللہ کے ذکر میں ملتا ہے۔ ''وَ الْاَرْوَاحُ لَا تَرُوْحُ اِلَّا بِمَعْرِفَتِهٖ'' اور روح کو خوشی اس وقت ملتی ہے جب اللہ کی ذات کی معرفت حاصل ہو جائے۔

کیونکہ اسی کی ذات کامل ہے اس کے سوا کوئی کامل نہیں ہے، اس کے اندر کوئی نقص نہیں ہے۔ باقی جتنے دنیا میں صاحب کمال ہیں ان میں کوئی نہ کوئی نقص ہے۔ ایک آدمی کامل ہے، لیکن دوسرے کے اعتبار سے ہے۔ ہر کسی کے اندر نقص ہے۔ بڑے سے بڑا عالم ہو، لیکن پہلے جاہل تھا۔ بڑے سے بڑا عالم ہو، لیکن کسی کا شاگرد تھا۔ بڑے سے بڑا کتاب لکھنے والا ہو، لیکن کتاب لکھنے والا اس سے زیادہ ہو گیا۔ اللہ کی ذات ہے جس میں کوئی نقص نہیں ہے۔ اس لیے قرآن میں آتا ہے:

﴿اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ [الرعد:۲۸]

''یاد رکھو کہ صرف اللہ کا ذکر ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔''

❁......بعض نے فرمایا: ''لَاہَ یَلُوْہُ'' سے مشتق ہے۔ جیسے جانور کا بچہ اپنی ماں کی طرف دوڑتا ہے، اللہ کی تمام مخلوق بھی اللہ کی طرف دوڑتی ہے۔

❁......بعض نے کہا: ''اَلِهَ الرَّجُلُ'' سے مشتق ہے۔ جب کوئی مصیبت آئے اور بندہ پریشان ہو جائے، تمام مخلوق کو نقصان سے پناہ دینے والی اللہ کی ذات ہے۔ ﴿وَهُوَ یُجِیْرُ وَلَا یُجَارُ عَلَیْهِ﴾ [المؤمنون:۸۸] (وہ سب کو پناہ دیتا ہے اس کو کسی کی پناہ کی ضرورت نہیں) اور وہی نعمت دینے والے ہیں۔

﴿وَمَا بِکُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ [النحل:۵۳]

''اور تمہیں جو نعمت بھی حاصل ہوتی ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔''

﴿وَهُوَ یُطْعِمُ وَلَا یُطْعَمُ﴾ [الانعام:۱۴]

''اللہ پاک تمام مخلوق کو کھانا دینے والے ہیں اور خود کھانے سے پاک ہیں۔''

﴿قُلْ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ [النساء:۷۸]

''ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے۔''

وہ ہر چیز کو ایجاد فرمانے والے ہیں۔

❁......علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لفظ ''اَللّٰہُ'' کسی سے مشتق نہیں ہے۔ یہ اسم جامد ہے۔ اگر ہم اشتقاق مانیں گے تو اس معنی کے اندر اور بھی شریک ہوں گے۔ اور باقی جتنے بھی اسماء ہیں وہ اس کی صفات بن کر آتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ اسم مشتق نہیں ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھے اس پر اعتراض ہے کہ علامہ رازی نے لکھا ہے کہ لفظ ''اَللّٰہُ'' عربی زبان کا لفظ بھی نہیں ہے، بلکہ یہ عبرانی لفظ ہے۔ لیکن یہ ضعیف قول ہے۔ اور اس کے بعد علامہ رازی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مخلوقات دو قسم کی ہیں: ایک قسم وہ مخلوق ہے جو دریا کے کنارے پر ہے اور دوسری قسم کی مخلوقات وہ ہیں جو اندھیرے میں ہیں، جنگلات کے اندر پڑے ہوئے ہیں۔ گویا کہ انہوں نے اپنے عقل اور ارواح کھو ڈالے ہیں۔ اور جو اس ساحل کو پانے والے ہیں گویا کہ وہ اللہ کے اس نور کے میدان میں آ گئے۔ انہوں نے وحدانیت اور فردانیت کو سمجھ لیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ تمام مخلوق اللہ کی مضطرب ہے، تضرع کرنے والی ہے۔ بعض ایسے ہیں کہ ان پر اللہ کی رحمت ہوئی اور وہ توحید کے راز کو پا گئے۔ اور بعض ڈھونڈتے رہے ڈھونڈتے رہے، لیکن وہ توحید تک پہنچے بھی نہیں پائے۔ وگرنہ اللہ کی تلاش سب کو ہے۔ اسی طرح ہندو، بدھ مت ہیں، عیسائی ہیں اور یہودی ہیں، اصل میں وہ خدا کی تلاش میں ہیں۔ ہم ان کو مومن نہیں کہیں گے، کیونکہ انہوں نے کلمہ نہیں پڑھا، حضور ﷺ کی رسالت کا اقرار نہیں کیا۔ لیکن تلاش ہے، وہ کہتے ہیں کہ کوئی گاڈ ہے، کوئی دیوتا ہے، کوئی داتا ہے، کوئی رام ہے اپنی اپنی عقلوں میں سوچ رہے ہیں، لیکن گمراہ ہو رہے ہیں، منزل پر پہنچ نہیں پائے۔ اس لیے کہا کہ یہ لفظ ایسا ہے کہ ہر آدمی اس کی طرف مضطر ہے اور اس کی طرف دوڑ رہا ہے۔

بعض حضرات نے کہا ''اَللّٰہُ'' علو سے ہے کہ صفت علو اس کے لیے ہے۔ وہ سب سے اوپر ہے، اس کے اوپر کوئی نہیں ہے۔

❁......بعض نے کہا: ''اَلَہَ الرَّجُلُ'' سے ہے ''اِذَا تَعَبَّدَ'' جب آدمی عبادت میں کھو جائے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰی وَقَوْمَهٗ لِیُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَیَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ﴾

[الاعراف: ۱۲۷]

''اور قوم فرعون کے سرداروں نے کہا کہ کیا آپ موسیٰ علیہ السلام اور اس کی قوم کو یوں ہی رہنے دیں گے کہ وہ ملک میں فساد کرتے پھریں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو ترک کیے رہیں۔''

''باء'' پر بھی بحث ہو چکی ہے، ''اسم'' پر بھی بحث ہو چکی ہے اور لفظ ''اللہ'' پر بھی بحث ہو چکی ہے۔ آگے اللہ کی صفات ''اَلرَّحْمٰنُ'' اور ''اَلرَّحِیْمُ'' کا بیان ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۰،۱۹ فصل فی فضلها (البسملة)]

﴿اَلرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ﴾

یہ دونوں رحمت سے مشتق ہیں اور ان کے اندر مبالغہ پایا جاتا ہے۔ کہا: اللہ بہت رحمت والا، نہایت ہی مہربان ہے۔ ''اَلرَّحْمٰنُ'' کے اندر ''اَلرَّحِیْمُ'' سے بھی زیادہ مبالغہ ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ دونوں بھی غیر مشتق ہیں، اسم جامد ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ لفظِ ''اَلرَّحْمٰنِ'' عبرانی ہے، عربی لفظ نہیں ہے۔ اور ''اَلرَّحِیْمُ'' عربی کا لفظ ہے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ مشتق ہے۔ ان کا استدلال وہ حدیث قدسی ہے جو امام ترمذی رحمہ اللہ نے نقل فرمائی ہے:

((قَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: قَالَ اللّٰہُ: أَنَا اللّٰہُ، وَأَنَا الرَّحْمٰنُ، خَلَقْتُ الرَّحِمَ وَشَقَقْتُ لَهَا مِنَ اسْمِي، فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهٗ، وَمَنْ قَطَعَهَا بَتَتُّهٗ)) [سنن الترمذی، حدیث: ۱۹۰۷، باب: ما جاء في قطيعة الرحم]

''اللہ فرماتے ہیں: میری صفت الرحمن ہے اور میں نے اس رحم کو پیدا کیا ہے۔ یہ صلہ رحمی اور رشتہ داری اس کا اشتقاق بھی رحمت سے ہے۔ جو اپنے رشتہ داروں کو ملانے کی کوشش کرے گا میں بھی اپنی رحمت سے اس کو ملا دوں گا اور جو کاٹنے کی کوشش کرے گا میں اس کو اپنی رحمت سے جدا کر دوں گا۔''

اس لیے حکم ہے کہ انسان رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرے۔ وہ رشتہ دار والد کی طرف سے ہو یا والدہ کی طرف سے ہوں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۰ فصل فی فضلها (البسملة)]

رشتے نسب سے ہوتے ہیں یا صہر کے ہوتے ہیں؟

رشتہ یا تو باپ سے چلتا ہے یا جہاں شادی ہوئی، ماں کے خاندان سے یا بیوی کے رشتے دار۔ ان سب سے

قرابت ہوتی ہے۔ بعض زیادہ قریب ہوتے ہیں اور بعض بعید ہوتے ہیں۔ اس لیے ذوی الانساب ہوتے ہیں، ذوی الارحام ہوتے ہیں، ذوی الاصول کہلاتے ہیں، ذوی الفروع کہلاتے ہیں اور عصبات کہلاتے ہیں۔ ان کے بارے میں حکم یہی ہے کہ ان کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔ صلہ رحمی کا معنی یہ ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔ ان کو پناہ دینا، ان کی مدد کرنا، ان کے دکھ سکھ میں شریک ہونا، ان کی مصیبتوں میں شریک ہونا، ان کی خوشیوں میں شریک ہونا اور اگر آپس میں رشتہ داریاں ہوں تو رشتے داریاں نبھانا، تاکہ رشتے جڑے رہیں، خاندان جڑے رہیں اور ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ تعلق قائم رہے۔ اس لیے فرمایا: اس حدیث کے اندر اللہ نے رحمن کا خود ہی اشتقاق بیان فرما دیا ہے۔ اس لیے جھگڑے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ رحمن اور رحیم مشتق نام ہیں۔

عرب کے لوگ رحمن کے نام سے انکار کرتے تھے۔ ان کو پتا ہی نہیں تھا کہ یہ اللہ کا نام ہے۔ وہ کہتے تھے کہ محمد ﷺ خود کبھی اللہ کو مانتے ہیں اور کبھی رحمن کو مانتے ہیں۔ نعوذ باللہ! خود دو خدا ماننے لگ گئے۔ وہ جاہل تھے، انکار کرنے لگ گئے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کی اصل ذات ایک ہی ہے، باقی اس کی صفات ہیں۔ ایک چیز کے اندر کئی صفتیں ہوتی ہیں۔ بعض دنیا کی چیزوں میں دیکھ لیں کہ ایک آدمی کے اندر علم کی صفت بھی ہوتی ہے، جمال کی صفت بھی ہوتی ہے، سخاوت کی صفت بھی ہوتی ہے۔ ایک آدمی کے بارے میں آپ کہیں کہ بڑا سخی ہے۔ اگر وہ عالم ہے تو آپ اس کے علم کا انکار تو نہیں کر رہے۔ تو انہوں نے جہل کی وجہ سے رحمن کا انکار کیا۔

قرآن میں دو خاص نور:

سورۂ فاتحہ باعتبار قرآت کے بھی پہلی سورت ہے اور باعتبار نزول سورت کاملہ کے بھی پہلی سورت ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے "سُوْرَۃُ الْعَلَقِ" اور "سُوْرَۃُ الْمُدَّثِّرِ" کی کچھ کچھ آیات تو اتر چکی تھیں، مگر پوری سورت کوئی بھی نہیں اتری تھی۔ اور اگرچہ قرآن تو سارا نور ہے، کیونکہ اللہ نے فرمایا:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا﴾ [النساء: ۱۷۴]

"اور ہم نے آپ کی طرف نور مبین بھیجا۔"

لیکن سورۂ فاتحہ اور خواتیم سورۃ البقرہ کے بارے میں فرمایا: اللہ نے خاص فرشتہ نازل فرمایا جو کبھی زمین پر نہیں اترا تھا۔ اس نے آ کر مجھے بشارت دی کہ اللہ نے آپ کو دو نور عطا فرمائے ہیں: ایک سورۂ فاتحہ ہے اور ایک سورۂ بقرہ ہے۔

سورۃ الفاتحہ کے بعض نام:

اس سورۃ الفاتحہ کو سبع مثانی بھی کہا گیا ہے، کیونکہ یہ سورت بار بار دہرائی جاتی ہے۔ اس کو سورۂ شافیہ بھی کہا گیا ہے، کیونکہ اللہ نے اس میں شفا رکھی ہے۔ اس کا نام ام الکتاب بھی ہے کہ یہ سارے قرآن کا خلاصہ ہے۔ قرآن مقدس میں جن مضامین پر اللہ کا کلام ہے ان سب کا اگر خلاصہ نکالا جائے تو سورۃ الفاتحہ ہے۔

تعوذ کی اقسام:

جمہور کی رائے یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت سے پہلے انسان تعوذ "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" پڑھے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ "أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ" پڑھے اور ایک روایت میں ہے "أَسْتَعِيذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ" پڑھے اور ایک روایت میں ہے کہ "أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ" پڑھے۔ یہ تمام قسم کے تعوذ احادیث میں ثابت ہیں۔

مصاحف عثمانی (جن کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے نقل کرا کے پوری دنیا میں بھجوایا تھا ان) کے اندر "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" ہے۔ اس کا مختصر لفظی ترجمہ یہ ہے کہ یا اللہ! میں آپ کی پناہ میں آتا ہوں شیطان مردود کے فتنہ، مکر، وساوس اور حملوں سے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۳، تفسیر الاستعاذة وأحكامها]

شیطان سے پناہ کی ضرورت:

ایک ہمارا انسانوں میں سے ظاہری دشمن ہے اور ایک جنات میں سے باطنی دشمن ہے۔ ظاہری دشمن کا علاج یہ ہے کہ اخلاق کے ساتھ معاملہ کریں کہ وہ گالیاں دے تو آپ اس کو دعا دیں، وہ رشتہ توڑنا چاہے تو آپ جوڑنے کی کوشش کریں۔ حسن اخلاق، حسن معاشرت اور مدارات سے اس کو آدمی قائل کر لیتا ہے، لیکن جن اور شیطان ایسا دشمن ہے جو ہمیں نظر بھی نہیں آتا اور ہمارے پاس اس کا کوئی توڑ بھی نہیں ہے ماسوا اس کے کہ ہم اس ذات کی پناہ پکڑ لیں جس کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ جنات بھی نہیں دیکھ سکتے اور انسان بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ ۚ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ﴾ [الانعام: ۱۰۳]

"دنیا کے اندر کوئی آنکھ اس کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتی۔"

جب ہم نے "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" پڑھا تو ہم اللہ کی پناہ میں آ گئے۔

نماز میں فاتحہ کے شروع میں بسم اللہ آہستہ پڑھیں:

اگر نماز میں ہے تو پہلے تعوذ اور تسمیہ پڑھے گا، لیکن آگے اگر سورت شروع کرے تو "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" تو پڑھے گا، لیکن تعوذ نہیں پڑھے گا۔

اور امام شافعی رحمہ اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" زور سے پڑھی جائے، چاہے نماز ہو یا خارج نماز ہو، کیونکہ ان کے نزدیک یہ سورۂ فاتحہ کا حصہ ہے۔ چونکہ سورت فاتحہ بھی جہراً پڑھی جاتی ہے اس لیے امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک "بِسْمِ اللّٰهِ" کو بھی جہراً پڑھا جائے گا۔ باقی ائمہ اور جمہور رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ "بِسْمِ اللّٰهِ" پڑھی جائے، لیکن سراً اور آہستہ پڑھی جائے، اسے جہراً نہیں پڑھا جائے گا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا یہی معمول تھا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بھی نمازیں پڑھیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے بھی نمازیں پڑھیں، حضرت عمر، عثمان و علی رضی اللہ عنہم کے پیچھے بھی نمازیں پڑھیں۔ جب وہ نماز شروع کرتے تو ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ سے شروع کرتے تھے۔ یعنی "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ" اور "بِسْمِ اللّٰهِ" کو آہستہ پڑھتے تھے۔

[صحیح مسلم، تحت باب حُجَّةِ مَنْ قَالَ لَا يُجْهَرُ بِالْبَسْمَلَةِ]

سورۂ فاتحہ جامع دعا ہے:

سورۂ فاتحہ کی پہلی تین آیات کے اندر حمد وثنا ہے اور آخری تین آیات میں دعا ہے۔ اس لیے علماء نے فرمایا کہ اس سے جامع دعا اور کوئی نہیں ہو سکتی جو اللہ نے اپنے بندوں کو خود سکھائی ہے، کیونکہ یہ رحمتِ خداوندی کا قاعدہ ہے کہ جب اللہ اپنے بندوں سے راضی ہوتے ہیں تو مانگنا بھی خود سکھلا دیتے ہیں۔ اسی طرح جب اللہ اپنے بندوں پر رحمت فرماتے ہیں تو دعا مانگنے کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔ کبھی آدمی دعا مانگ رہا ہوتا ہے، لیکن اس میں دل نہیں لگ رہا ہوتا۔ کبھی زبان سے الفاظ صحیح معنوں میں ادا ہی نہیں ہو رہے ہوتے، کبھی دعا مانگتا ہے، لیکن جو مانگنا چاہتا ہے وہ اسے یاد ہی نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سب کچھ میرے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم دیا:

﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ﴾ [سبا: ۱۳]

''اے آلِ داؤد! میرا شکر ادا کرو۔''

حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا: اے اللہ! میں تیرا شکر کیسے ادا کروں؟ شکر کرنے کی توفیق، شکر ادا کرنے والی زبان بھی آپ عطا فرماتے ہیں اور شکر ادا کرنے والے الفاظ بھی آپ سکھلاتے ہیں، میں کس کس نعمت کا شکر ادا کروں؟ تو اللہ نے فرمایا:

((اَلْاٰنَ شَكَرْتَنِيْ يَا دَاوٗدُ)) [تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۵۵۶، ابراہیم، الآیۃ: وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا]

''اے میرے پیغمبر داؤد! اب تو نے میرا شکر ادا کیا ہے۔''

بندہ جب اپنے عجز کا اقرار کرتا ہے تو اللہ کی رحمت آتی ہے۔

علماء نے فرمایا کہ سورۂ فاتحہ اتنی جامع، کامل اور مکمل دعا ہے کہ اگر آدمی کو اور دعا نہ آئے اور اسی سے دعا کرلے تو ساری دنیا اور آخرت کی نعمتیں اس کو مل جاتی ہیں، کیونکہ پہلی تین آیات میں حمد وثنا سکھلائی گئی ہے اور آخری تین آیات میں دعا سکھلائی گئی ہے۔ اور درمیانی آیت میں من وجہ دعا ہے اور من وجہ ذکر وعبادت ہے۔ اس سے سبق ملا کہ جب بھی انسان دعا کرنا چاہے تو سب سے پہلے ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ '' پڑھے، اس کے بعد اللہ کی حمد وثنا بیان کرے، پھر اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور ربوبیت کا اقرار کرے، پھر اپنی عبودیت اور بندگی کا اقرار کرے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگے۔ اور جو دعا مانگے اس کا زیادہ تر تعلق آخرت کی نعمتوں سے ہو، کیونکہ دنیا فانی ہے اور اس کی نعمتیں بھی فانی ہیں۔

اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم لوگ زمزم بھی پیتے ہیں تو دنیا کا تصور ہوتا ہے کہ بیماری چلی جائے، شفا مل جائے۔

اکابر کی دعا میں عظمت:

اگرچہ یہ جائز ہے، لیکن جن کی نظر آخرت کی نعمتوں پر ہوتی تھی وہ یوں دعا مانگتے تھے جیسے حضرت سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ، جو امام بخاری رحمہ اللہ کے بھی استاذ ہیں اور محدث جلیل ہیں۔ انہوں نے جب زمزم پیا تو دعا مانگی: اے اللہ! تیرے دروازے پر کھڑا ہوں اور تیرے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی حدیث ہے۔ زمزم کا پانی جس غرض کے لیے پیا جائے وہی غرض پوری ہوتی ہے۔ یا اللہ! میں یہ دعا مانگتا ہوں کہ مجھے قیامت کے دن کی پیاس اور گرمی سے بچا لینا۔

ان کی نظروں میں یہ دنیا آنی اور جانی شے ہے، ان کی نظر آخرت پر تھی۔

کسی جھوٹے فرقے نے اپنے معبود کا نام اللہ نہیں رکھا:

خدا کی شان ہے کہ دنیا میں کئی فرقے پیدا ہوئے۔ کسی نے اپنے جھوٹے معبود کا نام اللہ نہیں رکھا ہے۔ کسی نے لات رکھا، عزیٰ رکھا، منات رکھ لیا، کسی نے بھگوان اور کسی نے رام رکھ لیا، کسی نے دیوی، دیوتا، کسی نے کرشنا رکھ لیا، کسی نے بدھا رکھ لیا، لیکن لفظ اللہ نہیں رکھا۔ کافروں کی جرأت نہیں ہوئی کہ جھوٹے معبود کا نام اللہ رکھ لیں۔

اس لفظ کا کوئی تثنیہ بھی نہیں ہے اور جمع بھی نہیں ہے۔ اللہ کی صفت تو "أَحَدٌ" ہے، "اَلصَّمَدُ" ہے اور "لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ" ہے۔

کسی کو رب کہنا جائز نہیں:

"رَبٌّ" کہتے ہیں ایسی تربیت کرنے والا جیسے جیسے حالات ہوں، حتیٰ کہ کمال تک پہنچا دے۔ یہ صفت صرف اللہ کی ہے۔ "رَبٌّ" کا لفظ اللہ کے علاوہ کسی کے ساتھ بغیر اضافت کے نہیں لگایا جاتا ہے۔ کسی اور کو رب تو نہیں کہہ سکتے، ہاں "رَبُّ الدَّارِ" کہہ سکتے ہیں، اس گھر کا یہ مالک ہے۔ بغیر اضافت کے "رَبٌّ" کا اطلاق صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر ہوگا۔

غیر اللہ کی تربیت کی حد ہے:

تربیت تو ماں باپ بھی کرتے ہیں۔ جیسے قرآن مقدس میں ارشاد فرمایا:

﴿رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ [الاسراء: ۲۴]

"اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحمت فرمائیے جیسا کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا اور میری پرورش کی ہے۔"

تربیت ماں باپ بھی کرتے ہیں، استاذ بھی کرتے ہیں اور کہیں کام سیکھنے کے لیے جائیں وہ بھی تربیت کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تربیتوں کی ایک حد ہے۔ ماں باپ تربیت کرتے ہیں، جب آپ بڑے ہو جائیں گے تو ضرورت نہیں ہے۔ استاد تربیت کرے گا، ہر دور گزرتا جائے گا، لیکن یہ رب کی صفت ہے۔ جب ہم ماں کے بطن میں تھے اس وقت سے تربیت کرتے ہیں اور مرنے تک کرتے ہیں۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو چل نہیں سکتا، بول نہیں سکتا اور مانگ نہیں سکتا، اللہ نے بچے کو رونا سکھلا دیا کہ تم روؤ تو دیکھو سارا گھر تمہارے لیے بھاگتا پھرے گا۔

ایک علمی نکتہ:

علماء نے لکھا ہے کہ جب تم پیدا ہوتے ہو تو رو رہے ہوتے ہو اور عالم ہنس رہا ہوتا ہے۔ اب جب موت کا وقت آئے تو تم ہنس رہے ہو اور دنیا رو رہی ہو کہ تمہیں جنت کی خوشخبری مل رہی ہو، جنت کے فرشتے تمہیں لینے کے لیے آئے ہوئے ہوں، اس لیے تم ہنس رہے ہو اور لوگ رہے ہو۔ اور لوگ رو رہے ہوں کہ کتنا اخلاق والا اور اچھا آدمی تھا، کتنا ایمان، احسان اور فیض والا تھا اور کتنے لوگوں کو نفع پہنچانے والا تھا۔

رب تو سب کی تربیت کرتا ہے:

پھر جب تھوڑا سا وقت گزرا تو اللہ نے پاؤں پر گھسنے کی تربیت دی، پھر اماں، ابا کہنے کی تربیت دی، پھر پاؤں پر چلنے کی تربیت دی اور پھر تم بڑے ہوتے گئے اور ہر دور میں اللہ تعالیٰ کی تربیتیں تمہارے ساتھ رہیں۔ "اَلْعٰلَمِیْنَ" ہر جنس کو ایک عالم کہا جاتا ہے۔ عالم نباتات، عالم حیوانات وغیرہ اور خدا جانے اس خلا کے اندر کتنے عالم ہیں!؟ علماء نے لکھا ہے کہ چالیس ہزار عالم ہیں۔

ایک روایت میں ہے جس کو قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اور رازی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ اسی ہزار عالم ہیں اور ہر عالم کے لیے احکامات علیحدہ ہیں۔

جدید سائنس نے مریخ اور چاند پر آبادیوں کے آثار ڈھونڈے ہیں، لیکن ان آبادیوں کا اللہ نے کیا نظام رکھا ہے اور ان پر کونسی مخلوقات ہیں؟ ابھی تک یہ ہمارے سامنے نہیں آیا ہے۔ جیسے ہم دنیا کے اندر ہوا اور پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، لیکن ان پر جو مخلوق ہے ہوسکتا ہے ان کو اس آکسیجن کی ضرورت بھی نہ پڑتی ہو، کیونکہ اللہ نے ہر جگہ اپنی مخلوق علیحدہ پیدا فرمائی ہے۔ بعض مخلوق ایسی ہے جو خشکی کے اندر ہوتی ہے اور کوئی سمندر کے اندر ہوتی ہے اور بعض مخلوقات ہواؤں اور فضاؤں میں معلق ہیں۔ اس لیے فرمایا: ان تمام عالم کو تربیت دینے والی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

جانوروں کے بچوں کی سمجھداری:

ایک مرغی کا بچہ جب پیدا ہوتا ہے اور پہلے دن کا ہو، اگر وہ بلی کی آواز سنتا ہے یا بلی کو دیکھتا ہے تو فوراً ماں کے پروں کے نیچے چھپ جاتا ہے۔ اس کو یہ تربیت اور یہ سبق کس نے پڑھایا ہے؟

ایک جانور کے بچے کو دیکھ لیں، آپ کے پاس دو سو گائے ہیں اور ان کی تازہ ولادت ہوئی ہے۔ دو سو بچے بھی ساتھ ہیں، ہر بچہ اپنی ماں کے پاس جاتا ہے، حالانکہ سب کا رنگ، شکل، قد و قامت اور دودھ کا ذائقہ ایک ہے، لیکن سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ جانور کا بچہ اپنی ماں کو چھوڑ کر کسی دوسری گائے کو چمٹ جائے۔ یہ تربیت دینے والا اللہ ہے۔

چلو! تم ان کو تربیت دو گے جو نفع دینے والی ہیں، لیکن جو نقصان دینے والی ہیں ان کو تربیت دینے والا کون ہے؟ جس کے تم قریب بھی نہیں بھٹک سکتے۔ اور ایک ایسی مخلوق جو تمہارے سامنے آئے تو تم ڈر جاؤ۔ مثلاً: جن ہیں، اگر ان کو دیکھنے کا حوصلہ رکھ لیں تو پھر ان کو پکڑنے کی جرأت نہیں کر سکتا ہے۔ ان کا رب بھی اللہ ہے۔

پتھر میں رزق پہنچانے کا واقعہ:

ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک پتھر کو توڑا اور وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ دیکھا کہ اس کے درمیان میں ایک کیڑا بیٹھا ہوا ہے اور اس کے منہ میں ایک سبز پتہ پڑا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا: اے اللہ! یہ تیری کمال تربیت ہے کہ ایک پتھر ملا ہوا ہے، اس کے اندر تازہ غذا کا پہنچانا تیرا کام ہے۔ اسی طرح بعض جانور گوشت کھاتے ہیں، سارا دن باغ میں پھرتے رہیں گے، لیکن سبزہ نہیں کھائیں گے۔ اور بعض جانور سبزہ کھاتے ہیں، گوشت نہیں کھاتے، بعض پرندے صرف مچھلی کھاتے ہیں۔ تو ان تمام کو تربیت دینا، مخرج اور مدخل سمجھانا، یہ اللہ کی صفت ہے۔ اس لیے فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ (تمام تعریفوں کا حقدار بھی اللہ ہے جو سب کا رب ہے)۔

مخلوقات اللہ کی عبادت کیسے کرتی ہیں؟

قرآن میں دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ﴾ [الاسراء: ۴۴]

''کوئی چیز ایسی نہیں ہے مگر وہ اپنے رب کی حمد و ثنا کرتی رہتی ہے، لیکن تم لوگ ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔''

بعض زبان سے حمد کرتی ہیں اور بعض حال سے حمد کرتی ہیں، یعنی ان کا وجود اللہ کی ذات پر دلالت کر رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح درخت، پہاڑ، جانور ہر چیز کی ایک عبادت اور تسبیح ہے۔ اس کا اندازہ یوں لگائیں کہ جیسے درخت سیدھے کھڑے ہونے والے ہیں وہ قیام میں ہیں، اسی طرح جو جانور چار پاؤں پر چل رہے ہیں وہ حالتِ رکوع میں ہیں، اسی طرح بعض جانور سینے پر چلتے ہیں، گویا وہ ہر وقت سجدہ کی حالت میں ہیں اور پہاڑ ہر وقت تشہد میں

بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے انسان کو جامع عبادت کا طریقہ سکھلایا ہے۔ اس میں قیام بھی ہے، رکوع، سجود اور تشہد بھی ہے اور ذکر اللہ بھی ہے۔ اللہ نے فرمایا: جب تیری ان ساری چیزوں پر نظر پڑے گی تو تم بھی کہو گے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾۔

آسمانوں کے دروازے بغیر اجازت نہیں کھلتے:

اور وہ عالم جو ہم نے ابھی نہیں دیکھے ہیں۔ اگر چہ ہم نے ترقی کی ہے، چاند پر پہنچ گئے ہیں، ابھی تو وہ دور دراز کے علاقے بھی باقی ہیں جن کی روشنی بھی زمین تک نہیں آئی ہے۔ اور اگر پہنچے بھی ہیں تو یہ وہ سیارے ہیں جو آسمانوں سے نیچے ہیں، کیونکہ آسمان کے دروازے اللہ کے حکم کے بغیر کسی کے لیے بھی نہیں کھولے جاتے۔ جب مدنی پاک ﷺ معراج کے لیے تشریف لے گئے تو ان کے لیے بھی دروازے کھلوائے جاتے تھے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام آواز دیتے اور اندر سے پوچھا جاتا تھا کہ کون ہے؟ تو جبرائیل علیہ السلام جواب دیتے کہ میں جبرائیل ہوں۔ دوسرا سوال ہوتا تھا: "مَنْ مَّعَكَ؟" "تمہارے ساتھ کون ہیں؟ تو جبرائیل علیہ السلام جواب دیتے تھے: محمد رسول اللہ۔ اور تیسرا سوال کیا ان کو معراج کا دعوت نامہ پہنچایا گیا؟ تو جبرائیل علیہ السلام جواب دیتے کہ ہاں۔ پھر ان کے لیے دروازہ کھلتا اور میرے مدنی پاک ﷺ اوپر تشریف لے جاتے تھے۔ تو وہ عالم جن تک ہماری رسائی بھی نہیں ہے ان سب کو تربیت دینے والا اللہ ہے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۳۸۸۷، باب: المعراج]

کسی کو "رحمٰن" یا "رحیم" کہنا:

"رحمٰن" اور "رحیم" صرف اللہ کے نام ہیں۔ آج عبد الرحمٰن، عطاء الرحمٰن اور فضل الرحمٰن نام رکھ لیتے ہیں اور ان کو رحمٰن صاحب پکارتے ہیں۔ یہ غلط ہے اور آدمی کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے۔

آج کے زمانے میں بڑے ہونے کی پہچان:

اس لیے پورا نام پکاریں۔ اصل مصیبت یہ ہے کہ ہم لوگوں نے عقائد بھی بدل ڈالے، اپنی صورتیں اور عادات بھی بدل ڈالیں، حتیٰ کہ اپنے نام بھی بدل ڈالے۔ آج بڑا آدمی اس کو کہا جاتا ہے جس کے سر سے پاؤں تک اسلام کی جھلک نظر نہ آئے، جس کا نام بھی اسلامی نہ ہو، جس کی کوٹھی میں کبھی نماز نہ پڑھی گئی ہو، قرآن کی تلاوت نہ ہوئی ہو، جس کے بچے انگریزی بولتے ہوں اور انگریزی بود و باش ہو۔ اور اگر اس کے گھر کے قریب کوئی مسجد نظر آئے

اور وہ قرآن پڑھتا ہوا نظر آجائے اور وہ بوڑھا ہو، ہاتھ کے اندر تسبیح بھی ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ چھوڑو یہ مولوی ہو گیا ہے۔ ابھی تو ہماری جوانی ہے، ہم تو کھا پی لیں۔

نام بدل دینا:

نام بدلنا یہ انگریزوں کی عادت ہے، وہ ہمیشہ آدھے نام کے ساتھ پکارتے ہیں۔ اگر کسی کا نام اکرم ہے تو اس کو ''اکو'' کہیں گے۔ ہمارے لوگ بھی ان کی اتباع کرتے کرتے اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ انہوں نے اللہ کے نام بھی بدل ڈالے ہیں۔ یہ ابتدا تو گناہ ہے، لیکن جب جان بوجھ کر ایسے کرے تو کفر اور شرک تک پہنچ جاتا ہے۔

اللہ کی رحمت کا اندازہ:

''الرَّحْمٰنِ'' اور ''الرَّحِيْمِ'' دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں، یعنی عام رحمت والا۔ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ نے سو رحمتیں پیدا فرمائیں: ان میں سے ایک رحمت پوری دنیا پر تقسیم کی ہے۔ دنیا کے اندر جتنی محبت پائی جاتی ہے یہ صرف ایک رحمت کا اثر ہے۔ اور ننانوے رحمتیں اللہ نے اپنے پاس رکھی ہیں۔ قیامت والے دن پوری سو رحمتوں کا اظہار فرمائیں گے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ قیامت کے دن اللہ کی رحمت کا کیا عالم ہوگا!؟ [صحیح البخاری، حدیث: ۶۰۰۰ باب: جَعَلَ اللّٰهُ الرَّحْمَةَ مِائَةَ جُزْءٍ]

اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ اللہ نے عرش کے نیچے ایک حوض پر لکھ دیا ہے:

''إِنَّ رَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ'' [صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۲۲ باب: وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ]

''میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے۔''

اسی سے رحمت کا اندازہ لگائیں کہ ساری زندگی کفر و شرک میں گزری، لیکن اللہ فرماتے ہیں کہ تم توبہ کرو، میں توبہ قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ساری زندگی گناہوں میں گزری، اللہ کے در پر سر ڈالا تو اللہ نے سارے گناہ معاف کر دیے۔ اور پھر حکم دے دیتے ہیں کہ میرے بندے نے توبہ کر لی ہے، اب اسے پچھلے گناہوں کا طعنہ بھی نہ دو۔ فرمایا:

((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ)) [سنن ابن ماجہ، رقم: ۴۲۵۰]

''گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔''

جب آدمی گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے تو ہم اس کے گناہ ختم کر دیتے ہیں، بلکہ قرآن مجید میں ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا، جن لوگوں نے قتل کیا اور جن لوگوں نے زنا کیے، لیکن انہوں نے توبہ کر لی اور ایمان لا کر اللہ کے دروازے پر آ گئے، ان کے گناہوں کے بدلے میں نیکیاں لکھ دو۔

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾

قیامت کی ضرورت:

﴿يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ سے مراد یوم قیامت ہے، کیونکہ اللہ نے ہمیں دنیا میں بے کار نہیں بھیجا۔ کوئی دن ایسا تو ہو جس میں اللہ تعالیٰ ماننے والوں پر انعام فرمائیں اور نہ ماننے والوں کو سزا دیں۔

قیامت میں سب اختیار اور ملک اللہ کا:

اللہ صرف "يَوْمَ الْجَزَاء" یا "يَوْمَ الْقِيَامَةِ" کے مالک ہی نہیں، بلکہ دنیا کے بھی مالک ہیں۔ دنیا کے اندر کوئی نہ کوئی عارضی ملک کا دعویٰ کرتا ہے اور اللہ نے بھی اس کو عزت بخشی ہے۔ لیکن قیامت کے دن نہ کوئی ظاہری مالک ہوگا، نہ کوئی باطنی مالک ہوگا، نہ کوئی صورۃً مالک ہوگا اور نہ کوئی معناً مالک ہوگا، صرف اللہ ہی مالک ہوں گے۔ اس لیے قرآن میں فرمایا:

﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝﴾ [غافر:١٦]

"آج کے روز کس کی حکومت ہوگی؟ بس اللہ ہی کی ہوگی جو یکتا (اور) غالب ہے۔"

اس لیے فرمایا:

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾

اس دن ہر آدمی اپنی نفسا نفسی میں مبتلا ہوگا۔

قیامت کے دن سب کے بدلے چکا دیے جائیں گے:

قیامت کے دن اللہ فیصلے فرمائیں گے۔ فرمایا کہ ایک اندھا ہے اور ایک دیکھنے والا ہے، کیا برابر ہو سکتے ہیں؟ ایک مومن ہے اور ایک کافر ہے، کیا برابر ہو سکتے ہیں؟ جب یہ برابر نہیں ہو سکتے تو میں ان کو قیامت کے دن کیسے برابر کروں

گا؟ میں ایمان والوں کو ان کے ایمان کے مطابق بدلہ دوں گا، کفر والوں کو ان کے کفر کے مطابق سزا دوں گا اور شرک والوں کو ان کے شرک کے مطابق سزا دوں گا۔

کسی کو رؤف، رحیم، سمیع و بصیر کہنا:

جیسے کسی کا نام اللہ نہیں رکھا جا سکتا، اسی طرح اللہ کے سوا کسی کا نام "رحمٰن" بھی نہیں ہے، جبکہ "رَؤُفٌ رَحِيمٌ" اللہ کے سوا قرآن میں حضور ﷺ کی بھی صفت آئی ہے۔ اللہ کی بعض صفات ایسی ہیں کہ جن کا اللہ کے سوا کسی پر اطلاق جائز نہیں اور بعض صفات ایسی ہیں جن کا اللہ کے ماسوا پر اطلاق جائز ہے۔ جیسے آپ کسی کو "رَحْمٰن"، "خَالِقٌ" اور "رَازِقٌ" نہیں کہہ سکتے، لیکن کسی کو "رَحِيمٌ"، "سَمِيعٌ" اور "بَصِيرٌ" کی صفت سے موصوف کر سکتے ہیں، کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا﴾ [الدهر:٢]

"ہم نے انسان کو ایک ملے جلے نطفے سے اس طرح پیدا کیا کہ اسے آزمائیں۔ پھر اسے ایسا بنایا کہ وہ سنتا بھی ہے، دیکھتا بھی ہے۔"

لہٰذا رحمٰن ان صفات میں سے ہے جس کا اطلاق اللہ کے ماسوا پر جائز نہیں ہے۔

مسیلمہ کذاب کے دعوے:

جب اللہ ناراض ہوتے ہیں تو عقل چھن جاتی ہے۔ مسیلمہ کذاب نے جہالت کی اور اپنا نام رحمٰن رکھا۔ اب مسیلمہ کذاب نے دعویٰ تو نبوت کا کیا، لیکن رحمٰن نام رکھ کر خدا بھی بن بیٹھا۔ اس لیے اس کی صفت ایسی مشہور ہوئی کہ اب کوئی بھی نام لے تو مسیلمہ کذاب کہے گا۔

مرزا قادیانی کے مختلف دعوے:

مرزا قادیانی لعنۃ اللہ علیہ کا بھی یہی حال تھا کہ کبھی مجدد بن بیٹھا، کبھی مجتہد بن گیا اور ترقی کر کے مسیح موعود بن گیا۔ اور کبھی یہ کہا کہ میں نے دیکھا ہے کہ مجھے حمل ٹھہر گیا ہے۔ لکھا کہ مجھے کشف ہوا کہ میں عورت ہوں اور اللہ نے مجھ پر اپنی قوت کا اظہار کیا ہے۔ معاذ اللہ! یہ کسی نبی کی بات ہو سکتی ہے یا کسی عقلمند کی بات ہوتی ہے؟ بدقسمتی کہ بڑی بڑی ڈگریوں والے اس کے دھوکے میں ہیں، کیونکہ باطل فرقے پڑھانے میں بڑی امداد کرتے ہیں، ان کو اعلیٰ عہدوں

پر پہنچاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مرزا پاگل ہے، لیکن اپنے عہدوں کو بچانے کے لیے لگے رہتے ہیں۔

مسیلمہ کذاب کا انجام:

اور مسیلمہ کذاب کی حکومت بھی ایسی ہے کہ حضور ﷺ کی طرف پیغام بھیجا کہ اگر اپنی وفات کے بعد مجھے خلیفہ بنا دیں تو میری نبوت کا دعویٰ ختم ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: میرے ہاتھ میں جو لکڑی ہے یہ بھی کسی بے ایمان کو نہیں دے سکتا۔

تو اس نے رحمٰن نام رکھنے کی جرأت کی تو اللہ نے اس کو کذاب کی صفت کے ساتھ متصف کیا اور وہ اسی کفر میں مر گیا۔ دعا کریں اللہ پاک اپنی رحمت سے ہمیں صراطِ مستقیم پر رکھیں، ورنہ آدمی کتنا بھی پڑھا ہوا کیوں نہ ہو، بھٹکتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔

''بِسْمِ اللّٰهِ'' میں ''الرَّحْمٰنِ'' اور ''الرَّحِيْمِ'' دو نام کیوں آئے؟

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''الرَّحْمٰنِ'' کے اندر زیادہ عموم ہے تو پھر ''الرَّحِيْمِ'' کی صفت ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ علماء نے فرمایا کہ اگر صرف ''الرَّحْمٰنِ'' ذکر فرماتے تو جاہلوں کے دماغ میں آسکتا تھا کہ ''اللّٰهِ'' سے اور ذات مراد ہے اور ''الرَّحْمٰنِ'' سے کوئی دوسری ذات مراد ہے۔ اس لیے جب حضور ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' لکھوایا تو کافروں نے کہا: ہم تو ''الرَّحْمٰنِ'' کو مانتے ہی نہیں ہیں۔ اس لیے جب دونوں صفات آگئیں تو اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہی۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کا فائدہ:

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی۔ دنیا کی تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔ اس زمانے میں صحابہ اور تابعین موجود تھے۔ انہوں نے اس صلح کو پڑھا اور سنا۔ اسی صلح کی وجہ سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کوفہ چھوڑ کر مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ اس صلح کو ساری دنیا نے دیکھا اور سنا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے صلح میں کمال کر دیا کہ انہوں نے ایک سفید کاغذ پر اپنی مہر لگا کر صحابہ کے ذریعے سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا کہ میں صلح چاہتا ہوں۔ آپ اس کاغذ پر جو شرطیں لکھ دیں مجھے منظور ہیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے صلح فرمائی اور خطبہ پڑھا۔ اس دور میں جو لوگ فتنہ پیدا کرنا چاہتے تھے انہوں نے بڑی سخت باتیں بھی

کیں، لیکن آپ نے فرمایا: میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی مسلمان کا خون گرے، قتلِ عام ہو اور اس طرح مسلمان ایک دوسرے کو کاٹتے رہیں۔ میں چاہتا ہوں امن، استقرار ہو، مسلمانوں کی قوت متحد ہو اور مسلمان کافروں کا مقابلہ کر سکیں۔

ہمارے ملنگوں کو ان کی صلح پسند نہ آئی۔ ان کی "جلاء العیون" ایک مشہور کتاب ہے اس میں لکھا ہے کہ اس طرح صلح ہوئی تھی جس طرح حضور ﷺ کی صلح حدیبیہ میں ہوئی تھی۔ وہ مسلمانوں کو کافر بنا رہے ہیں، حالانکہ حضور ﷺ نے بشارت دی تھی کہ یہ میرا بیٹا حسن سردار بنے گا اور میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے اس بیٹے کی برکت سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے بڑے جھگڑے میں صلح کرائے گا۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۲۷۰۴، باب: قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ لِلْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ...]

اس حدیث میں حضور ﷺ نے دونوں جماعتوں کو مسلمان فرمایا ہے۔ ملنگوں نے اپنا بغض نکالنے کے لیے یہ کہہ دیا کہ یہ صلح حدیبیہ کی طرح صلح تھی۔

شیعوں کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے بغض:

آج بھی جب ماہِ محرم آتا ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا نام لیا جائے گا، لیکن حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا نام مرمر کر لیں گے۔ کبھی انہوں نے یومِ حسن رضی اللہ عنہ نہیں منایا، نہ ان کا جلوس نکالتے ہیں اور نہ چہلم مناتے ہیں، کیونکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی تھی۔ آج چودہ سو سال کے بعد ان کو اعتراض ہو رہا ہے، جبکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بیٹے ہیں۔ جب یہ بڑے بیٹے کو نہیں مانتے تو یہ چھوٹے بیٹے کو کیسے مانتے ہیں؟

حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی صلح چاہتے تھے۔ اس لیے ان لوگوں نے راستے میں ان کو شہید کر دیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: میرا راستہ چھوڑ دو، میں خود جا کر یزید سے بات کرتا ہوں۔

اگر ملنگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کی اولاد سے محبت ہے اور اسی لیے ان کے بیٹوں کے نام لیتے ہیں تو پھر ان کی بیٹیوں کے نام بھی لیں۔ اس لیے نام نہیں لیتے کہ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا داماد ماننا پڑے گا۔

ہماری قوم کی جہالت:

ہماری قوم اتنی سادی ہے کہ اگر مدینہ سے کوئی آدمی خط لکھ دے کہ فلاں بزرگ کو یہ خواب آیا ہے۔ اگر تم نے اس خط کو سو دفعہ چھپوا کر تقسیم نہ کیا تو تمہاری اولاد مر جائے گی۔ تو وہ اس خط کو چھپوا رہے ہیں۔ یہ بڑی جاہل قوم ہے۔ اگر پیر نماز نہ پڑھے تو کہتے ہیں کہ مرشد ہیں، یہ تو اللہ تک پہنچے ہوئے ہیں۔ پیر ایسا بدبخت ہے کہ اس کو کھانے کی ضرورت ہے، نماز کی ضرورت نہیں ہے، روزہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ان کو کہا جائے کہ سنا ہے تمہارے مرشد بھنگ پیتے ہیں!؟ تو کہتے ہیں کہ یہ راز ہیں..... اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ..... دعا کریں کہ اللہ ان کو ہدایت نصیب فرمائیں۔

کینہ، بغض اور منافقت یہودیوں کے پاس ہیں۔ مشرکین نے تو سیدھا اسلام کا انکار کر دیا تھا کہ ہم اسلام کو نہیں مانتے۔ حضور ﷺ کو سچا اور امین بھی مانتے تھے، لیکن آپ ﷺ کو رسول نہیں مانتے تھے۔ حضور ﷺ کو قتل کرنے کے ارادے سے ساری رات گھر کے باہر کھڑے رہے، اندر نہیں گئے کہ گھر کے اندر عورتیں ہوتی ہیں۔ حضور ﷺ جب باہر نکلے تو دیکھا کہ مشرکین کھڑے ہیں تو حضور ﷺ نے "شَاهَتِ الْوُجُوْهُ" پڑھ کر ان پر مٹی پھینکی، جو محاصرہ کرنے والے سب مشرکین کی آنکھوں میں پہنچی اور آپ آگے تشریف لے گئے۔

ہمارے ہاں منافقت ہے کہ خانہ کعبہ کے ساتھ ٹھہرے ہیں تو کہہ رہے ہیں: یا اللہ! تو مہربانی فرما اور جب داتا دربار کے ساتھ کھڑے ہیں تو کہہ رہے ہیں: اے داتا! تو رحم فرما۔ سب کو راضی کر رہے ہیں کہ اللہ بھی راضی ہو جائے اور پیر بھی راضی ہو جائے۔ اللہ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے۔

ہر آیت کو الگ الگ کر کے پڑھنا:

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب حضور ﷺ قرآن پڑھتے تو آیات کو علیحدہ کر کے پڑھتے تھے۔

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾، ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱﴾، ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲﴾، ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳﴾ [الخ]

بعض قراء نے اس طرح پڑھا ہے اور بعض قراء نے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱﴾ میم کو لام کے ساتھ ملا کر، یعنی ایک آیت کے طور پر پڑھا ہے۔ بہر حال دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔

﴿اَلْحَمْدُ﴾ میں مختلف قراءتیں اور اعراب:

﴿اَلْحَمْدُ﴾ قراء سبعہ کے ہاں اس کی قراءت دال کے پیش (ضمہ) کے ساتھ ہے۔ تو "اَلْحَمْدُ" مبتداء ہے اور لفظ "اللہ" خبر بن جائے گا۔

سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ اور روبہ بن العجاج رحمہ اللہ نے ﴿اَلْحَمْدَ﴾ دال کے زبر کے ساتھ فرمایا ہے۔ تو ﴿اَلْحَمْدَ﴾ مفعول ہوگا اور فعل مقدر مانیں گے۔

ایک قرأت کے اندر دال کا بھی پیش ہے اور لام کا بھی پیش ہے۔ اگرچہ اس کے شواہد موجود ہیں، لیکن یہ قرأت شاذ ہے۔ بعض لوگوں نے ﴿اَلْحَمْدِ﴾ زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ لیکن جمہور کی قرأت راجح ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۲، الفاتحۃ: الآیۃ: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ...]

حمد و ثنا کا مستحقِ حقیقی:

ابو جعفر ابن جریر نے اس کا معنی "اَلشُّکْرُ لِلّٰہِ" کیا ہے۔ تمام شکر خالصاً اللہ کے لیے ہیں، ان دوسروں کے لیے نہیں ہیں جن کی اللہ کے سوا عبادت کی جاتی ہے۔ تمام مخلوق کو اللہ نے پیدا فرمایا ہے۔ اور اللہ کے سوا کوئی مخلوق کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ پیدا کرنے کے بعد ایسے اعضا اور جوارح عطا فرمائے کہ وہ اللہ کا شکر اطاعت وعبادت کر سکیں، رزق کی نعمت عطا فرمائی ہے۔ یہ سارا اللہ کا انعام ہے۔ اگر اللہ ہمیں پیدا نہ کرتے تو ہمارے پاس کون سی طاقت تھی کہ ہم دعویٰ اور مطالبہ کر سکتے کہ ہمیں کیوں نہیں پیدا کیا گیا؟ اس لیے تمام حمد و ثنا اور شکر اللہ کے لیے ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۲، الفاتحۃ: الآیۃ: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ...]

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ﴾ جامع کلمۂ شکر:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ﴾ یہ ایسی تعریف ہے جس کو اللہ نے اپنی ذات کے لیے خود بیان فرمایا ہے اور ہمیں بھی حکم دیا کہ جب میں تعریف کر رہا ہوں تو تمہارا بھی فرض ہے کہ میری تعریفیں کرو۔

بعض مفسرین نے فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے ساتھ حمد و ثنا ہے۔ جو ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ﴾ کہے گا تو گویا اس نے اللہ کی ذات وصفات کی تعریف کی ہے اور جس نے "شُکْرُ لِلّٰہِ" کہا اس نے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا ہے۔ حضرت عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دونوں تعریفیں برابر ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ ہر شکر کرنے والے کے لیے کلمۂ شکر ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۲، الفاتحۃ: الآیۃ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ...]

مدح، حمد اور شکر میں فرق:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حمد کا معنی شکر کرنا، اس پر مجھے اعتراض ہے۔ متاخرین نے لکھا ہے کہ شکر زبان کے ساتھ، دل اور اعضاء کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ مفسرین نے فرمایا: ایک وجہ سے وہ عام ہے اور ایک وجہ سے خاص ہے۔ حمد شکر سے عام ہے، کیونکہ وہ صفاتِ لازمہ اور متعدیہ پر ہوتی ہے۔ جیسے کہتے ہیں: ہم نے اس کی تعریف کی اس کے شہسوار ہونے کی، ہم نے اس کی سخاوت کی تعریف کی۔ یہ خاص ہے، کیونکہ یہ زبان سے ہے۔ اور شکر عام ہے کہ قول، فعل اور دل کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔

اسماعیل بن حماد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حمد ذم کی نقیض اور ضد ہے، جیسے کہتے ہیں: ''حَمِدْتُ الرَّجُلَ أَحْمَدُهُ حَمْدًا وَمَحْمَدَةً فَهُوَ حَمِيْدٌ وَمَحْمُوْدٌ'' تحمید حمد سے ابلغ ہے اور حمد شکر سے ابلغ ہے۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ شکر کہتے ہیں کہ کسی کی اس بات پر تعریف کرنا کہ اس نے انعام کیا ہے۔

مدح حمد سے بھی عام ہے، کیونکہ مدح زندہ اور مردہ کی، نباتات اور جمادات کی بھی کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ طعام کتنا اچھا ہے! یہ پتھر کتنا اچھا ہے! مکان کتنا اچھا ہے! اور مدح احسان سے پہلے بھی ہوتی ہے اور احسان کے بعد بھی ہوتی ہے۔ ان صفات پر بھی ہوتی ہے جو متعدی ہوں اور ان صفات پر بھی ہوتی ہے جو متعدی نہ ہوں اور ان صفات پر بھی جو لازم ہوں۔

مختلف اکابرین کے نزدیک تسبیح، تحمید اور تکبیر کی فضیلت:

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ'' اللہ تعالیٰ کی تنزیہ بیان کرتا ہے کہ وہ تمام صفاتِ نقصان سے پاک ہے، ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' اس کی الوہیت کا اقرار ہے، لیکن ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کا کیا معنی ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' ایسا کلمہ ہے جو اللہ نے اپنے لیے پسند فرمالیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے فرمایا: ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ'' یہ تو ہم نے سمجھ لیا، لیکن ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' سے کیا مراد ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ ایسا کلمہ ہے جو اللہ نے اپنی ذات کے لیے محبوب فرمالیا، اللہ کو پسند ہے کہ یہ کلمہ کہا جائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ کلمہ شکر ہے۔ جب بندہ "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہتا ہے تو اللہ فرماتے ہیں: "شَكَرَنِي عَبْدِيْ" "میرے بندے نے میرا شکر ادا کیا۔ اس لیے ہر نعمت پر "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہیں۔ پانی پئیں، کھانا کھائیں "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" پڑھیں، حتیٰ کہ جب بیت الخلاء سے نکلیں تو "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" پڑھیں۔ جتنی زیادہ حمد ہوگی اتنی اللہ کی نعمتیں ہوں گی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" اللہ کا شکر اور اس کی نعمتوں کا اقرار ہے۔ حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے فرمایا: "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" اللہ کی رضا ہے۔ حضرت شعبہ رحمہ اللہ سے ایک روایت اس طرح کی بھی ہے کہ جب بندہ "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہتا ہے تو اللہ فرماتے ہیں کہ تو نے میرا شکر ادا کیا، بلکہ زیادہ شکر ادا کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: افضل ذکر "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" ہے اور افضل شکر "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا کہ یہ حدیث ایک طریق سے درجہ حسن کو پہنچتی ہے اور دوسرے طرق سے اس میں غرابت ہے۔

جب آدمی کو نعمت حاصل ہو اور وہ "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہے تو اللہ اس کو اور زیادہ نعمتیں عطا فرماتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۲، الآیۃ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ... ذِكْرُ أَقْوَالِ السَّلَفِ فِي...]

شکر نہ کرنے سے نعمت چھن جاتی ہے، واقعہ:

ایک اسرائیلی روایت ہے کہ اللہ کا ایک محبوب بندہ تھا۔ اللہ نے اس کو بڑی نعمتیں عطا فرمائی تھیں۔ رزق، مال، اولاد اور اطمینان دیا تھا۔ اس نے ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا: آپ اللہ کے نبی ہیں۔ اللہ نے مجھے اتنی نعمتیں دی ہیں کہ اب دل بھر گیا ہے، اب کسی اور نعمت کی مجھے تمنا نہیں رہی، بس یہی نعمتیں مجھے کافی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے عرض کیا: جب آپ کا بندہ راضی ہوگیا ہے تو اس پر نعمتوں کی بس فرما دیں، مزید نعمتیں نہ دیں۔ اللہ نے فرمایا: میرے بندے سے کہو کہ میرا شکر کرنا چھوڑ دے تو میں بھی نعمتیں دینا چھوڑ دوں گا۔

اس کی دلیل قرآن میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ﴾ [ابراہیم: ۷]

"اگر تم نے واقعی شکر ادا کیا تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا، اور اگر تم نے ناشکری کی تو یقین جانو، میرا عذاب بڑا سخت ہے۔"

شکر کا معنی:

شکر کرنے کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ زبان سے کہہ دیا کہ یا اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ یہ تو استہزاء ہے اور اللہ کے

عذاب کو دعوت دیتا ہے کہ آدمی گناہ بھی کرتا رہے اور "الحمد للہ" بھی کہتا رہے۔ احکام کی خلاف ورزی کرے یا حرام کی دولت ہاتھ آئے، چوری کرے اور ڈاکہ مارے اور "الحمد للہ" کہے یہ کفر ہے۔

شکر کا معنی یہ ہوتا ہے کہ جو نعمتیں اللہ نے ہمیں دی ہیں وہ اللہ کی اطاعت میں لگیں۔ اللہ نے آنکھیں دی ہیں یا دماغ دیا تو اللہ کی نعمتوں کے بارے میں سوچیں۔ زبان دی ہے اس سے قرآن حدیث، اچھا کلمہ وعظ و نصیحت اور تبلیغ ہو، وگرنہ خاموش رہے۔ ہر عضو کو اللہ کی اطاعت میں لگانا شکر ہے۔ پھر زبان سے "الحمد للہ" کہے تو اس کا مزہ ہے۔

نعمتوں کا بے جا استعمال:

ایک آدمی معصیت کرے اور پھر کہے کہ اللہ کا شکر ہے۔ گھر کے اندر فحاشی، عریانی ہے اور کہے الحمد للہ! اللہ نے ہمیں بڑی نعمتیں دی ہوئی ہیں۔ یہ شکر نہیں ہے، بلکہ ناشکری ہے۔ اللہ نے اس لیے تو نعمتیں نہیں دی تھیں کہ تم ناشکری اور نافرمانی میں خرچ کرو۔

علماء نے فرمایا ہے کہ آدمی گناہ کرے اور پھر کوئی نعمت مل جائے، مثلاً: جوا کھیل رہا ہے، گھوڑوں کی ریس پر پیسے لگائے ہوئے ہیں اور اس کو پیسے مل گئے تو سمجھو اللہ کا عذاب آنے والا ہے، کیونکہ یہ استدراج ہوتا ہے، آخری مہلت ہوتی ہے کہ اچھی طرح گناہ میں ڈوب جائے اور پھر میں اس کو عذاب میں پکڑوں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾ [یونس: ۱۱]

"اے میرے مدنی! جن کو امید نہیں ہماری ملاقات کی ہم انہیں ان کی طغیانی اور سرکشی میں چھوڑ دیتے ہیں۔"

﴿إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ﴾ [البروج: ۱۲]

"جب ہم ان کو پکڑیں گے تو ہماری پکڑ بڑی سخت ہے۔"

اصل حمد اللہ پر ایمان لانا ہے، اللہ کے رسولوں پر ایمان لانا ہے۔ ایک آدمی اللہ پر ایمان نہیں رکھتا تو وہ اللہ کا شکر کیسے ادا کرے گا؟ جب ایک آدمی کا حضور ﷺ کی نبوت اور رسالت پر ایمان نہیں ہے تو وہ کیسے شکر گزار ہوگا؟ قرآن میں اللہ نے شاکر کے مقابلے میں کافر کو رکھا ہے۔ فرمایا:

﴿إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا﴾ [الدھر: ۳]

"ہم نے واضح کر کے راستہ دکھا دیا ہے۔ اب مومن ہوں گے یا کافر ہوں گے۔"

دوسرا شکر یہ ہے کہ اپنے اعضا کو اللہ کے حکم میں لگا دے۔ آپ ایک ملازم رکھتے ہیں، اس کی ڈیوٹی لگائی ہے کہ کار کی صفائی کرے، انجن وغیرہ چیک کرے۔ آپ نے گاڑی سٹارٹ کی، موبل آئل نہیں تھا تو انجن جل گیا۔ آپ اس سے پوچھیں کہ تم کیا کرتے رہتے ہو؟ اگر وہ کہے کہ میں سارا دن آپ کا شکریہ ادا کرتا رہتا ہوں کہ میرا مالک بہت اچھا ہے، شریف ہے۔ آپ کہیں گے کہ میں نے تو تیرے ذمہ یہ کام لگایا تھا، تعریف کرنے کا نہیں کہا تھا۔ میری تو گاڑی تباہ ہو گئی ہے۔ ایسے نوکر کو کوئی بھی قبول نہیں کرے گا۔

اللہ بھی فرماتے ہیں کہ جب میں نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے اعضا میرا شکر نہیں کر رہے، بلکہ کفر کر رہے ہیں۔ میں نے تمہیں آنکھیں دیں کہ اس سے صراطِ مستقیم دیکھو اور تم عورتوں کو دیکھتے ہو، میں نے پیشانی دی تھی کہ مجھے سجدہ کرنا ہے اور تم قبروں کو سجدہ کرتے ہو، زبان دی تھی کہ مجھے پکارنا ہے اور تم غیروں کو پکار رہے ہو، میں نے تمہیں پاؤں دیے تھے کہ میرے راستے پر چلنا، لیکن تم زنا، ڈاکے اور چوری کے راستے پر چل رہے ہو اور میں نے ہاتھ دیے تھے کہ میری بندگی کرنا اور تم اس سے لوگوں کو مارنے پر زور لگا رہے ہو۔ جس چیز کو جس مقصد کے لیے بنایا جائے اگر اس میں استعمال نہ کیا جائے تو یہ ظلم ہے۔ عینک اس لیے بنائی کہ اس کو آنکھوں پر لگائیں، باریک حروف موٹے نظر آئیں۔ اگر کوئی اس کو پاؤں میں لگائے تو یہ ظلم ہے۔ جوتے کو سر پر رکھیں اور پاؤں میں نہ پہنیں تو یہ بھی ظلم ہے۔

سکندر بادشاہ کا واقعہ:

سکندر بادشاہ نے ایک ملک فتح کیا۔ وہاں ایک آدمی کو سویا ہوا دیکھا۔ اس کو غصہ آیا اور لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ بہت ہی غافل آدمی ہے۔ بادشاہ نے اس کو پاؤں کی ٹھوکر مار کر کہا: اٹھو میں نے ملک فتح کر لیا ہے اور تم سوئے ہوئے ہو؟ وہ اٹھا اور اس نے کہا کہ ملک کو فتح کرنا تو بادشاہوں کا کام ہے، لیکن ٹھوکریں مارنا گدھوں کا کام ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ملک گدھوں کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔

لوگوں نے یہی سمجھا ہوا ہے کہ رشوت اور حرام کھا کر کوٹھی پر لکھ دو:

"هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ"

تو وہ حرام حلال ہو جائے گا۔ سود پر پیسے اکٹھے کر کے مسجد بنالو اور اس پر لکھ دو:

﴿وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴾

یہ شکر نہیں ہے۔ فقہاء کا فتویٰ ہے کہ جو حرام پیسہ خرچ کر کے ثواب کی نیت کر لے تو وہ کفر تک جا پہنچتا ہے۔ اللہ حلال پر ثواب دیتے ہیں حرام پر نہیں۔

حضور ﷺ کو مسکینی پسند تھی:

حضور ﷺ کے پاس ایک فرشتہ آیا اور عرض کیا کہ اللہ فرماتے ہیں کہ چاہے آپ ملک و حکومت کو پسند کریں، چاہے فقر و مسکینی کو۔ تو چونکہ اس وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام ساتھ بیٹھے تھے۔ آپ نے ان سے مشورہ مانگا تو جبرائیل نے اشارہ کیا کہ تواضع کو اختیار فرمائیں۔ تو حضور نے اس فرشتے سے فرمایا کہ میں مسکینی پسند کرتا ہوں۔ (تا کہ جو مل جائے اس پر شکر کروں اور اگر نہ ملے تو اللہ سے مانگا کروں)۔

دنیا میں اپنے سے کم تر اور دین میں اپنے سے برتر کو دیکھو:

حکم دیا گیا کہ اپنے کم حیثیت والوں کے پاس جاؤ، زیادہ حیثیت والوں کے پاس نہ جاؤ، کیونکہ اگر بڑی حیثیت والوں کے پاس جاؤ گے تو ناشکری پیدا ہوگی اور کم حیثیت والوں کے پاس جاؤ گے شکر پیدا ہوگا۔ آنکھوں والے ہو تو اندھے پر نظر ڈالو، اگر تندرست ہو تو بیمار پر نظر ڈالو، اگر قوی ہو تو کمزور پر نظر ڈالو، امیر ہو تو غریب پر نظر ڈالو اور اگر خوبصورت ہو تو بدصورت پر نظر ڈالو، تا کہ اللہ کا شکر کرو۔

اس لیے فرمایا کہ اگر کسی اندھے کو، لنگڑے کو یا بیمار کو دیکھو تو یہ دعا پڑھو:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ عَافَانِيْ مِمَّا ابْتَلَاكَ بِهٖ وَفَضَّلَنِيْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيْلًا))

[سنن الترمذی، حدیث: ۳۴۳۱، باب: ما یقول اذا رأی مبتلی]

"یا اللہ! تیرا کروڑ کروڑ شکر ہے کہ تو نے مجھے اس بیماری سے بچالیا ہے جس میں اس بندے کو مبتلا کیا ہے۔ تیرا کروڑ شکر ہے کہ لاکھوں بندوں سے اچھا بنایا ہے۔"

اگر تمہارے گھر میں روٹی پک رہی ہے تو اس گھر میں نظر ڈالو جہاں دھواں بھی نہیں اٹھتا، تمہارے گھر میں پھل ہیں تو اس گھر میں نظر ڈالو جس گھر میں سوکھی روٹی بھی نصیب نہیں ہے۔ بستر پر سوتے ہو تو ان پر نظر ڈالو جو فٹ پاتھ

پر ہوتے ہیں، پھر اللہ کا شکر پیدا ہوگا۔ اور اگر اپنے سے بڑے پر نظر ڈالو گے تو کفرانِ نعمت پیدا ہوگی۔

کمتر رکھنے میں حکمت:

یہ اللہ کی تقسیم ہے کہ ایک آدمی کو علم کی دولت دیتے ہیں، مال و دولت نہیں دیتے۔ ایک آدمی کو علم و مال کی دولت دیتے ہیں، حسن و جمال کی دولت نہیں دیتے اور ایک آدمی کو حسن و جمال کی دولت دیتے ہیں، علم اور مال کی دولت نہیں دیتے۔ یہ میرے اللہ کا نظام ہے اور اسی نظام سے دنیا قائم ہے۔ اگر سارے امیر بن جائیں تو مزدوری کون کرے گا؟ مکان کون بنائے گا؟ تم غریب کے ہاتھوں کے محتاج ہو اور وہ تمہارے پیسے کا محتاج ہے۔ صرف اللہ کی ذات غنی ہے، جس کو کوئی احتیاج نہیں ہے۔

آدمی کتنا امیر یا بڑا آدمی کیوں نہ ہو جائے، لیکن روزانہ اپنے پیشاب، پاخانہ پر بیٹھتا ہے، اپنے ہاتھ سے استنجا کرتا ہے۔ پھر غرور اور تکبر کا کوئی حق نہیں ہے۔

ایک بزرگ اور بادشاہ کا واقعہ:

مثل مشہور ہے کہ ایک بادشاہ نے ایک بزرگ کو ناراض ہو کر کہا کہ میرے ملک سے نکل جاؤ۔ اس بزرگ نے ایک مصلیٰ اٹھایا اور لوٹے کو ہاتھ میں لے کر چلے گئے۔ اتفاق سے بادشاہ کو درد شروع ہو گیا۔ بادشاہ کی والدہ سمجھدار تھی، انہوں نے کہا: آپ نے اللہ والے کا دل دکھایا ہے، لگتا ہے اس کی بددعا لگ گئی ہے۔ بادشاہ کی والدہ ان بزرگ کی خدمت میں دوڑی آئیں کہ حضرت! معاف فرما دیں۔ حاسدین غلط باتیں پہنچا دیتے ہیں، ان سے بھی غلط آرڈر ہو گیا۔ بزرگ نے فرمایا: اس کو ایک شرط پر معاف کریں گے۔ اس نے ہمیں اپنے ملک سے نکالا، شرط یہ ہے کہ وہ آدھا ملک ہمیں لکھ دیں، ہم دعا کریں گے اس کا پیشاب جاری ہو جائے گا۔ بادشاہ نے کہا: سارا لکھ لیں، میں مر جاؤں گا تو ملک کا کیا کروں گا؟ بادشاہ نے پروانہ لکھ کر دے دیا۔ بزرگ نے فرمایا: تمہارے ملک کی یہی قیمت تھی۔ توبہ کرو، ملک اللہ کا ہے۔

اصل شکر یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگ جاؤ۔ تم وضو کر رہے ہو، یہ شکر ہے۔ حلال کی کوشش کر رہے ہو، گھر میں بیٹھے لوگوں کو اسلام کی باتیں بتا رہے ہو، یہ شکر ہے۔ میاں بیوی ملیں تو عبادت کا ثواب ہے، اگر غیر سے ملیں تو کوڑے کا حکم ہے۔

فضول خرچی کا ایک معیار:

ایک آدمی نے اللہ والے سے آکر پوچھا کہ اللہ فرماتے ہیں: فضول خرچی نہ کرو۔ کتنا میں خرچ کروں تو ٹھیک ہے، وگرنہ فضول خرچی ہوگی؟ آپ نے فرمایا: اگر احد پہاڑ کے برابر سونا اللہ کے راستے میں خرچ کردو تو یہ کوئی فضول خرچی نہیں ہے۔ اگر ایک پیسہ بھی حرام میں خرچ کرو گے تو یہ فضول خرچی ہوگی۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کا ثواب:

حضور ﷺ نے فرمایا: یہ دنیا ساری بندے کے ایک ہاتھ میں ہو اور دوسرے ہاتھ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" ہو تو "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" والا ہاتھ زیادہ بھاری ہے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ دنیا کی نعمتیں بھی اللہ نے دیں اور حمد کرنے کی توفیق بھی اللہ نے دی ہے، لیکن "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" والی نعمت زیادہ ہے، اس کا ثواب کبھی ختم نہیں ہوگا۔ یاد رکھو! کہنا آسان ہے۔ اثر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آدمی کا دین اسلام سے تعلق پیدا ہوتا ہے۔

تہجد کا مزہ:

بادشاہ نے ایک بزرگ کو لکھا کہ فلاں اسٹیٹ ساری کی ساری آپ کو دے رہے ہیں، تا کہ آپ کے لنگر کے کام آئے۔ انہوں نے لکھا: جب سے ہمیں تہجد کا ملک ملا ہے، ہمیں تمہارے اس ملک کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

باقیاتِ صالحات:

اس لیے جب ہم نے نعمت پر "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کہا تو اس کا ثواب آخرت میں بھی ملے گا اور آخرت کی نعمتیں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ دنیا کی نعمتیں چاہے کتنی زیادہ ہوں، لیکن ایک دن ختم ہو جائیں گی۔ اس لیے قرآن پاک میں فرمایا:

﴿اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ۝﴾ [الکہف:۴۶]

"مال اور اولاد دنیا کی زینت اور رونق ہے۔ باقی رہنے والے نیک اعمال ہیں جو اللہ کے ہاں باقی ہوں گے۔"

ایک عظیم کلمہ کا ثواب:

ابن ماجہ کی روایت ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: حضور ﷺ نے ان کو یہ حدیث بیان کی کہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ کہتا ہے:

((یَا رَبِّ! لَکَ الْحَمْدُ کَمَا یَنْبَغِیْ لِجَلَالِ وَجْهِکَ وَلِعَظِیْمِ سُلْطَانِکَ))

"یا اللہ! آپ ہی کے لئے تمام تعریفیں ہیں جو آپ کی بزرگ ذات اور عظیم سلطنت کے شایانِ شان ہے۔ میں تیری حمد بیان نہیں کر سکتا۔"

لکھنے والے فرشتوں کے لیے مشکل پڑ گئی کہ ہم اس کا کتنا ثواب لکھیں؟ وہ اللہ پاک سے رجوع کرتے ہیں: یا اللہ! تیرے بندے نے آج ایسا کلمہ زبان سے کہا ہے، ہم اس کی کیا جزا لکھیں؟ اللہ جانتے ہیں، لیکن پوچھتے ہیں: میرے بندے نے کیا کہا تھا؟ وہ عرض کرتے ہیں: اس نے یہ کلمہ کہا تھا:

((یَا رَبِّ! لَکَ الْحَمْدُ کَمَا یَنْبَغِیْ لِجَلَالِ وَجْهِکَ وَلِعَظِیْمِ سُلْطَانِکَ))

اللہ نے فرمایا: جس طرح میرے بندے نے کہا ہے اسی طرح لکھ دو، اس کا بدلہ تم نہیں جانتے، میں خود قیامت کے دن اس کا بدلہ دوں گا۔ [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۳۸۰۱، باب: فضل الحامدین]

صحیح حدیث میں ہے کہ جب امام نے کہا: "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" تو ایک مقتدی نے کہا:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُّبَارَكًا فِيْهِ مُبَارَكًا عَلَيْهِ، كَمَا يُحِبُّ رَبُّنَا وَيَرْضٰى"

حضور ﷺ نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ تیس سے بھی کچھ اوپر فرشتے ہیں جو دوڑ رہے ہیں کہ یہ کلمے ہم اللہ کی طرف لے جائیں۔ [سنن ابی داود، حدیث: ۷۷۳، باب: مَا یُسْتَفْتَحُ بِهٖ...]

حضور ﷺ کی شفاعتِ کبریٰ اور شفاعتِ صغریٰ:

جب ساری مخلوق تمام انبیاء سے خالی لوٹ کر حضور ﷺ کے پاس آئے گی کہ آپ ان کی شفاعت کریں تو حضور ﷺ فرمائیں گے: "أَنَا لَهَا أَنَا لَهَا" نہ گھبراؤ، اللہ نے اس کام کے لیے مجھے چن لیا ہے۔ پھر میں آؤں گا اور اللہ اس وقت مجھے اپنی حمد سکھلائیں گے جو میں اس وقت نہیں جانتا۔ پھر میں عرش کے پاس جا کر دو رکعت پڑھوں گا اور سر سجدہ میں ڈالوں گا اور وہی حمد کروں گا۔ تو حکم ہوگا: میرے مدنی! اپنا سر اٹھالو، جو تم نے درخواست کی ہم نے منظور کر لی ہے۔ یہ شفاعت کبریٰ ہوگی جس کے بعد ساری امتوں کی پیشی شروع ہو جائے گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ساروں کو جہنم سے چھٹی مل جائے گی۔ یہ شفاعت بعد میں ہوگی جب سارے گنہگار جہنم میں ڈال دیے جائیں گے، پھر حضور ﷺ سفارش کریں گے۔ ان کو جہنم سے نکالیں گے جو صحیح عقیدہ پر ہوں گے اور جو کفر و شرک پر مر گئے، بدعات کے اندر الجھ گئے تو حضور ﷺ کبھی کسی بدعتی کے لیے سفارش کرنا قبول نہیں کریں گے۔

بدعتی حضور ﷺ کی شفاعت سے محروم ہوگا:

صحیح حدیث مبارک میں ہے کہ کچھ لوگ حوض کوثر کے پاس آرہے ہوں گے، فرشتے ان کو دھکا دے رہے ہوں گے۔ حضور ﷺ فرمائیں گے: ان کو چھوڑ دو! یہ تو میرے امتی ہیں، میرے دوست ہیں، ان کو آنے دو۔ فرشتے عرض کریں گے: آپ کو علم نہیں ہے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیسی کیسی بدعتیں دین میں گھڑ لی تھیں۔ حضور ﷺ فرمائیں گے:

((سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ بَدَّلَ بَعْدِي)) [صحیح البخاری، حدیث: ۶۵۸۴، باب: فی الحوض]

ان کو میری نظروں سے دور کر دو جنہوں نے میرے بعد دین کو بدل دیا۔

بدعتی کی عزت نہ کرو:

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ أَعَانَ عَلَى هَدْمِ الْإِسْلَامِ)) [شعب الایمان، حدیث: ۹۰۱۸]

''جو کسی بدعتی مولوی، بدعتی پیر کی عزت کرے، خوشامد کرے گویا اس نے اللہ کے دین کو گرانے میں اس کی مدد کی ہے۔''

کیونکہ جب تم ان کی عزت کرو گے تو وہ بدعت کے اوپر جم جائیں گے اور پکے ہوں گے۔ جب تک تم کھڑے ہو کر ان کی بدعت کا انکار نہیں کرو گے، سنت کا پرچار نہیں کرو گے کیسے اصلاح ہوگی؟ اس لیے کم از کم ان کی مجلسوں سے اظہار براءت کرو۔

برائی کو روکنے کے تین طریقے:

کیونکہ ہمیں حکم ہے کہ اگر تمہارے پاس طاقت ہے تو برائی کو ہاتھ سے مٹاؤ، اگر طاقت نہیں تو زبان سے مٹاؤ اور اگر حق کہنے کی طاقت نہیں ہے تو کم از کم دل میں اس کو برا سمجھ کر ان سے دور تو ہو جاؤ۔ انہوں نے اللہ کے دین کا حلیہ اور نقشہ بگاڑ دیا ہے۔

چند بدعات کا رد:

بحیثیت ایک مسلمان اور کلمہ گو آپ سوچیں کہ میرے مدنی پاک ﷺ مدینہ میں دین لائے، مکہ میں دین لائے

اور ساری دنیا میں اس کو پھیلایا۔ کیا صرف یہی دین تھا کہ عرس کریں گے، ساتویں اور چالیسویں کریں گے؟ کیا یہی دین تھا؟ ٹھنڈے دل سے ان باتوں کو سوچیں!! اگر یہ سارے کام کرنا دین میں شامل ہے تو کیا حضور ﷺ نے ان کو کیا؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ، عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم، اصحاب بدر اور اصحاب حدیبیہ رضی اللہ عنہم نے دین کا یہ نقشہ ہمیں نہیں دکھایا تو اب یہ دین کیسے بن گیا ہے؟ اگر انہوں نے یہ سارا کچھ کیا ہے تو دین ہے۔ پھر تو کوئی جھگڑا نہیں ہے۔

حضور ﷺ کی محبوب بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ ان کی وفات کے بعد بھی پوری زندگی حضور ﷺ ان کو نہیں بھولے، حتیٰ کہ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا حسرت کرتی تھیں۔ حضور ﷺ غصہ میں آگئے کہ اے عائشہ! کیا باتیں کرتی ہو!! تم میرے گھر میں اس وقت آئیں جب دین پھیل چکا تھا اور خدیجہ (رضی اللہ عنہا) اس وقت آگئیں جب میرا اللہ کے سوا کوئی نہ تھا۔ میں اس بیوی کو بھول سکتا ہوں؟

کیا حضور ﷺ نے بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے قل اور چار جمعراتیں کی تھیں؟ اگر کی ہیں تو ہمیں دکھلا دو۔ ہمارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر آج اللہ چاہیں اور حضور ﷺ کے صحابہ کو زندہ کر دیں اور اللہ اس پر قادر ہیں اور وہ ہمیں دیکھیں تو وہ کہیں گے کہ یہ سب کچھ ہیں، لیکن مسلمان نہیں ہیں، کیونکہ مسلمان تو وہ ہوتا ہے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کا نمونہ بنے۔ اب جن لوگوں میں اسلام رہ گیا ہے تو صرف نماز اور مسواک کی حد تک ہے، لیکن گھروں کے اندر کیا ہے؟ کچھ پتا نہیں ہے۔

کلمہ طیبہ اور الحمد کے فضائل:

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ایک جماعت کا قول نقل کیا ہے کہ ایک کلمہ مبارک "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" اور دوسرا کلمہ مبارک ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ①﴾ ہے۔ احادیث مبارکہ میں "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کے بڑے فضائل موجود ہیں۔ ایک حدیث مبارکہ میں فرمایا:

((مَنْ قَالَ: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" دَخَلَ الْجَنَّةَ))

"جس نے "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" پڑھا وہ جنت میں داخل ہوگا۔"

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۶۳۸، باب: ما جاء فیمن یموت وھو...]

ایک اور حدیث مبارکہ میں فرمایا:

((مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" دَخَلَ الْجَنَّةَ))

"جس کا آخری کلام "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" ہو گیا وہ جنت میں داخل ہوگا۔"

[سنن ابی داود، حدیث: ۳۱۱۶، باب: فی التلقین]

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ①﴾ افضل ہے، کیونکہ اس میں معنی توحید بھی ہے اور معنی حمد بھی ہے اور کلمہ طیبہ میں توحید کا معنی ہے، حمد کا معنی نہیں ہے۔

علماء اس کا جواب دیتے ہیں کہ ایک ذکر تو وہ ہے جو دعائے ماثورہ میں ہے، مثلاً: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ"۔ اور دوسرا ذکر وہ کلمات ہیں جو اللہ کے قرآن میں آئے ہیں، مثلاً: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ①﴾ یہ قرآنی آیت دوسرے اذکار سے افضل ہے۔ چونکہ یہ اللہ کا قرآن ہے، اس معنی کے اعتبار سے یہ افضل ہے۔ اور باقی ماثورہ دعاؤں میں سے "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" افضل ہے۔

زبانی اقرار کے ساتھ دل سے اقرار بھی ایمان کے لیے شرط ہے:

بعض علماء نے فرمایا: کلمہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" افضل ہے، کیونکہ اس کے اندر توحید ہے جو ایمان اور کفر کے درمیان فرق ہے۔ بندہ مومن اس وقت کہلائے گا جب دل سے بھی ایمان ہو، زبان سے بھی اقرار ہو اور جوارح اور ارکان اس کی تصدیق کر رہے ہوں تو ایمان مکمل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر: ایک آدمی زبان سے کلمہ پڑھتا ہے، لیکن دل میں ایمان نہیں ہے وہ منافق ہے۔ اور اگر دل کے اندر تو تصدیق ہے کہ اسلام سچا مذہب ہے۔ جیسے بڑے بڑے انگریز مؤرخ گزرے ہیں اور اب بھی ہیں، جنہوں نے اسلام کی سچائی پر اور حضور ﷺ کی عظمت پر کتابیں لکھی ہیں۔ ابھی ایک نئی کتاب آئی ہے جس میں ایک سو ہیروز کا ذکر ہے۔ ان سب میں ٹاپ اور اعلیٰ درجہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو دیا ہے۔ وہ اسلام کا معترف ہے، لیکن زبان سے کلمہ شہادت نہیں پڑھتا ہے، لہٰذا ہم اس کو مسلمان نہیں کہیں گے۔

بعض علماء کے نزدیک ایمان کی تعریف:

اگر دل میں بھی کلمہ ہے اور زبان سے اقرار بھی ہے، لیکن ہمارے اعضا اور ارکان اس کی عملی تصدیق نہیں کرتے تو یہ بھی اسلام نہیں ہے۔ ہم نے تو پھر طوطے کی طرح پڑھا ہے۔ اس لیے علماء نے ایمان کی تعریف کی ہے:

"تَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ، إِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَعَمَلٌ بِالْأَرْكَانِ"

"دل سے تصدیق، زبان سے اس کلمہ کا اقرار اور پورا بدن اس کلمہ کی شہادت دے۔"

جیسے آپ نے کلمہ پڑھا اور غیر کے آگے نہیں جھکتے تو آپ کا پورا بدن توحید کی گواہی دے رہا ہے۔ اور "یَا اَللّٰہُ! یَا رَحْمٰنُ! یَا رَحِیْمُ!" کے سوا کسی کو نہیں پکار رہے ہیں تو آپ کی زبان توحید کی گواہی دے رہی ہے۔ اور اسی طرح آپ کے ہاتھ پاؤں حضور ﷺ کے حکم پر چل رہے ہیں۔ تو یہ سارا بدن ایمان کی تصدیق کر رہا ہے۔ اس لیے افضل ذکر "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ))

"اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس وقت تک جہاد کروں جب تک لوگ اللہ کی توحید کو نہ مان لیں۔"

حضور نے فرمایا: جن لوگوں نے کلمہ پڑھ لیا تو ان کا خون بھی محفوظ، عزت بھی محفوظ اور مال بھی محفوظ۔ اب ان کے ساتھ کسی قسم کا قتال نہیں کریں گے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۳۹۲، باب: فضل استقبال القبلۃ]

کلمہ طیبہ کے فضائل:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: سب سے افضل کلمہ جو میں نے اور مجھ سے پہلے انبیاء نے کہا وہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ" ہے۔

اور اسی طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے۔ فرمایا:

((أَفْضَلُ الذِّكْرِ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" وَأَفْضَلُ الدُّعَاءِ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ"))

"سب سے افضل ذکر "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" ہے اور سب سے افضل دعا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" ہے۔"

[سنن الترمذی، حدیث: ۳۳۸۳، باب: ما جاء أن دعوة المسلم...]

اس لیے علماء نے فرمایا: کلمہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" افضل ہے۔ پہلے مومن بنے گا تو دعا کرے گا۔ اور علماء، اولیاء اور صوفیاء اس کلمہ پر زور دیتے ہیں۔ اس کو پورے غور و فکر کے ساتھ پڑھے اور اس انداز سے پڑھے کہ اس کے بدن پر بھی اثر ظاہر ہو اور یہ معلوم ہو کہ جو بھی سانس لیتا ہے اس کے اثر سے نکل رہا ہے۔ اصل دین کلمہ ہے، باقی اس دین تک پہنچنے کے ذرائع ہیں۔

علماء فرماتے ہیں کہ کلمہ کے اندر "لَا اِلٰہَ" سے تمام معبودانِ باطلہ کی نفی کرے اور "اِلَّا اللّٰہُ" سے اللہ کی معبودیت کا اثبات کرے اور یقین کرے کہ یہی چیز میرے اندر اتر گئی ہے۔ اصل دل ہے۔ جب وہ ٹھیک ہو گیا تو سارا بدن ٹھیک ہو جائے گا اور جب وہ بگڑ گیا تو سارا بدن خود بخود بگڑ جائے گا۔

اور یہ کلمہ شیطان کو بھگانے کا سب سے بڑا علاج ہے۔ اس لیے کوشش کریں کہ اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے ہوئے، گھر جاتے ہوئے، گھر سے واپس آتے ہوئے اور کاروبار میں، ہر مقام پر ان اوراد کو اپنا حرزِ جان بنالیں۔ قاعدہ ضابطہ ہے کہ جب ایک چیز آپ کی زبان پر چڑھ گئی تو موت کے وقت آپ کی زبان پر وہی چیز آئے گی۔ اللہ معاف کرے بعض لوگوں کو گالی کی عادت ہوتی ہے تو کبھی کبھی وہ اپنے بزرگوں کو بھی گالی دے دیتے ہیں، حالانکہ ان کا گالی کا ارادہ نہیں ہوتا ہے، لیکن چونکہ زبان پر عادت بن چکی ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی کی زبان پر "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"، "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"، "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" یا "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" چڑھ جائے تو موت کے وقت بھی زبان پر یہی کلمہ جاری ہوگا۔ سمجھ لیں کہ جنت کا راستہ آسان ہو گیا، کیونکہ پہلی منزل قبر ہے۔ اگر اس پر پاؤں جم گئے تو...... ان شاء اللہ...... آگے بھی ہم چڑھ جائیں گے۔ اگر پہلی سیڑھی پر ہی پاؤں پھسل گئے تو بات ختم ہو گئی۔ اس لیے ان کلمات کو وردِ جان اور حرزِ جان بنالیں۔

﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

رب کا معنی:

رب کا معنی ہے سب کا مالک اور ساری مخلوق میں تصرف کرنے والا۔ رب کا معنی سید بھی ہے، بمعنی سردار۔ ہم عجم میں مشہور ہے کہ سید قوم ہے، حالانکہ سید قوم نہیں ہے۔ عربی میں اس کا معنی ہوتا ہے سردار۔ عربی کے اندر کسی مصنف کا نام لکھیں تو اس پر "اَلسَّيِّدُ فُلَانٌ" لکھا ہوا ہوتا ہے کہ فلاں محترم، مکرم۔

جیسے حضور ﷺ نے فرمایا:

((سَيِّدُ الشُّهَدَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَمْزَةُ بْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ)) [المعجم الاوسط، حدیث: ۴۰۷۹]

"حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ قیامت کے دن شہیدوں کے سردار ہوں گے۔"

اسی طرح فرمایا:

((اَلْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ سَيِّدَا شَبَابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ))

''حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما جنتی نوجوانوں کے سردار ہوں گے۔''

[ترمذی، حدیث:۳۷۶۸، باب: مناقب أبي محمد الحسن بن علي...]

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

((أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ، وَأَبُوكِ سَيِّدُ كُهُولِ الْعَرَبِ، وَعَلِيٌّ سَيِّدُ شَبَابِ الْعَرَبِ))

[فضائل الصحابہ، لاحمد بن حنبل رحمہ اللہ، حدیث:۵۹۹]

''میں اولادِ آدم کا سردار ہوں اور مجھے اس پر کوئی فخر نہیں ہے، اور (اے عائشہ!) تیرا باپ عرب کے ادھیڑ عمر لوگوں کا سردار ہے اور علی عرب کے نوجوانوں کا سردار ہے۔''

اور اسی طرح فرمایا:

((هٰذَا سَيِّدُ كُهُولِ أَهْلِ الْجَنَّةِ مِنَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ، إِلَّا النَّبِيِّينَ وَالْمُرْسَلِينَ))

''یہ (ابوبکر رضی اللہ عنہ) انبیاء اور مرسلین علیہم السلام کے علاوہ جنت کے ادھیڑ عمر لوگوں کا سردار ہے۔''

[السنۃ لابن ابی عاصم، حدیث:۱۴۲۰]

اصل اور بڑا قبیلہ قریش ہے۔ قریش کے آگے کئی شاخیں ہیں۔ بنی ہاشم میں جو پیدا ہوئے وہ افضل ہوئے۔ اس لحاظ سے حضور ﷺ قریشی بھی ہیں اور ہاشمی بھی ہیں۔ اور حضور ﷺ نے اپنے بارے میں فرمایا:

((أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) [صحیح مسلم، حدیث:۲۲۷۸]

''قیامت کے دن میں تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں گا۔''

تمام مخلوق کے سردار حضور ﷺ ہیں۔ سید الانبیاء والمرسلین، تمام نبیوں اور رسولوں کے سردار ہیں۔ سید الاولین والآخرین تمام پہلے والے انسان اور قیامت تک آنے والوں کے سردار حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

قائدِ اعظم اور خاتونِ اوّل کون؟

ہمارے ہاں غلط رواج ہے۔ جیسے ہم ہر کسی کو قائد، بلکہ قائدِ اعظم کہہ دیتے ہیں۔ اگر کوئی یہ بات سمجھائے تو کہتے ہیں: یہ اس پارٹی کا مخالف ہے۔ حالانکہ وہ اس پارٹی کا مخالف یا اس کی خدمات سے انکار نہیں کر رہا ہوتا۔ قائد

اعظم کا لقب صرف حضور ﷺ کے لیے ہے۔ اسی طرح خاتونِ اوّل سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ انگریزوں نے ہمارے ساتھ ہر قسم کی جنگ لڑی ہے: فکری جنگ، سیاسی جنگ، اقتصادی جنگ، معاشی جنگ اور حربی جنگ، غرض یہ کہ ہر طرح نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ انگریزوں کا جو بادشاہ یا صدر ہوتا تھا اس کی بیوی کو فرسٹ لیڈی کہتے تھے۔ اس سے ہم نے خاتونِ اوّل کا ترجمہ لیا۔ اسلام میں خاتونِ اوّل صرف سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ہیں۔ ہم بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی خاتونِ اوّل نہیں کہتے۔ یہ کسی کی توہین نہیں ہے، بلکہ اسلامی اعزاز ہیں۔ ان کو استعمال کرنے میں ہم احتیاط کریں۔ جیسے ہمارے ہاں کوئی فاسق، شرابی یا زانی ہے، اس کو سید کہہ دیتے ہیں۔ اس لفظ کو اتنا عام کر دیا کہ اس کی عظمت کم کر ڈالی ہے۔ حالانکہ سید کا اطلاق حضور ﷺ پر اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ و حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم پر اور ان لوگوں پر ہوتا تھا جو دین کے سردار تھے۔ انسان عمل سے سید بنتا ہے، ورنہ تو حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا بھی سید ہوا اور اللہ فرماتے ہیں: وہ جہنمی ہے۔ اور ابولہب حضور ﷺ کا چچا ہے، رشتہ داری ہے، اس کو بھی سید کہنا پڑے گا۔

حضرت مولانا عبدالستار تونسوی رحمہ اللہ بیان میں فرماتے ہیں کہ شکر کرو ابولہب مر گیا۔ اگر وہ زندہ ہوتا اور ہمارے علاقے میں آ جاتا تو اس کو بھی ہدیہ اور نذر دیتے کہ حضور ﷺ کا رشتہ دار ہے...... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ......

بعض مخصوص القاب:

وہ لقب جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ لگائے جائیں ان کو غیر کے ساتھ نہیں لگانا چاہیے۔ جیسے ''عَلَیْہِ السَّلَامُ'' انبیاء علیہم السلام کے لیے ہے، ''رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ'' صحابہ کے لیے ہے اور ''رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْھِمْ'' اولیاء اللہ کے لیے ہے۔ اب اگر ہم کسی اللہ کے ولی کو ''رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ'' کہہ دیں تو جائز ہے، لیکن چونکہ یہ لقب صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے مشہور ہے تو آنے والی نسلوں کو دھوکہ لگ سکتا ہے کہ شاید یہ بھی صحابی ہیں، اگر کسی کو علیہ السلام کہیں تو منع تو نہیں ہے، ایک دوسرے کو بھی روزانہ ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ'' کہتے ہی رہتے ہیں۔ یا کہتے ہیں کہ فلاں آدمی نے آپ کو سلام دیے ہیں تو ''وَعَلَیْہِ السَّلَامُ'' کہتے دیتے ہیں۔ تو ٹھیک بات ہے، لیکن ''عَلَیْہِ السَّلَامُ'' اللہ کے نبیوں کے نام کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ اگر ہم اس کو کسی اور نام کے ساتھ لکھیں گے تو آنے والی نسل سمجھے گی کہ شاید یہ بھی کوئی نبی گزرے ہیں، حالانکہ وہ اللہ کے نبی نہیں ہوں گے۔

اسی طرح ''قَائِدُ الْغُرِّ الْمُحَجَّلِیْنَ، عَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ، رَحْمَۃٌ لِّلْعَالَمِیْنَ'' حضور ﷺ کا لقب ہے۔ اب کوئی

آدمی حضور ﷺ کے نام کے علاوہ کسی اور کے نام کے ساتھ لکھے تو حضور ﷺ کی توہین ہے۔

ناجائز القاب:

ہمارے ہاں بزرگوں کے مزار پر جو چادر ڈالتے ہیں اس پر لکھا ہوا ہوتا ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ﴾

جب ہم نے اس اللہ کے ولی کو وہ خطاب دیا جو حضور ﷺ کے لیے خاص ہے تو ہم اس بزرگ کی تعریف کر رہے ہیں یا اللہ کے نبی ﷺ کی توہین کر رہے ہیں؟ اس کو ٹھنڈے دل سے سوچیں، اختلافات اور جھگڑوں میں نہ پڑیں۔ جب حج اور عمرہ کے لیے آتے ہیں، اس وقت ان کے ذہنوں میں ڈال دیتے ہیں کہ خیال کرنا وہاں وہابی ہیں، ان کے پیچھے نماز نہ پڑھنا، کیونکہ وہ گستاخ ہیں، حضور ﷺ کو نہیں مانتے، نبی ﷺ کو نہیں مانتے۔ حالانکہ اس غریب کو یہ بھی پتا نہیں ہوتا کہ وہابی کیا ہے؟ مدینہ کے حرم کو تعمیر کر رہے ہیں اور جو چیز اس کے لیے بنا رہے ہیں وہ صرف وہاں لگے اور کہیں نہیں لگے گی۔ کیا ان کو حضور ﷺ سے محبت نہیں ہے؟ اس کا کوئی علاج نہیں، صرف اللہ ہی ہدایت عطا فرمائے۔

ہمارے وطن والے ایسے ہیں کہ اگر ایک بزرگ کا عرس کریں تو چندہ لیتے ہیں۔ یہ تو عاشق ہیں اور ایک وہ ہیں جو اپنا سب کچھ مدنی پاک ﷺ کے دربار پر لٹا رہے ہیں، وہ وہابی ہیں۔

کیا لفظ ''رَبّ'' اسمِ اعظم ہے؟

بعض علماء نے لکھا ہے کہ لفظ ''رَبّ'' اسمِ اعظم ہے۔ اسمِ اعظم اس کو نصیب ہوتا ہے جس سے اللہ راضی ہوتا ہے، جس کا اکل حلال اور صدقِ مقال ہو، لباس پاک ہو، زندگی میں حرام اندر نہ جائے اور زندگی میں غیر شرعی قدم نہ اٹھائے۔

﴿الْعَالَمِينَ﴾

کتنے ہزار جہان ہیں؟

﴿الْعَالَمِينَ﴾ جمع ہے، اس کی مفرد ''عَالَمٌ'' ہے۔ اللہ کے سوا جو کچھ ہے سب ''عَالَمٌ'' ہے۔ لفظ ''عَالَمٌ'' ایسا ہے

کہ اس کا مفرد نہیں ہے۔ ''عوالم'' کہا جائے تو اس کا معنی ہوتا ہے کہ اللہ نے مخلوقات کی جتنی قسمیں بنائی ہیں جو خشکی پر ہیں اور سمندروں میں ہیں، اسی طرح صدی کے اندر جو ایک نسل گزر جاتی ہے اس پر بھی عالم کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور بعض علماء نے لکھا ہے کہ مشرق سے مغرب تک عالم ہے۔ اسی طرح چالیس ہزار اور عالم ہیں۔ ہم نے ان کو دیکھا نہیں ہے، ہم نے تو ایک عالم کو بھی نہیں دیکھا۔ بلکہ بعض علماء نے فرمایا: اسی ہزار دوسرے عالم ہیں۔ جدید علوم والے کہہ رہے ہیں کہ زمین اور آسمان کے درمیان خلا ہے۔ خدا جانے اس کے اندر کتنے عالم ہیں؟ سیارات اور بروج ہیں، ان کے اندر کتنے عالم ہیں؟ اور ان کے اندر رہنے والی مخلوق کے لیے کیا تقاضے ہیں؟ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ جتنا ہمارا علم بڑھے گا اتنا ہمارا اللہ سے تعلق بڑھتا جائے گا۔

کتے کے جھوٹے برتن کے جراثیم میں شریعت کی خصوصیات:

حضور ﷺ نے فرمایا: کتا برتن میں منہ ڈالے تو اس کو سات مرتبہ دھوئیں اور ایک مرتبہ مٹی سے دھوئیں۔ جدید تحقیق نے بھی اعتراف کر لیا ہے کہ کتے کے منہ کے جراثیم مٹی سے مرتے ہیں، آگ میں بھی جلاؤ تو نہیں مرتے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کوئی آدمی اپنی بیوی سے غیر فطری فعل نہ کرے، کوئی عورت کسی جانور سے ایسا فعل نہ کرے، کوئی مرد کسی جانور سے ایسا فعل نہ کرے۔ آج ایڈز کے نتائج سامنے ہیں کہ افریقہ کے کالے لوگوں سے زیادتیاں کی گئیں اور وہ بیماریاں پھیلیں تو پوری دنیا پر ایڈز پھیل گیا، کیونکہ وہ جنگلی تھے، ان کو پتا نہیں تھا کہ کیا عورتیں ہیں اور کیا مرد ہیں اور کیا جانور ہیں۔ اب یہ وبائیں پھیلتی پھیلتی اس مقام تک پہنچ گئی ہیں کہ جو بڑے بڑے ایڈوانس ملک ہیں ان میں آدمی اپنی بیوی سے ملتے ہوئے بھی ڈرتا ہے کہ اگر اس کو بیماری لگی ہوئی ہوگی تو میں کیا کروں گا؟ اگر حضور ﷺ کے حکم پر عمل کرتے کہ مائیں اپنے بچوں کو خود دودھ پلائیں۔ جدید تحقیق یہی ہے کہ جو مائیں اپنے بچوں کو دودھ نہیں پلاتیں ان کو سینے کا کینسر ہو جاتا ہے۔

دین اسلام کی سائنس کی رو سے تصدیق:

حضور ﷺ نے فرمایا کہ رات کو خالی معدہ نہ سوئیں، کچھ نہ کچھ کھا کر سوئیں، کھانے کے بعد کوئی میٹھی چیز کھالیں، تا کہ کھانے کی اشتہا پیدا ہو اور معدہ اپنی حرکت شروع کر دے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: دن کو دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑا سا لیٹ جائیں۔ آج دنیا نئی نئی تحقیق کرتی جائے گی اور ہمارا ایمان بڑھتا جائے گا۔ ہم کہیں گے:

"صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ" حضور ﷺ نے سچ فرمایا تھا۔

سنن ابی داؤد شریف میں ایک حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: میری امت پر ایک وقت آ رہا ہے کہ پہلے پانی پر جھگڑا ہوگا، پھر اسلام اور صلیب کی لڑائی ہوگی اور ایسی لڑائی ہوگی کہ باقی لڑائیوں کو دنیا بھول جائے گی۔

[سنن أبی داود، حدیث: ۴۲۹۲، باب: ما یذکر من ملاحم الروم]

ہمارا ایمان اور یقین ہے کہ ان شاء اللہ فتح اسلام کی ہوگی۔ اور بالکل یہی حالات بن رہے ہیں کہ ایک طرف اسلام ہے اور ایک طرف صلیب ہے۔ باقی جو چھوٹے چھوٹے فرقے تھے وہ ختم ہو گئے ہیں۔ کیمونسٹ اور سوشلسٹ ختم ہو گئے ہیں۔ پوری دنیا پر نظر ڈالیں صرف عیسائیت اور اسلام ہے۔

اسلام کی طاقت:

علامہ اقبال رحمہ اللہ نے کہا تھا:

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

بس اسلام کی طرف ہمارے ایک قدم پلٹنے کی دیر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جب میرا بندہ میری طرف ایک قدم آتا ہے تو میں دس قدم آتا ہوں۔ بس تم میری طرف آؤ تو سہی! اگر مسلمان سرکس کے شیر بن جائیں تو ان کا اپنا قصور ہے۔ جس دن اس کو یاد آ جائے کہ میں جنگل کا شیر ہوں تو سارے سرکس والے بھاگ جائیں گے۔ مسلمان بھی بھولا ہوا ہے کہ میں کیا ہوں؟ جس دن اس کو یاد آ گیا کہ میری للکار سے دریائے دجلہ کانپ جاتا تھا، سمندر ٹھہر جاتے تھے، ان پر صحابہ اپنے گھوڑے دوڑاتے تھے۔ جس دن اسلام یاد آ گیا اسی دن اسلام کی عظمت لوٹ آئے گی۔

حضور ﷺ کی بعثت کے مخاطب:

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ روایت ہے کہ عالمین سے مراد انسان اور جن ہیں۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے قرآن کی اس آیت ﴿لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا﴾ [الفرقان: ۱] (تاکہ وہ دنیا جہان کے لوگوں کو خبردار کردے) سے اس بات کا استدلال کیا ہے کہ آپ انسانوں اور جنوں کے نبی ہیں۔ یعنی انسانوں کا بھی ایک عالم ہے اور جنوں کا بھی ایک عالم ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں: عالم اس مخلوق کو کہتے ہیں جو عقل والی ہے۔ انسان، جن، فرشتے اور شیطان عقل والے

ہیں، یہ عالم ہے۔ جانوروں کو عالم نہیں کہیں گے، کیونکہ ان کے پاس شعور تو ہوتا ہے، لیکن عقل نہیں ہوتی۔ اس لیے ان کے پاس کوئی نبی نہیں بھیجا جاتا۔ ایک قول یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کے اندر روح حرکت کرتی ہے یہ بھی عالم ہے۔ اور بعض نے فرمایا: ہر صنف کی نوع ایک عالم ہے۔ حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے مروان بن حکم کے حوالے سے لکھا ہے کہ اللہ نے ۱۷۰۰۰ (سترہ ہزار) عالم پیدا فرمائے۔ آسمان والے اور زمین والے ایک عالم ہیں اور باقی جتنے عالم ہیں ان کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ راجح قول یہ ہے کہ عالمین سے مراد عالم الجن اور عالم الانسان ہے، کیونکہ اللہ نے حضور ﷺ کو عالمین کی طرف نبی بنا کر بھیجا ہے۔ اور قرآن میں بھی ہے:

﴿يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ﴾ [الانعام: ۱۳۰]

اگر اس کے علاوہ بھی کوئی عالم ہو تو اس کو اللہ جانتا ہے۔ واللہ اعلم۔

انسان اور جنات ایمان لانے کے مکلف ہیں:

ملائکہ عالم کے اندر داخل نہیں ہیں، کیونکہ وہ ایمان کے مکلف ہی نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے، ان کے اندر نافرمانی اور شہوت کا مادہ ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝﴾ [التحریم: ۶]

"جو اللہ کے کسی حکم میں اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔"

بعض فرشتوں کے ذمہ ہے کہ وہ یہ تسبیح ادا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فرشتوں نے کہا:

﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ [البقرۃ: ۳۰]

"حالانکہ ہم آپ کی تسبیح اور حمد و تقدیس میں لگے ہوئے ہیں۔"

اور بعض فرشتوں کی ڈیوٹی آسمانوں اور زمینوں میں پھرنا ہے۔ اللہ کے احکامات کی تنفیذ کرنے والے، بعض ہواؤں پر اور بعض بادلوں پر موکل ہیں، بعض دریاؤں پر اور ارحام الامہات پر موکل ہیں۔ کراما کاتبین ہیں، حاملین عرش ہیں، جہنم کے فرشتے ہیں اور رحمت کے فرشتے ہیں۔ وہ صرف اور صرف حکم کے بندے ہیں۔

مشہور عالم الجن والانس ہیں۔ انہی کے پاس اللہ نے اپنے پیغمبر اور نبی بھیجے اور انہیں کو اللہ نے اپنی عبادت کا مکلف بنایا، انہیں کے اندر اللہ نے خیر اور شر کی صفات رکھیں۔ پھر ان کو خیر اور شر کے سمجھنے کی توفیق بھی عطا فرمادی

اور پھر ان کو اختیار بھی دیا کہ چاہیں تو خیر اختیار کریں اور اگر چاہیں تو شر اختیار کریں۔ اسی کے مطابق جزا اور سزا کا فیصلہ ہوگا۔

مفسرین نے فرمایا کہ ﴿لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا﴾ [الفرقان:١] سے مراد بھی انسان اور جن ہیں۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اللہ نے گورے اور کالے کی طرف مبعوث فرمایا ہے، اللہ نے مجھے انسانوں اور جنوں کے لیے نبی بنایا ہے۔ آپ کے بعد نہ نبوت ہے، نہ رسالت ہے اور نہ شریعت ہے۔ سورت رحمٰن کے اندر بھی اسی کی تائید ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ﴾ [الرحمٰن:٣٣]

''اے انسانوں اور جنات کے گروہ! اگر تم میں یہ بل بوتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی حدود سے پار نکل سکو تو پار نکل جاؤ، تم زبردست طاقت کے بغیر پار نہیں ہو سکو گے۔''

یہاں بھی اللہ نے جن اور انسان دونوں کو خطاب فرمایا ہے۔ اس لیے راجح قول یہ ہے کہ عالمین سے مراد عالم الجن والانس ہیں۔

کتنے ہزار عالم ہیں؟

علامہ رازی رحمہ اللہ نے ابو العالیہ سے ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کی تفسیر میں یہ قول نقل فرمایا ہے کہ ''اَلْاِنْسُ عَالَمٌ وَالْجِنُّ عَالَمٌ'' (انسان ایک عالم ہے اور جن ایک عالم ہے) اور اس کے سوا ١٨٠٠٠ (اٹھارہ ہزار) عالم ہیں یا ١٤٠٠٠ (چودہ ہزار) عالم ہیں۔ اور جو ملائکہ زمین پر ہیں وہ ایک عالم ہیں۔ اور زمین کے ہر کونے میں ٣٥٠٠ (تین ہزار پانچ سو) عالم ہیں۔ ان سب کو اللہ نے اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ اللہ کے ہاں کئی عالم ہو سکتے ہیں، لیکن اس بات کی صحت تک پہنچنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہم اس کو صحیح کہہ سکیں۔

﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے ایک ہزار امت مراد ہے۔ اور چھ سو امت دریاؤں کے اندر ہے اور چار سو خشکی کے اندر ہے۔ اسی طرح حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے بھی نقل کیا گیا ہے۔ اور ایک مرفوع روایت میں بھی ہے۔

حافظ ابو یعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جراد (ٹڈی) نظر نہ آئی تو آپ پریشان ہو گئے۔ ایک آدمی کو یمن، دوسرے کو شام اور تیسرے کو عراق کی طرف بھیجا کہ جا کر دیکھو کہ وہاں جراد ہے یا ختم ہو گئی ہے؟ جو آدمی یمن کی طرف گیا تھا وہ واپسی پر مٹھی بھر ٹڈیاں بھی پکڑ کر لے آیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ڈال دیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ اکبر!۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ کیوں گھبرا گئے تھے؟ انہوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے ایک ہزار امت پیدا کی ہے، جن میں سے چھ سو بحر (پانی) میں اور چار سو خشکی میں ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے پہلے جو امت ہلاک ہوگی وہ ٹڈی ہے۔ اس ٹڈی کا ختم ہونا قیامت کے قریب آنے کی دلیل ہے۔ جب یہ علامت پوری ہو جائے گی تو باقی علامات اس طرح پوری ہوں گی جس طرح کسی ہار کا دھاگہ ٹوٹ جائے تو موتی ایک دوسرے کے پیچھے گرتے ہیں۔ اس لیے میں گھبرا گیا تھا کہ ٹڈی نظر نہیں آ رہی۔ [شعب الایمان، حدیث: ۹۶۵۹]

اس روایت کے اندر بھی ایک راوی ضعیف ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: جس طرح انسان ایک امت اور جن ایک امت ہیں، اسی طرح جانور بھی ایک ایک امت ہیں، اللہ کی مخلوق ہیں۔ اور ایسی ایسی مخلوقات ہیں جن کا آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا اور نہ شمار کر سکتا ہے۔ اللہ کے سوا اللہ کی مخلوق کو اور کون جان سکتا ہے؟

حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک قول نقل کیا گیا ہے کہ اللہ نے ایک ہزار عالم پیدا فرمائے ہیں: چھ سو دریا کے اندر ہیں اور چار سو خشکی کے اندر ہیں۔ حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے اٹھارہ ہزار عالم پیدا فرمائے ہیں دنیا تو صرف ایک عالم ہے باقی تو اللہ ہی جانتے ہیں۔ حضرت کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے جتنے عالم پیدا فرمائے ہیں ان کا حقیقی عدد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

ابھی تک جدید علم بھی چاند تک پہنچا ہے جو زمین سے قریب ترین ہے، ورنہ اس کے علاوہ مریخ، مشتری، عطارد اور زحل بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاۤءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ ۝﴾ [الصّٰفّٰت: ۶]

"بے شک ہم نے نزدیک والے آسمان کو ستاروں کی شکل میں ایک سجاوٹ عطا کی ہے۔"

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ﴾ [الحجر:۱۶]

"اور ہم نے آسمان میں بہت سے برج بنائے ہیں اور اس کو دیکھنے والوں کے لیے سجاوٹ عطا کی ہے۔"

ان جمیع عوالم کا اللہ کو ہی علم ہو سکتا ہے۔ ان کواکب اور سیارات پر کتنے عالم ہیں؟ اللہ ہی جانتا ہے۔ چاند کا طول وعرض ہماری زمین سے بھی بڑا ہے۔ اسی طرح دوسرے سیارات چاند سے بھی کئی ہزار گنا بڑے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۳، ۲۴، الفاتحۃ: الآیۃ: ۱]

اللہ کی کرسی کی وسعت:

صحیح احادیث میں ہے کہ اگر ہم ان سات زمینوں اور سات آسمانوں کو پھیلا دیں تو اللہ کی کرسی کے سامنے ان کی حیثیت ایسے ہوگی جیسے جنگل میں ایک حلقہ پڑا ہوا ہو۔

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ﴾ [البقرۃ:۲۵۵]

"اس کی کرسی نے سارے آسمانوں اور زمین کو گھیرا ہوا ہے۔"

اور عرش کے مقابلے میں کرسی ایسی ہے جیسے جنگل میں ایک کڑا پڑا ہوا ہو۔ جب اتنا بڑا عرش اور کرسی ہے تو عوالم کتنے بڑے ہوں گے؟ "لَا يَعْلَمُهُ إِلَّا اللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى" بہر حال اس بارے میں مفسرین کے سارے اقوال ذکر کر دیے گئے ہیں۔

حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے چالیس ہزار عالم پیدا فرمائے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ مشرق سے لے کر مغرب تک ساری مخلوق ایک عالم ہے۔ حضرت زجاج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عالم کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے سوا جتنا کچھ ہے سب عالم ہے۔ یہی قول راجح ہے۔

﴿قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝ قَالَ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ إِنْ كُنْتُمْ مُوقِنِينَ﴾ [الشعراء:۲۳، ۲۴]

"فرعون نے کہا: اور یہ رب العالمین کیا چیز ہے؟ (کون ہیں؟) موسیٰ علیہ السلام نے کہا: وہ سارے آسمانوں اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا پروردگار ہے جو ان کے درمیان پائی جاتی ہیں، اگر تم کو واقعی یقین کرنا ہو۔"
[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۳، ۲۴، الفاتحۃ: الآیۃ: ۱]

عالم اللہ کے وجود کی دلیل ہے:

عالم کو عالم اس لیے کہتے ہیں کہ یہ علامت سے مشتق ہے اور عالم کے اندر ہر چیز اس پر دلالت کر رہی ہے کہ کوئی پیدا کرنے والا موجود ہے، مجھے کوئی بنانے والا ہے۔ اور وہ ایک ہے جو جب چاہتا ہے اور جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔ فرمایا:

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا﴾ [الانبیاء: ۲۲]

''اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے سوا دوسرے خدا ہوتے تو زمین و آسمان میں فساد برپا ہو جاتا۔''

ایک حکایت:

اس لیے ایک مثال مشہور ہے کہ ایک بدو جنگل میں رہتا تھا۔ وہاں سے ایک عالم گزرا۔ اس نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا: میں مسلمان ہوں۔ اس نے کہا: تم خدا کو مانتے ہو؟ اس نے کہا: میں خدا کو مانتا ہوں، وہ وحدہ لاشریک ہے۔ عالم نے کہا: تم نے اپنے خدا کو کیسے پہچانا اور کہاں کہاں تم نے پڑھا ہے؟ بدو نے کہا: توحید کے مسئلے میں کسی کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے؟ دیکھو! یہ اونٹ کا گوبر پڑا ہے، یہ بتلا رہا ہے کہ یہاں سے اونٹ گزرا ہے، اگر گائے کا گوبر پڑا ہے تو وہ بتلا رہا ہے کہ یہاں گائے ہے، پاؤں کے نشانات دیکھو تو وہ بھی بتلا رہے ہیں کہ یہاں سے آدمی گزرا ہے۔ تو کیا یہ ساری مخلوق خدا پر دلالت نہیں کر رہی؟ یہ آسمان اور زمین پیدا کرنے والے کے بغیر بن گئے؟ اللہ پاک نے عقیدۂ توحید ہر ایک کی فطرت میں رکھ دیا ہے، آگے لوگ اس کو مسخ کر دیتے ہیں۔ ایک صاف کاغذ پر صحیح پرنٹ آئے گا۔

ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے:

اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ، أَوْ يُنَصِّرَانِهِ، أَوْ يُمَجِّسَانِهِ))

''ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ماں باپ اگر یہودی ہیں تو اس کو یہودی بنا ڈالتے ہیں یا نصرانی بنا ڈالتے ہیں یا مجوسی بنا ڈالتے ہیں۔''

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۳۸۵، باب: مَا قِيلَ فِي أَوْلَادِ الْمُشْرِكِينَ]

اگر مشرک ہیں تو مشرک بنا ڈالتے ہیں۔ وہ اس فطرت کو بھول جاتا ہے۔ ورنہ ہر بندہ اپنے خدا کو پہچانتا ہے۔ ہر چیز کے اندر ایک نشانی ہے کہ وہ وحدہ لاشریک لہ ہے۔ اسی طرح یہ اس بات پر بھی دلالت کر رہی ہے کہ وہ ایک ہے، کیونکہ اگر دو ہوتے تو ایک کہتا کہ رات ہو اور دوسرا کہتا کہ دن ہو۔ یہ ایک نظام چل رہا ہے۔ وقت پر سورت نکلتا ہے، غروب ہوتا ہے، وقت پر تارے نکلتے اور غائب ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کسی ایک کا نظام چل رہا ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ ایک وحدانیت لے کر آئے تھے کہ ہر آدمی حکمِ الٰہی کے تابع ہوگا۔ بندہ اللہ کے حکم کو نافذ کرنے والا ہے، ٹھکرانے والا نہیں بن سکتا۔ ہم انسانوں کے بنائے ہوئے جو نظام ہیں یہ بہلاوے ہیں۔ ہر سال کے اندر ان میں ردوبدل اور تماشے بنتے رہتے ہیں۔ ایک نظامِ الٰہی ہے جو ازل سے ابد تک چلے گا، جس میں کوئی تغیر اور تبدل نہیں ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ نے ہمیں حلال اور حرام کے بارے میں بتلا دیا ہے۔ قیامت تک حلال حرام نہیں ہوسکتا اور حرام حلال نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ ہم نے آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنایا۔ اس لیے جو انبیاء علیہم السلام آئے، انہوں نے احکامِ ربی کو چلایا ہے، نافذ کر کے دکھایا ہے۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتے۔ فرمایا:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى ۝﴾ [النجم: ۳،۴]

"میرے مدنی ﷺ تو اپنی زبان بھی نہیں ہلاتے جب تک ہم وحی نہیں کرتے۔"

حضور ﷺ سب کے لیے اور آخری نبی ہیں:

بہرحال ﴿الْعَالَمِيْنَ﴾ کے بارے میں معروف بات یہ ہے کہ ﴿الْعَالَمِيْنَ﴾ سے مراد جن اور انس ہیں۔ حضور ﷺ تمام دنیا کے انسانوں کے بھی نبی ہیں اور تمام دنیا کے جنات کے بھی نبی ہیں۔ اور تمام دنیا کی مخلوق امت محمد مصطفیٰ ﷺ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک امت ماننے والی ہے اور ایک امت انکار کرنے والی ہے۔ جیسے ایک باپ کے دو بیٹے ہوں: ایک فرمانبردار اور ایک نافرمان ہے۔ لیکن دونوں اس کے بیٹے ہیں۔ یہ ساری حضور ﷺ کی امت ہے، کیونکہ حضور ﷺ سب کے لیے آخری نبی ہیں، آپ ﷺ کے بعد کسی نبی نے نہیں آنا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک امتِ اجابت ہے اور ایک امتِ دعوت ہے۔

﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے پہلے فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾، اس کے بعد صفات آئیں ﴿رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾، ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾۔ پہلی صفت کے اندر ترہیب ہے اور ان صفات میں ترغیب ہے۔ جیسے قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی ترتیب ہے۔

﴿نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ﴾ [الحجر:۴۹]

''میرے بندوں کو بتادو کہ میں ہی بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہوں۔''

اور آگے فرمایا:

﴿وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ﴾ [الحجر:۵۰]

''اور یہ بھی بتادو کہ میرا عذاب ہی دردناک عذاب ہے۔''

اور ایک جگہ فرمایا:

﴿اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ [الاعراف:۱۶۷]

''بے شک تمہارا رب جلد ہی سزا دینے والا بھی ہے اور یقیناً وہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان بھی ہے۔''

اس آیت میں ترہیب بھی ہے اور ترغیب بھی ہے۔

صحیح مسلم میں حدیث پاک ہے:

((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَوْ يَعْلَمُ الْمُؤْمِنُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الْعُقُوْبَةِ، مَا طَمِعَ بِجَنَّتِهِ أَحَدٌ، وَلَوْ يَعْلَمُ الْكَافِرُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الرَّحْمَةِ، مَا قَنَطَ مِنْ جَنَّتِهِ أَحَدٌ)) [صحیح مسلم، حدیث:۲۷۵۵، باب: فِي سِعَةِ رَحْمَةِ اللّٰهِ تَعَالَى...]

''حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر مومن کو پتا ہو کہ اللہ کے ہاں کتنا عذاب ہے، کتنی عقوبت ہے تو ڈر کے مارے جنت کی امید بھی نہ کر سکے اور اگر کافر کو پتا چل جائے کہ اللہ کی کتنی رحمتیں ہیں تو وہ کبھی جنت سے مایوس نہ ہو۔''

اس حدیث کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی رحمت بھی اتنی بڑی ہے اور اس کی سزا بھی اتنی بڑی ہے۔ اس لیے مومن کو چاہیے کہ وہ ''بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ'' رہے۔

حجاج بن یوسف کی اللہ سے امید:

تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ حجاج بن یوسف کی موت کے وقت جو لوگ موجود تھے ان سے ایک بزرگ نے پوچھا کہ جب حجاج مرنے لگا تو اس کا حال کیا تھا؟ ایک آدمی نے کہا کہ میں اس وقت موجود تھا اور اس کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

"يَا رَبِّ! أَنْتَ أَنْتَ وَأَنَا أَنَا، أَنْتَ الْعَوَّادُ إِلَى الْمَغْفِرَةِ وَأَنَا الْعَوَّادُ إِلَى الذُّنُوبِ"

"میرا اللہ! تو تو ہے اور میں میں ہوں۔ تو بار بار مغفرت کی طرف لوٹنے والا ہے اور میں بار بار گناہوں کی طرف جانے والا ہوں۔"

اب تیری شان ہے کہ معاف فرمادے۔ میں تو مرگیا، لیکن تیری رحمت تو باقی ہے۔ بزرگ حیران ہوئے اور فرمایا: شاید اللہ معاف ہی کردے۔ اس کو اللہ سے اتنی امید ہے۔

اللہ سے ڈرنے اور امید رکھنے کی مقدار:

امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا جملہ ارشاد فرمایا جس کے اندر ایمان کی صحیح کیفیت کا بیان آگیا ہے۔ فرمایا: اگر قیامت کے دن اعلان ہوجائے کہ تمام آدمی جنت میں جائیں گے اور صرف ایک آدمی جہنم میں جائے گا، میں ڈرتا ہوں کہ وہ ایک آدمی میں نہ ہوں۔ اور اگر اعلان ہوجائے کہ سارے جہنم میں جائیں گے اور صرف ایک آدمی جنت میں جائے گا، میں امید کرتا ہوں کہ وہ ایک آدمی میں ہوں گا۔ یعنی اللہ کی رحمت پر امید ہو تو ایسی ہو اور اللہ کے عذاب سے ڈر ہو تو ایسا ہو۔ [کنز العمال، حدیث:۳۵۹۱۵، خَوْفُهُ (عمر) رضی اللہ عنہ]

تقویٰ کی حیثیت:

کسی نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اللہ فرماتے ہیں کہ تقویٰ اختیار کرو۔ تقویٰ کیا ہے؟ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہارا کبھی ایسے جنگل سے گزرنے کا اتفاق ہوا ہے کہ جس میں چھوٹا سا راستہ ہو اور اس پر کانٹے ہوں اور وہ ہو بھی ٹیڑھا تو اس پر آپ کیسے چلتے ہو؟ اس نے کہا: حضرت! میں نظر نیچی کرلوں گا، کپڑے اونچے کرلوں گا اور اپنا وزن برقرار رکھوں گا کہ کہیں ادھر ادھر نہ گر جاؤں۔ فرمایا: یہی تقویٰ ہے کہ گناہوں سے، حرام سے بچتے ہوئے سیدھے نکل جاؤ، اسی کا نام تقویٰ ہے۔ ادھر لذتیں بلائیں گی، ادھر خواہشات بلائیں گی، ادھر حرام بلا رہا ہے اور دنیا کی

زینتیں بلا رہی ہیں اور ادھر قبر، حشر اور آخرت ہے اور تم بچ بچ کر چل رہے ہو تو یہ تقویٰ ہے۔

[التذكرة في الوعظ للقرشي، ص ۱۲۷]

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾

آخرت پر ایمان کی ضرورت:

اس کے اندر آخرت کا بیان ہے۔ جس کا آخرت پر ایمان نہیں اس کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر بھی ایمان نہیں ہے، کیونکہ آخرت کی خبر ہمیں حضور ﷺ نے دی ہے۔ اور آخرت پر ایمان نہیں ہوگا تو اللہ کے عدل پر ایمان نہیں ہوگا کہ اللہ نے ایسی دنیا پیدا فرمادی ہے کہ کافر مزے کر رہے ہیں اور مومن پریشان ہیں۔

علماء نے فرمایا ہے کہ اللہ نے اپنے قرآن میں جو قانون بیان فرمائے ہیں ان پر چلنے کے لیے کسی پولیس کی ضرورت نہیں ہے، کسی سیکورٹی فورسز کی ضرورت نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ آخرت پر ایمان آجائے۔ جس کا آخرت پر ایمان نہ ہو اس پر لاکھ پہرے لگا دو وہ گناہ کرے گا۔

نیکی کی توفیق اور محرومی کون دیتا ہے؟

ایک آدمی اے سی کمرے کے اندر سو رہا ہے اور اس کے نیچے چادریں بچھی پڑی ہیں، وہ ٹھیک چار بجے اٹھ جاتا ہے، وضو کرتا ہے اور مصلے پر کھڑا ہو کر رو رہا ہے۔ اس کو کس نے اٹھایا ہے؟ اس کو آخرت کی فکر لگی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں ایک آدمی حرم کے دروازے پر کھڑے ہو کر کپڑے بیچ رہا ہے یا ٹوپی بیچ رہا ہے، کوئی عطر بیچ رہا ہے۔ جیسے ہی اذان ہوتی ہے وہ چھپ جاتا ہے۔ اس کو کس نے بھگایا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ جس کا آخرت پر ایمان پورا ہو جائے وہ گناہ کرتا ہی نہیں ہے۔

آدمی گناہ سے کب بچتا ہے؟

حضرت یوسف علیہ السلام پر کتنے ڈورے ڈالے گئے؟ زلیخا نے انتہا کر دی تھی۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام ایک غلام ہیں، نوکر ہیں، اس کی کتنی طاقت ہوتی ہے؟ حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان سے ایک ہی لفظ نکلا: معاذ اللہ! میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ تم جو کہہ رہی ہو میرا اللہ دیکھ رہا ہے۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ایک چوکیدار سے جتنا ڈرتے ہیں اتنا

اللہ سے نہیں ڈرتے۔ زبان سے کہہ دیتے ہیں کہ اللہ کو سب پتا ہے، اللہ غفور رحیم ہے۔ اللہ تو غفور رحیم ہے، لیکن تم نے شیطان رجیم ضروری بننا ہے؟ اس کا تو حکم ہے کہ ایمان والے بنو میرے مدنی ﷺ کے نمونہ پر چلو۔ اس لیے یاد رکھنے کی بات ہے کہ جتنا آخرت پر یقین کامل ہوتا چلا جائے گا اتنا ایمان کامل ہوتا چلا جائے گا۔

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کی قرأت:

حضرت مطرف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضور ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کا بیٹا یزید بن معاویہ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ پڑھتے تھے۔ سب سے پہلے مروان نے آکر ﴿مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ پڑھا۔ مروان نے غلطی کی ہے، لیکن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ صحیح ہے، کیونکہ یہ بھی ایک قرأت ہے اور مروان کو یہ پتا تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۴، الفاتحۃ: الآیۃ: ۳]

آخرت میں سب حکومت اللہ کی ہے:

﴿مَلِكِ﴾ ملک سے ہے کہ یہ ساری مخلوق اللہ کی ملک میں ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ﴾ [مریم: ۴۰]

”یقین جانو کہ زمین اور اس پر سارے رہنے والوں کے وارث ہم ہی ہوں گے اور ہماری طرف ہی ان سب کو لوٹایا جائے گا۔“

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ النَّاسِ ۝﴾ [الناس: ۱، ۲، ۳]

”کہو: میں پناہ مانگتا ہوں سب لوگوں کے پروردگار کی، سب لوگوں کے بادشاہ کی اور سب لوگوں کے معبود کی۔“

”مَالِكِ“ ”مَلِكِ“ سے بھی ہے اور ”مُلْك“ سے بھی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ [غافر: ۱۶]

”کس کی بادشاہی ہے آج؟ (جواب ایک ہی ہوگا:) صرف اللہ کی جو واحد و قہار ہے۔“

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُۨ﴾ [الملک: ۱]

”بڑی شان ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں ساری بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔“

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ ۡ﴾ [آل عمران: ۲۶]

''کہو کہ اے اللہ اے اقتدار کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے اقتدار بخشتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اقتدار چھین لیتا ہے۔''

﴿قَوْلُهُ الْحَقُّ ۚ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ۚ﴾ [الانعام: ۷۳]

''اس کا قول برحق ہے۔ اور جس دن صورت پھونکا جائے گا اس دن بادشاہی اسی کی ہوگی۔''

﴿اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۚ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا﴾ [الفرقان: ۲۶]

''اس دن صحیح معنی میں بادشاہی خدائے رحمٰن کی ہوگی۔ اور وہ دن کافروں پر بہت سخت ہوگا۔''

قیامت کے دن ملک اللہ کا ہے۔ اب بھی ملک اللہ کا ہے، لیکن عارضی طور پر کوئی کہتا ہے کہ یہ فلاں کا ملک ہے۔ قیامت کے دن یہ کہنے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔ کون دعویٰ کرے گا؟ اور وہ دن کافروں پر سخت ہوگا۔

''مَالِكِ'' کا معنیٰ:

''مَالِكِ'' کی اضافت ''يَوْمِ الدِّيْنِ'' کی طرف کی گئی ہے کہ اس دن صرف وہی مالک ہوگا۔ اس دن اللہ کے حکم کے بغیر کوئی بول بھی نہیں سکتا۔ فرمایا:

﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۚ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾

[النبأ: ۳۸]

''جس دن ساری روحیں اور فرشتے قطاریں بنا کر کھڑے ہوں گے، اس دن سوائے اس کے کوئی نہیں بول سکے گا جسے خدائے رحمٰن نے اجازت دی ہو۔ اور وہ بات بھی ٹھیک ٹھیک کہے گا۔''

﴿وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا﴾ [طٰہٰ: ۱۰۸]

''اور خدائے رحمٰن کے آگے تمام آوازیں دب کر رہ جائیں گی، چنانچہ تمہیں پاؤں کی سرسراہٹ کے سوا کچھ سنائی نہیں دے گا۔''

سب آوازیں اللہ کے احکام کے لیے بجھ گئیں، خاموش ہو گئیں، بالکل ہلکی آواز ہو گئی۔ اور قیامت کے دن بدبخت لوگ بھی ہوں گے اور کامیاب لوگ بھی ہوں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس دن کوئی بطور حکم بھی مالک نہیں ہوگا۔

علامہ ابن جریر رحمہ اللہ نے ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کا ایک معنی یہ بھی کیا ہے کہ قیامت کو قائم کرنے والا، کیونکہ یہ اسی کی

طاقت ہے۔لیکن یہ قول ضعیف ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دونوں قول صحیح ہیں۔ پہلا قول راجح ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کے مالک ہیں۔

قیامت کا دن کتنا لمبا ہوگا؟

قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا،لیکن اللہ کے نیک بندوں پر ایسے گزرے گا جیسے ایک نماز پڑھنے کی دیر ہوتی ہے۔ایک روایت میں ہے کہ جیسے عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت ہے۔وجہ یہ ہے کہ جب مصیبت ہو تو رات بڑی ہو جاتی ہے اور جب خوشی ہو تو وقت کا پتا ہی نہیں چلتا۔

صحیحین کے اندر روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ سب سے خراب آدمی وہ ہے جو اپنے آپ کو مالک الاملاک بادشاہوں کا بادشاہ کہتا ہے۔کیونکہ یہ صرف اللہ کی ذات ہے اور کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ اپنے آپ کو شہنشاہ کہے۔

[صحیح البخاری: حدیث:٦٢٠٦،باب: أبغض الأسماء إلى الله، صحیح مسلم،حدیث:٢١٤٣]

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے ہاتھ میں زمینوں کو لپیٹ دیں گے اور آسمانوں کو لپیٹ کر فرمائیں گے: ''أَنَا الْمَلِكُ'' میں ہی بادشاہ ہوں (زمینوں کے بادشاہ کہاں گئے؟) ''أَيْنَ الْجَبَّارُوْنَ؟'' دنیا میں فساد اور جبر کرنے والے کہاں گئے؟ ''أَيْنَ الْمُتَكَبِّرُوْنَ؟'' زمین میں تکبر کرنے والے کہاں گئے؟

[صحیح مسلم،حدیث:٢٧٨٨]

علماء نے فرمایا کہ کسی دوسرے کو مجازاً ملِک کہہ سکتے ہیں،حقیقی مَلِک تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔قرآن میں ہے:

﴿إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنبِيَاءَ وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا﴾ [المائدۃ:٢٠]

''جب اللہ تعالیٰ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے اور تمہیں صاحبِ ملک (حکمران) بنایا۔''

اللہ پاک نے بندوں اور طالوت کو ملک کہا۔قصہ موسیٰ وخضر علیہما السلام میں بھی کہا کہ ایک بادشاہ آنے والا ہے۔تو ملک کا اطلاق کسی پر مجازاً جائز ہے۔

موت سے پہلے تیاری کرلو:

صحیحین کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے امت کے کچھ لوگ اللہ کی

راہ میں (جہاد کرنے کے لیے) اس دریا میں سوار ہوں گے، ان کی حالت تخت نشین بادشاہوں کی طرح ہوگی۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۲۸۷۷، باب: غَزْوِ الْمَرْأَةِ فِي الْبَحْرِ، صحیح مسلم، حدیث: ۱۹۱۲]

ایک حدیث پاک میں آتا ہے کہ عقل والا وہ ہے جو موت کے بعد پیش آنے والے حالات کی تیاری موت سے پہلے کر لے۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۲۴۵۹]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"حَاسِبُوا أَنْفُسَكُمْ قَبْلَ أَنْ تُحَاسَبُوا" [سنن الترمذی، حدیث: ۲۴۵۹]

"اپنے نفسوں کا حساب اس دن سے پہلے پہلے کر لو جس دن تمہارا حساب کیا جائے گا۔"

تم اپنے اعمال کا وزن کر لو اس دن سے پہلے جس دن تمہارے اعمال کا وزن کیا جائے گا اور اس پیشی کے لیے تیار ہو جاؤ جو تمہارے رب قدیر کے سامنے ہوگی، جس کے سامنے تمہاری کوئی چھوٹی بڑی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔

لہٰذا اب تم اپنا محاسبہ کر لو اور اپنے اعمال کے ساتھ تیاری کر لو۔ اللہ ہم سب کا خاتمہ ایمان پر فرمائے۔

﴿إِيَّاكَ﴾ اور ﴿نَسْتَعِينُ﴾ کی قراءتیں:

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝﴾ قراء سبعہ اور جمہور علماء نے اس کو یا کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ عمرو بن فائد نے اس کو تخفیف کے ساتھ ﴿إِيَاكَ﴾ پڑھا ہے۔ لیکن یہ قرأت شاذہ ہے۔ اور بعض نے اس کو ﴿أَيَّاكَ﴾ پڑھا ہے، بعض نے ﴿هَيَّاكَ﴾ پڑھا ہے۔ جیسے آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ اللہ نے قرآن کو سات قراءتوں میں نازل فرمایا ہے۔ جو بھی پڑھی جائے صحیح ہوتی ہے، لیکن بعض قراءات ایک دوسرے سے زیادہ مشہور ہوتی ہیں۔ پہلے نون کے زبر کے ساتھ ﴿نَسْتَعِينُ﴾ رائج قراءت ہے۔ یحییٰ بن وثاب اور اعمش نے نون کے کسرہ کے ساتھ ﴿نِسْتَعِينُ﴾ پڑھا ہے، لیکن یہ قراءت مشہور نہیں ہے۔

عبادت کا معنی:

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ عبادت کا لغوی معنی ذلت ہے کہ ایسا راستہ جس کو چل چل کر سیدھا کر دیا گیا ہو، پرانا کر دیا گیا ہو۔ "بَعِيرٌ مُعَبَّدٌ أَيْ مُذَلَّلٌ" اس وقت کہا جاتا ہے جب ایک اونٹ کو کام میں لگا لگا کر ہلاک کر دیا گیا ہو۔

شریعت کے اندر عبادت اس کو کہتے ہیں جس میں کمال محبت اور کمال خوف دونوں جمع ہو جائیں۔ کیونکہ کوئی بندہ

کسی ذات کی عبادت کر ہی نہیں سکتا جب تک اس کے بارے میں کمالِ محبت پیدا نہ ہو، وگرنہ آپ عاجزی اور تذلل پیدا کریں گے، نہ خشوع اور خضوع پیدا کریں گے۔ اگر ایک چیز ہے اور دوسری چیز نہیں ہے تو عبادت میں لذت پیدا نہیں ہوگی۔ اس لیے اللہ نے فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ ۗ﴾

[البقرۃ:۱۶۵]

''اور لوگوں میں کچھ وہ بھی ہیں جو اللہ کے علاوہ دوسروں کو اس کی خدائی میں اس طرح شریک قرار دیتے ہیں کہ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسے اللہ کی محبت (رکھنی چاہیے)۔ اور جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔''

اور اس کے بعد محبت کا درجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ سے محبت ہو، کیونکہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ، حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ))

[صحیح البخاری، حدیث:۱۵، باب: حُبُّ الرَّسُولِ ﷺ مِنَ الْإِيمَانِ]

''تم میں سے کوئی آدمی مومن نہیں بن سکتا جب تک میں اس کے نزدیک ماں باپ سے، اولاد سے اور ساری دنیا سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔''

حضور ﷺ سے محبت ہے تو اتباعِ سنت کریں:

محبوب کا معنی اور مطلب یہ نہیں کہ صرف زبانی کلامی اعتراف ہو۔ جیسے اس معنی کے اندر پڑھے لکھے لوگ بھی مغالطے میں پڑے ہوئے ہیں۔ دعویٰ محبت کا ہے، لیکن عمل آپ ﷺ کی سنت کے خلاف ہے۔ آدمی جس سے محبت کرتا ہے اس جیسی شکل بناتا ہے اور اس جیسا لباس پہنتا ہے۔ اگر ہمیں حضور ﷺ سے محبت ہے تو داڑھی سے کیوں ضد ہے؟ حضور ﷺ نے زندگی میں کبھی جماعت کی نماز نہیں چھوڑی۔ اگر ہمیں حضور ﷺ سے محبت ہے تو ہم جماعت میں حاضر کیوں نہیں ہوتے؟ زبان سے دعویٰ کچھ ہو اور اندر کچھ ہو اور عمل کچھ کرے اس کا نام منافقت ہے کہ جس کے دو رنگ ہوں۔ جب ایمان والوں سے ملا تو کہا: ہم تو پکے مومن ہیں۔ میرے دادا بھی شب بیدار اور تہجد گزار تھے اور میرے ابا جان ہر سال حج کرتے تھے۔

بدعات سے محبت اور دعوئ ایمانی:

ایک میں کہ کبھی مسجد میں نہیں گیا ہوں۔ میرے لیے دعا فرمایا کریں۔ مجھے آج تک اس مسلمان کی سمجھ نہیں آئی ہے۔ ہم قانونی مسلمان ضرور ہیں، لیکن حقیقی مسلمان نہیں ہیں۔ اور جو پکا مسلمان ہے وہ کہتا ہے: میں ہر سال میلاد مناتا ہوں، دس محرم کو باقاعدہ مجلس کرتا ہوں، سبیل لگاتا ہوں اور گیارہویں شریف مناتا ہوں..... إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ......

قرآن اگر ہاتھ سے گر جائے تو صدقہ کرے گا، خیرات کرے گا، اُٹھ کر قرآن کو چومے گا، خوشبو لگائے گا اور پریشان ہوگا، کہے گا کہ میرے لیے کیا سزا ہے؟ مجھ سے بڑی بے ادبی ہوگئی ہے اور جو قرآن کے اندر احکامات ہیں ان کو نہیں مانتا۔ یہ کیسا ایمان ہے؟ فاتحہ خوانی پر لڑتے لڑتے مر گئے کہ اس کے بغیر نماز ہوتی ہے یا نہیں، لیکن قبروں پر سجدہ جاری ہے۔ جبکہ فاتحہ کا سبق یہ ہے ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ اس میں غیر کی عبادت نہیں ہو سکتی۔

صرف اللہ کی عبادت کرنے کا معنی:

﴿إِيَّاكَ﴾ مقدم ہے، حصر کا فائدہ دے رہا ہے کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ یہ معنی نہیں ہے کہ تیری بھی عبادت کرتے ہیں۔ تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ دوسری جگہ اس کا معنی بیان فرمایا:

﴿إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ﴾ [الزمر:۲]

''(اے پیغمبر!) بے شک یہ کتاب ہم نے تم پر برحق نازل کی ہے، اس لیے اللہ کی اس طرح عبادت کرو کہ بندگی خالص اسی کے لیے ہو۔''

﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا﴾ [النساء:۳۶]

''اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔''

نماز عبادت ہے، رکوع عبادت ہے، سجدہ عبادت ہے، دعا، ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، عاجزی، تذلل اختیار کرنا عبادت ہے اور یہ صرف اللہ کا حق ہے۔

دعا میں شرک:

ایک عبادت نداء اور پکارنا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم بزرگوں کی عبادت نہیں کرتے، صرف دعا کرتے

ہیں۔ جبکہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) [سنن الترمذی، حدیث: ۳۳۷۱]

''دعا عبادت کا مغز ہے۔''

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ﴾

[غافر: ۶۰]

''اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔ بے شک جو لوگ تکبر کی بنا پر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔''

یہاں لفظ عبادت سے دعا مراد ہے۔ اس لیے حرف یا کے ساتھ غیر اللہ کو پکارنا مثلاً: کوئی کہتا ہے: یا رسول اللہ!، یا نبی اللہ!، یا ابراہیم خلیل اللہ!، یا جبرائیل!، یا میکائیل!، یا اسرافیل!، یا آدم!، یا نوح!، یا پیر!، یا دستگیر!۔ یہ شرک ہے، کیونکہ صرف اللہ کو پکارنا چاہیے۔

حضور ﷺ نے بھی اللہ کو پکارا ہے۔ آدم علیہ السلام نے بھی اللہ کو پکارا ہے۔ آپ خانہ کعبہ میں رکن یمانی کے پاس جو دعائیں پڑھ رہے ہیں یہ وہی دعائیں ہیں جو قرآن میں اللہ کے نبیوں نے مانگی ہیں، میرے مدنی پاک ﷺ نے مانگی ہیں۔ ان دعاؤں میں یعنی قرآن و حدیث میں کسی ایک جگہ بھی یہ نہیں ہے کہ اے ابراہیم! اے جبرائیل! مہربانی کر، یا داتا! یا دستگیر! یا پیر! ہماری مدد فرما۔

خدا ہماری سنتا نہیں اور ان کی موڑتا نہیں:

ان کا فلسفہ یہ ہے کہ ہم تو ان بندوں تک نہیں پہنچے تو خدا تک کیسے پہنچیں گے؟ ہم گناہ گار ہیں، ہماری گندی زبانیں ہیں ہم اللہ سے کیسے مانگیں؟ یہ اللہ کے پیارے ہیں ان کی بات خدا کبھی نہیں موڑ سکتا اور معاذ اللہ ہماری بات تو اللہ سنتا ہی نہیں ہے۔ یہ ان کا عقیدہ ہے۔ اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ اور ہر مسلمان کو کفر و شرک سے بچائے۔ (آمین)

محبت میں مبالغہ کا نقصان:

محبت کا معنی یہ نہیں کہ ہم شرک کریں اور حد سے تجاوز کریں۔ کوئی آدمی اپنی بیوی سے محبت کرتے کرتے ماں بنا

لے تو وہ بیوی اس پر حرام ہو جائے گی۔ اسی طرح کوئی آدمی ولی سے محبت کرتے ہوئے اس کو نبی بنا دے اور نبی سے محبت کرتے ہوئے اس کو خدا بنا دے۔

کیا ولایت اور امامت کا درجہ نبوت سے زیادہ ہے؟

بلکہ ان کا عقیدہ بن گیا کہ ولایت کا درجہ نبوت سے بھی اونچا ہے۔ پہلے ملنگوں نے عقیدہ بنایا تھا کہ امامت کا درجہ نبوت سے بھی زیادہ ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ حضور ﷺ نے معاذ اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی ہے۔ پہلے ملنگوں کا یہ عقیدہ تھا تو ہمارے لوگوں نے کہا کہ ہم کیوں پیچھے رہ جائیں تم تو امامت کی بات کرتے ہو ہم کہتے ہیں کہ ولایت کا درجہ نبوت سے بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ نبی تو نبی ہے لیکن دعا کر رہا ہے:

﴿رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ﴾ [الشعراء: ۸۳]

''میرے رب! مجھے حکمت عطا فرما، اور مجھے عباد صالحین میں شامل فرما۔''

اور عباد صالحین ولی ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ولایت کا مرتبہ بلند ہے۔ یہ جہالت ہے اور جہالت بری بلا ہے۔ اللہ ہدایت عطا فرمائے۔

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کے اندر سارا مسئلہ ہے ﴿إِيَّاكَ﴾ پہلے ہے کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ یہ حصر ہے بمعنی بند کر دینا اب عبادت صرف اللہ کے لیے بند ہوگئی۔ حضور ﷺ نے اس کی تفسیر میں فرمایا:

((إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللَّهَ))

''جب تو سوال کرے تو اللہ سے سوال کر، اللہ سے مانگ۔''

((وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللَّهِ)) [سنن الترمذی، حدیث: ۲۵۱۶]

''جب مدد پکڑو تو اللہ کے ساتھ مدد پکڑو۔''

یہ جملے اگر سمجھ لو تو ساری زندگی شرک سے بچ جاؤ گے۔

اللہ سب کی سنتا ہے:

کہتے ہیں کہ اللہ پاک تو فوق العرش ہیں، وہ ہماری کیسے سنیں گے؟ تو اللہ نے فرمایا:

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ

﴿يَرْشُدُونَ ۝﴾ [البقرۃ:۱۸۶]

''اور (اے پیغمبر) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجیے:) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں۔ لہٰذا وہ بھی میری بات دل سے قبول کریں، اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ وہ راہِ راست پر آ جائیں۔''

اللہ فرمارہے ہیں میں قریب ہوں کیونکہ اس کا علم ہر شئی کو محیط ہے۔ تو معیت علمی کے اعتبار سے اللہ پاک ہر چیز کے قریب ہیں۔ اس کی شان عالی ہے۔

بلکہ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا پر نزولِ اجلال فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں: ((هَلْ مِنْ سَائِلٍ يُعْطَى؟)) (ہے کوئی مانگنے والا جس کا میں سوال پورا کروں؟) [مسلم، رقم:۷۵۸]

کیا مقبول دعا کے لیے وسیلہ ضروری ہے؟

اللہ پاک فرمارہے ہیں کہ ہے کوئی مانگنے والا؟ اور ہمارے لوگ کہتے ہیں کہ خدا سنتا ہی نہیں کہتے ہیں کہ اللہ سے بات کرنے کے لیے کسی واسطے اور وسیلے کی ضرورت ہے جیسے دنیا کے بادشاہ کے پاس جانے کے لیے واسطے کی ضرورت پڑتی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بادشاہ کے ساتھ تشبیہ دینا کفر ہے۔ کیونکہ فرمایا:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [الشوریٰ:۱۱]

''اس کی تو کوئی مثل ہی نہیں ہے۔''

یہ مثال دینے سے انسان ایمان سے بھی نکل جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بادشاہ انسان ہیں کبھی راضی ہیں اور کبھی ناراض ہیں کبھی سنتے ہیں کبھی نہیں۔ جبکہ وہ کریم ذات کہہ رہی ہے کہ مجھ سے مانگو اگر مجھ سے نہیں مانگو گے تو میں ناراض ہو جاتا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: جب بندہ توبہ کرتا ہے تو میرے اللہ خوش ہوتے ہیں کہ دیکھو ملائکہ میرے بندے نے آج پہچان لیا ہے کہ اس کا بھی کوئی رب ہے۔ اگر کوئی آدمی ستر سال بھی گناہ کر کے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بھی معاف فرمادیتے ہیں۔ وہ اتنا ارحم الراحمین ہے تو وہاں سیڑھیاں لگانے کی کیا ضرورت ہے؟

کسی کو قاضی الحاجات یا کافی المہمات سمجھنا، مشکل کشا سمجھنا، سیڑھیاں پکڑنا یہ سب چیزیں کفر و شرک کی حد میں آجاتی ہیں۔ اللہ پاک ہر مسلمان کو کفر و شرک سے بچائے۔ پورے دین کا خلاصہ نکالو تو ان دو جملوں میں ہے کہ عبادت بھی اللہ کی ہو اور مدد بھی اس سے مانگی جائے۔ حضور ﷺ ساری ساری رات نماز کے اندر گزارتے تھے۔ پاؤں پر ورم آجاتے تھے۔ حضور ﷺ تو اللہ کی نماز پڑھیں اور ہم لوگوں کی نماز پڑھیں۔

انبیاء ﷺ رورہے ہیں، حتیٰ کہ روتے روتے حضرت نوح علیہ السلام کا لقب بھی نوح پڑ گیا۔ یاد رکھیں! نبی نبی ہوتا ہے اور ولی ولی ہوتا ہے۔ لاکھو ولی ایک پیغمبر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور سارے نبی میرے پیارے مدنی ﷺ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ قرآن میں کسی جگہ حضور ﷺ نے اپنے ابا ابراہیم علیہ السلام کو پکارا ہو یا اللہ کو ان کا واسطہ دیا ہو، حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ اور جتنے بزرگ گزرے ہیں۔ اللہ ان کے درجات کو بلند فرمائے۔ ان کی زندگیاں دیکھ لیں۔ کہیں یہ بات نہیں ملے گی۔

دعا میں وسیلہ:

ہمارے بھائیوں نے بس ایک روایت دیکھی ہوئی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے یوں اوپر دیکھا تھا، عرش کے پائے پر حضور ﷺ کا نام لکھا ہوا تھا تو حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا یا اللہ! یہ کس کا نام لکھا ہوا ہے؟ اللہ نے فرمایا یہ میرا محبوب ہے، حبیب ہے اور آخری نبی ہے تو حضرت آدم علیہ السلام نے حضور ﷺ کا واسطہ دیا تو اللہ نے دعا قبول فرمائی۔ لیکن وہ ہمیں یہ بات صحاح ستہ میں سے کسی کتاب میں دکھائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے حضرت آدم علیہ السلام کو خود سکھلایا کہ تم ان کلمات کے ذریعہ مانگو تو ہم تمہاری دعا قبول کریں گے۔ فرمایا:

﴿فَتَلَقّٰٓي اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ﴾ [البقرۃ: ۳۷]

''اللہ نے اپنی طرف سے ان کے دل میں کلمات ڈالے کہ ان کلمات سے مانگو تو میں راضی ہوں گا۔''

وہ کلمات یہ تھے:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۲۳﴾ [الاعراف: ۲۳]

''اے ہمارے پروردگار! ہم اپنی جانوں پر ظلم کر گزرے ہیں، اور اگر آپ نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ

کیا تو یقیناً ہم نامراد لوگوں میں شامل ہو جائیں گے۔"

حضرت آدم علیہ السلام کا پیدا ہونا اور فرشتوں کو سجدہ کرنا بھی قرآن میں موجود ہے، شیطان کا انکار کرنا، حضرت آدم وحوا علیہما السلام کا جنت میں داخل ہونا، ان کو درخت سے روکا جانا، ان کا درخت کو کھانا، ان کے کپڑوں کا اتر جانا اور ان کو جنت سے اتار کر دنیا میں بھیجنا بھی قرآن میں موجود ہے۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام نے میرے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ پکڑا تھا تو وہ قرآن میں موجود کیوں نہیں ہے؟

ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو تو قرآن میں ذکر کر دیا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو مٹی سے پیدا فرمایا۔ وغیرہ ان سب کو اللہ نے ذکر کیا لیکن جو اصل مسئلہ واسطہ تھا اس کو اللہ نے بیان نہیں کیا۔ اچھا اگر قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا ذکر فرما دیتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں وضو سکھلا دیا، مسح کرنا سکھلا دیا، لیکن یہ مسئلہ نہیں سکھلایا۔ خدا کے لیے اس پر غور کریں۔

قرآن کی اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں:

﴿یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْۤا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ﴾

"اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور اس تک پہنچنے کے لیے وسیلہ تلاش کرو۔"

کیا یہاں پیچھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے؟ بلکہ پیچھے تقویٰ کا ذکر ہے کہ اللہ سے تقویٰ کے ساتھ وسیلہ پکڑو، اپنے اعمالِ صالح کو وسیلہ بناؤ۔ ہم معاذ اللہ اللہ کے قرآن میں بلاوجہ تحریف کر دیں؟ آگے ارشاد فرمایا:

﴿وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ﴾

"اور اس کے راستے میں جہاد کرو۔"

اگر ہمیں واسطے کا حکم دیا جا رہا تھا تو پھر محنت کے حکم کی کیا ضرورت تھی؟ اور فرمایا:

﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ [المائدۃ:۳۵]

"شاید تم کامیاب ہو جاؤ۔"

اللہ چاہے تو تمہیں کامیاب کر دے اور چاہے تو ناکام کر دے۔

انگوٹھے چومنے کا مسئلہ:

لیکن آج ہم رواج کے اندر اتنے پھنس گئے ہیں کہ چاہے ان کو قرآن سناؤ، حدیث سناؤ مانتے نہیں ہیں۔ پورا

قرآن سنتے ہیں، لیکن جب حضور ﷺ کا نام آئے تو انگوٹھے چومنے لگ جاتے ہیں۔ بھائی! ہاتھ اپنا چومتے ہو اور احسان حضور ﷺ پر کر رہے ہو؟ روٹی تم کھاؤ اور فائدہ مجھے پہنچے؟ آج تک یہ مسئلہ میری عقل کے اندر نہیں بیٹھا۔ تمہارے ہاں کوئی پیر آ جائے تو اس کے ہاتھ چومتے ہو یا اپنے ہاتھ چومتے ہو؟

سارے قرآن کا خلاصہ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ والی آیت میں ہے:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سارے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ ہے اور ساری سورۂ فاتحہ کا خلاصہ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ ہے۔ عبادت بھی تیری ہے اور مدد بھی تجھ سے مانگیں گے۔ جب ہم ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کہتے ہیں تو ہم شرک سے بری ہو جاتے ہیں اور جب ہم ﴿وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کہتے ہیں تو ہم اس میں اعتراف کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہم عاجز ہیں، ہم تیری مدد پکڑیں گے۔ تیرے سوا کوئی مدد کرنے والا نہیں ہے، تیرے سوا کوئی نفع ونقصان کا مالک نہیں ہے، تیرے سوا کوئی حاجت روا اور مشکل کشا نہیں ہے، تیرے سوا کوئی نذر و نیاز اور استغاثہ کا مالک نہیں ہے اور تیرے سوا کسی کی منت نہیں ہے، ہم نے عبادت بھی تیری کرنی ہے اور مدد بھی تجھ سے مانگنی ہے۔ اب سیدھے راستے پر آ گئے۔

اللہ ہی عبادت کے لائق کیوں ہے؟

زمانہ تین قسم پر ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل۔ ماضی زمانہ گزرا ہوا، حال موجودہ زمانہ اور مستقبل آئندہ زمانہ ہے۔ جب ہم نے ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ کہا تو ہم نے اقرار کیا کہ ماضی میں ہم عدم تھے تو اس سے تو نے ہی وجود بخشا اور تو ہی ہمارا رب ہے۔ ﴿الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾ بہت مہربان، نہایت رحم والا اللہ کہ جس نے ہماری ہر ضرورت کو پورا فرمایا، اللہ نے ہماری ہر حال میں مدد فرمائی اور ہمیں نعمتیں عطا فرمائیں۔ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کے اندر استقبال والا معنی ہے کہ یا اللہ! ہم تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں کہ جیسے تو نے ماضی اور حال میں ہماری مدد فرمائی ہے ایسی ہی آنے والے زمانہ میں اور آخرت میں بھی ہماری مدد فرمانا۔

اسی طرح جب آپ غور کریں گے کہ ہمیں عدم سے وجود میں لانے والا اللہ ہے، ہمیں پیدا کرنے والے، ہماری تربیت کرنے والے، ہم پر رحم کرنے والے اور مہربانی کرنے والے اللہ ہیں تو عقلی تقاضا یہ ہے کہ عبادت کے لائق بھی صرف اسی کی ذات ہے۔

پیروں کو رب بنانے کی مذمت:

قرآن پاک کی آیت مبارکہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [التوبۃ: ۳۱]

''بعض لوگوں نے اپنے مولویوں کو اور پیروں کو اللہ کے سوا خدا بنالیا ہے۔''

''اَحْبَار'' ''حَبْرٌ'' کی جمع ہے بمعنیٰ عالم اور ''رُهْبَان'' ''رَاهِبٌ'' کی جمع ہے۔ وہ لوگ جو گوشہ نشین ہوتے ہیں، پہاڑوں میں چلے جاتے ہیں۔ ان کو عیسائی مذہب میں راہب کہتے ہیں۔ ''اَرْبَاب'' ''رَبٌّ'' کی جمع ہے۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ پہلے عیسائی تھے، پھر مسلمان ہو گئے تھے۔ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! قرآن میں ہے کہ لوگوں نے اپنے مولوی، راہب اور پنڈت کو رب بنالیا جبکہ ہم نے تو کبھی رب نہیں بنایا تھا۔ (ہم نے پیر کو پیر کہا ہے، کبھی رب نہیں کہا ہے۔) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عدی! جن چیزوں کو اللہ نے حلال کیا، لیکن تمہارے مولویوں اور پیروں نے ان کو حرام کر دیا تو تم نے ان مولویوں کی بات مان لی یا نہیں مانی؟ انہوں نے کہا کہ مانی تھی۔ اور جن چیزوں کے بارے میں حکم دیا کہ ان کو کرو اور انہوں نے کہا کہ ان کو نہ کرو اور جن چیزوں کے بارے میں اللہ فرمایا کہ ان کو نہ کرو انہوں نے کہا کہ اس کو کرو۔ تو تم نے ان کی بات کو مانا یا نہ مانا؟ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہفتہ والے دن شکار نہ کرو تو پادریوں سے پوچھا کہ یہ بڑا مشکل حکم ہے اس دن مچھلی بھی بہت ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس طرح کرو کہ چھوٹے چھوٹے نالے بنا کر آگے حوض بنالو جب مچھلی ان میں آجائے تو اس کو بند کر دیا کرو اور دوسرے دن پکڑ لیا کرو۔ لوگوں نے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ حضرت حاتم رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! بات ایسے ہی تھی وہ جس کے بارے میں ہمیں کہتے تھے کہ کرو، ہم اس کو کرتے تھے اور جس کے بارے میں کہتے تھے کہ نہ کرو تو ہم نہ کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ حق تو رب کا ہے۔ جب اس کے مقابلے میں یہ حق کسی بندے کو دے دیا تو گویا تم نے اس کو رب بنالیا۔ [السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث: ۲۰۳۵۰]

گیارہویں، عرس اور قبروں کا طواف:

سارے قرآن مجید کو آپ ٹھنڈے دل سے پڑھ لیں اللہ یا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جگہ گیارہویں کرنے کا حکم دیا ہے، عرس شریف کا حکم دیا ہے؟ جب یہ حکم قرآن میں نہیں تو ہم جن مولویوں کے حکم پر چل رہے ہیں تو گویا ہم ان کو

رب بنا رہے ہیں۔ اللہ نے قرآن پاک کے اندر فرمایا کہ میرے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں ہے۔ تو انہوں نے کہا وہ سجدہ الگ ہے یہ سجدہ تعظیمی ہے کعبہ والا طواف عبادت کا ہے اور قبر والا طواف تعظیم کا ہے۔

ماتحت الاسباب اور مافوق الاسباب مدد کا حکم:

﴿وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ مدد اس سے مانگی جاتی ہے جو ہماری بولی بھی جانتا ہو اور جو ہماری بولی ہی نہ جانتا ہو اگر اس سے مدد مانگتے رہیں تو وہ کہے گا کہ کیا کہہ رہے ہو۔ کیا جب وہ مر جائے تو قبر میں جانے کے بعد تمام زبانیں سمجھنے لگ جاتا ہے؟ کسی سے دنیاوی اسباب کے اعتبار سے مدد مانگنا مثلاً میں کسی کو کہوں کہ مجھے چلنے میں تکلیف ہو رہی ہے ذرا تھوڑا سا سہارا تو دو یہ جائز ہے۔ ایک ہے کسی کو متصرف، مختار کل مانتے ہوئے اس سے مدد مانگنا یہ شرک ہے یا یہ عقیدہ رکھے کہ قادر مطلق خدا ہے رازق خدا ہے، متصرف فی الامور بھی خدا ہے، لیکن اللہ نے ان کو بھی مختار بنا دیا ہے۔ اب ہم ان سے مانگیں گے۔ یہ شرک ہے۔

کفار مکہ اور موجودہ لوگوں کا نظریہ:

جب مشرکین سے پوچھا جاتا تھا کہ تم بتوں کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ تو وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ یہ ہمارے خدا ہیں، بلکہ وہ کہتے تھے:

﴿هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [یونس:۱۸]

''یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ جس سے ہمارا کام ہو جاتا ہے۔''

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ [الزمر:۳]

''ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔''

اس لیے جب وہ تلبیہ پڑھتے تھے تو کہتے تھے:

''لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ إِلَّا شَرِيكًا هُوَ لَكَ، تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ.''

''اللہ! تیرا کوئی شریک نہیں ہے مگر جس کو تو نے خود اپنا شریک بنایا ہے۔ اس کا مالک بھی تو ہے اور وہ تیرا مالک نہیں ہے۔''

ان کا عقیدہ بھی یہی تھا۔ اب اسی عقیدہ کے ساتھ کسی بزرگ کے مزار پر جانا، کسی اللہ والے کی قبر پر جانا، ان کے آستان پر جانا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ اصل تو اللہ ہے، لیکن اللہ نے ان کو بھی کچھ نہ کچھ اختیار دے دیا ہے۔ اور اسی

اختیار دیے ہوئے میں سے ہمیں دے دیتے ہیں یہ بھی شرک ہے۔

معجزات اور کرامات کے ذریعہ دھوکہ:

معجزات اور کرامات سے دھوکہ دیتے ہیں۔ جیسے حضور ﷺ نے چاند کو دو ٹکڑے فرمایا تو کہتے ہیں اگر اختیار نہ ہوتا تو چاند کو دو ٹکڑے کیسے فرماتے؟

پانی کا دریا بہہ رہا ہے اللہ کا ولی پوری فوج لے کر اس پر گزر گیا لوگوں نے کہا اگر اختیار نہ ہوتا تو دریا پر سے کیسے گزرتے؟ معلوم ہوا کہ اللہ نے ان کو اختیارات دے دیے ہیں۔ تو ان معجزات اور کرامات سے آدمی کو دھوکہ دیا جاتا ہے۔

یاد رکھیں! اللہ کے حکم کے بغیر معجزہ نبی کے ہاتھ پر ظاہر نہیں ہو سکتا اور کرامت اللہ کے ولی کے ہاتھ پر ظاہر نہیں ہو سکتی۔ اللہ چاہتے ہیں تو دکھلا دیتے ہیں اور اگر اللہ نہیں چاہتے ہیں تو نہیں دکھلاتے۔ اگر اللہ چاہتے ہیں تو حضور ﷺ کی انگلی مبارک سے چاند دو ٹکڑے ہو جائے اور اگر اللہ نہیں چاہتے ہیں تو حضور ﷺ کے دو دندان مبارک شہید بھی ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے پیالہ کے اندر اپنا ہاتھ مبارک رکھا تو پندرہ سو آدمیوں نے اس سے پانی پی لیا۔ کبھی نہ دکھلایا تو حضور ﷺ کئی کئی دن فاقہ سے رہے۔

معجزہ و کرامت برحق ہے، لیکن تب ظاہر ہوتے ہیں جب اللہ تعالیٰ دکھلانا چاہتے ہیں نہ معجزہ نبی کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے اور نہ کرامت ولی کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ مکہ والے آپ کے پاس آگئے کہ آپ ہمیں یہ معجزہ دکھائیں اور یہ معجزہ دکھائیں تو اللہ نے فرمایا:

﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا﴾ [الاسراء: ۹۳]

"میرے مدنی! آپ ان کو جواب دیں کہ اے کافرو، معجزہ مانگنے والو! میرے رب کی ذات پاک ہے میں تو ایک بشر ہوں اور اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک رسول ہوں۔ معجزات ہمارے ہاتھ میں نہیں ہیں۔"

تمام پیغمبروں نے کہہ دیا:

﴿وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ [ابراہیم: ۱۱]

"اے کافرو! معجزہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ ہم اللہ کے حکم کے بغیر تمہارے مطالبے پورے کردیں۔"

اس لیے کسی کو قادر مطلق، خالق، مالک سمجھ کر مدد مانگنا بھی شرک ہے اور یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ نے ان کو اختیار دے دیا ہے یہ بھی شرک ہے۔

تفسیرِ مکی

اس کائنات رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں: بیت اللہ، کتاب اللہ اور اہل اللہ۔ اگر کسی جگہ پر ان تینوں کا اجتماع ہو تو مخلوق کے دلوں کا کھنچ آنا امر بدیہی ہے، جس کا مشاہدہ مسجد الحرام میں بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد مکی دامت برکاتہم العالیہ کے درس قرآن کے حلقہ میں کیا جا سکتا ہے۔ حضرت مولانا محمد مکی دامت برکاتہم العالیہ کے درس کا یہ حسن ہے کہ وہ جہاں توحید خداوندی کے رسوخ اور شرک و بدعت کی تردید پر زور دیتے ہیں، وہاں عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین کی محبت و احترام پر حرف نہیں آنے دیتے۔ بلکہ اپنے اکابر کے طریق پر چلتے ہوئے جس کمال مہارت سے سامعین کو راہ اعتدال پر گامزن کرتے ہیں یہ انہی کے درس کا خاصہ ہے۔ حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ کے دروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی درستگی، فکر آخرت، اخلاص و تقویٰ، اخلاق حمیدہ اور سیرت و کردار کی بلندی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ زیر نظر تفسیر ''انوار الحرم'' المعروف ''تفسیر مکی'' حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ کے دروس کا مجموعہ ہے۔

مکتبۃ الفقیر 223 سنت پورہ فیصل آباد
Cell: [illegible] E-mail: [illegible]